کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد ہفتم)

انشائیے (سوم)

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد ہفتم)

انشائیے (سوم)

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد ہفتم)

انشائیے (سوم)

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت	:	2012
تعداد	:	550
قیمت	:	-/140 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1593

Kulliyat-e-Rasheed Ahmed Siddiqui (Inshaiye-3) Vol.-VII
Edited & Compiled by:
Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-81-7587-776-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیشتر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہلِ قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کر لیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتدادِ وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ جائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین میں بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز و مزاح

اور انشائیہ کی اصناف کے بنیاد گداز کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کو رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ایسا استحکام نہ بخشا ہوتا تو بعد کے زمانے میں مشتاق احمد یوسفی، مختار مسعود، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز و مزاح کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں میں ایسی رنگا رنگی نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ علی گڑھ اور دبستان علی گڑھ کو ایک روایت میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس طرح ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک شائستہ طرز زندگی کی علامت کی شکل میں پیش کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ، عرصۂ دراز تک اپنے علمی اور تہذیبی کارناموں کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات رشید احمد صدیقی کے پروجیکٹ میں ان کی کتابی شکل میں مطبوعہ تحریروں کے ساتھ رسائل کے صفحات میں منتشر تحریروں، ان کے خطوط اور غیر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ کلیات محض رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی دوبارہ اور یکجا اشاعت ہی نہیں، تحقیق و تلاش اور تدوین کا بھی عمدہ نمونہ بن کر قارئین کے سامنے آرہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کے اپنے تمام منصوبوں میں اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو باخبر کریں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کر لیا جائے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائرکٹر

فہرست مضامین

دیباچہ IX

(●) **خنداں**

ریڈیو سننے والے 1
احمق کی جنت 9
ہوٹل میں ریڈیو 15
سفر (پہلے اور اب) 23
دعوت 31
یو. پی والا! 39
شراب کی ممانعت 49
امتحانات 57
باغ 65
ریڈیو کا مستقبل 73
خنداں 81

ایڈیٹر 91

شیخ پیرو 99

کنجوس 107

دیہاتی ڈاکٹر 115

فدوی 121

مقرّر 129

لیڈر 137

بابو 147

بیرا 153

بجرو 161

ملاح 169

ہونہار 177

اگر میں فاؤنٹین پین ہوتا 185

اگر میں چور ہوتا 193

اگر ڈاکٹر نہ ہوتے 201

شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے 209

ایم۔ایل۔اے ہونے کے کیا معنی ہے 217

پبلک 225

کانفرنس، کونسل، کمیٹیاں 233

الیکشن 241

عدالت 249

بیمہ کا ایجنٹ 257

سوداگر و سوداگری 265

عاشق 275
محبوب 283
دربان 293
ناصح 301
رقیب 309

(●) مضامین

حاجی صاحب 317
دھوبی 331
وکیل صاحب 341
چارپائی 349
پاسبان 357
ارہر کا کھیت 375
گواہ 381
شیطان کی آنت 389
ماتابدل 401
کارواں پیدااست 411
کھاگ 425
آمد میں آورد! 431
مغالطہ 439
مثلث 451
کچھ کا کچھ! 471

●●●

دیباچہ

رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے صف اوّل کے انشاپردازوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے انشائیے کا بڑا حصہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور خاکوں تک بھی پھیلا ہوا ہے اس لیے ان کی تحریروں میں طنز کا عنصر بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی حیثیت اردو کے لیے ایک مثالی طنز نگار کی بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رشید صاحب کی انشائیہ نما تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ لیکن اس سے اس پہلو کی نفی بالکل نہیں ہوتی کہ ان کی غیر مزاحیہ یا سنجیدہ تحریریں بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم کسی ادیب کے بنیادی اسلوب اور نمایاں رویے کی شہرت کو ادبی استناد سازی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ہم کسی ادیب کے ایک پہلو کو اتنا نمایاں کر دیتے ہیں کہ اس کے دوسرے امتیازات ثانوی سمجھے جانے لگتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رشید صاحب کی غیر مزاحیہ تحریریں چونکہ ابتدا میں کم شائع ہوئیں اس لیے اس نوع کی سنجیدہ اور بردبار تحریروں کی جانب اہل ادب کی بہت کم توجہ مرکوز رہی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی سنجیدہ تحریروں میں یوں تو ان کے خطبات کو مرکزیت حاصل ہے، اس لیے کہ ان خطبات کے موضوعات متنوع ہیں اور ہمیں غور وفکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

خطبات کے علاوہ رشید احمد صدیقی نے تنقیدی وتحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، اپنی آپ بیتی بھی لکھی ہے اور بعض اہم شخصیات اور معاصرین پر اعلیٰ درجے کے خاکے بھی لکھے ہیں۔ لیکن

ادبی اور تنقیدی اعتبار سے یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ تحقیق و تنقید کے علاوہ ان کے اظہار کے تمام اسالیب کو انشائیہ نگاری کے بڑے عنوان سے معنون کیا جاسکتا ہے۔ غیر افسانوی ادب میں یوں بھی انشائیہ نگار کو سب سے زیادہ ادبی وسائل کے استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خطوط نگاری، سوانح نگاری، سفر نامہ اور ان نوع کی اصناف میں ادیب کو تخلیقی اور تخیلی آزادی نصیب تو ہوتی ہے مگر برائے نام ہی ہوتی ہے۔ جبکہ انشائیہ کے دائرے میں آنے والے طنزیہ مضامین ہوں، ظریفانہ تحریر ہوں یا مزاحیہ مضامین یا پھر خاکے اور شخصیتوں کی نئی تشکیل، ہر صنف اور ہر اسلوب میں رشید احمد صدیقی جیسا ادیب اپنی ادبیت اور شعریت کے عناصر کو کسی نہ کسی روپ میں ضرور استعمال کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بہ ظاہر غیر معمولی اصناف نہ ہوتے ہوئے بھی ان اصناف میں دنیا کے بارے میں سنجیدہ ردعمل، روایت کی تشریح نو، شعری نمونوں کی تخلیقی، پیروڈی اور دانش وری کی روایت میں شامل تلمیحات اور لوک کہاوتوں کو رشید احمد صدیقی نے نہایت فن کارانہ اور دانش ورانہ سطح پر استعمال کیا ہے اور اس طرح انشائیہ کی صنف کو مختلف اصناف کا جوہر بنادیا ہے اور اس صنف میں اپنے اظہار کو دوام عطا کردیا ہے۔

اسی لیے عرض کیا جاسکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کو پڑھ کر ہمیں اس بات کا قائل ہوجانا پڑتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار ہونے کے علاوہ ایک دیدہ ور مفکر، سنجیدہ و بے باک تجزیہ نگار نیز اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے ادارے (علی گڑھ) کے سچے بہی خواہ اور قوم وملت کے حقیقی غم خوار بھی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی ہر تحریر میں ان کے برسوں کا تجربہ اور ان کی گہری فکر جھلکتی ہے۔ ان کو قومی، لسانی اور ملی مسائل سے کتنی گہری وابستگی تھی اور انھوں نے عرصے تک ان کے مسائل پر کسی بصیرت افروز انداز میں غور وفکر کیا تھا۔ ان تمام باتوں کی جھلک ان کے انشائیوں تک میں بھی خطبات کی طرح ہی صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کا عمیق مطالعہ رشید صاحب کے ادبی قدر کے ساتھ دانش ورانہ قدر ومنزلت میں بھی مزید اضافہ کردیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کا یہ تنوع اور رنگارنگی بلاشبہ اردو کے غیر افسانوی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے جس کو مربوط انداز اور جدید طریق کار کے ساتھ پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔ رشید صاحب کی ذہنی افتاد، علمی تبحر اور دانش ورانہ فہم وفراست کو سمجھنے کے لیے ان انشائیوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مرتب

ریڈیو سننے والے

خدا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سنتا سب کی ہے کرتا اپنی جیسی ہے۔ ریڈیو سننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ سنتے سب کی ہیں اور کر کچھ نہیں پاتے، غالب کو بھی یہی دقت پیش آئی تھی لیکن وہ تو یہ کہہ کر صاف نکل گئے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

لیکن آپ کو تو معلوم ہے جب آدمی کچھ کر نہیں پاتا تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا اس کے بندوں کو گالی دینے لگتا ہے مگر اب زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ آدمی کو اللہ کا شکر ادا کرنے کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت، چار و ناچار گالی سے جی بہلاتا ہے۔ اس میں ریڈیو والوں کا کوئی قصور نہیں ہے ان کی کمزوری ضرور ہے۔ وہ ہر ایک کو خوش کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض لوگ خوش ہونے سے شرماتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ خوش ہونے سے کھانا کم ہضم ہوتا ہے۔ ریڈیو سننے والے بھی اکثر قابلِ رحم ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہی کیا کم آفت ہے کہ ان کی کوئی نہ سُنے اور وہ سب کی سنتے جائیں، اس لیے اُکتا کر اگر وہ کبھی کبھی اول فول بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں (بکنے لگیں یا بکنے لگ جائیں دونوں صحیح ہیں بشرطیکہ آپ پہلے یہ دریافت کر لیں کہ بکنے والا کون ہے) یا چہرہ ایسا بنائیں جیسے کوئی اناڑی کی طرح سوڈا واٹر چڑھا جائے اور ڈکار آنے والی ہو تو مہذب بننے کی کوشش کرے تو ان کو معاف کر دینا چاہیے۔

ریڈیو سیٹ ابھی ہندوستان میں عام تو ہوا نہیں ہے اس لیے جس کسی کے پاس اس قسم کا سیٹ ہے اس کو وہی حاصل ہوتی ہے جیسے کسی گاؤں میں پہلے پہل اونٹ آیا، لوگوں نے کہا بھگوان آئے۔

آپ معاف فرمائیں اونٹ اور بھگوان والی مثل کا میں مصنف نہیں ہوں۔ یہ روایت صرف بزرگوں سے سنتا آیا ہوں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں، میں نے نہ تو اونٹ قسم کا بھگوان دیکھا نہ بھگوان قسم کا اونٹ، البتہ ان اقسام کے آدمی ضرور دیکھے ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ ہی کے آس پاس کوئی صاحب اسی قسم کے بیٹھے ہوں، لیکن آپ گھبرائیں نہیں وہ جس کل بیٹھ گئے ہوں گے بیٹھے ہوں گے۔ پھر اونٹ کی صحبت کچھ بُری بھی نہیں ہے بشرطیکہ آپ اس وقت کسی اونٹ گاڑی کی اوپر والی منزل پر نہ بیٹھے ہوں۔ معاف کیجیے گا، ریڈیو سننے والوں کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ میں نے احتیاطاً اونٹ گاڑی کا نام لے دیا، ورنہ کجا آپ اور کجا اونٹ۔ پورب کی مثل تو آپ نے سنی ہوگی ''دودھیلی گائے کی دولات بھی برداشت کرنا چاہیے۔'' اور اونٹ کا حال تو آپ جانتے ہیں اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اونٹ اور گائے دونوں الہامی جانور ہیں، جن سے ذرا دور ہی رہنا بہتر ہے۔

اچھا دیکھیے وہ صاحب جو سامنے بیٹھے ہوئے ہیں ان سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ ان کی آنکھ دیکھیے دونوں مصنوعی ہیں کہنے کا مطلب یہ کہ بٹن جیسی، یعنی پتھرائی ہوئی۔ یہ گانا جانتے نہیں۔ لیکن ان سے زیادہ گانا سمجھنے کی کوشش کرنے والا شخص میں نے نہیں دیکھا ہے۔ گانا سنتے وقت ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے اور شکل چوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ پوچھا جاتا ہے حضور گانا کیسا تھا، غرّا کر جواب دیتے ہیں گانا کون سُن رہا تھا۔ پوچھا گیا حضرت کس فکر میں تھے، بولے کنجی کہیں بھول آیا۔ تلاش میں نکلا، پھر سوچا ریڈیو ہی سنتے چلیں اور کیوں جی یہ جو گا رہا تھا کوئی عورت تھی یا مرد۔ میں نے کہا، نہ عورت نہ مرد، گراموفون تھا۔ کہنے لگے۔ جب ہی تو سوچتا تھا کہ آواز کبھی کی سُنی ہوئی ہے لاحول ولاقوۃ۔

ریڈیو سننے والوں کو ایک جگہ بیٹھا دیکھ کر مجھے اکثر کونسل یا اسمبلی کا اجلاس یاد آجاتا ہے۔ یعنی پروگرام جاری ہے لیکن حاضرین اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔ کوئی ہنس رہا ہے، کوئی

بول رہا ہے، کسی کو بولنا نہیں آتا تو کڑھ رہا ہے، کوئی اونگھ رہا ہے، کوئی ایسے مقام کی تلاش میں ہے جہاں نہ اس کو کوئی دیکھ سکے اور نہ اس کی سُن سکے، کوئی آمادہ فوج داری ہے، تو کوئی آمادۂ وفاداری۔

میرا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض لوگ ریڈیو کے بہانے شربت، پانی، سگریٹ سے شغل کرنے آتے ہیں اور چلتے وقت یہ کہہ کر دل بڑھا جاتے ہیں کہ آپ کا ریڈیو اچھا ہے، فرصت ہوئی تو کبھی پھر سنوں گا۔ اچھا پروگرام ہوا کرے تو اطلاع بھجوا دیا کیجیے۔ ریڈیو کے بعض مالک خود ریڈیو نہیں سنتے بلکہ ریڈیو سننے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اُن کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے اللہ تعالیٰ اپنے کمزور بندوں کی دوڑ دھوپ، مکر و فریب، رنج و راحت دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں دیکھیے کیسی معمولی چیز کو یہ شخص کس انہماک یا دلچسپی سے سُن رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی کیسا کارساز ہے۔ اپنے کمزور بندوں کی حاجت روائی مجھ سے کراتا ہے۔ اچھا خوب لطف اُٹھا، قبل اس کے کہ تو اس دنیا سے اُٹھ جائے نادان کھلونے کھیلنے والا جانور!

بعض سننے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر مجھے بے اختیار محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص بیوی سے لڑ کر آیا ہے۔ ورنہ یہاں سے جا کر ضرور لڑے گا۔ ایسے اشخاص ریڈیو کا سارا پروگرام سُن جائیں گے، لیکن کانوں کے ذریعہ نہیں نتھنوں کے راستے۔ وہ بھی اس طور پر گویا بڑا کاسٹنگ اسٹیشن والوں کو چیلنج دے رہے ہیں۔ بس! میرا تم نے کیا بگاڑ لیا۔ ہاتھی جھومتا جائے، کتا بھونکتا جائے، حالاں کہ آپ یقین مانئے ان میں اور ہاتھی میں سوا سونڈ کے اور کوئی چیز ملتی جلتی نہیں پائی جائے گی۔

میرے ایک دوست ریڈیو اس طور پر سنتے ہیں جیسے کوئی مذہبی شخص ہو جس کا گناہ کرنے کو جی چاہتا ہو، لیکن گناہ کرنے کی نہ اہلیت ہو نہ ہمت۔ ان کا جی تو بہت چاہتا ہے کہ ریڈیو سنیں، لیکن ڈرتے اس سے ہیں کہ کوئی ریڈیو سنتے دیکھ لے تو اللہ میاں سے نہ کہہ دے۔ یا کوئی مولوی کافر نہ قرار دے دے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کو کافر بننے میں عذر نہیں۔ البتہ ایک کافر سے جو توقعات خوش مذاق لوگ کرتے ہیں وہ ان کے بس کی نہیں، اس لیے کفر سے ڈرتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ سننے والے میاں بیوی ہوتے ہیں، بشرطیکہ دو چار بچے بھی موجود ہوں۔ فرض کیجیے کوئی محترمہ گا رہی ہیں۔ میاں کو غور سے سنتے دیکھ کر بیوی کے کان کھڑے ہوئے۔

بولیں، کیسا بُرا گا رہی ہے۔ میاں بولے، ہاں لیکن آواز سے کم سن معلوم ہوتی ہے۔ بیوی چمک کر بولیں، دتی نہیں چلے جاتے۔ میاں نے کہا، تھوڑا اور سُن لیں تو رائے قائم کریں۔ اتنے میں کسی خاموش بچے کو دیکھ کر بولیں، باہر جا کر کھیلتا کیوں نہیں۔ یہاں پڑا کیوں سڑ رہا ہے۔ اُس نے بھی کہہ دیا، بھوک لگی ہے۔ ماں بولیں، باپ گانا سنیں، بیٹے کھانا ٹھونسیں اور میں ساری مصیبتیں جھیلوں۔ یہ ریڈیو جب تک جہنم رسید نہ ہوگا، اس گھر میں چین آرام دیکھنا نہیں ملے گا۔ اس اثنا میں کسی منجھلے چھوٹے بچے نے لپک کر ریڈیو سیٹ کی کوئی گھنڈی گھما دی۔ ریڈیو کا سانس تلے اوپر ہونے لگا۔ بیوی بچے پر جھپٹیں، بچے نے باوا کی پناہ پکڑی، باوا ریڈیو کی حفاظت کے لیے بڑھے۔ آخر میں مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ باوا کی عینک بیوی کی زلف میں جھول رہی ہے اور بیوی کا بُندا باوا کی داڑھی سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ بچوں نے تالیاں بجائیں، اناؤنسر نے پکارا، فلاں صاحبہ عورتوں کے حقوق پر گفتگو فرمائیں گی۔ بات آئی گئی ہوئی۔

ایک دن بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک دکان کی بالائی منزل پر ریڈیو سیٹ تانیں اُڑا رہا تھا۔ نیچے مجمع تھا، یکہ بان تانیں سیکھنے کی مشق کر رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں کھانس رہی تھیں اور کلجگ کو کوس رہی تھیں۔ فقیر بھیک مانگ رہے تھے، بچے گولی کھیلتے تھے، بوڑھے قیامت کے منتظر تھے، نوجوان پر قیامت گزر رہی تھی۔ یہ سب کھیل ریڈیو کا تھا۔ ناگاہ ایک طرف گلی سے کوئی بے فکرا نکلا۔ صرف لنگوٹی بندھی ہوئی، مانگ نکلی ہوئی، منہ سے ستار بجاتے ہوئے۔ ایک یکہ بان کو دیکھ کر نعرہ لگایا، بیٹا گھوڑا بیچو نہیں جوانی مفلسی ہی میں کٹ جائے گی۔ بوڑھے کو دیکھ کر بولے، بابا کمر سیدھی کرنے کھڑے ہو گئے، گانا سُن لو بال کالے ہو جائیں گے۔ بڑھیوں کو دیکھ کر کہنے لگے، مائی جی سلام! تم بھی کس سے نکل پڑیں۔ ابھی مائی جی پورے طور پر گالیاں بھی ختم کر نہ پائی تھیں کہ ہمارے دوست نے ایک نوجوان عورت کو مخاطب کر کے تان لگائی آؤ آؤ نگریا ہماری۔ ایک بچے نے پکارا، کلن دوست آؤ آج ہمارے ساتھ گولی کھیلو، کتنے دنوں سے ہم نہیں کھیلے۔ اتنے میں سارے لڑکے کلن کو چمٹ گئے۔ کسی نے کہا، گولی کھیلو، کسی نے کہا، کندھے پر بٹھاؤ۔ کلن نے ایک کو کندھے پر بٹھالیا دوسرے کو یکے پر بٹھا دیا، تیسرے کو اُٹھا کر ایک موٹے تازے بنئے کی گردن سے چپکا دیا، چوتھے کی دونوں ٹانگیں مضبوط تھام کر سر سے بلند کیا اور مرغے کی آواز

بلندکی۔ سامنے سے پولیس کا سپاہی آتا نظر آیا۔ مسٹرکلن نے ایک لڑکے کو دکان کے سامنے کے ٹین کے چھجے پر پھینکا، چھجا نیچے آ رہا۔ اسٹیل ٹرنک کی دکان تھی، سارے ٹرنک ایک دوسرے پر گرے۔ بھگدڑ مچ گئی، ریڈیو سننے والے ہنستے، بولتے، روتے، گالی دیتے، کھانستے، پھلانگیں مارتے یا لنگڑاتے اپنے اپنے راستے لگے اور مسٹرکلن یہ جا وہ جا غائب!

ریڈیو سننے والوں میں سب سے دلچسپ جماعت بچّوں کی ہوتی ہے۔ میرا سابقہ ایسے بچّوں سے ہے جو گانا یا تقریر سمجھنے کے بجائے ان کی نقلیں کیا کرتے ہیں۔ ایک ہی کمرہ میں ہر بچّے نے ریڈیو سیٹ لگا رکھا ہے، جوتے کے خالی کاغذی بکس میں ایک چوڑا گول سوراخ بنا کر سُرخ کاغذ لگا دیا ہے۔ یہ اصلی ریڈیو کے اس حصہ کا جانشین ہے جو گھڑی نما سامنے ہوتا ہے۔ نقلی ریڈیو کو کمر بند کے ذریعہ کھونٹی پر لٹکا کر ایریل کا کام لیا گیا۔ اب ریڈیو کے مالک کھڑے ہو کر پکارتے ہیں، دلّی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے شیخ نیازی ستار بجائیں گے۔ اب شیخ صاحب منہ سے ستار بجا رہے ہیں۔ دوسرے نے پکارا، دلّی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے سلمیٰ نعت سنائیں گی۔ نعت بھی شروع ہوگئی۔ عذرا دلّی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے بچّوں کی تعلیم پر تقریر کریں گی، تقریر بھی شروع ہوگئی۔ اقبال نے آواز دی۔ دلّی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے اقبال انگریزی خبریں سنائیں گے، خبریں بھی آنی شروع ہوگئیں۔ احسان نے نعرہ لگایا۔ دلّی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے احسان بھجن سنائیں گے، بھجن بھی شروع ہوگئے۔ اتنے میں ایک صاحب کا جو ابھی پرہی تول رہے تھے، ریڈیو زمین پر آ رہا۔ انھوں نے چیخ چیخ کر بغیر پروگرام بتائے انگلش میوزک اور ہندستانی پکا گانا ساتھ ساتھ شروع کردیا۔ کمرے میں (آر۔اے۔ایس) آرکسٹرا بج رہا تھا کہ دفعتاً مرغ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے آواز آئی۔ قہرن اب خربزے تقسیم کریں گی۔ اس خبر نے آرکسٹرے کو آناً فاناً درہم برہم کردیا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو کسی کا ریڈیو کمر بند کے ساتھ چلا آ رہا ہے، کسی کا پاجامہ ہاتھ میں ہے اور کمر بند کھونٹی پر۔ کسی کی نعت نتھنوں میں پھنسی ہوئی ہے اور کسی کی بھجن گلے میں اٹکی ہوئی ہے۔ کسی کا ہاتھ خربزے پر اور کسی کی گردن قہرن کے ہاتھ میں!

سننے والے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، جاہل، تعلیم یافتہ، معقول نامعقول، تندرست، مریض، فلسفی، چور، غرض کہاں تک تفصیل بتائی جائے۔ سنانے

والے بھی اسی قسم کے ہوتے ہوں گے، قطع کلام ہوتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ممکن ہے سنانے والوں میں بعض اقسام نہ ہوتی ہوں، مثلاً چور یا کوئی اور لیکن آپ اس کی ذمہ داری کیسے لے سکتے ہیں کہ کب وہ سنانا ختم کر دیں گے اور چوری نہ شروع کر دیں گے۔ بالفرض چوری نہ بھی شروع کریں تو قیافے سے چور معلوم ہوتے ہوں گے۔ یہ بھی نہ سہی تو میری ہی غلطی سہی۔ غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے خواہ وہ چور ہی کیوں نہ ہو۔

پکے گانے سُن کر بعض لوگوں کو وحشت ہونے لگتی ہے، لیکن جو اصحاب گانے کے فن سے واقف ہیں ان کو میں نے دیکھا ہے، اس قسم کے گانے سے بے حد لطف اُٹھاتے ہیں۔ میرے ایک دوست ہیں جن کو میں نے دنیا اور دنیاداروں سے بہت کم مطمئن اور خوش پایا ہے، لیکن جب سے ریڈیو شروع ہوا ہے ان کی ذہنی زندگی بالکل بدل سی گئی ہے۔ ایک دن کسی قدر بشاش ہو کر فرمایا، دنیا ابھی رہنے کے لائق ہے۔ ہندوستان میں اچھے گانے بجانے والے اب بھی موجود ہیں۔ میں نے کہا، اس قسم کا گانا بجانا ہوا کرے تو فدوی کو بھی یاد فرمالیا کیجیے۔ چنانچہ ایک دن مجھے انھوں نے ایک صاحب کا گانا سنایا۔ میں نے کہا، حضرت یہ گانا ہے یا ہسٹریا۔ بگڑ کر بولے، جہنم میں جاؤ، چھوکریوں کی چیں چیں اور میں میں سنا کرو۔ تمہاری کئی پشت گانا نہیں سمجھ سکے گی۔ بہر حال میں نے ان کو اس گانے پر اونگھنے دیا اور خود بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن آپ اس امر کا بھی لحاظ رکھیں کہ میرے ان دوست کی عمر چالیس سال سے زائد ہے اور بیوی سے ڈرتے ہیں۔

ریڈیو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہر شخص کے دوستوں اور عزیزوں کے دائرہ کو وسیع کر دیا ہے۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ مقررہ وقت پر ریڈیو نے ہماری توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مائل کر لی۔ اناؤنسر کی آواز خاندان کے کسی دوست کی آواز کی طرح کانوں میں آئی۔ طبیعت خوش ہو گئی، لیکن ظاہر ہے یہ تعلق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اناؤنسر بار بار نہ بدلے جائیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد اناؤنسر کی وہی حیثیت ہو جائے گی جو گھر کے ڈاکٹر یا ڈاکیے کی ہوتی ہے، جس کی آواز پر گھر کا ہر چھوٹا بڑا دوڑتا ہے۔ اس سے ایک قسم کی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کے بعض بات چیت کرنے والوں کے ساتھ پیدا ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ ایسی بات چیت کرے جس سے لوگوں کا دل بہلے بات چیت سے مراد

گھریلو قسم کی بات چیت سے ہے۔ مثلاً کچھ بچوں کی باتیں، کچھ ہنڈیا ڈوئی، کچھ ہنسی ٹھٹھول، رشتے ناتے، آمدنی خرچ، مہمانوں کا آنا جانا، تیج تیوہار، موسم کا حال، سیر و تفریح کے ذرائع اور وسائل، میٹھی میٹھی ہمدردی یا دل بہلانے کی باتیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی مستقل آدمی ایسا ہو جو براڈ کاسٹنگ کا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں سننے والوں کا آدمی ہو، یعنی اس کو وہی حیثیت حاصل ہو جو اپنے گاؤں میں رپ وان ونکل کو حاصل تھی۔ یعنی عورت، مرد، کتے، بچے سب کے دوست ہیں اور سب کے معتمد۔ اپنے کلام کے علاوہ سب کا کام کرتے ہوں۔ موسم وقت، عمر رنج راحت کسی کی قید نہیں۔

(نشریہ)

●●●

احمق کی جنت

اس وقت تمام عقل مندوں کی نگاہ بے وقوفوں پر پڑ رہی ہے اور تمام بے وقوفوں کی مجھ پر۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

بالخصوص ایسے زمانہ میں جب کہ ریڈیو اور بے روزگاری نے بے وقوفوں پر آخرت اور عقل مندوں پر دنیا تنگ کر دی ہے۔

اپریل فول کا مفہوم کیا ہے؟ بے وقوف کی جنت کسے کہتے ہیں؟ تاریخ کیا ہے؟ یہ باتیں بے وقوفوں سے پوچھنے کی ہیں۔ میں کیا بتاؤں لیکن میرے اس بیان سے یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ مجھے بے وقوف بننے سے عار ہے یا میں بے وقوف کی وکالت نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ باتیں مجھے معلوم نہیں، اور آپ کو بھی نہ معلوم ہوں تو کتابوں میں پڑھ لیجیے۔ اُن کتابوں میں جو عقل مندوں نے بے وقوفوں کے لیے لکھی ہیں یا بے وقوفوں نے عقل مندوں کے لیے کتب خانوں میں محفوظ کر دی ہیں۔ یہ بھی منظور نہیں تو پھر عذاب بر گردن ریڈیو، کان دھر کے سنیے۔ میں جو کچھ بیان کروں گا وہ قطعاً منہ زبانی ہوگا۔ منہ زبانی کے معنی بس یہی سُن کر جو کچھ منہ میں آئے کہہ ڈالیے۔ بقول شخصے ؎

برلب فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد [1]

---

1. ترجمہ: آدمی کے ہونٹوں پر جو آئے کہہ ڈالنا چاہیے۔

اس کے بعد وہ منزل آتی ہے جہاں پہنچ کر کہنے لگتے ہیں۔

بر سرِ فرزندِ آدم ہر چہ آید بگذرد [1]

انھیں دونوں مصرعے میں بے وقوف کا انجام یا عقل مند کا آغاز پوشیدہ ہے۔

بہر حال آج کی سنت یہ ہے کہ جسے چاہے بے وقوف بنائیے، سوا بے وقوف کے آپ کو کسی اور سے گزند نہ پہنچے گا۔ جہاں تک کسی کو بے وقوف بنانے کا تعلق ہے، میرا خیال ہے ہر دن یکساں ہوتا ہے۔ یہ تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو دوسروں کو عقل مند بنانے کی کوشش کرے گا۔ اپریل فول یا کسی اور دن میں صرف یہ فرق ہے کہ آج کسی سے کوئی مواخذہ نہ کیا جائے گا اور یہ بہت بڑی رعایت ہے لیکن اس سے فائدہ اُٹھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی رعایتی کرایہ کے اعلان سے فائدہ اُٹھا کر سفر کیجیے اور کسی میلے میں بیوی بچے گم کیجیے اور خود گنواروں کے پاؤں تلے سُر گباش ہو جائے۔

رعایتی کرایہ پر ایک قصہ بھی سُن لیجیے۔ ہمارے ہی آپ جیسے کوئی بزرگ جاپان یا اسی قسم کے کسی ملک میں سفر کر رہے تھے۔ ایک مقام سے کرایہ کی لاریاں روانہ ہوتی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اوّل دوم اور سوم درجہ کے کرائے تو مختلف ہوتے ہیں، لیکن بیٹھنا سب کو ایک ہی جگہ ہوتا ہے۔ یہ تھے آدمی عقل مند، کیوں کہ انھوں نے فوراً یہ دریافت کر لیا کہ سب کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا اور زیادہ کرایہ دینا کوئی عقل مندی کی بات نہ تھی اور اس اندیشہ سے کہ اگر انھوں نے اس کی تفتیش کی تو ممکن ہے ان کے انکشاف سے دوسرے بھی فائدہ اُٹھانے لگیں۔ انھوں نے بلا تأمل تھرڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا اور فرسٹ سکنڈ کلاس والوں کے ساتھ اس طور پر جا بیٹھے جیسا کہ غالب نے بیان کیا ہے۔

سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں!

تھوڑی دور چل کر ایک بلندی آئی۔ لاری روک دی گئی، ڈرائیور نے اُتر کر اعلان کیا:

اوّل درجہ کے مسافر	بیٹھے رہیں
دوسرے درجہ کے مسافر	اُتر جائیں
تیسرے درجہ کے مسافر	اُتر پڑیں اور گاڑی ڈھکیلیں

---

1 ترجمہ: آدمی کے سر پر جو افتاد پڑے اسے جھیلنا چاہیے۔

یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو بہشت کی اُمید میں دنیا کے مطالبات کم ادا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جب بہشت ایک ہی ہے تو کرایہ کیوں زیادہ ادا کیا جائے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ بے وقوفوں کی جنت کوئی اور ہے اور عقل مندوں کی جنت کوئی اور۔ بہشت کے بارہ میں آزادی سے خیال ظاہر کرنا آسان نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے اس آزاد خیالی کا خمیازہ اس طور پر بھگتنا پڑے کہ قبل از وقت انسان بہشت پہنچ جائے یا جنت پہنچنے سے پہلے دنیا کے کام کا نہ رہ جائے۔

بہر حال اتنی سی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ آخرت میں جنت ہو یا نہ ہو، دنیا میں بے وقوف ضرور ہیں اور اس سے کوئی بے وقوف بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جنت میں کوئی بے وقوف موجود ہو یا نہ ہو، دنیا میں عقل مند ضرور موجود ہیں۔ اب بحث طلب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ اگر بہشت ایک ہی ہے تو اس میں بے وقوف اور عقل مند دونوں کو کیوں کر جگہ ملے گی۔ بظاہر اس کا جواب نہایت آسان ہے، یعنی جس طور پر ایک ہی دنیا میں عقل مند اور جنتی دونوں آباد ہیں۔ لیکن یہ پوزیشن بے وقوف کے لیے قابلِ اطمینان ہو یا نہ ہو، عقل مند کے لیے ضرور تکلیف دہ ہے۔ کیوں کہ اس طور پر بے وقوفوں کی جنت عقل مندوں کی دوزخ بن جائے گی۔

عقل مندوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا تاوقتیکہ بے وقوفوں کے سلسلے میں خود کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جس سے عقل مند فائدہ اُٹھائیں۔

تو میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ بے وقوف کے لیے عقل مند کے ساتھ دنیا میں رہنا خطرہ سے خالی نہیں، جس طرح بے وقوف کے ساتھ جنت میں رہنا عقل مند کے لیے کوفت سے خالی نہیں۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جنت میں خطرہ کا کوئی امکان نہیں بشرطیکہ جنت خود کوئی مستقل خطرہ نہ ہو۔ بے وقوف نے اپنی جنت پر یہ حکم لگایا ہے:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد [1]

بے وقوف کو اپنی جنت اس لیے پسند ہے کہ اس کو وہاں کسی سے سروکار نہ ہوگا، بالخصوص عقل مندوں سے سروکار نہ ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ آزار نہیں ہے۔ وہ راحت چاہتا ہے، دلچسپی نہیں۔ عقل مند کو اسی بنا پر بے وقوف کی جنت سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ دلچسپی چاہتا ہے چنانچہ اس نے پُرسکون

1۔ جنت وہاں ہے جہاں کوئی غم نہ ہو اور کسی شخص کو کسی سے کوئی کام نہ ہو۔

جنت میں داخل ہونے کے بجائے ایک دلچسپ جہنم کی تخلیق کی اور ظاہر ہے دوسروں کی جنت سے اپنی بنائی ہوئی جہنم زیادہ بامعنی اور دلکش ہوتی ہے۔

لیکن یہاں اس بات کو بھی بھولنا نہ چاہیے کہ جنت تو ہر اُس بے وقوف کو قبول کر لیتی ہے جو وہاں بھیج دیا جائے۔ جنت کی روایت بھی یہ ہے، لیکن دوزخ کا مزاج دوسرا ہے۔ بے وقوف کو وہ بھی قابلِ رحم سمجھتی ہے۔ قابلِ رحم نہ سمجھتی تو اس کو ایسی حالت میں کیوں چھوڑتی کہ جنت کے سوا اس کا کہیں اور ٹھکانا نہ ہوتا۔ عقل مند کی دوزخ اور بے وقوف کی جنت میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اگر آپ بے وقوف کی جنت میں داخل ہو جائیں تو آپ کو وہاں سے بہ یک بینی و دو گوش نکلنا بھی پڑے گا اور عقل مند کی دوزخ کا یہ عالم ہے کہ وہاں آپ داخل ہو جائیں تو آپ خود نکلنا نہیں چاہیں گے۔

فرض کیجیے آپ بے وقوف ہیں اور میں عقل مند یا میں بے وقوف اور آپ عقل مند۔ اس کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، کیوں کہ بات جہاں کی تہاں رہتی ہے اور میں اس لیے کہتا ہوں کہ سوال حل کرنے میں جو چیز فرض کر لی جاتی ہے اس کا جواب یا نتیجہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسا تو محض رفع شر کے خیال سے کر لیا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس جنت یا جہنم کے سلسلہ میں عقل مند اور بے وقوف کی معرکہ آرائی تھی، اس کا نتیجہ مفہوم کیا ہے۔ دیکھیے میری اتنی سی بات یاد رکھیے کہ میں جس جنت یا جہنم کا تذکرہ کر رہا ہوں، اس کا تصوّر، اس کی جغرافیائی حدود اور اس کی روایات، اس جنت و جہنم سے مختلف ہیں جو آپ پڑھتے یا سنتے آئے ہیں اور اس درجہ پڑھتے سنتے آئے ہیں کہ کبھی کبھی آپ اس میں آباد بھی ہو جاتے ہیں اور جب کبھی وہاں سے نکالے جاتے ہیں تو ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں کہ آپ کی جنت پر لوگ ہنستے ہیں، بالخصوص دوزخ والے۔

ہاں تو اس وقت بحث بے وقوف کی جنت سے تھی۔ آپ جانتے ہیں بہشت میں حضرت آدم پر کیا گزری تھی، یہ پہلا حادثہ ہے جب عقل مند اور بے وقوف میں بیر ہوا، اور یہی سبب ہے کہ بے وقوف نے اپنی جنت علاحدہ کر لی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسی دن سے عقل مند نے اپنی جہنم کی بنا علاحدہ ڈالی۔ ممکن ہے ہم آپ یہاں پہنچ کر یہ بھی تسلیم کر لیں کہ ہر انسان اپنی جنت و جہنم خود تیار کرتا ہے اور اس میں آباد رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی جنت و جہنم

تیار کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ سب محض اس لیے کہ دوسروں کی بنائی ہوئی جنت سے وہ نہایت خواری کے ساتھ نکالا جا چکا ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ دوسروں کی جنت میں داخل ہونے کے بجائے اپنی بنائی جہنم کو آباد کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ہر فرد اور ہر قوم اس کے درپے ہے کہ اسے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یا مملکت علاحدہ بنانے کا حق حاصل ہو جائے۔

اس ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یا مملکت کے بنانے میں دو قوتیں یا دو مقاصد برسرِ کار یا پیکار رہتے ہیں۔ ایک سکون و راحت اور دوسری عزیمت و بے باکی، یہی قوتیں اقوام کے روپ میں جنم لیتی ہیں، جن سے ایک یہ چاہتی ہے کہ جنت کو جنت ہی کے راستہ سے حاصل کرنا چاہیے۔ وہ اس کی قائل ہے کہ جنت بہرحال جنت ہے خواہ وہ کسی کی بنائی ہوئی یا کسی کی دی ہوئی ہو۔ دوسری اس کی قائل ہے کہ انسان کے لیے جنت مایوس کن ثابت ہو چکی ہے، اس کو اپنی جنت جہنم میں تعمیر کرنا چاہیے اور اس کے لیے اُن تمام عقوبتوں کو برداشت کرنا چاہیے جو اس راستہ میں پیش آتی ہیں۔ ایک ممنون بنانا چاہتی ہے، دوسری تسخیر کے درپے ہے۔

لیکن یہ باتیں اپریل فول اور بے وقوف کی جنت کی شایانِ شان نہیں ہوئیں۔ اس لیے چلتے چلاتے میں آپ کو بے وقوف کی جنت کی سیر کرانا چاہتا ہوں۔ آپ بُرا نہ مانیں تو میں چند فقروں میں عقل مند اور بے وقوف کا فرق بھی بتا دوں۔ بے وقوف کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے اندازہ پیائی میں یہ بھول جاتا ہے کہ اندازہ پیائی کا نام کامیابی نہیں ہے۔ آپ نے الف لیلہ میں بغداد کے اس حمال کا قصہ تو سنا ہوگا جو شیشے کے برتن سر پر اُٹھائے کہیں لے جا رہا تھا، تھوڑی دیر ستانے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی تصوّرات کی بھول بھلیاں میں اپنی جنت تعمیر کرنے لگا، یعنی جو مزدوری ملے گی اس کی مرغی خریدے گا، مرغی کے انڈے، بچّے بڑھیں گے تو مویشی خریدے گا۔ مویشیاں بڑھیں گے تو تاجر ہوگا۔ روپے پیسے کی افراط ہوگی تو بادشاہ اپنی لڑکی سے ان کی شادی کرے گا۔ شاہزادی گھر میں آئے گی تو یہ روٹھ جائیں گے اور جب وہ غریب ان کے منانے کے لیے ان کے قدموں میں سر رکھ دے گی تو یہ ایک ٹھوکر ماریں گے۔ یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ اس شاہزادی کا کیا انجام ہوا، لیکن ایک جھنکار پیدا ہوئی۔ شیشے کے برتنوں کا ٹوکرا ٹھوکر سے اُلٹ گیا اور سارے برتن پاش پاش ہو گئے۔

اب جیسا کہ عدالتی تجویزوں میں آتا ہے امور تنقیح طلب یہ ہیں کہ ان حمال صاحب کو کیا پڑی تھی کہ بغداد کے بھرے بازار میں اونگھنے لگے، جب کہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے پاس شیشے کے برتن تھے جو ذرا سے صدمہ سے پاش پاش ہوسکتے تھے اور اُس زمانہ میں بغداد میں ٹریفک سنبھالنے کا وہ انتظام نہیں تھا جو علی پور روڈ پر پایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے یہ کیوں کر فرض کر لیا کہ انھیں اُس دن کی مزدوری مل ہی جائے گی اور سوا مرغی خریدنے کے وہ کسی اور مصرف میں نہ آجائے گی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ مرغی سے مویشی اور مویشی سے تجارت اور تجارت سے بادشاہ کی دامادی کا رتبہ کیوں کر حاصل ہوجائے گا۔ ممکن ہے یہ سب ہوجاتا لیکن پھر اُن کو اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے تھا کہ بادشاہ کی بیٹی کا مصرف ٹھوکر مارنے کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا تھا۔

لیکن باوجود اس کے بغداد کا وہ زمانہ نہ رہا۔ بے وقوفوں کا اب بھی دور دورہ ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی جنت بنانے میں مصروف ہے اور جیسا کہ جنت کا قاعدہ ہے وہاں سے فوراً نکالا جاتا ہے، پھر وہ ماتم کرتا ہے کہ اس کو جنت سے نکالا گیا۔ حالاں کہ اس کو سوچنا یہ چاہیے کہ اس دنیا میں جتنے آدمی ہیں وہ سب کے سب اپنی اپنی جنت بنانے میں مصروف ہیں۔ بلکہ بعض تو ایسے بھی ہیں جو ایک سے زیادہ جنتیں بناتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس دنیا میں جب رہنے کے لیے کافی جگہ نہیں ملتی تو جنت بنانے کے لیے کہاں سے جگہ آئے گی۔ لیکن تعمیر جاری رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کی جنت کا دروازہ کسی دوسرے کی جنت کی چھت پر کھلتا ہے اور تیسرے کی جنت کی موری چوتھے کی جنت کی خواب گاہ میں گرتی ہے۔ ایسی حالت میں ہمسایوں میں فوج داری شروع ہوجاتی ہے اور انجام کار یہ سارے معماران بہشت ٹھکانے لگا دیے جاتے ہیں۔ کسی پر نان نفقہ کا دعویٰ ہوتا ہے، کوئی پاگل خانہ جاتا ہے، کوئی دوا بیچنے لگتا ہے اور کوئی اخبار نکالنے لگتا ہے۔ ایک فلسفی بن جاتا ہے، دوسرا آرٹسٹ، کوئی لیڈر بنتا ہے اور کوئی صوفی۔ ایک جیب کترتا ہے دوسرا مکھیاں مارتا ہے۔ کوئی بیوی کو پیانو سکھواتا ہے اور کوئی بچّوں سے قومی نظمیں پڑھواتا ہے اور میں ریڈیو پر تقریر ختم کر دیتا ہوں۔

(نشریہ)

●●●

ہوٹل میں ریڈیو

شام کا وقت ہے، بارش ختم ہوچکی ہے، ہر طرح کے بے فکرے، مراقی، مولوی، پنڈت، مزدور، طالب علم، پھیری والے، کسان، کارخانہ والے، جوان، بچے، بوڑھے، عورت مرد، ہوٹل کے آس پاس، ریڈیو سیٹ کے قریب جمع ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے، بارش بڑھنے کے آثار ہیں، بادل گرجتا ہے، مینہ برسنے لگتا ہے۔ ایک کوندا ہوا، زور کا ایک تڑاقا۔

مولوی صاحب: یُسَبِّحُ الرَّعْدُ وَ بِحَمْدِہٖ۔

ایک دیہاتی: مولبی صاحب ای کا کرت ہو، برکھا ہوئے دو۔

ایک نوجوان: الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے!

دوسرا بے فکرا: لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے۔

ایک آواز: کہو مولبی صاحب کیسی کہی!

مولوی صاحب: شامتی، دوزخ کا ایندھن!

پنڈت جی: شانتی، شانتی!

بے فکرا: دھن ہے مہاراج۔ کیا نام لیا ہے، کہاں ہیں۔

پنڈت جی: رام رام، کلجگ میں جو نہ ہو تھوڑا۔

(بارش اور تیز ہو جاتی ہے)

ایک نحیف آواز: (غمگین لہجہ میں) یہ کہہ دو ابر باراں سے اگر برسے تو یوں برسے
کہ جیسے خوں برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

ایک بڑھیا: ارے کل جبھے [1] تیری انھیں باتوں سے تو دنیا چوپٹ ہو رہی ہے۔

بڑھا شوہر کھانستے ہوئے: تم کو دنیا کے چوپٹ ہونے کی پڑی ہے۔ یہاں کھانستے کھانستے پلیتھن نکلا جا رہا ہے۔

بڑھیا: ارے تم کو کھانسنے سے تھوڑے ہی کوئی روکتا ہے۔ دنیا چوپٹ ہو یا نہ ہو، تم تو کھانسے جاؤ۔

ایک تانگہ والا: (منہ سے طبلہ بجاتے ہوئے) بڑے میاں گھر کا جھگڑا گھر میں چکانا، تانگہ ہانکتے تو یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے۔ چلو لولا رک [2] چھٹ کا میلا دکھلاؤں۔ من کرنکا [3] تک مفت!

ایک کسان: برکھا دیو کا کر پا۔

ایک موٹا مہاجن: (بازار) بجار مندا ہوا ہو تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

طالب علم: کسان اور طالب علم سے اُلجھے تو اچھا نہ ہوگا۔

پولیس کا سپاہی: کچھ بُرا بھی نہ ہوگا۔

اتنے میں کچھ بچّوں کے رونے، بلبلانے کی آواز آنے لگی۔ ماؤں نے انھیں پیٹا اور شوہروں کو کوسنا شروع کیا۔ جوانوں نے گانا اور ادھیڑوں نے سب کو سمجھانا شروع کیا۔ مونگ پھلی والے نے آواز لگائی، خستہ بادام لے لو، ہوٹل کا مالک گھومتا ہوا آیا، اور بالآخر یہ طے پایا کہ جب تک بارش نہ کھلے، ہوٹل کے ریڈیو سیٹ سے سب کی تواضع کی جائے۔

(ریڈیو نے تھوڑی سی گھرگھراہٹ کے بعد اعلان کیا۔)

''یہ دلّی ہے۔ اس وقت 7 / بجے ہیں''

---

1. جیبھ، زبان، کل جبھے، کالی زبان والے، بمعنی زبان کا منحوس ہونا۔
2. بنارس کا مشہور میلہ۔
3. بنارس میں مردہ جلانے کا گھاٹ۔ (رشید احمد صدیقی)

ایک آواز: کیا بات کہی ہے گویا ہم کو معلوم نہیں۔ وقت البتہ بُرا ہے۔ گھر والی دانت پیس رہی ہوگی، ہمسائی گرم مسالا مانگنے اور چغلی کھانے آئی ہوگی۔

دوسری آواز: ارے بھائی سننے تو دو۔ گھر کا کھڑاگ کہاں پھیلایا۔ وہ دیکھو کوئی صاحب بکھان دے رہے ہیں۔

ریڈیو: (...."یہ زمانہ بڑا نازک ہے۔ قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیے۔")

ایک آواز: واہ بے وا۔ بالکل اُلو کی دم فاختہ ہی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، ایک صاحب قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے کہ موٹر اوپر سے گزر گئی۔ مرگئی مردود، نہ فاتحہ نہ درود۔

دوسری آواز: بھائی زمانہ نازک ہے۔

تیسری آواز: بڑا نازک جیسے صنف نازک!

چوتھی آواز: سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔ ہاتھ لائے گا۔ جناب کا تخلص!

دور سے ایک آواز: منحوس!

سب قہقہہ لگاتے ہیں۔

ریڈیو: (اگر آج ہم اس بات کا عہد کرلیں کہ ہم کو اپنی حالت سدھارنی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو ہم کو نیچا دکھا سکے......")

ایک آواز: کہتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ عہد کرلیں، عہد کرلیں۔ عہد کرتے کیا دیر لگتی ہے، سینکڑوں دفعہ عہد کیے۔ کیا ہوا نمک حرام!

دوسری آواز: (بات کاٹ کر) ہاں جی، اور عہد نہ بھی کریں تو کون مائی کا لال ایسا ہے جو ہم کو نیچا دکھا سکے۔ (گاکر)

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا — اور کیا!

(مجمع سے کہیں سے ہنسنے کہیں سے اُف کرنے اور کہیں سے جمائی لینے کی ملی جلی صدائیں)

(ریڈیو کے کھٹکنے کی آواز آتی ہے، اعلان ہوتا ہے۔)

ریڈیو: تمام دن اور نصف سے زیادہ رات تک بحث مباحثہ کے بعد بالآخر سبجکٹ کمیٹی
نے یہ تجویز منظور کی۔)

''یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ اب ہم کو ایسے ذرائع اور وسائل
جلد سے جلد اختیار کرنے میں غیر معمولی تامّل سے کام نہ لینے کی کوئی معقول وجہ
نظر نہیں آتی، جن سے اُن امور کی وضاحت ہوتی ہو جو قوم اور ملک کی ایسی ترقیوں
میں معین ہوتے ہوں، جو زمانہ کے موجودہ مطالبات اور قوم کی گوناگوں ضروریات
کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم کو دوسری قوموں کے دوش بدوش رکھنے میں اُن تمام
باتوں کا احاطہ کرلیں، جو ہماری قومی روایات رواداری کو زندہ اور تابندہ رکھنے کی
طرف رہبری کرنے میں اس طور پر معاون ہوتی ہوں کہ ہمسایہ قوموں میں
شک وشبہ کے بجائے ایسا اعتماد پیدا کرسکیں جو اُن اغراض و مقاصد کے حصول
میں معیّن ہوں، جن کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے اپنا خون پسینہ ایک کردینے
کے لیے ایسے زرّیں کارنامے چھوڑے ہیں، جو ہر گرمی ہوئی قوم کو اُبھارنے کے لیے
ایسی محرکات کی طرف لے جانے میں معین ہونے کا امکان رکھتے ہوئے....''

سننے والوں کا سارا مجمع یک لخت گھبرا کر چیخ اُٹھتا ہے، کوئی رونے لگتا ہے، کوئی دانت
پیس کر رہ جاتا ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے، مارنا مارنا، جانے نہ پائے، مدت کے بعد
ہاتھ لگا ہے۔ کچھ عورتیں بے ہوش ہوجاتی ہیں۔ کوئی مونگ پھلی والے کا خوانچہ لوٹ لیتا ہے، کوئی
پکارتا ہے، ''فائر بریگیڈ''! منیجر دوڑا ہوا آتا ہے۔ بڈھوں کو اُٹھاتا ہے، پولیس کو آواز دیتا ہے۔
لفنگوں میں سے ایک آدھ کے جھانپڑ رسید کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں امن ہوجاتا ہے۔

ایک آواز: معاذ اللہ کی پناہ!

دوسری آواز: ارے بھائی لعنت بھیجو۔ تقریر سنتے سنتے تو کان پک گئے۔

ایک گرہ کٹ: اس کا مزا تو یار کمپنی باغ میں ہے۔

ایک بے فکرا: کمپنی باغ کا کیا کہنا، گانے لگتا ہے۔

''بجلی کے لیے تن من دھن ہے''

ایک بچہ (روکر): اماں پانی!

اماں: چپ رہ، پانی پانی، جب دیکھو پانی۔ میاں کلمچھرے اُڑا ئیں۔ میں دن رات ہلکان ہوں، آگ لگے ایسے پانی کو۔ پانی پانی دن رات پانی۔

ریڈیو: (''ہندوستان کی نجات اس وقت تک نہیں ہوسکتی.....'')

ایک آواز: اَرماں کچھ اور لگاؤ۔ ہندوستان کی نجات کو ہم سے کیا۔ جب گھر والی سے نجات نہیں تو پھر کیسی کوئی اور نجات۔ واہیات!

ایک عورت: کلموا!

(ریڈیو نے گھڑ گھڑا کر گت بدلی)

اندران دردے کہ در دل بود، درماں یافتن

در حجاب زلف جاناں، نور ایماں یافتن

ایک قلندر: ہُو۔ حق۔

ایک شاعر: کیا بات ظالم نے کہی ہے۔ نور ایماں بافتن!

ایک صاحب: ہوش میں آؤ، سُوپ ایسے کان ہیں لیکن سنائی نہیں دیتا۔ نور ایمان بافتن نہیں یافتن ہے۔

شاعر: ہوش میں آؤ۔ تم حُسن کلام کیا جانو۔ زلف کے ساتھ بافتن ہی ٹھیک ہے۔ واہ وا۔

معترض: اور نور ایماں؟

ایک آواز: چپ بے بے ایمان!

ایک بے فکرا: ارے بھائی جانے دو۔ نور باف کا بھی تو کوئی حق ہے!

ایک آواز: یار کچھ اور لگاؤ۔ یہ آداب تسلیمات قسم کا گانا کون سُنے۔

(ریڈیو میں گھر گھراہٹ)

اناؤنسر: اب پٹیالے والے عاشق علی خاں گورسا رنگ کا خیال تُرت لے میں گائیں گے۔ آ...آ...آ.... (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) آ...آ...آ۔ (گلا صاف کرنے کا جھٹکا) بھو...بھو...بھو۔

ایک بزرگ: سبحان اللہ اپنے فن کا امام ہے۔ اب یہ لوگ کہاں اور یہ فن کہاں۔

ریڈیو: بھو... بھو... بھو۔ آ... آ... آ.....)

مجمع میں خلفشار اور چیخ پکار۔

منیجر دوڑا ہوا آیا اور پکارا۔ ارے ریڈیو کس نے بگاڑا؟

ایک صاحب: جناب گھوڑ سارن ہے!

(ریڈیو کی چابی بدلی گئی)

اناؤنسر نے اعلان کیا۔

''اب طمنچہ جان ایک غزل سنائیں گی۔''

ایک آواز: جزاک اللہ کیا تاریخی نام ہے۔

دوسری آواز: کیا ہندو مسلم اتحاد کا پہلو نکالا ہے۔

تیسری آواز: جی اور کیا مسجد بھی ہے باجا بھی ہے۔

(گانا) ترے عشق میں زندگانی لٹا دی

عجب کھیل کھیلا جوانی لٹا دی۔

ایک آواز: کیا پُر تاثیر شعر ہے۔

دوسری آواز: کیوں نہیں ـــ اور بھئی جوانی تو لٹا دینے کی چیز ہی ہے (گاکر)

آؤ پیا سونی لاگے سیجریا

ایک بڈھا: آہ سرد کھینچ کر، رہے نام اللہ کا ـــ اب عناصر میں اعتدال کہاں۔

ایک لوفر: رام رام جپنا، پرایا مال تکنا۔

اخبار بیچنے والا لڑکا: چین میں جیاؤں پیاؤں۔ چیمبر لین کی چھتری۔

پھیری والا: ہر مال چھ پیسے کا ـــ ہر مال چھ پیسے کا!

منیجر کی گرج دار آواز: ارے نکالو، اس اخبار بیچنے والے لونڈے اور بساطی کو۔ ہوٹل میں لڑائی کا مول تول ٹھیک نہیں۔

(ریڈیو کی گھنڈی گھمائی گئی۔ آواز آتی ہے)

''اب جتن خانم امور خانہ داری پر تقریر فرمائیں گی۔''

''گھر کی بیویوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچّوں.....''

ایک بے فکرا: ارے فتو اُستاد، یہ عورتیں ریڈیو پر گھر گرہستی ہی کا کھڑاگ پھیلاتی ہیں۔ برسات میں تو کچھ چٹ پٹی سلونی باتیں.....

فتو اُستاد: اے لمنڈے کبھی تو کام کی بات سُن لیا کر۔ گھر والی میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔ یہی لچھن ہیں تو بیٹا بھیک مانگو گے اور بھونی بھانگ نہ ملے گی۔

بے فکرا: لے اُستاد تم تو سٹھیا گئے ہو۔ اپن نے کیا کہا جو لگے، اول فول بکنے۔

فتو اُستاد: چپ بے نہیں دیتا ہوں ایک لپوتا، بتیسی پیٹ میں گھس جائے گی۔

(بہت سی آوازیں) جانے دو اُستاد جانے دو۔ لونڈا ہے، کیا جانے، بھلے مانسوں میں بندھا ہو تو جانے۔ (بے فکرے سے مخاطب ہو کر) ادھر آبے، ادھر آ۔ اُستاد کے سامنے کان پکڑ کر اُٹھ بیٹھ۔

بے فکرے نے کان پکڑ کر اُٹھنا بیٹھنا شروع کیا۔

ایک آواز: ایک...دو...تین۔

دوسری آواز: تاک دھنا دھن دھن۔ تاک دھنا دھن دھن۔

بچّے ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں۔

ریڈیو سے آرکسٹرا بجتا ہے، جو اسی اُٹھک بیٹھک کے وزن پر ہے۔

(نشریہ)

●●●

سفر

(پہلے اور اب)

مجھے سفر کا وہ زمانہ تو یاد نہیں جب لوگ اُڑن کھٹولے پر سفر کرتے تھے اور کپتال کے درخت میں پوریاں پھلتی تھیں۔ اس کا حال تو وہ لوگ بتا سکتے ہیں جن کا ذہن اُڑن کھٹولا ہو یا جن کے دماغ میں تاریخی مواد ہو! میرا ذہن تو بسواری پیدل ہی سفر کرتا ہے، اور دماغ میں وہی باتیں آتی ہیں جو خود مجھ پر گزر چکی ہیں۔ چنانچہ یہ اس عہد کا واقعہ ہے جب میں خود ملازم نہیں رکھتا تھا، بلکہ میرے لیے ملازم رکھے جاتے تھے، اور میں ملازموں پر نہیں بلکہ ملازم مجھ پر حکومت کرتے تھے!

میرا بچپن ایک نہیں بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گزرا ہے اور ظاہر ہے ایسی بستیوں میں کس قسم کی سواریاں اور کس قسم کے سفر کرنے والے نظر آ سکتے تھے۔ میں اکثر اپنے ملازم کے کندھے پر سوار ہو کر، اور سفر کا یہ وسیلہ بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ بستی کے باہر جہاں اونٹ گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں جایا کرتا تھا۔ اس زمانہ کی یاد دھندلی سی رہ گئی ہے اور مجھے صرف وہ بزرگ یاد رہ گئے ہیں جو نیم کی پتی اسی شوق اور مرنجاں مرنج طریقے سے کھڑے چبایا کرتے تھے جس شوق اور مرنجاں مرنج طریقے سے لوگ اکثر اپنے ہونٹ اور دوسروں کے پان چبایا کرتے ہیں۔ انھیں بزرگ کے کوئی عزیز قریب کے کسی گاؤں میں نکل گئے تھے تو لوگوں کو

بھگوان کا شبہ ہونے لگا تھا اور دوسرے بزرگ کو دوسرے گاؤں والوں نے رمضان شریف کے دھوکے میں افطار کر ڈالا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے میرے ہیرو کو پہچانا یا نہیں، نہ پہچانا ہو تو یہ قصور میرے "حلیم و خوش خصال" ہیرو کا نہیں آپ کا ہے۔ بہر حال کچھ ہی کیوں نہ ہو مجھے اونٹ کی جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے اس کی تفسیر، اس کہاوت میں ملتی ہے، جہاں اُن کے باب میں کہا گیا ہے۔ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، یا جب تک یہ کسی کل بیٹھ نہ جائیں لوگوں کی قیاس آرائیوں کی چول نہ بیٹھے!

اس طور پر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میری طفولیت کی خیال آرائیاں اونٹ یا اونٹ پنے سے کس طرح وابستہ ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس قسم کی تمہید سے اصل مقصد ہی نہ فوت ہو جائے۔ اس لیے میں براہ راست اونٹ گاڑی پر آجاتا ہوں۔ اونٹ گاڑی کے بارے میں مجھے اپنے ایک مشہور فاضل بزرگ کا قول یاد آتا ہے، جنھوں نے اونٹ گاڑی کی تعبیر ان الفاظ میں کی تھی۔ یعنی اونٹ گاڑی وہ سواری ہے جو ہر جگہ سے شام کو روانہ ہوتی ہے اور ہر جگہ صبح کو پہنچ جاتی ہے۔ اونٹ گاڑی عموماً دو منزلہ ہوتی ہے اور غالباً محض اس لیے کہ اونٹ سہ منزلہ نہیں ہوتا۔ یہ کبھی نئی نہیں دیکھی گئی۔ چوں کہ اونٹ کے چلنے میں کوئی آواز نہیں ہوتی، اس لیے اونٹ گاڑی میں اس کا التزام رکھا جاتا ہے کہ وہ اس کی کو پوری کرتی رہے، جیسے بعض موٹریں اور بائیسکلیں ہوتی ہیں، جس میں ہارن یا گھنٹی کی یوں ضرورت نہیں پیش آتی کہ

ہر رگ من ہارن گشت و حاجت گھڑیال نیست

بعض اعتبار سے بعض موٹریں اونٹ گاڑی سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اونٹ گاڑی ہر شام ایک جگہ سے روانہ ہو جاتی ہے اور ہر صبح ایک دوسرے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ گاڑی بان، سواریاں، اسباب سب سوتے رہتے ہیں۔ لیکن اونٹ گاڑی صبح کے وقت منزل مقررہ پر پہنچ ہی جاتی ہے۔ بجنسہ یہی حالت میرے ایک بزرگ کے موٹر کی ہے۔ یہ موٹر بہت پرانی ہو چکی ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کی عمر یا اس کا رنگ کیا ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوتا ہے کہ یہ چلی کیوں کر جاتی ہے۔ اب تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہ موٹر مشین یا پٹرول کے ذریعہ نہیں بلکہ محض عادت کے زور سے چلتی ہے اور صرف ایک مقررہ مقام سے چل کھڑی ہوتی ہے اور مقررہ ہی راستہ نشیب و فراز

اور رفتار سے مقررہ جگہ پر پہنچ جاتی ہے۔ راستہ میں نہ رُکتی ہے اور نہ روکی جاسکتی ہے۔ جہاں ٹھہرنے کی اس کی عادت ہے، اس سے ایک انچ ادھر اُدھر ٹھہر نہیں سکتی۔ بعض لوگوں کو وہم سا ہونے لگا ہے کہ اگر اس پر کی سواریاں یا اس کا راستہ بدل دیا جائے تو اس گاڑی کی تاریخ اور اس کے متعلق جو توقعات ہیں وہ سب بدل جائیں گی یا کیا ہوگا۔

اونٹ گاڑی کی دوسری منزل پر بالعموم اسباب رکھا جاتا ہے اور نچلی منزل میں مسافر بیٹھتے ہیں۔ اوپر کی منزل میں عموماً سواریاں نہیں ہوتیں۔ اس کا سبب مجھے نہیں معلوم اور معلوم ہوتو اس کا تذکرہ میں ریڈیو پر نہیں کرسکتا۔ معلوم نہیں کون اور کس کس قسم کے لوگ گوش برآواز ہوں، اور ہاں یہ آپ اچھی طرح سے سُن رکھیے کہ میں نے صرف گوش برآواز کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے فضائی خلفشار یا بدنیتی سے لوگ اسے کچھ کا کچھ سُن لیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھیے کہ اس آواز کو اس آواز[1] سے کوئی تعلق نہیں جو آل انڈیا ریڈیو سے برآمد ہوتی یا ہوتا ہے۔

اونٹ گاڑی پر سوار ہوجانے کے بعد مسافر عموماً سونے لگتے ہیں۔ اُن سے پہلے اونٹ گاڑی ولا سوتا ہوتا ہے، اونٹ صرف ناک کی سیدھ جاتا ہے۔ ایک دفعہ کسی ستم ظریف نے، جب سفر تقریباً نصف ختم ہو چکا تھا اور ہر شخص سو رہا تھا، اونٹ گاڑی کا رُخ بدل دیا۔ چنانچہ لوگوں کی آنکھ کھلی تو تمام رات سفر کرنے کے بعد اپنے آپ کو صبح اسی مقام پر پایا جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے۔ اس سے آپ کو اونٹ یا اونٹ گاڑی دونوں کے بارہ میں صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل گیا ہوگا۔ اگر آپ نے صحیح رائے قائم نہیں کی تو پھر آپ کو یقیناً اونٹ گاڑی پر سفر کرنا چاہیے۔

اونٹ گاڑی کے ساتھ ساتھ بیل گاڑی کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے، جو چیز مہابھارت کے زمانہ میں رتھ کے درجہ پر تھی، وہی چیز جنگ عظیم تک پہنچتے پہنچتے بیل گاڑی یا بہلی بن گئی۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ رتھ کا جاپانی ایڈیشن بہلی ہے اور بہلی کا گاؤں سدھار ایڈیشن ٹھیلا، جس پر دہلی میں امٹرانک ہوتی ہے۔

بہلی میں ذرا تکلفات کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ دالان اور دردالان قسم کے شوالے سے بنے ہوتے ہیں اور بیل بھی بالکل انندی بیل سے نظر آتے ہیں۔ گھنگھرو، گھنٹیاں اور سرخ سرخ

---

1. آل انڈیا ریڈیو کا رسالہ جو مہینہ میں دو بار دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اب اس کی اشاعت بند ہوگئی ہے۔ مرتبین

پوششوں کو دیکھ کر میرا ذہن قدیم ہندوستان اور فالودے کی ہانڈیوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ قدیم ہندوستان کی طرف یوں کہ اصلی ہندوستان قدیم ہی ہندوستان ہے اور فالودے کی طرف یوں کی ان دنوں اللہ تعالیٰ کو گرمی پسند ہے اور اس خاکسار کو فالودہ ناپسند نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جہاں سے بیٹھا ہوا میں اس وقت باتیں بنا رہا ہوں اور فالودے کا ماتم کر رہا ہوں وہاں کا پنکھا بھی بند رکھا گیا ہے تا کہ پنکھے کے چلنے کی آواز بھی میری ہم نوا یا دم ساز نہ بن سکے۔ چنانچہ میں بار بار دل ہی دل میں اقبال کا ایک شعر مسخ کرتا جاتا ہوں اور فالودے کو یاد کرتا ہوں۔

یہ دستور ہوا بندی ہے کیسا تیرے کرے میں
یہاں تو بات کرتے خشک ہوتی ہے زباں میری[1]

اور ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں شاعر خود بھی نہ سُن رہا ہو۔

اب یکے اور تانگے کا نمبر آتا ہے۔ میرے دیار میں یکے ایسے ہوتے ہیں جیسے کمہار کا چاک، جس میں اُلٹے سیدھے دو پہیے لگا دیے گئے ہوں۔ اسے ایک قسم کی ''جوائے وھیل'' کہنا چاہیے جس پر لوگ تفریحاً بیٹھتے ہیں اور جب اس کو چرخ دیا جاتا ہے تو لوگ تفریحاً ہی ایک دوسرے پر گرتے ہیں اور تفریحاً ہی پٹخنیاں کھاتے ہیں۔ اس یکے کو سپاٹ رکھنے میں مصلحت یہ رکھی گئی تھی کہ جتنی سواریاں چاہیں بٹھالیں لیکن سواریوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ جتنوں نے چاہا راستہ میں گر گئے۔ مجبوراً اب یہ کرتے ہیں کہ جب سات آٹھ نفر بیٹھ لیتے ہیں تو کسی ایک کی پگڑی اُتار کر سب کو ایک حلقہ میں باندھ دیتے ہیں اور سفر شروع کر دیتے ہیں۔ رسّی اور پگڑی نہیں ملتی تو پھر مجبوراً ایک دوسرے کا کان پکڑ لیتے ہیں اور جھولتے جھومتے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کا سفر ایک دفعہ کرنے کے بعد اکثر لوگ سفر کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتے ہیں۔

تانگے مجھے پسند نہیں، اگر میں تانگے پر سفر کر رہا ہوں اور کوئی سواری پیچھے سے آتی ہوئی نظر آئے تو مجھے وہم سا ہونے لگتا ہے کہ یہ مجھے روندتی ہوئی تانگے کے اندر سے نکل جائے گی۔

---

1 اصل شعر یوں ہے:

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ہندوستان میں لوگ گدھوں پر سفر نہیں کرتے، اس کے یہ معنی نہیں کہ گدھے سفر نہیں کرتے۔ لیکن یہاں اس کمی کی تلافی ایک قسم کے گھوڑوں سے کرلی گئی ہے جن سے مجھے ایک دفعہ کالکا سے کسولی جانے کا سابقہ پڑا تھا۔ آپ یقین فرمایئے مجھے کسولی جانے کے بجائے کہیں اور جانے کا اتفاق یا ضرورت پیش آتی تو میں ان گھوڑوں یا معزز گدھوں پر کبھی نہ بیٹھتا۔ ان گھوڑوں کا خاصہ یہ ہے کہ کالکا میں ان پر بیٹھ جایئے اور کسولی میں اُتر جایئے۔ کسی ساتھی یا رہبر کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ شہ سوار ہوں یا سواری سے بالکل واقف نہ ہوں یہ ممکن ہے کہ آپ کسولی وقت سے پہلے یا بعد پہنچ سکیں۔ سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ نہ تو یہ گھوڑے ناہموار اور تنگ راستے پر کہیں گرتے ہیں اور نہ باوجود آپ کی کوشش کے آپ کو گرنے دیتے ہیں۔ میں نے تو اُکتا کر یہ ترکیب نکالی تھی کہ گھوڑے سے اُتر کر گھوڑے کی دُم پکڑ لی، اور اس کے سہارے کسولی جا پہنچا۔ گھوڑے کو مطلق نہیں محسوس ہوتا کہ اس کا مصرف کیا قرار دیا گیا ہے۔ آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں، البتہ میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا کہ باوجود اس کے کہ پہاڑ کی ہوا نہایت لطیف ہوتی ہے۔ آپ کسی وقت بھی یہ نہ محسوس کریں کہ آپ گھوڑے کی دم کے سہارے چل رہے ہیں اور اس کا لطف ہوا کی لطافت سے ذرا مختلف ہے۔

پہاڑوں اور بعض دیگر مقامات پر لوگ ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرتے ہیں۔ ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرنے والوں کو دیکھ کر مجھے کافی غصہ آتا ہے۔ غصہ فرو ہونے پر میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ڈانڈی اور رکشا پر صرف جدید الخیال عورتوں یا مایوس العلاج مریضوں کو بٹھانا چاہیے۔ ان کے علاوہ کوئی اور بیٹھا ملے تو اسے کسی ترکیب سے سفرِ آخرت پر روانہ کر دینا چاہیے۔ یہ میری رائے ہے اور رائے کا حال یہ ہے کہ اس ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ میں رائے دینے کی اتنی ہی آزادی ہے جتنی کہ اس پر عمل کرنے کی ممانعت ہے۔ اس لیے میری رائے پر عمل کرنے سے پیشتر آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ کسی کو سفرِ آخرت پر بھیجنے سے اکثر خود آخرت کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ اس قسم کی حرکت کرنے سے پہلے آپ کسی وکیل اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ کرلیں، کیوں کہ بغیر ان دونوں کی اعانت کے نہ آپ دوسروں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں اور نہ خود پاگل خانہ جا سکتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں انھیں سواریوں پر اور انھیں طریقوں سے سفر ہوتا تھا۔ یہ حال تو خشکی میں سفر کرنے والوں کا تھا۔ تری کا سفر کشتیوں میں طے کیا جاتا تھا۔ ایسی کشتیاں جو ہوا کے رُخ پر چلتی تھیں۔ اگر معمولی لوگ سوار ہوتے تھے تو یہ موجوں سے ہم آغوش ہو جاتی تھیں اور عشاق و شعرا موجود ہوتے تو ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں۔

ان سواریوں کے علاوہ لوگ پا پیادہ بھی سفر کرتے تھے۔ راستہ میں ڈاکو ملتے تھے، لوٹ مار ہوتی تھی، جا بجا پڑاؤ بنتے تھے۔ جہاں لوگ شب باش ہوتے اور صبح منہ اندھیرے بوریا بستر باندھ دوسری منزل کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اس سفر میں جہاں دقتیں اور خطرات تھے وہاں یک جہتی اور ہم آہنگی بھی ہوتی۔ لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے، ان سے ہمدردی کرتے اور دکھ درد کے شریک ہوتے۔

اب اونٹ گاڑی، بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی اور آدمی گاڑی کے بجائے، ریل گاڑی، ہوا گاڑی، جہاز اور طیارے یعنی ہوائی جہاز ہیں۔ پہلے سب سے تیز سواری ہوا سمجھی جاتی تھی، اور جلد بازوں سے سابقہ پڑتا تو لوگ کہتے تھے کہ تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو، اس زمانہ میں اسی سواری پر شعرا پھول کی مہک، یا محبوب کی موبافِ مشکین کی خوشبو سوار کرایا کرتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ لوگ بجلی پر آواز کو سوار کر کے ادھر سے اُدھر بھیجتے رہتے ہیں۔ ریڈیو اسی کھیل کا دوسرا نام ہے۔

پہلے زمانہ میں جو سفر ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں طے ہوتا تھا یا بالکل طے نہیں ہوتا تھا، اب گھنٹوں اور دنوں میں طے ہونے لگا ہے۔ پہلے صرف لوگوں کی آہیں آسمان کی طرف جاتی تھیں اب لوگ خود جانے لگے ہیں۔ پہلے آہوں کو خود سفر کرنا پڑتا تھا، اب انھیں ریڈیو کے ذریعہ دور دور تک پہنچا سکتے ہیں۔ پہلے ممکن ہے کہ ان کا اثر ہوتا ہو یا نہ ہو، آپ چاہیں تو محبوب تو در کنار محبوب کے اعزا و اقارب اور ہم وطن سب کو ان آہوں کے ذریعہ جلا کر خاک سیاہ کر ڈالیں۔ پہلے زمانہ میں لوگ امام ضامن باندھ کر سفر کیا کرتے تھے۔ اب بیمہ کرا کے سفر کرتے ہیں۔ پہلے چور اور ڈاکو کا خطرہ تھا۔ اب گاڑی لڑنے کا خطرہ ہے۔ پہلے بیماریاں کم سفر کرتی تھیں اب ان سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ پہلے لوگ سفر کے بارہ میں کہتے تھے پا بہ رکاب ہوں۔ اب ٹکٹ بدست

کہتے ہیں۔ پہلے لوگ آم کھانے لکھنؤ اور رام پور جاتے تھے، اب لکھنؤ اور رام پور کے آم اپنے کھائے جانے کے لیے یورپ اور امریکہ کا سفر کرتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں لوگ سفر کرتے تو بیوی بچّوں سے اس طور پر رُخصت ہوتے جیسے اب اللہ ہی ہے جو پھر ملنا ہو، اب دوسروں کی بیوی اور ضمناً بچّوں سے ملنے اس طور پر سفر کیا کرتے ہیں جیسے دنیا سے شوہر اور اللہ دونوں اُٹھ گئے ہیں۔

پہلے لوگ طلب علم کے سلسلے میں تپتے ہوئے ریگ زاروں کو گرتے پڑتے طے کرتے، پتیاں چباتے، بھوکے پیاسے بے یار و مددگار سرچشمۂ علم تک پہنچتے۔ اب طلب علم کے بہانے ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جن کو نہ سفر سے کوئی تعلق ہے اور نہ علم سے سروکار۔ پہلے علم کی خاطر علم کماتے ہیں۔

پہلے لوگ دہلی سیکھنے اور سمجھنے کے لیے آتے تھے، اب گانے اور بولنے کے لیے آتے ہیں۔ عربی کی ایک مثل ہے، مرنے سے پہلے مرجاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اس مقولہ یا نصیحت پر عمل نہ کر سکیں ان کو اس مقولہ پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خاموش کیے جانے سے پہلے خاموش ہو جاؤ۔

وہ عربی کی مثل تھی۔ یہ ریڈیو کا سوال ہے اور میں اصولاً ریڈیو ہی کے اصول پر کاربند ہوتا ہوں۔

(نشریہ)

●●●

دعوت

ایک مثل مشہور ہے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ مثل بھی عام ہونی چاہیے۔ "مجھے دعوتوں سے بچاؤ" گو دوستوں سے بچنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ دعوتوں سے بھی نجات مل جائے گی!

بھوک کی مانند دعوت کا بھی یہ حال ہے کہ اس کا نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ موقع۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہوگا۔

کلبہ افلاس میں دولت کے کاشانہ میں بھوک
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانہ میں بھوک
بھوک ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے بھوک کے آغوش میں

تیوہار تقریب ہو، کوئی مہمان آیا ہو کوئی چل بسا ہو، رقعہ دعوت بہر حال موجود ہے۔ ماحضر موجود ہے اور ایک بزرگ نے تو جوش میں آکر اس کی بھی فرمائش کر دی۔

"براہ کرم تناول ماحضر فرمایئے"

دعوت میں نہ جایئے تو غرور یا بے توجہی کی شکایت، جایئے تو معدہ اور عاقبت دونوں خراب۔

مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے جس جس قسم کی اور جن جن مواقع پر دعوت کھائی ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ سب سے پہلی دعوت مجھے خوب یاد ہے۔ گو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ میرے کسی بزرگ کی دعوت رہی ہو اور وہ مجھے اسی اُصول پر بن بلائے ساتھ لے گئے ہوں جس اصول پر ریل میں کرایہ نہیں ادا کرنا پڑتا۔ یعنی معصوموں کے لیے نہ کرایہ ادا کرنے کی ضرورت ہے اور نہ رقعہ دعوت کی۔

بعض ریلوے لائنوں کا تو مجھے حال معلوم ہے کہ وہاں فی گاڑی دو سادھو کے حساب سے مفت سفر کیا جاسکتا ہے۔ ادھر کے کوئی ٹکٹ کلکٹر اس لائن پر مامور ہوئے انھوں نے ایک بزرگ کو بے ٹکٹ سفر کرتے پکڑا، تو انھوں نے نہایت گھور کر عارفانہ ڈپٹ کے ساتھ کہا، ابھی شراپ دوں گا بھسم ہو جائے گا۔ جانتا نہیں فی گاڑی دو سادھو! بے چارے ٹکٹ کلکٹر ایسے مبہوت ہوئے کہ گاڑی کے نیچے کٹتے کٹتے بچے۔

ہاں تو پہلی دعوت مجھے ایسے صاحب کے ہاں کھانی پڑی جو کپڑے بُنتے تھے۔ غازی میاں کے معتقد تھے۔ راہ نجات پڑھتے تھے اور کوکین بیچنے میں سزا پا چکے تھے۔ ساری بستی مدعو تھی۔ مئی کا مہینہ اور دوپہر کا وقت مکان و میدان کا کوئی نشیب و فراز ایسا نہ تھا، جہاں کھانے والے نہ بیٹھے ہوں۔ فرش و دسترخوان کا وہاں کوئی دستور نہ تھا۔ جس کو جہاں جگہ مل گئی بیٹھ گیا۔ ایک نیب کی جڑ پر میں بھی بیٹھ رہا۔ ایک ہاتھ میں گرم گرم تنوری روٹی دے دی گئی۔ مٹی کے برتن میں زمین پر سالن رکھ دیا گیا۔ بہشتی نے مشک سے تام چینی کے گندے شکستہ گلاس میں پانی پلانا شروع کر دیا۔

سامنے ایک نیازمند کتے صاحب بھی موجود تھے۔ دُم ٹانگوں کے درمیان خود دو زانو بیٹھے ہوئے نظریں نیچی، بہت کچھ بھوکی، چہرہ اور جسم پر ہمسایا اہمسا کے غیر فانی نقوش جن پر کھیاں مصروف غزل خوانی اور بحیثیت مجموعی داغ کا ایک مصرعہ۔

''نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے''[1]

---

1 مکمل شعر:

پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے ۔۔۔ نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے

پاس ہی ایک بوڑھے کھانستے جاتے تھے۔ کھاتے جاتے تھے اور خلال کرتے جاتے تھے۔ ناتی گود میں پوتا کندھے پر۔ پوتے نے ایک ہڈی کتے کے سامنے پھینک دی۔ اب معلوم ہوا کہ ایک کتے صاحب کہیں قریب ہی مراقبہ میں بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے یک لخت غرا کر جست کی ہے تو میرے مقابل کے کتے پر آ گرے۔ لیکن جست کے دوران میں دادا نانا پوتا ناتی کے پورے شجرۂ نسب کو ڈھاتے گئے۔ خلال دادا یا نانا کے گلے میں جا پھنسا اور پوتے ناتی میری سالن میں آ رہے، ایک ہلّڑ مچا۔ مشہور ہوا کہ مہتو دادا پر غازی میاں آ گئے سارے کھانے والے بھاگ کھڑے ہوئے۔

یہ تو میرے ایام جاہلیت کا قصہ تھا۔ ہوش سنبھالا تو ایک مشہور شہر میں ڈیپوٹیشن پر جانے کا اتفاق ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ شام کو وہاں کی مشہور مسجد کے امام صاحب کے ہاں افطار پر ہم سب مدعو تھے، جہاں ایک ہجوم تھا۔ ہمارے سامنے بھی افطاری رکھ دی گئی۔ ابھی ہم سب نے مشکل سے دو ایک لقمے فرد کیے ہوں گے کہ ایک حملہ ہوا، چند سُورما ہم پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ سامنے تھا، اُسے چٹ کر کے آگے بڑھ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہاں کا یہی دستور تھا کہ جو چاہے جس کے سامنے سے افطاری اُچک لے۔ ایسا کرنے سے میزبان کو ثواب ملتا ہے۔ ہمارے ساتھ ایک روہیل کھنڈی پٹھان طالب علم تھے، وہ بڑے متحیر ہوئے۔ ان کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس واقعہ کو نظر انداز نہ کریں گے۔ جب نماز کے لیے لوگ کھڑے ہوئے اور ہر شخص نیت باندھ چکا تو انھوں نے اپنی ٹوپی تو جیب میں رکھی اور سامنے سے ایک نمازی کی پگڑی اُچک کر اپنے سر پر رکھ لی اور سلام پھیرتے ہی اُسے چھت سے نیچے پھینک دیا، جہاں ہزاروں فقیر ٹوٹ پڑے اور آناً فاناً پگڑی کا تبرک تقسیم ہو گیا۔ جھگڑا بڑھا تو انھوں نے فرمایا ہماری طرف دستور ہے کہ نماز میں جس کا عمامہ چاہے اُچک لے۔ نماز کے بعد وہی عمامہ غربا میں لٹوا دیا جاتا ہے۔ اس عمامہ کے جتنے پرزے ہوتے ہیں، اتنے ہی ہزار محل اور باغات امام کو جنت میں ملتے ہیں۔ اس کی دھجیاں بچّوں کے گلے میں ڈال دی جائیں تو ام الصبیان نہیں ہوتا، جوان باندھ لیں تو اُن پر جیل خانہ حرام ہو جاتا ہے۔ بوڑھے استعمال کریں تو آنتیں اُترنے سے محفوظ رہتی ہیں۔ بہر حال امام صاحب کے کہنے سننے سے معاملہ رفت گذشت ہو گیا۔

رات کو دعوت تھی۔ سارے مہمان دوزانو بیٹھے، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مارسڈن صاحب کی تاریخ ہند میں ٹھگوں کا گروپ ہے، ہم سب بھی بیٹھ گئے۔ایک بڑی سینی میں بریانی کا اہرام مصر بنا ہوا تھا جس کے اوپر ایک دیگچی شوربے کی انڈیل دی گئی۔لوگ سینی پر ٹوٹ پڑے اور براہِ راست دست بہ دہن ہو گئے۔دست بہ دہن کو آپ محض ''ہینڈ ٹو ماؤتھ'' کا ماحضر تصور فرمائیں۔ ہمارے روبیل کھنڈی دوست چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میزبان تو انھیں دیکھ کر خاموش رہے، لیکن ایک بزرگ جن کی داڑھی چاولوں کی مالا بن گئی تھی اور شوربا گنگا جمنی خضاب کی بہار دکھا رہا تھا، قاب سے سر اُٹھائے بغیر بولے۔کھاؤ سیٹھ صاحب کھاؤ نہیں تو ایک مسلمان کا مال جائع (ضائع) ہوگا۔دوست بولے بالکل درست، لیکن دوسرے مسلمان کی جان بھی جائع (ضائع) ہوگی۔

وہاں کے زمانہ قیام ہی میں ایک اور جگہ سے دعوت نامہ آیا۔ ہمارے میزبان وہاں کے معزز اور دولت مند ترین لوگوں میں سے تھے۔میزبانی کے فرائض خاتون خانہ ادا کر رہی تھیں۔ڈرائنگ روم میں پہنچے تو دن کو تارے نظر آنے لگے۔ایسی خوب صورت قیمتی پُر تکلف اور نایاب چیزیں ایک ساتھ کب دیکھنی نصیب ہوئی تھیں۔البتہ ان کا تذکرہ میلادوں میں سُنا تھا یا طلسم ہوش رُبا میں پڑھا تھا۔ مالک مکان سے زیادہ پُر شوکت اور شعر افگن نوکر، نوکرانیاں تھیں۔یہ شعر افگن نور جہاں کے پہلے شوہر نہیں بلکہ ہمارے اردو شعرا کی اولاد قسم کی چیز ہے۔ کس کی تعظیم کیجیے اور کس سے تعظیم لیجیے۔کھانے کے کمرہ میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ شاید دنیا کے سب سے بڑے آدمی کا سب سے بڑے شفا خانہ میں آپریشن ہونے والا ہے۔ ہر طرف سوائے صفائی اور سامان جراحی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔اوّل تو کھانے کا گانگ بجا تو ہم نے سمجھا ہماری روح قبض کرنے کا کوئی آلہ ایجاد ہوا ہے۔میز کے قریب آئے تو ایک مثنوی زہر عشق قسم کی، صنف نازک نے ہمارے بیٹھنے کی کرسی کھینچی۔معاً خیال آیا کہ آگے بڑھ کر کہوں ''اے قبلہ یہ آپ کیوں کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہیں، لیکن سیاستِ دربان سے ڈرا اور خاموش رہ گیا۔ جب ہم میز سے متصل ہوئے تو اس نے کرسی ہم سے متصل کر دی۔ میں اس آداب سے واقف نہ تھا اور پھر کچھ سہما ہوا بھی تھا۔اس لیے کرسی پر پورا بوجھ دینے کے بجائے اپنے ہی پاؤں پر زور

دیے رہا۔ بس یوں سمجھ لیجیے گویا کوئی نہایت سبک سوار جا کی گھوڑے پر بیٹھا ہوا روانہ ہونے کے اشارے کا منتظر ہو۔ آپ یقین مانیئے اگر اس دوران میں کہیں وہ گانگ ایک دفعہ اور بج جائے تو روح پرواز ہوتی یا نہ ہوتی ہمارا جسم ضرور پرواز کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ کھانا آیا اور آتا رہا لیکن یقین مانیے، کام یاروں کا بہ قدر لب و دنداں نکلا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ کھانا ایسے ایسے یونی فارم یا لباس فاخرہ یا ملبوسات عروسی میں لایا جاتا تھا کہ یہ طے کرنے میں دشواری ہوتی کہ ان پر حملہ کیا جائے یا ان کی عبادت کی جائے، یا پھر کھڑے ہو کر قومی ترانہ گایا جائے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ کس آلہ سے کس چیز پر حملہ کیا جائے۔ اس لیے کہ جان لینے کے لیے تو آپ آزاد ہیں جو آلہ چاہیے شوق سے استعمال کیجیے۔ لیکن کھانوں کے لیے تو مخصوص آلات مقرر ہیں۔ تیسری مصیبت یہ کہ جو کھانا پیش کیا جارہا تھا اس کے دوسرے عزیز اقارب نہ معلوم کون کون اور تھے جن کی عدم موجودگی میں کھانے کو ہاتھ لگانا بڑا گنوار پن ہوتا۔ میزبان خاتون کو مسکرانے اور خواہ مخواہ اخلاق برتنے سے فرصت کہاں کہ وہ کچھ بتائیں یا ہم پوچھ سکیں۔ بیروں کو دیکھیے تو زرہ بکتر اور چار آئینے لگائے ہوئے اس طور پر مصروف کار تھے، جیسے بعض نالائق اور بد دماغ، امتحان ہال میں اُمیدواروں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس قسم کے بیروں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو کچھ ایسا وہم سا ہونے لگتا ہے کہ یہ کہیں نہ کہیں اپنے یونی فارم یا پٹی ٹھپوں میں کوئی پیش قبض بھی چھپائے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی خادمہ بہ شکل مخدومہ آجاتی تھی اور ہم بر بنائے سراسیمگی یا دور اندیشی یہ سمجھ کر کہ یہ بھی میزبان قسم کی کوئی چیز تھی یا آج نہیں تو کل اس رتبہ پر فائز ہوں گی۔ ہمیشہ تعظیم دیتے یا بے وقوفوں کی طرح مسکرانے کے لیے تیار رہتے۔ کھانا تھا کہ چلا ہی آتا تھا، ہم نے بھی چُھری اس طور پر پکڑ رکھی تھی جیسے کسی قلم تراش چاقو سے گینڈے کی قربانی کرنے والے ہیں۔ کانٹا ہمارے ہاتھ میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پلیٹ پر کوئی کیکڑا مسلط ہے۔

خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا۔ کافی آئی بغیر دودھ یا شکر کے، بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے تمبا کو کا گُل پیس کر گرم پانی ملا دیا گیا ہے یا نادر شاہ کے اصلاح معدہ کے لیے املتاس کا مسہل جام بلوریں میں پیش کیا گیا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ کافی سے انکار کیجیے تو بعض میزبان اس طور پر خفا

ہوتے ہیں جیسے ریڈیو والوں کو آپ کی تقریر دس دن پہلے نہ پہنچ جائے یا صاف نہ لکھی ہو تو یہ دل ہی میں کوستے ہوئے براڈ کاسٹ کرتے ہیں۔

اب فرض کیجیے کسی رئیس کے ہاں دعوت ہوئی، وہ کھانا اس طور پر کھلائے گا گویا مہمان کے ساتھ پشت تک کو نواز ڈالا۔ قورمہ ہر دعوت میں ملتا ہے اور معمولی سے معمولی لوگ بھی اپنے گھروں پر کھاتے ہیں، لیکن رئیس کے یہاں کا قورمہ کچھ اور ہی چیز ہوتا ہے۔ ایک خاص انداز سے فرمائیں گے، مولانا کیسے قورمہ سے بھی شوق فرمایا۔ جی ہاں، شکریہ! ماشاءاللہ فرمائیں گے۔ صاحب ایسا حلوان دہلی بھر میں نہ ملے گا۔ بادام پر پلا تھا، ذرا بوٹی کی خستگی پر نظر رکھیے۔ سبحان اللہ کیوں نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ہاں ہاں خوب کھایئے۔ بہت ہے، جی ہاں خوب سیر ہو کر کھایا نہیں، نہیں آپ تکلف کرتے ہیں۔ فلانے چلو مولانا کو قورمہ اور دو، لیکن فلانے کو پکاریں گے اور قورمہ کا آرڈر اس طور پر دیں گے گویا مولانا کو پڑوا دینے کا ارادہ ہے۔ قورمہ پلیٹ میں ڈال دیا گیا اور مولانا کو قورمہ سے نفرت ہونے لگی۔ ارشاد ہوا، مولانا یہ باورچی اب دہلی میں اکیلا رہ گیا ہے، اس کا دادا معمولی حجام تھا۔ میرے والد نے اس کو کھانا پکانا سکھایا۔ وہ خود کھانے کے بڑے شائق تھے۔ اب اس کا ثانی دور دور نہ ملے گا۔ بس مولانا قورمہ کھا لیجیے، یہ چیز اب معدوم ہوتی جاتی ہے۔ غرض مولانا کو اس شفقت اور تپاک سے کھلائیں گے گویا اپنے والد مرحوم کے فاتحہ کا کھانا کسی نابینا حافظ کو کھلا رہے ہیں۔

دوسری آفت ملاحظہ ہو۔ بعض میزبان حماقت اور محبت کے سلسلے میں اصرار کرتے کرتے کھانا آپ کی پلیٹ میں ڈال دیں گے اور فرمائش کریں گے، کھایئے میرے سر کی قسم کھایئے۔ حالاں کہ اُس وقت جی یہی چاہتا ہے کہ پلیٹ سر پر مار لیجیے اور گریبان پھاڑ کر کہیں بھاگ جایئے۔ ایسی دعوت سے مجھ کو قلبی نفرت ہے جہاں میزبان بار بار کھانے کے لیے اصرار کرے اور اپنے ہاتھ سے میری پلیٹ میں کھانا رکھ دے اور صرف یہ کہتا رہے، آپ کو کھانا پسند نہیں آیا، آپ کے لیے کچھ انتظام نہ ہو سکا۔ بھائی جلدی میں یہی دال دلیا ہو سکا آپ نے کچھ بھی تو نہیں کھایا۔ حالاں کہ اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میں یہ کہوں کہ ایسا کھانا مجھے تو کیا میرے سات پشت کو نصیب ہوا اور نہ ہوگا اور آپ نے جس مروّت اور ایثار کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی۔

اس کے علاوہ بعض عورتوں میں عجیب عجیب قسم کے بدتمیزوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض کھانا نہیں کھاتے منہ میں جوتیاں چٹخاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ساری اُنگلیاں سالن میں ڈبو دیں گے اور منہ میں لقمہ کی پذیرائی اس طور پر کریں گے جیسے سرکس کے گھوڑے کو چابک لگاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بدحواس ہوکر بہت زیادہ حصہ پلیٹ میں لے لیں گے، تھوڑا کھائیں گے اور بقیہ کو گھنگھول کر چھوڑ دیں گے۔ ڈونگے میں سے بوٹیاں چمچے سے نکالنے کے بجائے ان کو ٹٹول ٹٹول کر نکالیں گے۔ کبھی پلیٹ میں نکالی ہوئی بوٹیوں کو پھر ڈونگے میں ڈال دیں گے۔ پانی پئیں گے تو معلوم ہوگا گویا بھری بوتل حلق میں اُنڈیلی جارہی ہے اور گلے سے قلقل مینا کا کام لے رہے ہیں۔ کچھ لوگ چپاتی کے حاشیے توڑ توڑ کر دسترخوان پر انبار لگادیں گے۔ سنی ہوئی اُنگلیاں روٹی سے پوچھیں گے اور ڈکار اس طور پر لیں گے گویا اس خوب صورت آواز کے تمام لوگ منتظر تھے۔

کچھ اس طور پر کھائیں گے گویا اپنے گھر کھانے کو نہیں ملتا، دوسروں کے دسترخوان پر نازک مزاجی یا بد دماغی کا ایسا ثبوت دیں گے گویا وہ بہ یک وقت اردو کے کوئی حق بخشوائے ہوئے شاعر بھی ہیں اور نالائق افسر بھی!

اور خدا اُس دعوت سے بھی ہر بھلے مانس کو بچائے جس میں تقریر کی جانے والی ہو، لیکن مقرروں میں بھانڈوں کی محفل اور شرفا کی مجلس میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہ ہو!

(نشریہ)

●●●

یو پی والا!

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں یو. پی والا پر آپ سے کچھ گفتگو کروں۔ سبحان اللہ و ماشاء اللہ تلاش کی داد دوں یا اپنے منتخب کیے جانے پر فریاد کروں۔ سننے والوں میں سے جناب والا سے لے کر معلوم نہیں کہاں کہاں اور کس کس قسم والے موجود ہوں گے۔ اس سے آپ کم از کم اتنا تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اس یو. پی والا مصرعہ طرح پر طبع آزمائی کرنے پر مجھے کتنا پیچ و تاب آ رہا ہے، لیکن اس کو کیا کیا جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے۔

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم [1]

چنانچہ جہاں سے بیٹھ کر میں گفتگو کر رہا ہوں وہاں کی رسم یہ ہے کہ آپ بھلے مانسوں کی طرح بیٹھے گفتگو کیے جایئے۔ بھلے مانسوں کی طرح لڑ جھگڑ نہیں سکتے اور نہ بھلے مانسوں کی طرح خاموش رہ سکتے ہیں۔ آپ نے وہ مثل تو سُنی ہوگی ''میاں مٹھو بولو ورنہ پنجرا خالی کرو'' بہر حال سنگ آمد و سخت کی بنا پر تو اس وقت صبر کیے لیتا ہوں، لیکن یہ بھی واضح رہے اسی مثل کا دوسرا مصرعہ تنگ آمد بجنگ آمد بھی ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک تقریر تو تحریری ہوگی جسے آپ لوگ سُنیں گے۔ یعنی جن کے پاس ریڈیو ہے یا جو ریڈیو کی زد میں ہیں اور دوسری تقریر بالکل منہ زبانی ہوگی۔ جس کا مخاطب صرف وہ ریڈیو والا ہوگا جو ہر روز اس قسم کے شگوفے چھوڑا

---

1. کوئی سُنے یا نہ سُنے میں تو گفتگو کرتا ہوں۔

کرتا ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ اور کچھ نہیں تو اس والے اور والا کا فرق سمجھتے ہوں گے اور آپ سمجھے ہوں یا نہ ہوں۔ میرے پاس جو بزرگ بیٹھے ہوئے شارٹ ہینڈ میں مسکرا رہے ہیں وہ سمجھ گئے ہیں۔ لیکن اطمینان یہ ہے کہ پندرہ منٹ تک تو وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور نہ میں ان کا کچھ کرسکتا ہوں۔ اس کے بعد البتہ

من وگرز و میدان وافراسیاب!

تو جناب والا اس لفظ والے میں عجیب عجیب قسم کے شب ناچے بند ہیں۔ اس کو مختلف ترکیب دے کر آپ مختلف مفہوم پیدا کرسکتے ہیں، اور اس ترکیب سے جس کی چاہیں تعریف کرلیں اور جس کو جی چاہے گالی دے دیں۔ عرصہ ہوا ایک صاحب نے خطابات کی ایک فہرست شائع کی تھی۔ قافیہ یہی والا تھا۔ خطاب یا القاب کا یہ طرز اتنا مقبول ہوا کہ اب لوگ اسے بے تکلف استعمال کرنے لگے ہیں۔ مجھے سارے خطابات تو یاد نہیں ہیں، صرف چند ایک ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ عام لوگوں کے فائدہ کو مدِّ نظر رکھ کر اس کا حق تصنیف یا حق ملکیت محفوظ نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کے ترک واختیار کا حق ہر عاقل بالغ اور بے روزگار کو حاصل ہے۔ سُنیے:

آر۔ سی .... شیشے والا

پی۔ کے .... بھٹی والا

جے۔ پی .... گھڑی والا

سی۔ پی .... موتی والا

او۔ یو .... مرغی والا

بہر حال اب یہ لفظ چل نکلا ہے، جسے بے تکلف صاحب اور یکّہ بان دونوں استعمال کرتے ہیں اور اب جب کہ ریڈیو والوں نے اسے چالو کردیا ہے تو ہم لوگ بھی جو اُصولاً لکھے پڑھے اور اخلاقاً تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں کیوں نہ استعمال کرتے۔ آپ نے وہ مثل تو سُنی ہی ہوگی:

دلّی میں رہ کر ریڈیو سے بیر

میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ یو پی کے باشندے کا حال کون بتائے اور کیسے بتائے۔ تہذیب وتمدن، علم وحکمت، اخلاق ومذہب، شعر وادب، نشیب وفراز، آسمان وزمین۔ سبھی کی تو

قدر و قیمت بدل چکی ہے۔ کس معیار سے کس متاع کو پرکھا جائے اور کس برتے پر پرکھا جائے۔ ہم جس چیز کا ماتم کریں، ممکن ہے آپ اس پر ہنس پڑیں یا جس پر ہم ہنسیں اس پر آپ برس پڑیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں جو کچھ کہوں اسے آپ اظہارِ واقعہ سمجھیں۔ مجھے اس پر قطعاً اصرار نہیں ہے کہ اسے آپ قابلِ قدر بھی سمجھیں۔ غزل میں پڑھتا ہوں، ساز کا انتخاب آپ خود کر لیجیے۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ یوپی کا علاقہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے اور کن لوگوں پر یو. پی والے کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن یہاں میں یوپی کے جغرافیائی حدود نہیں بتانا چاہتا۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ یہ کب تک ممالک مغربی شمالی و اودھ کہلایا اور کب ممالک متحدہ بنا۔ اس کی آب و ہوا کیسی ہے، پیداوار کیا ہے، اس کے قدرتی مناظر کیا ہیں۔ اس کا نظامِ حکومت کیا ہے اور یہ تمام باتیں مجموعی حیثیت سے اس کے باشندوں پر کیوں کر اثر انداز ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ مجھ ایسے بدنام سے اس کی توقع بھی نہ کرتے ہوں گے کہ میں ریسرچ یا گورکی قسم کی باتیں کر سکتا ہوں۔ میں آپ کی معلومات میں اضافہ نہیں، آپ کے تاثرات میں تنوع پیدا کر سکتا ہوں۔ میرا مسلک تو بقول ملہم ہند یہ ہے۔

خوش باش دمے کہ زندگانی نیست!

میں اس وادی کا مسافر ہوں۔ آیئے تھوڑی دیر کے لیے آپ بھی اسی مسلک کے پیرو بن جایئے اور تھوڑی ہی دیر کے لیے بھول جایئے کہ دنیا میں بیوی یا بے روزگاری بھی کوئی چیز ہے۔ مجھے اُمید ہے وہ بیویاں مجھے معاف کر دیں گی جو بے روزگار ہیں اور وہ بے روزگار بھی جن کے بیویاں نہیں ہیں۔

یوپی والوں کی خصوصیت وہی ہے، جو ایک زوال پذیر تمدن کے نام لیواؤں کی ہوتی ہے۔ دلی اُجڑ چکی، اودھ کا چراغ گل ہوگیا، پروانے خاکستر ہوئے، بزم کی بساط درہم برہم ہوگئی۔ عیش و طرب کی محفلیں سونی ہوئیں، علم و فضل کے سوتے خشک ہوئے۔ بادشاہ اور بادشاہتیں ختم ہوتی ہیں، کبھی جلد کبھی دیر میں، لیکن اُن کے تمدنی اثرات جلد نہیں زائل ہوتے۔ دلی، آگرہ، متھرا، لکھنؤ، الٰہ آباد، قنوج، فیض آباد، بنارس، ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن کے سرچشمے رہے ہیں۔ سیاسی و انتظامی در و بست کے اعتبار سے دلی، یوپی سے علاحدہ سہی لیکن تمدنی نقطۂ نظر

سے وہ یو پی سے علاحدہ نہیں کی جاسکتی۔ ہندوستان قدیم کا جائزہ لیجیے۔ آریا، ہندو، جین اور بدھ متوں کی تعلیم، تہذیب وتمدن، ان کے شعروادب ان کے سورما اور ساونت اُن کے دیوی دیوتا، ان کے رشی اور منی، ان کے شاعروادیب، ان کے کرشن اور رادھا، سب اسی خاک سے اُٹھے اور یہیں آسودۂ خاک ہیں۔ یو پی کو ان پر فخر ہو یا نہ ہو، اس کا فخر کرنا حق بجانب ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جہاں ایسے اور اتنے ڈرامے کھیلے جاچکے ہوں وہاں کی آب وہوا اور وہاں کے خمیر میں کیسے کیسے عناصر کی آمیزش نہ ہوگی، اور ان کا مظاہرہ کس کس طور پر کہاں کہاں نہ ہوا ہوگا۔ اسلامی حکومت اور ہندستانی تمدن کا آخری نقشہ دہلی کے اسٹیج پر نظر آتا ہے جہاں سے معمولی چلتی پھرتی تصاویر تھوڑے عرصہ کے لیے اودھ کے افق پر جلوہ گر ہوتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے غدر کے ہنگامے میں خاک وخون میں مل جاتی ہیں۔ سلطنت ختم ہوئی اور اپنے نقوش ان لوگوں میں چھوڑ گئی جو اس کے علم بردار ہو نہیں سکتے تھے۔ صرف سوگوار ہو کر رہ گئے۔ گزرے ہوئے تمدن کی خوبی اور خرابی دونوں یو پی کے حصہ میں آئیں۔

جس کو تمدن کہتے ہیں وہ بڑے عرصہ میں بنتا سنورتا ہے، اور بڑے عرصہ میں مٹتا ہے۔ دہلی پر آفتیں نازل ہوئیں، متواتر اور پے بہ پے جو لوگ دہلی کے چشم و چراغ تھے ان میں سے اکثر وبیش تر نے فیض آباد اور لکھنؤ کے بام ودر روشن کیے، اور کچھ عرصہ کے لیے لکھنؤ کے کوچے دہلی کے اوراق مصوّر بن گئے۔ لیکن جس فلک نے دہلی کو لوٹ کے برباد کیا تھا اسی نے لکھنؤ کو بھی اُجاڑ دیار بنادیا۔ لکھنؤ سے تمدن کا مرکز نیا برج (کلکتہ) کو منتقل ہوا۔ چنانچہ لکھنؤ سے کلکتہ تک چلے جائیے اب بھی آپ کو معلوم ہوگا۔

یاں سے گزرا ہے ابھی اک باتجمل کارواں!

یہ تاریخ کی دھندلی سی فضا تھی جس میں، میں نے مٹتے ہوئے نقوش کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اب مٹتی ہوئی تہذیب وتمدن کے سوگواروں پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

قدیم اور جدید دور حکومت کے اور اس میں قدیم ہندو زمانہ سے لے کر صرف عہد مغلیہ تک کی سلطنت اور تمدن کے نشیب وفراز شامل ہیں۔ علم بردار وارث یا مرثیہ خواں کی حیثیت سے یو پی والوں کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مٹتے ہوئے تمدن کے آثار باقی سے تعبیر کیے

جاسکتے ہیں۔ سرحد یا ساحل سے دور ہونے کے سبب سے نو وارد اقوام سے ان کا سابقہ یک بہ یک نہیں ہوتا تھا اور فوری تغیرات کا اثر ان تک بہت کم پہنچتا تھا۔ یہ لوگ صرف ان اثرات کے حامل ہوتے تھے جو تمدن میں اچھی طرح راسخ ہو چکے ہوتے تھے۔ اس بیان کی تصدیق اس وقت ہو سکتی ہے جب آپ ان مقامات کا جائزہ لیں، جن کا جغرافیائی اعتبار سے حملہ آور اقوام سے سب سے پہلے اور سب سے بعد سابقہ پڑتا ہے۔ چنانچہ اب دیکھیں گے کہ ان مقامات کے لوگ یا تو ہر نئی قوم میں گھل مل جاتے تھے اور یہ صحیح اور صالح تمدن کے عین منافی ہے یا اگر جغرافیائی اعتبار سے دور دراز مقام پر واقع ہوئے تو پھر ان کا کسی خاص تمدن سے سابقہ ہی نہ پڑتا تھا۔ جس کا اثر و انجام یہ ہوتا کہ ان کا تمدن فرسودہ ہو کر بے جان ہو جاتا۔

اس کی تشریح پانی کے قدرتی دھارے سے بھی دی جاسکتی ہے۔ جب کوئی دھارا پہاڑ سے برآمد ہو کر میدان کی طرف بڑھتا ہے، تو اس میں بڑا زور ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سنگ ریزوں کا انبار اور خس و خاشاک کا طومار ہوتا ہے۔ دھارا اپنی پوری قوت اور ان تمام لوازم کے ساتھ آگے بڑھتا ہے تو اپنا راستہ خود بنالیتا ہے اور نشیب و فراز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد جب سطح میدان میں داخل ہوتا ہے تو اس کا زور کم ہو جاتا ہے۔ سنگ ریزے اور خس و خاشاک تہ نشین ہو جاتے ہیں، اور اس کی رفتار ہموار و متوازن ہو جاتی ہے۔ یہی حالت نئی اقوام اور ان کے تہذیب و تمدن کی ہوتی ہے جو ملک یا اقوام نئی تہذیب یا تمدن کی سب سے پہلی ٹکر سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ تمدن کے اعتبار سے ہمیشہ متغیر اور منقلب ہوتی رہتی ہیں۔ دراصل ان کا کوئی تمدن نہیں ہوتا۔ یو پی کی مثال اس میدان کی سی ہے جہاں پہنچ کر تمدن کے دھارے سنگ ریزے اور خس و خاشاک سے پاک ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال افریقہ کی بعض ان جھیلوں سے بھی دی جاسکتی ہے جن میں نئے دھارے جوش و خروش سے گرتے ہیں۔ لیکن جھیل کی دوسری سمت سے دوسرے دھارے سکوت اور سلامت روی کے ساتھ برآمد ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میری اس سنجیدہ تابی یا نثر گفتاری سے اُکتانے لگے ہوں گے، لیکن مجھے یقین ہے کہ ان مثالوں کے بغیر بعضوں کو یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا کہ یو پی کے لوگ کیسے ہیں، ان کا تمدن کیا ہے اور ان کی سیرت کے خصائص کیا ہیں۔

یو پی کے لوگوں میں آپ سب سے بڑی خوبی یا خرابی یہ پائیں گے کہ وہ وضع دار زیادہ ہوتے ہیں یا یوں سمجھ لیجیے کہ وہ بحیثیت ایک کلاس یا جماعت کے اسلاف کی روایات اور ان کے کارناموں کو وقتی مصالح یا مفاد سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ ہوا کے رُخ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی کے ان چیزوں کو جو ہوا کی زد میں ہوتی ہیں۔ یہ صفت معقول بھی ہے اور نامعقول بھی۔ وہ زمانہ کے رجحانات سے کم اور نسبتاً بہت دیر میں متاثر ہوتے ہیں۔ تاوقتیکہ زمانہ المجز کے رجحانات خود ان کے رجحانات سے کم وبیش متوازن یا ہم آہنگ نہ ہو پائیں۔ ان کی طبیعت کی یہ افتاد ان کو زمانہ کے بعض ترقی پذیر صلاحیتوں سے یا تو بالکل مستفید نہیں ہونے دیتی یا بہت دیر میں مستفید کرتی ہے۔ یو پی کی اس سُست روی یا سلامت روی پر چاہے ہنس لیجیے یا ان کا ماتم کیجیے۔ ہندوستان کا اصلی تمدن اور اس کا وزن اور وقار یو پی کی اسی دیر آشنائی اور کم گیری سے وابستہ ہے۔ جس پر دوسرے حصہ ملک والے پہلے ہنستے ہیں، اور بعد میں اس کی تقلید کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اسے معزز بھی گردانتے ہیں۔ جیسا میں نے اشارتاً بطور اصول پہلے عرض کیا تھا۔ یہ باتیں یو پی کے اس حصہ میں زیادہ پائی جاتی ہیں، جو دہلی سے نسبتاً دور واقع ہے۔ مثال کے طور پر میں پورب یا اضلاع مشرقی کو پیش کروں گا جن میں لکھنؤ بھی شامل ہے۔ وہ لکھنؤ جس کے بارہ میں میر نے کہا تھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو![1]

ملکی تحریکوں میں جہاں تک ہندوستان کے سرداروں کا تعلق ہے، با استثناء چند میرا ذاتی خیال ہے کہ یو پی کے لوگوں کی نظر کا افق زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ وہ صوبہ جاتی حقوق یا مراعات پر

1
کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویرانہ کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

بہت کم جھگڑتے ہیں، ورنہ عام طور پر میں نے یہ دیکھا ہے کہ دوسرے صوبہ والے آل انڈیا قسم کے مسائل کی اہمیت کو مقامی اور صوبہ جاتی حقوق کے مقابلہ میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یو پی والے ہر مسئلہ کے نشیب و فراز کو نسبتاً زیادہ رواداری اور وسیع النظری سے پرکھنے کے عادی ہیں۔ جاہ و دولت، امارت و سربلندی سے وہ کچھ اس طور پر سیر ہو چکے ہیں کہ ان کو ان کے حصول میں مقررہ سطح سے نیچے اُترنے میں بہت تامل ہوتا ہے۔ مسابقت کے میدان میں یہ رویہ کامیاب نہیں ہوتا اور دنیائے عمل میں یہ طریقۂ کار کبھی مفید نہیں، لیکن یو پی والے اپنی خصوصیت کو ابھی زائل نہیں کر پائے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جہاں تک کسی زبان کے تلفظ کا تعلق ہے۔ ہندوستان کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں یو پی کے لوگ زیادہ صحیح تلفظ کرنے پر قادر ہیں اور میں کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ یہ فیض کچھ اس زبان کا ہے۔ جو یو پی میں بولی جاتی ہے اور جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی خراد پر چڑھا کر ہموار اور سبک بنا لیتی ہے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول کرنے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتی ہے۔

یہ باتیں تو پڑھے لکھے بے روزگاروں جیسی ہوئیں، جن سے مجھے اندیشہ ہے کہ آپ گھبرانے لگے ہوں گے۔ اب کچھ گھریلو باتیں ہونی چاہئیں۔ یو پی میں عام قاعدہ ہے کہ محلّہ کا سب سے بڑا بوڑھا محلّہ کا سردار ہوتا ہے۔ اب سے پہلے جو لوگ نوکریاں کرتے یا کوئی اور پیشہ اختیار کرتے وہ پنشن لے کر یا کاروبار سے منہ موڑ کر گھر بیٹھتے تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا کہ وہ محلّہ کے چھوٹے بچوں کو گھیر کر اپنے یہاں بٹھا لیتے، ان کو تعلیم دیتے اور ان کے اخلاق کی نگہداشت کرتے۔ شادی ناتے میں بھی ان کی صلاح لی جاتی، لوگوں کے یہاں شادی غمی کے موقع پر یہ ان کے یہاں پہنچ کر انتظام کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتے۔ ان کی منظوری یا منشا بغیر نہ میت اُٹھائی جاتی نہ دُلہن کا ڈولا۔ لوگ عید یا تہوار منانے کے لیے نکلتے تو پہلے محلّہ کے سردار کے یہاں حاضر ہوتے اور اسی کی سرکردگی میں تہوار مناتے باہر جاتے۔ محلّہ کے سردار کی موجودگی یا منظوری کے یہ معنی تھے کہ کام ٹھیک ہوا اور اس میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ یو پی کے شرفا میں دستور ہے کہ گھر کا بڑا ہمیشہ مردانے میں رہے، وہ ہمیشہ کھانا باہر کھائے گا اور گھر میں جو کچھ موجود

ہو یا بھلی بُری چیز پکی ہو، وہ باہر بھیج دی جائے گی۔ جہاں صاحب خانہ ان تمام لوگوں کے ساتھ کھائے گا جو اس کے یہاں بحیثیت مہمان یا ملاقاتی مقیم یا اس وقت موجود ہوں۔ صاحب خانہ صرف رات کو زنان خانہ میں جائے گا۔ وہ بھی اس وقت جب باہر کے سب لوگ کھا پی کر رُخصت ہو جائیں یا آرام کرنے لگیں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے وہ باہر نکل آئے گا۔ پورب میں رئیس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر وقت مکان پر موجود ہو اور جو لوگ اس کے گھر آئیں، ان کی خاطر مدارات کرے۔ ان کی ضروریات کا کفیل بنے اور ان کی عزت کرے۔ وہاں یہ بات معیوب ہے کہ لوگ کسی کے گھر جائیں، اور وہ زنان خانہ میں ہو۔ اسے گھر کے سردار کی حیثیت سے ہمیشہ مردانے میں ملنا چاہیے۔ قصبات اور دیہات میں ہر اجنبی سرائے میں جانے یا بھٹکنے کے بجائے سیدھا بستی کے سردار کے پاس جائے گا۔ قیام کی کوئی مدت نہیں ہے۔ وہ صاحب خانہ کے ساتھ خورد نوش میں شریک ہوگا۔ ہنسی مذاق، سیر و شکار سب کا ساتھی رہے گا۔ یو پی کے رؤسا میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو مقروض نہ ہو اور جس کی جائداد تباہ نہ ہو چکی ہو۔ لیکن ان کی وضع داری میں ابھی بہت کم فرق آیا ہے۔ یو پی میں یہ چیز نہایت معیوب سمجھی جاتی ہے کہ کوئی ملنے والا پانی مانگے اور اس کو صرف پانی دے دیا جائے۔ گھر میں روکھا پھیکا جو کچھ ہوگا وہ پیش کیا جائے گا۔ جس کو چکھ لینا آداب مہمان میں سے ہے۔ آپ کسی کے یہاں جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ آپ یکہ یا تانگہ کا کرایہ خود ادا کریں یا اپنے گھر وہاں کے تحائف لے جائیں تو اس کی قیمت خود ادا کریں۔ یہ میزبان کا حق ہے جس کو وہ حتی المقدور ضرور بجالائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یو پی کا ایک حصہ میں نے ایسا بھی پایا ہے اور یہ پورب سے بہت فاصلہ پر ہے۔ جہاں بڑے بڑے رئیس بھی کھانا یا چائے کے وقت حاضرین کو چھوڑ کر اُٹھ جائیں گے اور کھا پی کر واپس آ جائیں گے۔ یہی نہیں بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو صرف ایک پیالی چائے خود منگا کر پی لیں گے اور حاضرین میں سے کسی سے اخلاقاً بھی نہ پوچھیں گے کہ وہ شریک ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ایک صاحب کے وسیع دسترخوان پر تو میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ صاحب خانہ اور معززین کے لیے کھانے رکھے گئے اور ہریجن قسم کے شرکا کو گھٹیا قسم کے کھانے پیش کیے گئے۔ پورب والے یہ سُن کر یقیناً بدحواس ہو جائیں گے۔

یو پی سے نئی تحریکیں بہت کم شروع ہوئی ہیں اور نئی تحریکوں کو یہاں فروغ بھی کم ہوتا ہے۔ لیکن جس تحریک کو یو پی والے قبول کر لیں اس میں وزن اور وقار ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ چیز بغیر عمر طبعی تک پہنچے مرتی مٹتی نہیں۔ یہاں والوں پر جمود اور ایک طرح کی افسردگی ضرور طاری ہے اور اُن کو ہر جدید چیز لذیذ نہیں معلوم ہوتی۔ اُن کے شعر و ادب کا بھی یہی حال ہے لیکن ان کے دل و دماغ ٹھٹھرے نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان پر جیسی جیسی مصیبتیں نازل ہوئیں، اور جیسے جیسے دن انھیں دیکھنے پڑے ہیں، ان سے ہندوستان کے دوسرے حصہ ملک والوں کو بہت کم سابقہ پڑا ہے۔ تمدن کے مختلف مدارج میں مصائب کی تلخی بھی مختلف درجہ کی ہوتی ہے۔ ایک آفت نیم متمدن جماعت کے لیے برائے نام تلخ ہو سکتی ہے، لیکن وہی آفت نہایت درجہ متمدن جماعت کے لیے نہایت درجہ المناک ہو جاتی ہے۔ یو پی والوں کی حالت اور حیثیت کو اسی معیار سے جانچنا پرکھنا چاہیے۔

آخر میں میرؔ کی حزیں فریاد کسی قدر تغیر کے ساتھ ایک بار اور سُن لیجیے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو مغرب کے ساکنو　　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

یو پی جو ایک خطہ تھا عالم میں انتخاب　　　ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

لیکن شاید وہ دن بھی دور نہیں ہے جب آپ کسی یو پی والے ہی کے بارہ میں کہہ اُٹھیں گے۔

''ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی''

(نشریہ)

●●●

شراب کی ممانعت

ایک بڑے شہر میں حکومت نے شراب کی ممانعت کردی ہے۔ گوشہ گوشہ میں اس پر رائے زنی ہورہی ہے۔ ہر طرح کی حرکتیں کی جارہی ہیں، جو لوگ شراب کے عادی تھے وہ خم کے خم لنڈھارہے ہیں۔ جو نہیں پیتے تھے وہ بھی تھوڑا بہت چکھنے اور بہت کچھ بہکنے لگے ہیں۔ شراب کے دام اور پینے والوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک پبلک جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔

ایک شخص ڈائس پر کھڑے ہو کر منہ سے بھونپو لگائے آواز دیتا ہے۔ ''صاحبو خاموش ہوجایئے، جلسہ کی کارروائی شروع ہوگی اور صدر کا انتخاب ہوگا۔''

دوسرے صاحب کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے تالیاں اور لفنگوں نے بغلیں بجائیں۔ شوروشغب کم ہوا تو آواز آئی۔

بھائیو، بہنو!

ایک آواز کسی قدر ماتمی لہجہ میں:

ماؤ بہنو بیٹیو!

عام قہقہہ۔

پہلی آواز: بھائیو بہنو!

ایک آواز: ارماں، حضرت آدم کو گزرے اتنے دن ہو گئے اب تک رشتوں میں کوئی فرق ہی نہیں پیدا ہوا، آخر اور بھی تو رشتے ہیں۔ وہ کس موقع پر یاد کیے جائیں گے۔

دوسری آواز: واہ برخوردار واہ کیوں نہ ہو۔

پہلی آواز: خاموش ہو جاؤ، صاحبو، خاموش ہو جاؤ۔ بالکل گم سُم۔

دوسری آواز: وگرنہ بھائیو کھاؤ گے جوتی تم۔

عام قہقہہ (مجمع میں خاموشی)

مقرر: ''آج کا جلسہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ ہے۔ ہم کو نہایت دلیری اور خلوص کے ساتھ قدم اُٹھانا چاہیے۔ ورنہ ہم تمام عمر پچھتائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس جلسہ کا صدر ایسے شخص کو ہونا چاہیے، جس پر ہم کو پورا بھروسہ ہو........''

(مجمع میں کسی قدر ہلچل)

ایک آواز: جناب ہم کو کسی پر بھروسہ نہیں ہے۔ ہم کو صرف اپنے آپ پر بھروسہ ہے۔

دوسری آواز: یہی وجہ ہے کہ ہم تمام عمر نہیں پچھتائے۔

تیسری آواز: بیٹا شراب بند ہو گئی تب تو پچھتاؤ گے۔

چوتھی آواز: بے ایمان!

بہت سے لوگ: شاباش شاباش، زندہ باد!

(قدرے سکوت وسکون)

مقرر: اس لیے میں تجویز کرتا ہوں کہ اس جلسہ کے صدر مولانا.....''

(اکٹھی آوازیں)

''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ ان کو کیا معلوم ہم کو کس لذت سے محروم کیا جا رہا ہے۔''

ایک آواز: (ذرا گا کر) ارے ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے!

ایک دوسرے بزرگ ڈائس پر کھڑے ہو کر فرماتے ہیں۔

''میری تجویز یہ ہے کہ آج کے جلسہ کی صدارت شری متی........''

ایک آواز: (آہ سرد کے ساتھ) چھٹتی نہیں ہے، منہ سے یہ کافر لگی ہوئی!

مجمع: اُف!

ایک بے فکرا: (گا کر) ہائے جوانی وائے جوانی۔

ایک بہت موٹا آدمی آپے سے باہر ہو کر:

''گنڈا، چور، شریفوں کو نہیں پہچانتا۔''

دوسرا بے فکرا: شریف ہوتے تو شراب ہی کیوں بند کی جاتی۔

تیسرا بے فکرا: تو روتا کیوں ہے۔ جلسہ کر کے کہیں شراب بند کی جاتی ہے۔

(ایک آواز ڈائس پر سے)

''میں تجویز کرتا ہوں کہ آج کے جلسہ کے صدر بھٹی سیٹھ ہوں۔
انھوں نے شراب کے کاروبار میں لاکھوں کا نقصان اُٹھایا ہے۔''

ایک آواز: اور اس سے زیادہ سٹے میں مارا ہے۔

دوسری آواز: میری رائے ہے کہ یہ جلسہ چوں کہ عام مشورہ کا ہے، اس لیے کسی صدر کی ضرورت نہیں۔ صدر کے موجود ہونے سے لوگوں کو شرافت و سنجیدگی برقرار رکھنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔

ایک بے فکرا: ارے بھائی کسی مسخرے کو اڈے پر آ تو جانے دے، جب تک ڈائس پر پھولوں سے لدا پھندا کوئی بے وقوف نظر نہیں آتا اس وقت تک نہ پیٹ دینے کی اُمنگ ہوتی ہے اور نہ پٹ جانے کا حوصلہ!

(تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہیں)

(مجمع نے یک لخت پکارا۔ ''وہ مارا'' کیسا پھنسا ہے، چڑا گلخیر وا!)

ایک آواز: اور کیوں حضرات، یہ بزرگ کہاں براجمان ہیں۔ آدھی رات تک تو شراب خانہ میں رہے اور بقیہ رات پولیس کی چوکی پر پٹتے رہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی بُرے دن گئے نہیں ہیں۔

دوسری آواز: صدارت کی تجویز تو میں نے پیش کی تھی اور یہ میرے دوست جو قریب بیٹھے ہوئے ہیں انھوں نے تائید پر آمادگی بھی ظاہر کی، لیکن بقیہ دوستوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہ بغیر تائید کے ہی اچھے رہیں گے۔

تیسری آواز: ٹھیک تو کہتے ہیں۔ دیکھو بغیر تائید کے عین مین صدر معلوم ہوتا ہے —— ڈیوٹ پر بھالو!

چوتھی آواز: بالکل درست! دیکھوں تو کون سور ما تائید کرنے اُٹھتا ہے اور کون اُن کو صدارت سے اُتارتا ہے۔

(مجمع میں شور وغل، نکالو، مارو، ٹوپی اُتارلو، بغیر تائید کے کرسی پر بیٹھ گیا ہے)

ایک صاحب: (کسی قدر چونک کر پاس والے آدمی سے) کیوں بھئی کیا بات ہوئی۔

دوسرا: کوئی بات نہیں۔ دعا مانگی گئی، آمین کہنے والا نہ ملا۔

پہلے صاحب: استغفر اللہ۔

ایک آواز: جناب دیکھئے دخل فصل ٹھیک نہیں۔ اس جلسہ کا صدر بغیر تائید کے ہوگا۔

دوسری آواز: ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ تائید چہ کتیست!

جناب صدر: ہرگز نہیں، میں بغیر تائید کے صدر بننا نہیں چاہتا۔ چاہے آپ کی شراب نوشی قائم رہے چاہے جہنم میں جائے!

دور سے ایک چورن والے کی صدا: میرا چورن ہے انو وان، جس کو کھائیں ہندو مسلمان ارے میں تائید کرتا ہوں، میں۔

(بلند آواز سے گھنٹی بجاتا ہے اور صدا لگاتا ہے)

میرا چورن ہے انو وان اس کو کھائیں ہندو مسلمان

پھر گھنٹی بجاتا ہے۔ میرا چورن ہے انو وان!

مجمع: (لو بھئی وہ تائید بھی ہوگئی۔ صدر صاحب کے آنسو بھی پُنچھ گئے)

(مبارک سلامت کا شور)

(مجمع میں خاموشی)

صدر: خیر۔ آپ بزرگوں کے اصرار سے میں صدارت تو قبول کر لیتا ہوں، لیکن آپ اتنا سمجھ لیں کہ آئندہ سے گھنٹی بجانے کا حق کسی چورن والے کو نہ ہوگا۔ یہ حق کلیتہً صدر کا ہوگا اور نہ ایسے قومی جلسوں میں چورن پر نظمیں پڑھی جائیں گی۔

(جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی)

(ابھی چوں کہ صدر صاحب اپنی نالائقی اور قوم کی مردم ناشناسی پر اظہار قابلیت فرما رہے ہیں، اس لیے انھیں یہیں چھوڑیے۔ اس درمیان میں آیئے، میں آپ کا تعارف ان حضرات سے کراؤں جو مجمع میں جہاں تہاں بجائے خود جلسہ یا صدر جلسہ بنے بیٹھے ہیں۔

ایک آواز: ہائے کیا چیز حرام ہوگئی ہے۔

دوسرا: زندگی حرام ہوگئی۔ میاں زندگی، کھانا پینا سب حرام۔ حلال بھی حرام ہوگیا۔

تیسرا: حرام خور۔

چوتھا: ارماں شراب کس نے بند کی ہے (آسمان کی طرف دیکھ کر) وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔

پانچواں: جن میں کسٹم اور پولیس والے بھی شامل ہیں۔

ایک آواز: بھائی میں نے تو اسے کلیجہ سے لگا رکھا ہے۔

دوسرا: ارے تو کس دن کے لیے لگا رکھا ہے، نکال بھی۔ وہ دیکھ آسمان سے برسنے والی ہے۔

(شراب کی بوتل نکالی گئی)

آوازیں: (۱) مرحبا مرحبا، جیسی دُلہن حجلۂ عروس سے برآمد ہو رہی ہو۔

(۲) جیسی بہادر کی تلوار نیام سے نکل آئی ہو۔

(۳) جیسے گہن سے چاند نکلا ہو۔

(۴) جیسے صدف سے موتی۔

(۵) جیسے آتشِ نمرود۔

(۶) جیسے شباب کا خواب۔

ارے ختم بھی کرو، آؤ دو دو گھونٹ لے لیں۔ چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند!

(دوسرے گوشہ میں)

ایک: بھائی ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

دوسرا: تمھارے لیے یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے!

پہلا: دیکھو جی، بیچ میں مت بولا کرو۔ میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ شراب کی ممانعت کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی!

دوسرا: بات یہ ہے کہ حکومت نام ہے، انتہائی احکام نافذ کرنے کی قوت کا...''

پہلا: دیکھو جی، تمہارے ہی جیسے پڑھے لکھوں جیسی گفتگو کرنے والوں کے سبب سے تو یہ بُرے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ بات بھلے مانسوں جیسی کہا کرتے ہیں۔

ایک آواز: بالخصوص، جب شراب کا ساتھ ہو۔

دوسرا: اچھا تو پھر یہ سمجھ لو کہ شراب میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ساری خرابی شرابیوں میں ہے۔

تیسرا: جیسے مذہب میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ سارا فساد مذہب والوں کا ہے۔

چوتھا: ملعون!

پانچواں: اسے ہندستانی میں کیا کہتے ہیں۔

چھٹا: یہ اصطلاحات علمیہ ہیں۔ ان کا ترجمہ ہندستانی میں نہیں کرنا چاہیے۔

ساتواں: ارے یہ کہاں کا جھگڑا شروع کر دیا۔ ہندستانی خود اصطلاح ہے اس کے چکّر میں تو پڑنا ہی مت!

جناب صدر کی آواز آتی ہے۔

''آج ہندوستان کی آزادی کا پہلا دن ہے۔ جب ہم شراب کی لعنت سے آزاد ہوں گے۔''

ایک بدمست کی آواز: ساقیا جب تک چلے ساغر چلے۔

دوسری آواز: بھیجے جاؤ لعنت، پنڈال سے نکلو گے تو معلوم ہوگا۔

پولیس کا سپاہی: خبردار حوالات بھیج دیے جاؤ گے۔ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

ایک آواز: جمعدار، چڑھی معلوم ہوتی ہے۔

سپاہی: ابے ہماری ہمیشہ چڑھی رہے گی۔

آواز: (بوتل بڑھاتے ہوئے) یہ لو پوری چڑھا لو۔

سپاہی: جیتا رہ۔ چین کی بنسی بجائے جا۔

صدر کی آواز۔

''اس لعنت نے ہندوستان کو کہیں کا نہیں رکھا۔ عورتیں تباہ ہیں، بچے بلبلا رہے ہیں اور جوان کسی کام کے نہیں رہے.....''

ایک بھاری بھرکم آواز: جزاک اللہ، جزاک اللہ۔

دوسری آواز: بولے جاؤ، عربی اور کھائے جاؤ جوتا۔

تیسری آواز: رام رام کیسے دشٹ لوگ ہیں۔

صدر کی آواز۔

''اے بھارت ماتا کے سپوتو، کیا تم یہ دیکھنا پسند کرو گے کہ عورتیں تباہ ہوں، مرد برباد ہوں اور بچے بے کس ہو جائیں.....''

اک آواز: (آہ سرد کھینچ کر) دیکھنے کی جو چیز ہے، وہ دیکھی ہی جائے گی۔

دوسری آواز: ارے بھائی کیا دیکھ رہا ہے۔ ذرا مجھے بھی تو بتا۔

پہلی آواز: بالکل گاؤدی ہو، دیکھنے ہی کی چیز دیکھی جاتی ہے۔ ہائے

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا

اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

دوسری آواز: ارے ہاں بات تو ٹھیک کہتا ہے۔ ارے عین سینما! اور وہ گدھا کون ہے۔ جو پاس ہی سر جھکائے بیٹھا ہے۔

تیسرا: آداب و اخلاق تو شوہروں جیسا معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا: شکل سے کچھ اور بھی معلوم ہوتا ہے۔

ایک آواز: یعنی چہ۔

دوسرا: بالکل چور۔

تیسرا: چور ہی چور۔

چوتھا: چپل ہی چپل۔

ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ (شکریہ) ●●●

امتحانات

ادھر اُدھر کی باتوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے اس میں نہ تو کہنے والے کو اس کی فکر ہوتی ہے کہ وہ کیا کہتا ہے اور نہ سننے والے کو اس کا غم کہ اسے کیا سننا پڑا۔ لیکن کہنے والے کے لیے یہ دقت ضرور ہے کہ جب اس کو ہر قسم کی باتیں کہنے پر آزاد کر دیا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، اور یہ اس لیے کہ اکثر کہنے والی باتیں وہی ہوتی ہیں جن کو نہ کہنا چاہیے اور آپ تو جانتے ہیں ناگفتنی باتیں کتنی دلچسپ ہوتی ہیں۔ کہنے کو تو میں سب کچھ کہہ ڈالوں اور اس میں شک نہیں کہ آپ انھیں سُن کر خوش بھی اچھے خاصے ہو لیں گے۔ لیکن اسی سلسلے میں میرے دن بُرے آئیں گے تو آپ ہی میرے قتل کے محضرنامے پر سب سے پہلے دستخط کریں گے۔ چنانچہ اب مجھے یہ سوچنا پڑ رہا ہے کہ کون کون سی باتیں نہ کہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اس کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتا کہ کون سی باتیں ایسی ہیں جن کے کہنے سے دوسروں کا مچلکہ یا ضمانت لی جاسکتی ہے، اور کون سی ایسی ہیں جن سے خود براہِ راست میرا چالان ہو سکتا ہے۔ بات کوئی نہیں فیصلہ صرف شیخ جی کے دو بیٹوں میں ہے۔ جن کے بارہ میں اکبر مرحوم کہہ گئے ہیں۔

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے ایک ہیں خفیہ پولس میں، ایک پھانسی پا گئے

پھر مشکل یہ ہے کہ میں دوسروں کے خفیہ پولیس میں ہونے اور اپنے پھانسی پا جانے دونوں سے ڈرتا ہوں اور یہی دقت ہے، جس کے سبب سے میں نے اپنا اور آپ کا وقت ضائع کیا ہے۔

اسی قسم کی حرکتوں کو شرفا تمہید اور پہلوان پیترا کہتے ہیں۔ ان دنوں میرا سابقہ امتحان کی کاپیوں اور بڑے آدمیوں سے زیادہ رہا ہے۔ ان دونوں کی اہمیت کا اندازہ تو غالباً آپ کر ہی سکتے ہیں۔ امتحان کی کاپیوں سے انسان میں فربہی آتی ہے، اور بڑے آدمیوں کے فیض صحبت سے انسان اپنی نظر میں سبک ہو جاتا ہے۔ اب آپ ہی فرمائیے، آپ ایسے شخص کے بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں جو فربہ بھی ہو رہا ہو اور سبک سر بھی۔ سبک سر تو میں نے جلدی میں کہہ دیا ہے، میرا مطلب نامعقول سے تھا۔

امتحان بھی عجیب غریب شے بنائی گئی ہے۔ عجیب یوں کہ اس میں عجیب کا سابقہ غریب سے پڑتا ہے۔ یعنی امتحان دینے والوں کا امتحان لینے والوں سے۔ میرا خیال ہے کہ امتحان صرف ایک وسیلہ ہے، جس سے طلبا یا اُمیدواروں کی نالائقی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی امتحان لینے والوں کی بھی قلعی کھل جاتی ہے۔ بعض ممتحن صاحبان ایسے سوالات دریافت کرتے ہیں جن کا جواب وہ خود نہیں دے سکتے۔ ایک ممتحن صاحب نے ایک عبارت ایسے صفحہ سے اخذ کی تھی جس کے بعد کے کئی صفحات کتاب سے غائب تھے۔ انھوں نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا کہ صفحات مسلسل ہیں یا نہیں، یا عبارت میں کوئی ربط بھی ہے یا نہیں۔ لڑکوں نے اپنی انتہائی ذہانت صَرف کی، لیکن مشکل یہ آن پڑی تھی کہ عبارت شروع ہوئی تھی ایک مشہور لیڈر کی سوانح عمری سے، اور ختم ہوئی تھی اس موقع پر جہاں ہر شخص کو خوش رکھنے کے لیے باپ بیٹے اپنے گدھے سے خوش فعلیاں کرتے کرتے غریب گدھے کو ایک ندی میں غرق کر چکے تھے۔ ممتحن کو نہ لیڈر سے سروکار ہوتا ہے اور نہ وہ گدھے کا یار ہوتا ہے۔ اس لیے مجبوراً اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو بدنصیب لیڈر یا غریب گدھا کرتا، یعنی شبہ کا فائدہ وہ خود اُٹھاتا ہے اور اُمیدوار کو تھرڈ ڈویژن کے نمبر دے دیتا ہے۔ اس بنا پر نہیں کہ جواب صحیح تھا، بلکہ ایک بڑے آدمی کو ایک غریب جانور سے ہم آہنگ رکھنے پر ان دونوں کے مجموعے یعنی اُمیدوار کو کیسی کیسی دِقتیں نہ جھیلنی پڑی ہوں گی۔ حال میں ایک پرچہ میں بدقسمتی سے حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ پاس ہی پاس واقع تھے۔ ان بزرگوں کی موجودگی میں عصا اور قم باذنی اور لن ترانی وغیرہ کہاں جاتے۔ چنانچہ بعض اُمیدواروں کے جوابات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہو گئے تھے۔ مثلاً:

حضرت عیسیٰ ایک پیغمبر تھے جن کا تخلص قم باذنی تھا

دوسرے صاحب فرماتے ہیں، عصا ایک پیغمبر تھے، جو اپنی لاٹھی مردوں پر پھیر دیتے تھے تو وہ لن ترانی پڑھنے لگتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے پاس ایک لاٹھی تھی، جس کا نام ید بیضا تھا۔ ایک شعر میں آہو گیر کا لفظ آیا تھا۔ جسے ایک صاحب نے رد ہو گیر پڑھا۔ چنانچہ صفحے کے صفحے رد ہو کے خواص اور ترکیب استعمال پر رنگ دیے۔ ایک مقام پر ٹھیٹھ لغت کا فقرہ تھا۔ ہمارے ایک منچلے دوست نے لغت کو لغو کے بھائی بندوں میں شمار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے لغویت کے اصلاح میں قریب قریب نصف صفحے سیاہ کر ڈالے۔ امتحانات کے سلسلے میں اس قسم کے لطائف ظرائف بے شمار ملیں گے۔ لیکن ان میں خود اُمیدواروں کے کارنامے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک بار میرے ایک مکرّم بزرگ جو سن و سال کے اعتبار سے آپ لوگوں کے بھی اچھے خاصے بزرگ ہو سکتے ہیں۔ تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ بھئی ایک بات کہوں اگر مان جاؤ۔ میں نے کہا، ضرور ارشاد ہو۔ آخر میں میری زندگی کا مقصد ہی کیا رہ گیا ہے۔ بہت ساری تمہید کے بعد فرمایا۔ فلاں مقام سے میرے مرحوم دوست کے دولڑکے امتحان میں شریک ہیں۔ یقین مانو میں نے ایسے سعادت مند نہیں دیکھے ہیں۔ کہتے تھے پرچہ خراب ہوا ہے۔ اگر پاس نہ ہوں گے تو خودکشی کر لیں گے۔ میں نے کہا، مولانا خودکشی اوّل تو کوئی بُری بات نہیں ہے، لیکن خرابی یہ ہے کہ اگر میں انھیں خودکشی سے باز رکھنے کی کوشش کروں تو پھر آپ مجھے جیل خانے بھیجے جانے سے کیسے باز رکھ سکتے ہیں۔ کہنے لگے، یہ کیوں کر۔ میں نے کہا، حکام بالادست کو اطلاع ہو گئی تو زن و فرزند سمیت جیل خانے بھیج دیا جاؤں گا۔ کہنے لگے، بالکل غلط زن و فرزند سمیت لوگ جیل خانے نہیں جاتے۔ کولھو میں بیل ڈالے جاتے ہیں۔ میں نے کہا، مولانا یہ اگلے زمانہ میں ہوتا تھا۔ اب زن و فرزند سمیت کولھو میں نہیں پیلے جاتے۔ بلکہ اُن سے کولھو پلوایا جاتا ہے۔

پھر یہ سب واقعہ نہ ہو نہ سہی، حسنِ کلام تو ہے۔ جس سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ فرمایا، واللہ اعلم۔ لیکن زن و فرزند سمیت میں نے کسی کو جیل خانے جاتے نہیں سنا۔ میں نے کہا، ممکن ہے آپ نے نہ سنا ہو، لیکن اس سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہو گا کہ جیل خانے میں فرزند ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زن کسی کی ہو، فرزند کسی کے ہوں۔ مولانا مجھ سے کچھ آزردہ سے ہو گئے، اور چلتے وقت دبی زبان سے کچھ ایسے فقرے کہتے ہوئے سنے گئے جو صاف طور پر سمجھ میں

نہیں آئے۔ لیکن اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھے کسی کلمۂ خیر سے یاد نہیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن پھر ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے، بھئی مان گیا بڑے روشن ضمیر ہو۔ اس زمانے میں ایسے لوگ کہاں نظر آتے ہیں۔ میں نے کہا، خیریت تو ہے مولانا۔ آپ تو میرے بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں کہ میرے بیوی بچے سُن پائیں تو مجھے زہر دیے بغیر نہ چھوڑیں۔ کہنے لگے، بھئی ان دونوں نے تو عجیب پاجی پن کیا۔ عشا کے وقت تو دونوں نے میرے ساتھ نماز پڑھی اور کھانا بھی ساتھ کھایا، لیکن فجر کے وقت نماز کے لیے اُٹھا تو دیکھتا ہوں کہ جماعت سے وہی دونوں نہیں غائب ہیں، بلکہ جانماز، لوٹا، تولیہ، جوتے اور دو عدد شیروانیاں بھی غیر حاضر ہیں۔ بے غسلوں نے بڑا چرکا دیا۔ میں نے کہا، مولانا یہ بے غسلے کون ہوتے ہیں۔ کہنے لگے، بس چپ رہو۔ معلوم ہوا تم سب کیسے ہوتے ہو۔ منافق کہیں کے۔ میں نے کہا، مولانا منافق تو سمجھ میں آتے ہیں، گو یہاں منافق کا پرچہ ترکیب استعمال سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن یہ بے غسلے کون ہوتے ہیں۔ کہنے لگے، بس بس مداخلت فی الدین سے باز رہو، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں نے کہا، مولانا یہی تکیے کلام تو ہیں۔ جن کی بنا پر میں آپ کے قتل کو زر فدیہ سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔

ایک بار امتحان کے زمانہ میں علی گڑھ میں تعطیل ہوئی اور میں دور دراز وطن کو چلا گیا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ دو اجنبی اصحاب تشریف فرما ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی امتحان کے مرض میں گرفتار ہیں۔ میں وطن میں تھا اور یہ غریب الوطن، اس لیے بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اخلاق سے پیش آتا۔ لیکن یہ دونوں تیور سے کچھ ایسے خوف ناک کارٹون معلوم ہوتے تھے کہ مجھ پر کچھ ہراس سا طاری ہوا اور مجبوراً اخلاق سے پیش آنے پر مجبور ہوا۔ امتحان کی سخت گیری اپنی مظلومی، قسمت کی ستم ظریفی، موسم کی سختی، مسلمانوں کی کم بختی، غرض کہ اس قسم کے مضامین پر نہایت رقت آمیز گفتگو رہی۔ وہ لقمے دیتے رہے میں سرد آہیں بھرتا رہا۔ آخر میں حرف مطلب زبان پر لائے۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب اس قسم کے مسائل پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے پر میں نے اپنے آپ کو قادر پایا۔

میں نے کہا، میرے دوستو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے، لیکن تم سے زیادہ خود اپنے آپ سے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں ایمان داری اور بے ایمانی کا مفہوم ایک دوسرے سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ ہر شخص کے ایمان کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ جس وقت قیمت لگ گئی ایمان بک گیا۔ دنیا میں کوئی

ایسا نہیں ہے جس کے ایمان کی قیمت نہ لگائی جا سکے۔ یہ اور بات ہے کہ قیمت یا معاوضہ کی نوعیت نہ قائم کی جا سکے، یا قیمت اتنی گراں ہو کہ ادا نہ کی جا سکتی ہو۔ کسی کا ایمان ایک روپیہ میں بک سکتا ہے، کسی کا ایک لاکھ میں۔ ایمان کی قیمت روپیہ ہی سے نہیں بلکہ دوسری چیزوں سے بھی متعین کی جا سکتی ہے۔ اس میں احباب، اعزا، بزرگ، بچے، عورت، مرد کا اصرار، مستقبل کا نفع، حال کا ضرر، ہوس ناکی، فتح مندی، غرض کہ ہر قسم کے عناصر شامل ہیں۔ میں معمولی قسم کا آدمی ہوں اور اس کا دعویٰ بالکل نہیں کرتا کہ میرے ایمان کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ لیکن میں نے زندگی کا ایک اصول قرار دے لیا ہے۔ جس سے منحرف ہونا پسند نہیں کرتا۔ وہ یہ ہے کہ میں جس چیز اور جس بات کی روٹی کھاتا ہوں اس میں رور عایت یا بے ایمانی نہیں کروں گا۔ تم کہو تو شاید میں کسی کو قتل کر آؤں، چوری کروں، جھوٹی گواہی دے دوں، کسی کو لے بھاگوں یا بھگا لے جاؤں۔ اور اس طرح کے دوسرے جرائم کر گزروں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ امتحان کے معاملہ میں رور عایت یا بے ایمانی کو دخل دوں۔ ممکن ہے آئندہ کسی قسم کی بے ایمانی کر جاؤں۔ لیکن جہاں تک آپ لوگوں کا تعلق ہے، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ فی الحال مجھے بے ایمانی کرنے میں کوئی لطف نہ آئے گا۔

میری اس تقریر کو جس میں رقت، جوش اور کسی قدر حماقت کا دخل تھا، ان لوگوں نے صبر سے سنا۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب بولے۔ پروفیسر صاحب آپ کی قیمتی نصائح سے ہم سب بہرہ مند ہوئے۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جس کو زبان تک لانے میں بڑی شرم آتی ہے، لیکن مسلمان بھائی بھائی ہیں اس لیے کہنے میں کوئی عار بھی نہیں۔ میں نے کہا کہ بے تکلف کہہ ڈالیے۔ اس دنیائے دنی میں مسلمان ہونا آخر کس کام آئے گا۔ فرمایا، بات یہ ہے کہ جب گھر سے چلے تو اخراجات سفر صرف علی گڑھ تک کے لیے کافی تھے۔ اب جو یہاں آنا پڑا تو جو کچھ رہا سہا تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ آپ سے کیا تکلف اب واپسی کا خرچ باقی نہیں رہا، اس لیے کچھ امداد ہو جائے تو ہم سب وطن پہنچ جائیں۔

میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ پہلی تقریر میں نے جس ہمت اور قابلیت سے کی تھی اس کے بعد اتنی سکت باقی بھی نہیں رہ گئی تھی کہ اس حادثہ سے جاں بر ہو سکتا۔ چنانچہ پہلے تو میں ذرا بے معنی طور پر پہلو بدلتا رہا، اس کے بعد نہایت ہی بامعنی طور پر ایک آہ سرد کھینچی

اور پھر کافی بلیغ انداز سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اور دیر تک بیٹھا رہا۔ آپ یقین مانیے میں اس طور پر اس وقت تک بیٹھا تھا جب تک کہ پولیس یا غسال اور گورکن مجھے آ کر نہ اُٹھاتے۔ لیکن معاً یہ خیال آیا کہ اگر میں نہ بولا تو یہ لوگ بولنے لگیں گے۔ اس لیے نہایت عجلت سے لیکن سر پکڑے اور سر نیچا ہی کیے ہوئے بولا۔ حضرات آپ تو جانتے ہی ہیں مسلمان بھائی بھائی ہیں، لیکن آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ سوال نے مجھے اتنا بدحواس کر دیا ہے کہ اب مجھے یہ بھی نہیں یاد رہا کہ اس سے قبل میں نے کس قسم کی تقریر کی تھی۔ لیکن واقعہ صرف اتنا ہے اور آپ یقین فرمائیے کہ انسان اپنے آخری وقت میں جھوٹ نہیں بولتا کہ روپیہ فراہم کرنا میرے لیے اس سے کہیں مشکل ہے کہ میں آپ کو پرچہ بتا دوں یا نمبر بڑھا دوں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہم مسلمان بھائیوں کو روپے کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ نمبروں کی۔ آپ نے اپنی دونوں فرمائشات اگر ایک ساتھ بیان کر دی ہوتیں تو آپ یقین فرمائیے، آپ کی پہلی فرمائش پوری ہو جاتی اور مجھے دوسری فرمائش پوری نہ کر سکنے کی ندامت نہ ہوتی۔ لیکن مسلمان بھائی بھائی ہیں، آپس میں تکلف کیسا۔ آپ نے جس خلوص اور بے تکلفی سے اپنی ضروریات کا اظہار کیا، اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ جس بے تکلفی سے میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا ہے اس کی آپ بھی قدر فرمائیں گے۔

امتحانات کا مضمون نہایت رواں اور زرخیز ہے۔ اس زعفران زار کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ لیکن ریڈیو کے اوقات امتحانات کے معینہ اوقات کی مانند محدود ہیں۔ اس لیے اس تقریر کو مختصر کرنا ضروری ہے۔ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ ان دنوں میرا سابقہ امتحانات اور بڑے آدمیوں سے رہا ہے۔ اب مجھے بڑے آدمیوں کے بارہ میں بھی کچھ بیان کرنا ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ یہ ہو رہا ہے کہ کہیں اس تقریر کے سننے والوں میں وہ لوگ نہ ہوں جن کا میں تذکرہ کرتا آیا ہوں اور اب ان کا شمار بڑے لوگوں میں ہو رہا ہے۔

بڑے لوگوں کا تذکرہ کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ بظاہر ہماری ہی طرح ان کے بھی ہاتھ پاؤں آنکھ ناک ہوتے ہیں۔ لیکن ان اعضا کا طریقِ استعمال ان کے ہاں بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا آدمی وہ ہے جو اپنے اعضا کا سب سے زیادہ غلط استعمال کرے۔ مجھے حال ہی میں ایک بڑے آدمی کی پرائیویٹ بیاض ملی۔ جس میں وہ اپنے تجربات نوٹ کرتے

جاتے تھے۔ چوں کہ مجھے بھی بڑا آدمی بننے کی خواہش ہے، اس لیے میں نے ان کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش شروع کردی تھی۔ لیکن پہلے ہی دن مجھے ایسے تلخ تجربہ سے دوچار ہونا پڑا کہ میں نے مجبوراً اپنا ارادہ ترک کردیا۔ میں نے بڑے آدمیوں جیسی ایک بہت معمولی سی بات کی تھی، یعنی یوں ہی کچھ جھوٹ سا بول دیا تھا۔ میرے دوستوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے میری ایسی خبر لی کہ میں نے بڑا آدمی ہونے سے توبہ کرلی اور تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ اگر چھوٹے لوگوں میں بڑے آدمیوں کے کریکٹر کی ادنیٰ سی جھلک بھی آجائے تو چھوٹے آدمی کا اس کے دوست احباب کیا حشر کریں۔ بڑے لوگوں کو دیکھیے کہ ان کے کریکٹر کے بھیانک اور بدبودار سے بدبودار پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہم خاموش رہ جاتے ہیں۔ خاموش ہی نہیں بلکہ مداح اور عقیدت مند بھی۔

میں نے فوراً بیاض کھولی۔ اس میں لکھا تھا جب تک بڑے آدمی نہ ہو جاؤ بڑے آدمیوں کی سی حرکتیں نہ کرو۔ ورنہ عزّت، جان و مال کا خطرہ ہے۔ اس بیاض کے پہلے ہی صفحہ پر لکھا تھا کہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے کہ وہ ہمدردی، سچائی اور بہادری وغیرہ جیسے بے معنی اور پُرخطر الفاظ کا پابند نہ ہو۔ اگر بڑا بننا چاہتے ہو تو بڑی باتیں ترک کردو۔ دنیا کا سب سے بڑا انکشاف جھوٹ ہے۔ جس کے بغیر نہ بڑے آدمی کی جان بچ سکتی ہے اور نہ چھوٹے آدمی کو اطمینان نصیب ہوسکتا ہے۔ بڑا آدمی کسی بُرائی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ اچھائی کی صلاحیت ہی سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد لکھا تھا، بڑے آدمی پرانے دوستوں کے لیے اتنے مفید نہیں ہوتے جتنے نئے دشمنوں کے لیے۔ اس لیے بڑے آدمیوں کو پُرانے دوستوں کی نہیں نئے دشمنوں کی تالیف قلوب کرتے رہنا چاہیے۔

بڑا آدمی کتے سے بھی محبت کرتا ہے لیکن اس کو سمجھتا کتا ہی ہے۔ آخر میں اگر کوئی بڑا آدمی اور کتا دونوں ساتھ ساتھ میری تقریر سُن رہے ہوں تو مجھے معاف کردیں۔

(نشریہ)

●●●

باغ

بیویوں کی مانند باغوں کے بھی اقسام ہوتے ہیں۔ لیکن آپ مطمئن رہیں، میں بیویوں کی تفصیل میں نہ پڑوں گا اور نہ باغ سے باہر ہوں گا۔ باغوں کے اقسام سے میری مراد آم، جامن، لیچی، لوکاٹ قسم کے باغ سے نہیں ہے اور نہ آم جامن لیچی لوکاٹ کو میں عورتوں بیویوں سے کوئی نسبت دینا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب اُن باغوں سے ہے جو مختلف لوگ مختلف مقاصد کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیتے ہیں۔

ایک باغ تو بچوں کا ہوتا ہے۔ یہ کسی درخت کی ٹہنی زمین صاف کر کے لگا دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ کھانا یا مار کھا کر واپس آئیں گے تو ان میں وہ تمام پھل لگے ہوں گے جنھیں یہ خود بہت پسند کرتے ہیں یا جو ان کے حصے میں بہت کم آئے۔ جتنی دیر میں یہ واپس آتے ہیں، باغ سوکھ سوکھ کر برابر ہو جاتا ہے اور یہ دوسرا باغ لگانے لگتے ہیں۔

ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے ایک صاحب ہیں، یہ اس کا مطلق انتظار نہیں کرتے کہ ان کا باغ پھل لائے اور یہ کھائیں۔ بلکہ بعض لیڈروں کی مانند یہ آم گھاس لگا دیتے ہیں اور اپنے حصہ کا پھل جو دوسرے بچوں کی مانند انھیں بھی ملا ہوتا ہے لے کر اپنے باغ میں بیٹھ کر کھاتے ہیں اور اپنے آپ کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ یہ انھیں کے باغ کا پھل ہے! انھوں نے کسی دن مالی کو قلم باندھتے دیکھ لیا تھا، ان کو کیا معلوم قلم کیوں کر لگائی جاتی ہے اور کس کا پیوند کس پر چڑھایا جاتا ہے۔ ایک دن

کیا دیکھتا ہوں کہ بھنڈے پر گلاب کی ٹہنی باندھ کر پاجامہ پکڑے ہوئے کچھ اس انداز سے بیٹھے ہوئے ہیں کہ مجھے کچھ شک ہوا۔ معائنۂ موقع سے معلوم ہوا کہ کمر بند سے قلم باندھ رکھی ہے اور اس فکر میں ہیں کہ گلاب پر بھنڈے نمودار ہوں یا بھنڈے پر گلاب کھلے یا میں گھر سے باہر نکل جاؤں تو یہ اپنے کارنامے کا اعلان کریں۔

میں نے چاہا کہ ان سے کچھ اس قسم کا سلوک کروں جس سے واقعی ان کو وہ ضرورت پیش آ جائے، جس کا اظہار ان کے آداب نشست سے ہو رہا تھا لیکن ۔

'سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا' [1]

لیکن اک ذرا ٹھہریے گا، میں اس امر کی اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ غالب کے اس شعر کو میں جتنا پہلے کبھی پسند کرتا تھا، اتنی ہی زیادہ اب اس سے للّہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک بزرگ نے یہ شعر ایسے بُرے وقت تقریر کے دوران میں پڑھا تھا کہ آپ کو نہیں معلوم مجھ پر کیا گزر گئی۔ تقریر کے دوران میں بے محل یا خواہ مخواہ اشعار پڑھنے والے کو میں نہایت ہی نامعقول آدمی سمجھتا ہوں، اور چوں کہ آدمی بڑا ہوتا ہے اور میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس لیے خود اس شعر سے بغض ہو جاتا ہے۔ میرے لیے یہ کچھ اچھے آثار نہیں ہیں، لیکن آپ ہی انصاف فرمائیے، کیا خود شعر و ادب کے لیے یہ کچھ اچھے آثار ہیں؟

ممکن ہے یہی سبب ہو کہ میں نے بھی یہ شعر بے محل استعمال کیا ہو۔

اچھا ان باتوں کو جانے دیجیے۔ میں نے اصل موضوع کو سر و سنگ کے آس پاس چھوڑا تھا، اور اب نہیں چاہتا کہ آپ زیادہ دیر تک وہاں قیام رکھیں۔ ہاں تو بھنڈے پر گلاب کی قلم چڑھائی گئی تھی اور میں آمادہ فساد ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کیا تعجب یہ وہی ذہنیت ہو جو ہمارے بعض لیڈروں کی ہوتی ہے جو اپنی بدعقلی یا بدنیتی کے سبب قوم اور ملک کے لیے اسی طرح بھنڈے اور گلاب کی قلم بندی کرتے رہتے ہیں اور وقت بے وقت اُس شغل سے بھی گریز نہیں کرتے جس کا بار بار تذکرہ کرنا ممکن ہے اشتعال انگیز ہو۔

---

1 مکمل شعر:

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا — غالب

اس کے علاوہ مجھے اپنا وہ دن بھی یاد آ گیا ہے (اور ہاں یہی وہ موقع تھا جہاں سروسنگ کے سلسلہ میں مَیں نے بعض نامعقول قسم کے اعتراضات کیے تھے) جب میں اسی عمر کا تھا۔ مکان کے پاس ہی ایک ٹوٹی سی مسجد تھی۔ یہی فصل تھی، کچے آم، جامن کھانے پر والدین میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے جس کا تذکرہ کروں تو ماہرین تعلیم کانوں میں اُنگلیاں دے لیں۔ میں نے سوچا کہ آخر بات کیا ہے کہ آم جامن ہمیشہ کچے ہی رہتے ہیں۔ اس لیے انتظام یہ ہونا چاہیے کہ پھل ہمیشہ پکے پکائے ملیں۔ چنانچہ میں نے بہت ساری ٹہنیاں زمین میں گاڑ دیں اور مسجد میں گڑگڑا کر دعا مانگ ہی رہا تھا کہ ان میں پکے پھل آ جائیں کہ گھر والوں کے آنریری فوجدار اور برق انداز پہنچ گئے۔

اس زمانہ میں اس زمانہ کا کوئی قانون تو تھا نہیں کہ غلط افواہ اُڑانے پر سزا دی جائے۔ گھر والوں کو خبر یہ پہنچائی گئی کہ میں نے کچے پھل کھائے۔ ان کی ٹہنیاں میرے قبضہ میں ہیں اور مسجد پر میں نے قبضہ کرلیا ہے۔ حالاں کہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ میں نے کچے پھل ضرور کھائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں ایک ایسی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ وہ بارآور ہو جاتے تو بچوں ہی کو نہیں والدین کو بھی فائدہ پہنچتا۔ مسجد میرے قبضہ میں نہ تھی، بلکہ میں مسجد کے قبضہ میں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا باغ اُجاڑ دیا گیا اور عین دعا کی حالت میں میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا کہ مجھ میں اور بزرگان حبشہ میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔

بچپن کے اس ظاہری باغ کے بارہ میں آپ جو رائے چاہیے قائم کر لیجیے۔ لیکن آخر آپ بھی تو کبھی بچے رہے ہیں، ذرا یہ تو بتایئے یہ ظاہری باغ کس پوشیدہ باغ یا کس تصوّر کی نامکمل اور دھندلی سی تصویر ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت کون کرسکتا ہے۔ کس میں اتنی قوت ہے کہ وہ اس تصویر پر سے پردہ اُٹھا سکے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ننھا باغبان دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر، آرٹسٹ، حکیم یا حکمران سے بلندتر درجہ پر ہوتا ہے!

جوانی میں آدمی باغ نہیں لگاتا، باغ میں گناہ کرتا ہے۔ بڑھاپے میں باغ کی ہوا کھاتا ہے اور توبہ استغفار کرتا ہے۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں، میں آپ کو اس قسم کے باغوں کی سیر نہیں کرانا چاہتا۔ یہ تو میرے بہکنے کی عادت ہے۔ جس کا موقع ریڈیو سے بڑھ کر کہیں اور نہیں ملتا۔

بچوں کے بعد شاعروں کا باغ آتا ہے، جن کو باغ سے دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ اس سے
بچے کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی مثال بعض ایسے بزرگوں سے دی جاسکتی ہے جو مخصوص اقسام
کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یعنی کھانا اس لیے نہیں کھائیں گے کہ بھوک معلوم ہوتی ہے یا
لذیذ غذا بجائے خود کوئی لطف رکھتی ہے۔ بلکہ بعض خاص قسم کی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ
غذا مفید ہے۔ چہل قدمی اس لیے نہیں کریں گے کہ سیر تفریح نشاط بخش ہوتی ہے، بلکہ طبیب نے
ایسا کرنے کی ہدایت کی ہے۔ غسل اس لیے نہ کریں گے کہ غسل کرنا پاکیزگی کا تقاضا ہے، بلکہ
ڈاکٹروں نے اسی کی ہدایت کی ہے۔ پہاڑ پر اس لیے نہیں جائیں گے کہ وہاں کی آب و ہوا
فرحناک ہوتی ہے، بلکہ خاص دواؤں کا استعمال یہیں ہوسکتا ہے۔

شاعر کا باغ بڑے آدمیوں کا انگلستان ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی بڑا آدمی مایوسی،
رُسوائی یا تباہی سے ہم کنار ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے انگلستان چلا جاتا ہے یا اپنا روپیہ
وہاں کے بینک میں رکھتا ہے جو آڑے وقت اس کے کام آتا ہے۔ اس طرح ہمارا شاعر جب
ہر طرف سے مایوس ہوتا ہے تو اپنی بعض نفسی کیفیات سے بہرہ مند ہونے کے لیے باغ کی طرف
رجوع کرتا ہے۔ اس کے باغ کی تمام موجودات اس کی مرض کی علامتیں یا اس کے درد کا مداوا
معلوم ہوتی ہیں۔ وہ باغ کی تمام چیزوں کو محبوب کے اعضا یا اس کے افعال سے تشبیہ دیتا ہے۔
تشبیہ کی بھرمار استلاء ذہنی یا دماغی (Mental Obsession) کی علامت ہے۔

دوسرا باغ اردو کے بعض کم سواد خود رو مضمون نویسوں کا ہوتا ہے۔ آپ ان کا کوئی
مضمون ایسا نہ پائیں گے جس میں سپتاں قسم کا معشوق یا ریشہ خطمی جیسا عاشق موجود نہ ہو۔ ان کا
ہر مضمون باغ سے شروع ہوگا، مثلاً نسیم اٹھکیلیاں کر رہی ہے، سبزہ سو رہا ہے، کلیاں چٹک رہی ہیں،
پھول مہک رہے ہیں، سنبل بال سنوار رہی ہے، نرگس آنکھ مار رہی ہے، سوسن زبان درازی کر رہی
ہے، لالہ داغ دل دکھا رہا ہے، پتے تالیاں بجا رہے ہیں، شبنم رو رہی ہے یا موتی بکھیر رہی ہے۔
بیلا گلے کا ہار ہے، چمن پُر بہار ہے، کہیں آبشار ہے، ہر طرف بہار ہے ـــــ لاحول ولاقوۃ۔

یا پھر کوئل کوک رہی ہے، پپیہا ہوک رہا ہے، بھونرا منڈلا رہا ہے، بلبل چہک رہا ہے،
قمری کوکو کر رہی ہے، چمن میں ایک کنج ہے، جس کے نیچے ایک دوشیزہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر پھول

توڑ رہی ہے اور عاشق صاحب ایک آہ سرد کھینچ کر کہتے ہیں۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی [1]

یہ سنتے ہی وہ ان کے قلب پر بجلیاں گرا کر ایک دوسرے کنج میں روپوش ہو جاتی ہے اور یہ اس کی تلاش میں تنکے چننے اور خاک چھاننے لگتے ہیں۔ یہی باغ اب صحرا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یعنی ان کے پاؤں میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ لو ان کا منہ جھلسنے لگتی ہے۔ ذرّے بیابان اور قطرہ سمندر بننے لگتا ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں اور یہ گریبان پھاڑنے اور بھلے مانسوں کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔

ایک باغ فسانۂ عجائب قسم کا بھی ہوتا ہے، جہاں انار توڑیے تو پریاں برآمد ہوتی ہیں اور ہنستی ہوئی کوہ قاف کا راستہ لیتی ہیں۔ حوض میں غوطہ لگائیں تو مرد سے عورت اور عورت سے مرد بن جائے۔ مجھے یقین ہے آج کل اس طرح کا کوئی باغ یا حوض دریافت ہو جائے تو بڑا خلفشار مچ جائے۔ بہت سے شوہر اور بیویاں ایک دوسرے سے انتقام لینے کے لیے اس حوض میں غوطہ لگائیں گے یا غوطہ لگانے پر مجبور کی جائیں گی۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کا حوض کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔ اس لیے کہ موجودہ دور کے سماجی میلانات یا ازدواجی تعلقات اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ کہیں نہ کہیں پانی مر رہا ہے اور ممکن ہے، وہ پانی اسی حوض کا ہو۔

دوسرا باغ دیہات یا قصبات کا ہوتا ہے جہاں بارات بھی ٹھہرتی ہے اور حکام بھی۔ لڑکے درختوں پر چڑھنے اُترنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ پرگنہ کے ڈپٹی صاحب دورہ میں یہیں مقدمات فیصل کرتے ہیں اور بیگار کی مذمت کرتے ہیں۔ اسکول کے ڈپٹی صاحب اس باغ میں لڑکوں کا امتحان لیتے ہیں۔ مدرسوں کو ایثار کی تعلیم دیتے ہیں اور اطمینان سے معائنہ تحریر فرماتے ہیں۔ کبھی کبھار چور، ڈاکو بھی دم لینے یا مالِ غنیمت تقسیم کرنے ٹھہر جاتے ہیں۔ اکثر مویشی چرانے والے دوپہر کو دم لیتے ہیں اور بعض خاص قسم کے ڈراموں کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔

---

1 سودا

ایک باغ ہوتا ہے جسے مہاجنی قسم کا باغ کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح مہاجن ہر قسم کا مال ایک صندوق میں گڈمڈ رکھتا ہے اور اشرفی، روپیہ، پیسہ، نوٹ، زیور، برتن، دستاویز سب ایک دوسرے پر گرے پڑے بکھرے ہوتے ہیں اور اندھیرے میں اندھیرا ہوتا ہے، اسی طرح مہاجنی قسم کا باغ ہوتا ہے۔ آم، جامن، برگد، نیب، بانس، کیلا، بیلا، چنبیلی، چمپا، نارنگی، امرود، فالسہ، رام بانس، دھتورا ایک مختصر سے رقبے میں اُگے ہوئے، ہر طرف اندھیرا، نمی، مختلف پرندوں کے پر اور بیٹ۔ کسی طرف گندے بُسے پانی کا تالاب ہوتا ہے، جس میں مینڈک، کچھوے، سانپ اور سنگھاڑے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کی گندگی دھوئی جاتی ہے۔ درختوں پر بندر اور گدھ سر بہت میں بن مرغی، ادھر اُدھر بن بلاؤ اور سیڑھیوں پر ہم آپ بیٹھے ہوتے ہیں، اور ساری فضا پر ایک طرح کا آسیب طاری ہوتا ہے۔

اسی قسم کا باغ پورب میں خانہ باغ کے نام سے ملتا ہے۔ ہتھیلی بھر کا آنگن، دیوار و در پر ہر قسم کی بیلیں چڑھی ہوئیں، ایک طرف بانس کی جعفری پر انگور، کریلے یا ترکاریوں کی بیل، پاس ہی پانی کا نل، جس کے اردگرد گیندے، بیلے، چنبیلی، کیلے اور پپیتے کے درخت، دو چار کائی لگی ہوئی اینٹیں جس پر کپڑا ہی مانجی جاتی ہے اور صاحب خانہ جسم کے کپڑے تر کے تکمیل غسل کا رزولیشن پاس کر دیتے ہیں۔ باغ کی نمی کیڑے مکوڑے اور بو باس تمام مکان میں پھیلی ہوتی ہے۔

ایک باغ کمپنی باغ کے نام سے موسوم ہوتا ہے، جس میں ہر چیز قرینے سے ہوتی ہے۔ ستھری کشادہ روشیں، سبز گھاس کے قطعات، قرینہ قرینہ سے خوش نما موسمی پھولوں کی کیاریاں، لیکن اس میں جو چیز تکلیف دہ ہوتی ہے وہ ان کا ضرورت سے زیادہ باضابطہ ہونا ہے۔ جابجا تختیوں پر اس کی تو ممانعت لکھی ہوتی ہے کہ گھاس پر نہ چلو، پھول نہ توڑو، سائیکل نہ چلاؤ، لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہوتا کہ ایسے اشخاص اس باغ میں نہ آنے پائیں جنھیں کوئی بھلا مانس کسی ویرانے میں بھی دیکھنا گوارا نہ کرے۔ نہ شکل قرینے کی، نہ لباس ٹھکانے کا۔ میلے کپڑے، پھٹے جوتے، مانگ نکلی یا سر گھٹا، ٹوپی ہر حال میں غائب، بیڑی پیتے، ہنہناتے، شور مچاتے، چلے آ رہے ہیں۔ عام باغ اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر شخص اس میں گھس پڑے۔ بدقوارہ، بدلگام، گندے، بدتمیز لوگوں

کے لیے جیل خانہ، جلسے اور کانفرنسوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ باغ میں انسان تفریح کے لیے جاتا ہے، قوم سدھارنے کے لیے نہیں!

ستم بالائے ستم یہ کہ ان پارکوں میں ٹینس کورٹ بھی ہوتے ہیں۔ جن میں ہر وہ شخص ٹینس کھیل سکتا ہے جس نے کسی کباڑیے سے ریکٹ خرید لیا۔ لوہار سے مرمت کرائی اور خود ہی دیسی بدبودار گٹ لگا کر کرایہ کی سائیکل پر سوار کورٹ تک پہنچ گیا۔ پوری آستین سے دو تین انچ لمبی قمیص، لنگوٹ نما شرعی پتلون، پھٹا ہوا سری موزہ، جن میں میل، پسینہ، گرد وغبار، پان کی پیک، اس طرح ملے جلے کہ آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ کون کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ ٹینس کھیلیں گے تو اس طرح جیسے ہولی کھیل رہے ہیں، یا باغ سے طوطے اُڑا رہے ہیں۔

لان ٹینس ایسوسی ایشن، ٹینس کے آئین وضوابط کی بڑی سختی سے پابندی کراتی ہے، لیکن آخر وہ دن کب آئے گا جب وہ ٹینس کورٹ کے آداب ٹینس کھیلنے والوں کے حلیہ اور اخلاق پر بھی پابندی عائد کرے گی۔ ایسے لوگوں کے لیے سی سا یا پھسلنے کے لیے آڑے ترچھے تختے کسی چوراہے یا دیرانے میں نصب کرا دینے چاہئیں۔ جیسے بچوں کے لیے میونسپلٹی یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ البتہ اس کے نصف اخراجات کا بار ٹینس لان ایسوسی ایشن کو اُٹھانا پڑے گا۔ ان داموں ایسوسی ایشن گھاٹے میں نہیں رہے گی۔

باغ مجھے بہت پسند ہیں۔ درختوں اور پودوں سے بڑھ کر محنت ومحبت کی داد دینے والا، آدمیوں میں کوئی نہیں۔ جانوروں میں صرف کتا ہے۔ بیوی، بچوں، عزیزوں کی خدمت میں مٹ جایئے، ان کا منہ کبھی سیدھا نہ ہوگا۔ درختوں پودوں کو تھوڑی سی بھی راحت پہنچا دیجیے، شاداب وشگفتہ ہو جائیں گے، اور آپ محسوس کریں گے کہ وہ اپنی استطاعت سے زیادہ آپ کی محبت ومحنت کا معاوضہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں!

آج کل برسات کا موسم ہے۔ جب ہندوستان کا گوشہ گوشہ باغ بن جاتا ہے۔ آم ٹپکتے ہیں، پکوان پکتے ہیں، ملیریا پھیلتا ہے، کونین کھائی جاتی ہے، جھولے جھولے جاتے ہیں، پینگیں بڑھائی جاتی ہیں، بجلی چمکتی ہے، بادل گرجتا ہے، ہوا لہکتی ہے، فضا مہکتی ہے، پانی برستا ہے، چھت ٹپکتی ہے، رات بھیگتی ہے، توبہ ٹوٹتی ہے اور.......

(بقیہ آئندہ برسات میں)

تھوڑی بہت باغوں کی سیر آپ نے کر لی، لیکن فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی بہت سے باغ ایسے ہیں جن تک آپ کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً باغ جنت، لیکن مشکل یہ ہے کہ جہاں تک میرا آپ کا تعلق ہے ہم میں سے کوئی ابھی وہاں نہ پہنچ سکا ہے، اور نہ پہنچنے کے لیے مضطرب ہے۔ نکالے ہوئے سبھی ہیں، بعضوں کا پہنچنا مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض صورت سے جنتی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایک گر کی بات ضرور یاد رکھیں، یعنی اسی برسات میں ایک مہینہ ایسا آتا ہے جب لوگ اندھا ہونا زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں کیوں کہ پھر تمام عمر ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھائیں۔

اگر یہ بات دل کو نہ لگتی ہو تو پھر کسی فرصت کے وقت جب عقل معطل اور معدہ خالی ہو، کسی لیڈر سے رجوع کریں۔ بقیہ سبز باغ وہ دکھادے گا۔

(نشریہ)

●●●

ریڈیو کا مستقبل

جب میں کسی دقت میں مبتلا ہوتا ہوں تو سب سے پہلے یہ کوشش کرتا ہوں کہ اسی دقت میں اور لوگ بھی مبتلا ہو جائیں۔ ایسا کرنے سے دقت معتدل ہو جاتی ہے، اور پھر اس پر قابو پا لینا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات میں نے آپ کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے بتائی ہے نہ اس لیے کہ آپ اس کا تجربہ کرنے لگیں۔ کیوں کہ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ لوگوں کے شریک ہو جانے سے دقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اتنی ساری بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ میں دقت میں مشورہ لینے کا عادی ہوں، لیکن اس کا بھی قائل ہوں کہ مشورہ دینے سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں۔ اگر اس سے بڑھ کر کوئی اور حماقت ہو سکتی ہے تو پھر یہ ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کیا جائے۔

چنانچہ جس وقت ریڈیو کے دفتر سے یہ فرمائش موصول ہوئی کہ میں ریڈیو کے آئندہ ترقی کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کروں تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ ریڈیو کے ترقی کے کیا امکانات ہیں۔ جتنا سوچتا اتنا ہی گھبراتا، اور جتنا گھبراتا اتنا ہی سوچتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چہرہ سے کچھ ایسی علامات ظاہر ہونے لگیں کہ آس پاس کے لوگوں نے کنارہ کھینچنا شروع کیا۔ میں نے اس صورت حال کا جلد احساس کر لیا۔ یہ بات تو آئی گئی ہوئی، لیکن ریڈیو کا مستقبل جہاں کا تہاں ہی رہا۔ آخر میں نے محسوس کیا کہ کانفرنس میں ڈسپلن خراب ہو رہا ہے، چنانچہ میں نے ایک ڈانٹ بتائی۔ لپک کر کمرہ کا دروازہ بند کر دیا، اور ہانپ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دروازہ کے بند

کرنے کو حاضرین کانفرنس نے خدا جانے کیا سمجھا، ایک نے نہایت رونی صورت بنا کر کہا پانی۔ میں نے گھڑک کر کہا بیٹھ جاؤ۔ پانی منگائے دیتا ہوں۔ ابھی وہ بیٹھا بھی نہ تھا کہ دوسرے نے بسور کر پوائنٹ آف آرڈر سر کیا۔ میں نے کہا، کیا چاہتا ہے۔ اس نے رو کر ایک ایسی ناگفتہ بہ بات کی فرمائش کی کہ آپ یقین فرمائیے، میں وہ چیز کسی طرح نہیں منگوا سکتا تھا۔ میں نے خون کا گھونٹ پی کر دروازہ کھولا اور تیز ہو کر کہا۔ جا دفع ہو، اتنے میں ایک تیسرا شیطان ٹانگوں کے نیچے سے نکل کر بھاگا، اور اماں کہتا ہوا صحن میں ڈھیر ہو گیا۔

صاحبو! اس جمی جمائی کانفرنس کا جیسا دردناک انجام ہوا اور ابھی جو عفریت صحن میں ڈھیر تھا، اس کی وجہ سے مجھ پر اور میری غریب کانفرنس پر ایک غیر ذمہ دار سابق رکن کانفرنس نے جس غیر شاعرانہ طریقہ پر لے دے شروع کی اس کا انجام یہ ہوا کہ خاکسار نے

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

جنگل پہنچ کر میں نے اپنا خطبہ صدارت جیب سے نکالا اور بآواز بلند پڑھنا شروع کیا۔ ممکن ہے دہلی ریڈیو اسٹیشن نے اتنی ترقی کر لی ہو کہ وہ گزری ہوئی تقریروں اور بھولی بسری باتوں کو بھی فضا کے دور دراز گوشوں سے گرفتار کر کے دُہرا سکتا ہو۔ کیوں کہ ریڈیو کے امکانات ترقی میں یہ بھی ہے کہ آج سے ہزاروں برس پہلے اس زمین پر جو ڈرامے کھیلے گئے ہیں، ان کو جوں کا توں آج آپ کے سامنے پیش کر دے۔ کیوں کہ اتنی سی بات تو ہم آپ سبھی نے فیصلہ کیا کہ جہاں اپنی عقل کام نہ دے، وہاں دوسروں کی حماقت سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ایک گھریلو کانفرنس منعقد کی۔ ہر قسم ہر جنس اور ہر عمر کے لوگ جمع ہوئے۔ پریسڈنٹ کے انتخاب میں کوئی دقت پیش نہ آئی، کیوں کہ اوّل تو شکل و صورت کے اعتبار سے میں ہی صدارت کرنے کے لیے موزوں تھا۔ پھر سب سے بڑی بات مجھ میں یہ تھی کہ اگر کانفرنس میں گڑبڑ یا بلوی کی نوبت آتی تو مجھ میں پٹ جانے سے زیادہ پیٹ دینے کی استعداد اور عادت دونوں موجود تھیں۔ اس کانفرنس میں ایک معزز خاتون بھی تھیں۔ جن کا نام بتانے سے بعضوں کا خیال ہے کہ مرمت نکاح کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اس لیے آپ سے التجا ہے کہ مجھے کسی ایسی حرکت پر مجبور نہ

کریں جس سے میں ایسے لوگوں کے رحم وکرم کا محتاج بن جاؤں۔ جن کے میں کیا، آپ بھی شاکی ہوں گے۔ ان خاتون نے میرے صدر نشین ہونے پر کچھ اس طرح سے ''واک آؤٹ'' کیا کہ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دماغ روشن ہو گیا۔ انھوں نے بعض متعلقین کو بھی اپنا ساتھی بنانا اور میری کانفرنس کو ویران کر دینا چاہا، لیکن اس خاکسار نے بھی فوراً جیب سے ایک سیب نکالا جو بعد میں امرود ثابت ہوا اور ایک ہی وار میں نصف کے قریب اپنے منہ میں رکھتا ہوا بقیہ نصف ڈگمگاتے ہوئے ممبر کے سامنے لڑھکا دیا اور کانفرنس جم گئی۔

میں نے کہا معزز حضرات۔ اتنے میں ایک طرف سے آواز آئی۔ کھس، دیکھا تو صاحبزادے تھے۔ میں نے اپنی غلطی تو تسلیم کر لی، لیکن ڈسپلن پھر ڈسپلن ہے۔ میں نے گرج کر کہا، گدھو احمقو۔ دور سے آواز آئی، شاباش کیا خوب جوڑا ہے۔ اس پر کانفرنس میں کچھ تفریح سی شروع ہوئی اور جانتے ہیں کہ بہت سے ستارے ایسے دور دراز فاصلہ پر واقع ہیں کہ ان تک ابھی ہماری اس دنیا کی روشنی نہیں پہنچ سکی۔ اس لیے ہزاروں برس پہلے جو کچھ یہاں پیش آ چکا ہے، اب تک ان کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔ ہاں تو میں نے پڑھنا شروع کیا تھا۔ صاحبو! کسی کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا اور اپنے مستقبل سے بے نیاز ہو کر کہنا، یا تو بہت بڑی جرأت ہے یا اس سے بڑی حماقت۔ لیکن ریڈیو جس کا ماضی مطلق کچھ نہیں، اس کے مستقبل قریب یا بعید کے بارہ میں اظہارِ خیال کرنا دلچسپ ضرور ہے۔ ریڈیو سے اس وقت تمام دنیا میں جیسی دلچسپی ہے اور انسانی ذہن و تخئیل کی رفتار جیسی تیز اور ہمہ جہت ہے، اس سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ آئندہ ریڈیو سیٹ اور آواز بھیجنے کی اسٹیشن اور مشینوں کی تعداد بے حد و بے حساب ہو جائے گی۔ ان کی لاگت نسبتاً بہت کم ہو جائے گی۔ چنانچہ اس ہندوستان میں کوئی رام لال اور غلام محمد ایسے نہیں رہ جائیں گے جن کے پاس کم سے کم ایک ریڈیو سیٹ یا ٹرانسمیٹر نہ ہو۔ دہلی اسٹیشن والوں کو پھر یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑا کرے گی کہ ہمارے دیہاتی بھائی اپنے اپنے باجے بند کر لیں۔ اسی طور پر پولیس والوں اور گھر والیوں کو مجرموں اور شوہروں کی نقل و حرکت دریافت کرنے، یا گرفتاری میں بڑی سہولت ہوگی، اور بھاگنا یا بھگا لے جانا دونوں ناممکن ہو جائے گا۔ آواز کے ساتھ ساتھ صورت کا دکھائی دینا جس کو ٹیلی ویژن کہتے ہیں، انگلستان میں عام ہو چلا ہے۔

کیا تعجب آئندہ سال بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کی دہلی میں تاج پوشی ہم دہلی سے دور بیٹھے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

ٹیلی ویژن کے عام ہو جانے پر مجھے یقین ہے کہ گانے اور بولنے والوں کو تھوڑی بہت احتیاط اور اہتمام سے کام لینا پڑے گا۔ ممکن ہے اس سے پروگرام والوں کی دقت بھی بڑھ جائے۔ پھر اناؤنسر صاحب اس امر کا بھی اعلان کیا کریں کہ فلاں صاحب یا صاحبہ کا بولتے یا کم سے کم گانا گاتے وقت خاص طور پر مشاہدہ کیجیے۔

گانے بولنے سے پہلے ان کی صورت کیسی ہوتی ہے اور گاتے بولتے وقت ان کا برزخ کیسا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت معاوضہ کے نرخ میں بھی ان کو ترمیم کرنی پڑے۔ فرض کیجیے ہم آپ ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سے گزر رہے ہیں، ریڈیو اسٹیشن کے اندر ایک مشین ایسی رکھی ہوئی ہے جس سے ایک ماہر فن سڑک پر گزرنے والوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس نے فوراً چپراسی بھیج کر ہم کو بلوا بھیجا اور تمام مراسم میزبانی یا احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بعد بولا۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی ابھی آسٹریلیا سے خبر آئی ہے کہ وہاں اس وقت کوئی کنگارو ریڈیو اسٹیشن پر نہیں لایا جا سکتا۔ کیا آپ از راہ کرم فلاں وقت اسٹیشن پر تشریف لا کر اپنی زیارت سے ہمارے ناظرین و سامعین اور ضمناً مسٹر کنگارو کو اپنا احسان مند بنا سکیں گے۔ آئندہ سب سے ضروری اور نہایت ضروری اصلاح ریڈیو میں یہ ہوگی کہ آپ اس فضائی خلفشار یا چل پکار کے سننے پر مجبور نہ ہوں گے۔ جو کبھی کبھی آپ کے لطف کو کرکرا کر دیتی ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ ریڈیو سیٹ کے اندر مختلف اقسام کے لمبوترے قمقمے سے نصب ہوتے ہیں۔ جن کو والو (Valve) کہتے ہیں۔ ان کے کام بھی مختلف کرتے ہیں۔ بعض دور کی آواز قبول کرتے ہیں۔ بعض دھیمی آواز کو بلند کرتے ہیں۔ بعض کا کام یہ ہے کہ بعض خاص اسٹیشنوں سے بھیجی ہوئی آواز کو سیٹ کے اندر ہم آہنگ کر دے۔ بعض برقی لہروں کی مختلف لرزشوں کو خاص خاص اطراف و جوانب یا صرف ایک خاص سمت میں لاتے لے جاتے ہیں۔ آئندہ چل کر ریڈیو کے کل پرزے اس درجہ سہل سادے متوازن اور مکمل کر دیے جائیں گے کہ وہ تمام کام جو مختلف والو (Valve) علاحدہ علاحدہ انجام دیتے ہیں، ایک ہی والو (Valve) انجام دینے لگے۔ ممکن ہے والو (Valve)

سرے ہی سے غائب ہوجائے۔ اس طور پر ریڈیوسیٹ نہایت سستا مختصر ہلکا پھلکا ہوجائے گا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ چیز اتنی عام اور مکمل ہوجائے کہ ہر شخص کے پاس گھڑی عینک یا سگریٹ کیس یارام لال کی سنگھنی کی مانند ریڈیوسیٹ ہی نہیں بلکہ ٹرانسمیٹر بھی موجود ہو۔

فرض کر لیجیے کوٹ یا اُچکن کے سارے بٹن مختلف اسٹیشنوں کے لیے مختلف رسیور یا ٹرانسمیٹر کا کام دیں۔ اس طور پر جس طرح آج کل دکانوں کے پتے شہر یا سڑک کے اعتبار سے ہوتے ہیں۔ آئندہ ان کا پتہ لہروں کی مخصوص نوعیت یا لمبائی پر ہو۔ جس کی ایک ضخیم ڈائرکٹری ہوگی۔ ممکن ہے ایک مکمل لائبریری ہو۔ پروفیسر اپنے لیکچر، ڈاکٹر اپنی ہدایات، تاجر اپنے اشتہارات، گویئے اپنے گانے، جنرل اپنے احکام، وکلا اپنی بحث، حکام اپنے فیصلے، طلبا اپنی شکایات، بیویاں اپنی فرمائشات، شوہر اپنی نیازمندی، اپنے اپنے متعلقین کو براہِ راست سنا بتا سکیں گے۔ مشہور اطبا اور ڈاکٹروں کی امداد بھی آسانی سے لی جا سکے گی۔ مریض کا معائنہ دور دراز فاصلہ سے ہو سکے گا۔ ضرورت ہوئی تو ڈاکٹر ساتھ ہی ساتھ اکسریز سے معائنہ بھی کر لے گا۔ کیا تعجب کسی وقت سائنس اتنی ترقی کر لے کہ بجلی کی لہروں سے ڈاکٹر دور دراز فاصلے سے مریضوں کا آپریشن بھی کر سکے اور بجلی کی لہریں نشتر کا کام دیں۔ اسی طور پر انجینئر، پروفیسر اور اس وقت تک جھاڑ پھونک والے باقی رہے تو وہ بھی تعمیر، تعلیم اور جھاڑ پھونک بھی دور دراز سے کر سکیں گے۔ اس وقت ہر مضمون کا پروفیسر اپنے اپنے جائے قیام سے لکچر دے سکے گا، اور طلبا ایک مقام پر یا اپنے اپنے کمروں یا گھروں پر لکچروں سے مستفید ہو سکیں گے۔ ممکن ہے اس وقت یونیورسٹیاں ہوں اور پروفیسر نہ ہوں، یا پروفیسر ہوں طلبا نہ ہوں یا دونوں ہوں یونیورسٹیاں نہ ہوں۔

ہوائی جہاز یا پانی کے جہاز ایسے بنائے اور چلائے جا چکے ہیں، جن میں چلانے والا موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف برقی لہروں کی مدد سے ان کو آسانی کے ساتھ چلایا، اُتارا، چڑھایا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کو آئندہ اتنی ترقی دے دی جائے کہ لڑائی سے سپاہی بالکل غائب ہوجائیں۔ صرف دو مخالف جنرل دور دراز اور محفوظ ترین فاصلہ پر بیٹھے، اپنی ذہنی چال اور مشینوں کی مدد سے ایک دوسرے کو مات کریں یا مات کھا جائیں۔ ان دنوں ہم محفوظ مقام پر بیٹھ کر جنگ کی نیچ اونچ کی خبریں سنتے یا ان کی چھپی ہوئی تصاویر اخبارات میں دیکھتے رہیں۔ آئندہ

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے وسیلہ سے ہم اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر اصل لڑائی دیکھ سکیں گے۔ یہ مرا وہ گرا، گولیاں کیسی چل رہی ہیں، گولے کہاں پھٹ رہے ہیں، کس کا بھائی مرا کس کا شوہر کام آیا۔ کس کا باپ اُٹھ گیا اور کس کا بیٹا پرزے پرزے ہو گیا۔ خون کی ہولی اور مشینوں کی برات کیسی ہوتی ہے۔

سائنس کی ترقی کا یہی حال رہا اور برقی لہروں کے معجزے بھی یہی رہے تو کچھ بعید نہیں کہ ہزار پانسو سال بعد انسانی آبادی خشکی اور تری کے بجائے ہوا میں بھی ملنے لگے۔ برقی لہروں کی مدد سے بستیاں اور شاہراہیں فضا میں قائم ہو جائیں گی۔ ریڈیو کی مدد سے آمد و رفت کے وسائل اور ان کا انتظام اتنا مکمل اور عام ہو جائے گا کہ وہ تمام خطرات جو اَب پیش آتے رہتے ہیں دور ہو جائیں گے۔ یہ عالم زمین اور آسمان ہی کا نہ ہو گا بلکہ سمندر کے اندر بھی انسان آباد ہو گا۔ خشکی کی مانند سمندر کے اندر بھی جزیرے بنائے جائیں گے اور یہ انسان اپنے رہنے سہنے آنے جانے کے لیے برقی لہروں سے ایسے انتظامات کرلے گا کہ اسے رہنے سہنے کی کوئی دقت محسوس نہ ہو گی۔ آج کل آپ ریگستانوں کو لق ودق پاتے ہیں، جہاں کھانے پینے کو کچھ مل نہیں سکتا اور نہ کھانے پینے کی چیزیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ دقتیں قطعاً ایسی نہیں ہیں جن کو برقی لہروں پر قابو پا جانے اور ان کو سستا بنانے کے بعد دور نہ کیا جا سکے۔

ضرورت صرف اتنی ہے کہ بجلی کی قوت کو تاروں کے بجائے وائرلیس کے اصول پر منتقل کیا جا سکے۔ آج کل جہاں بجلی نہیں پہنچائی جا سکی ہے، وہاں انجن یا بیٹری سے بجلی کی قوت حاصل کرتے ہیں، لیکن وہ دن دور نہیں ہے جب بجلی کی طاقت حسب ضرورت وائرلیس سے منتقل کی جانے لگے گی۔ جیسا کہ آج کل تقریریں یا گانے منتقل کیے جاتے ہیں۔ میں ابھی ابھی بتا چکا ہوں کہ آئندہ ریڈیو سیٹ اور ٹرانسمیٹر کی تعداد اتنی بڑھ جائے گی، برقی لہروں پر اتنی قوت حاصل ہو جائے گی اور ان پر اتنی کم لاگت آئے گی کہ ریڈیو سیٹ اور ٹرانسمیٹر گھڑی، انگوٹھی، بٹن، عینک، فاؤنٹین پین، سگریٹ کیس کی طرح لوگوں کے پاس ملنے لگیں گے۔ اس زمانے میں روزگار حاصل کرنے یا شوہر بیوی کا انتخاب کرنے کے لیے اُمیدواروں کو دور دراز سے بلانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ گھر بیٹھے وہ سارے مراحل طے ہو جائیں گے جو اَب سفر کرنے کے

بعد طے ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بے پناہ ہمہ گیری کا یہ عالم ہو کہ طالب علم امتحان میں نقل نہ کرنے پائیں، اور امتحان میں گارڈ رکھنے کی بجائے رجسٹرار صاحب خود اپنے کمرہ میں ایک جام امتحان نما لگائے بیٹھے ہوں، اور ہر امتحان دینے والے کی نقل و حرکت دیکھتے رہیں۔

امتحان ہی کا نہیں بہت سی اور باتیں ایسی ہیں جن کو ہم آپ خفیہ رکھنا چاہتے ہیں، اور نہیں چاہتے کہ دوسرا ان سے واقف ہو کر ہم پر ہنسے یا ہم سے ہمدردی کرے۔ اس لیے اس زمانے میں ہر روز ہم کو یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کسی دوست دشمن نے کوئی یا کارتوس کی مانند کہیں کوئی ٹرانسمیٹر تو ہمارے غسل خانہ یا کمرہ میں نہیں چھپا دیا ہے۔ مجھے آپ کی نیت پر شبہ نہیں ہے، لیکن کیا معلوم ٹرانسمیٹر کی مخبری سے آپ کے دشمن آپ کے بارہ میں کیا منصوبے کر رہے ہوں۔ ہر خطرہ کا انسداد غالباً اسی طرح کیا جائے گا۔ جیسے پہلے زمانے میں بڑے بڑے پیر فقیر کیا کرتے تھے۔ یعنی چاروں طرف ایک حصار یا حلقہ کھینچ دیا گیا۔ ساری بلائیں باہر ہی رہ جائیں گی اور آنے کی کوشش کریں گی تو جل کر راکھ ہو جائیں گی۔ اسی طرح ایک خاص قسم کی برقی لہر بہت ممکن ہے ہر شخص کے گرد قائم کر دی جایا کرے، اور اس طور پر وہ عافیت کے ساتھ گزر بسر کر سکے۔

آج کل ہر پروگرام کے لیے اوقات مقرر ہیں۔ صرف معینہ وقت پر آپ معینہ پروگرام سن سکتے ہیں۔ آئندہ بہت ممکن ہے ہر چیز کا پروگرام ہر وقت ہو سکے... ہر پروگرام کے لیے علاحدہ علاحدہ اسٹیشن بنے ہوں۔ ان کی مخصوص برقی لہریں ہوں۔ فرض کیجیے آپ کو گھڑی ملانی ہے، ایک اسٹیشن ایسا ہے جو وقت یا موسم کے نشیب و فراز ہر لحظہ بتا تا رہتا ہے۔ آپ نے اس اسٹیشن کی برقی لہر سے رجوع کیا، فی الفور آپ کو صحیح وقت یا حالات معلوم ہو گئے۔ اسی طور پر تعلیم، سائنس، آرٹ، کچے پکے گانے، ڈرامہ، مذہب و اخلاق (جن کا اللہ ہی مالک ہے) حفظان صحت، رزم و بزم، غرض کہ ہر اس موضوع سے جس کی طرح عام لوگوں کی توجہ مائل کی جا سکتی ہے یا کرانی چاہیے، ہمہ وقت آپ مستفید ہوتے رہیں گے۔ آپ خواہ کسی مقام پر ہوں، یہی نہیں کہ آپ کو تمام دنیا کے حالات معلوم ہوتے رہیں گے۔ بلکہ آپ چاہیں گے تو خود اپنے حالات سے دوسروں کو مطلع کرتے رہیں گے۔ پھر یہ ناممکن ہو جائے گا کہ کوئی شخص انسانی امداد سے کہیں کسی وقت بھی محروم رہ سکے۔

گھریلو زندگی میں بڑی بوڑھیوں کو بچوں کو قصہ سنانے کی زحمت سے اور ماؤں کو لوریاں دینے سے نجات مل جائے گی۔ بچوں کے سرہانے ریڈیو سیٹ ہوگا جو انھیں قصہ یا لوریاں سناتا ہوگا۔ طالب علموں کو یہ آسانی ہوگی کہ ان کو مخصوص مضامین پر ہمہ وقت اُستاد کی رہبری حاصل ہوتی رہے گی۔ گو مجھے یقین ہے اس وقت یہ سزا بھی لگا دی جائے گی کہ امتحان میں کسی کے پاس ریڈیو سیٹ یا ٹرانسمیٹر نکلا تو اس کی وہی سزا ہوگی جو..... مثلاً چوری کی ہوگی۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ بعض اوقات ریڈیو میں جو عجیب وغریب قسم کی صدائیں سننے میں آتی ہیں۔ ممکن ہے یہ ان لوگوں کی ہوں جو کسی دوسرے ستارہ میں آباد ہیں اور ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہوں اور ریڈیو ہی کے وسیلے سے ہم سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ یہ خیال آرائی نہایت دلچسپ ہے۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہایت آسانی کے ساتھ نکل سکتا ہے کہ اس انتہائی ترقی یافتہ عہد میں ہم نے سب سے بڑی پرواز کرنے کے بعد بھی جس مخلوق کا پتہ لگایا وہ ہمارے ہی بھائی بند نکلے۔ بھائی رام لال، بھائی غلام محمد۔

یہ سب تو رہا الگ، میں خود اکثر سوچتا ہوں کہ لگے ہاتھوں اگر کوئی ایسا ٹرانسمیٹر یا ریسونگ سیٹ نکل آئے جو لوگوں کے سر یا سینوں پر لگا دیا جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ۔ ان کے دل میں خلوص ہے یا بے ایمانی، تو کیا ہو۔ چنانچہ اس قسم کے سیٹ بنانے والوں کو میں ایک بات یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کو اس امر کا خاص طور سے لحاظ رکھنا ہوگا کہ سیٹ نازک نہ ہو، بلکہ بے حد پائیدار ہو۔ خشکی اور تری دونوں میں کام دے سکے، کیوں کہ جس طرح بعض لوگ کھانا کھانے سے انکار کر دیتے ہیں تو ان کو زبردستی غذا پہنچائی جاتی ہے۔ اسی طرح اکثر لوگ اس قسم کے ٹرانسمیٹر اپنے اوپر لگوانے پر بھی آمادہ فساد ہوں گے۔ اس وقت ظاہر ہے ٹرانسمیٹر کے سلسلہ میں ان سے زبردستی کی جائے گی۔

آخر یہ جبری غذا کا مسئلہ چھڑ کیوں کر گیا۔ کل سے روزے تو نہیں ہیں!

شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

(نشریہ)

●●●

خنداں

خنداں شاعر بھی ہیں، اور ڈاکٹر بھی اور یہ بتانا یقیناً دشوار ہے کہ ان کی شاعری بلائے جان ہے یا ڈاکٹری۔ غالب نے مہ رخوں کے لیے مصوری سیکھی، جس کے پیچھے ان کو آخر میں اعتراف کرنا پڑا۔

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حالاں کہ تاریخ اور بڑی بوڑھیاں دونوں گواہ ہیں کہ غالب اور خنداں کبھی کام کے آدمی نہ تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب ایمان دار تھے اقرار کرلیا۔

ننگ پیری ہے جوانی میری

خنداں گھاگ ہیں فرماتے ہیں:

بے اعتدالیوں پہ بھی خنداں جوان رہے!

غالب عمر بھر بے خانماں رہے، ان کی "حسرت تعمیر" کبھی بر نہ آئی۔ خنداں کو دیکھیے ان کا "آفس" بہ یک وقت مطب، دواخانہ، آپریشن تھیٹر، خلوت و خواب گاہ سبھی کچھ تھا۔ اسی آفس میں روح بھی قبض کرتے تھے اور دیوان بھی مرتب کرتے تھے۔ ایک دفعہ بے خیالی میں کہہ گئے۔

گھریلو زندگی میں بڑی بوڑھیوں کو بچوں کو قصہ سنانے کی زحمت سے اور ماؤں کو لوریاں دینے سے نجات مل جائے گی۔ بچوں کے سرہانے ریڈیو سیٹ ہوگا جو انھیں قصہ یا لوریاں سناتا ہوگا۔ طالب علموں کو یہ آسانی ہوگی کہ ان کو مخصوص مضامین پر ہمہ وقت اُستاد کی رہبری حاصل ہوتی رہے گی۔ گو مجھے یقین ہے اس وقت یہ سزا بھی لگادی جائے گی کہ امتحان میں کسی کے پاس ریڈیو سیٹ یا ٹرانسمیٹر نکلا تو اس کی وہی سزا ہوگی جو.....مثلاً چوری کی ہوگی۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ بعض اوقات ریڈیو میں جو عجیب وغریب قسم کی صدائیں سننے میں آتی ہیں۔ ممکن ہے یہ ان لوگوں کی ہوں جو کسی دوسرے ستارہ میں آباد ہیں اور ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہوں اور ریڈیو ہی کے وسیلے سے ہم سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ یہ خیال آرائی نہایت دلچسپ ہے۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہایت آسانی کے ساتھ نکل سکتا ہے کہ اس انتہائی ترقی یافتہ عہد میں ہم نے سب سے بڑی پرواز کرنے کے بعد بھی جس مخلوق کا پتہ لگایا وہ ہمارے ہی بھائی بند نکلے۔ بھائی رام لال، بھائی غلام محمد۔

یہ سب تو رہا الگ، میں خود اکثر سوچتا ہوں کہ لگے ہاتھوں اگر کوئی ایسا ٹرانسمیٹر یا ریسونگ سیٹ نکل آئے جو لوگوں کے سر یا سینوں پر لگادیا جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں یا سچ۔ ان کے دل میں خلوص ہے یا بے ایمانی، تو کیا ہو۔ چنانچہ اس قسم کے سیٹ بنانے والوں کو میں ایک بات یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کو اس امر کا خاص طور سے لحاظ رکھنا ہوگا کہ سیٹ نازک نہ ہو، بلکہ بے حد پائیدار ہو۔ خشکی اور تری دونوں میں کام دے سکے، کیوں کہ جس طرح بعض لوگ کھانا کھانے سے انکار کر دیتے ہیں تو ان کو زبردستی غذا پہنچائی جاتی ہے۔ اسی طرح اکثر لوگ اس قسم کے ٹرانسمیٹر اپنے اوپر لگوانے پر بھی آمادہ فساد ہوں گے۔ اس وقت ظاہر ہے ٹرانسمیٹر کے سلسلہ میں ان سے زبردستی کی جائے گی۔

آخر یہ جبری غذا کا مسئلہ چھڑ کیوں کر گیا۔ کل سے روزے تو نہیں ہیں!

شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

(نشریہ)

●●●

خنداں

خنداں شاعر بھی ہیں، اور ڈاکٹر بھی اور یہ بتانا یقیناً دشوار ہے کہ ان کی شاعری بلائے جان ہے یا ڈاکٹری۔ غالب نے مہ رخوں کے لیے مصوّری سیکھی، جس کے پیچھے ان کو آخر میں اعتراف کرنا پڑا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حالاں کہ تاریخ اور بڑی بوڑھیاں دونوں گواہ ہیں کہ غالب اور خنداں بھی کام کے آدمی نہ تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب ایمان دار تھے اقرار کرلیا۔

ننگ پیری ہے جوانی میری

خنداں گھاگ ہیں فرماتے ہیں:

بے اعتدالیوں پہ بھی خنداں جوان رہے!

غالب عمر بھر بے خانماں رہے، ان کی ''حسرت تعمیر'' کبھی بر نہ آئی۔ خنداں کو دیکھیے ان کا ''آفس'' بہ یک وقت مطب، دواخانہ، آپریشن تھیٹر، خلوت وخواب گاہ سبھی کچھ تھا۔ اسی آفس میں روح بھی قبض کرتے تھے اور دیوان بھی مرتب کرتے تھے۔ ایک دفعہ بے خیالی میں کہہ گئے۔

اک ڈوز[1] جس کو دے دیا فی النار ہو گیا
خنداں تمہارے ہاتھ ہیں گویا قضا کے ہاتھ

نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والوں نے آفس کو، اور مکھیوں نے خنداں کے چہرہ کو گھیر لیا۔ بڑی مشکلوں سے نجات ہوئی اور اعلان کرنا پڑا۔

یہی ہیں زندگی کے اپنے دو مقصد فقط خنداں
مریضوں کو دوا دینا حسینوں کو دعا دینا

چنانچہ مریض بھی آنے لگے اور حسین بھی اور معاملہ رفت و گذشت ہو گیا۔ وکٹر ہیوگو نے اپنا مشہور افسانہ لافنگ مین (Laughing man) اگر اس صدی میں تصنیف کیا ہوتا تو ہمارے ڈاکٹر خنداں یقیناً اس کے ہیرو ہوتے۔ کچھ لوگوں نے (انسان کی تعریف ہی حیوانِ خنداں) سے کی ہے، لیکن یہ ساری باتیں کتابی ہیں۔ خنداں البتہ سب کچھ ہیں، کسی حال میں ہوں، آپ ان کو ہمیشہ "اظہارِ تخلص" فرماتے (یعنی مسکراتے) پائیں گے۔ آپ نے بہت سارے شعرا ایسے دیکھے ہوں گے جن کے اصلی نام کے ساتھ ایک تخلص بھی ہوتا ہے۔ بعض ایسے بھی ملیں گے جو صرف تخلص رکھتے ہیں، شعر نہیں کہتے۔ خنداں کا حال یہ ہے کہ صرف تخلص ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس کا مظاہرہ بھی کیا کرتے ہیں اور اس بارہ میں ان کو اس درجہ غلو ہے کہ ہر شعر پر تخلص کی مہر لگا دیتے ہیں تاکہ سرقہ کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

خنداں پستہ قامت، سبک خرام، کم سخن، کم آمیز، گندم گون، ستم رسیدہ، خزاں دیدہ، نکتہ سنج، شاعر، ڈاکٹر سب ہی کچھ ہیں اور اُن تمام معالجات میں کمال رکھتے ہیں جو مسلمانوں اور مفلسوں میں عام ہیں۔ جیب میں شیشیاں، بغل میں بوتل، ہاتھ میں آلات جراحی، پیٹ میں درد، سر میں سودا اور زبان پر اشعار۔ ڈاکٹر خنداں مرض بھی ہیں اور مریض بھی۔ پھر ان کا ڈاکٹر ہونا محل تعجب کیا۔ خود فرماتے ہیں کہ زندگی کا مقصد صرف مریضوں کو دوا اور حسینوں کو دعا دینا ہے۔ حالاں کہ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ حسینوں کو دعا دینا یا اس قسم کی باتیں آدابِ طب کے خلاف ہیں۔ بدمذاق یہ چاہتے ہیں کہ مریضوں کو دعا اور حسینوں کو دوا دینی چاہیے، لیکن مشکل یہ ہے کہ

---

[1] ایک Dose یعنی دوا کی ایک خوراک۔

خنداں کے پاس جو مریض آتے تھے، وہ دعا کی حدود سے بھی نکل چکے ہوتے تھے۔ رہے حسین وہ خنداں کو اپنی جماعت کے لیے مستقل توہین نہیں تو آشوب ضرور سمجھتے تھے۔ غالب کی مشہور غزل ستم گر کہے بغیر، دشنہ وخنجر کہے بغیر سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ خنداں کی سنیے، فرماتے ہیں:

اچھا! پھر آپ غیر کے گھر جا رہے ہیں آج	اب مانتا نہیں ہوں میں اندر کہے بغیر
اس نے ذرا جو قتل کی خنداں کو دھونس دی	لے آئے غیر دوڑ کے خنجر، کہے بغیر
خنداں نے جب سے غیر کے چانٹے اُڑا دیے	گھستا نہیں ہے بزم کے اندر، کہے بغیر

خنداں باعتبار حلیہ ذرا نیازمند واقع ہوئے ہیں، لیکن غیر کے مقابلہ میں اکثر غیر کے باپ کو اس طور پر چیلنج دے دیا کرتے ہیں کہ خنداں کے دوستوں کو ان کے تیور کے سمجھنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

دربان کا جو باپ بھی آئے تو غم نہیں
اُٹھتے نہیں ہیں اب تو تری رہ گزر سے ہم

ایک جگہ اور غیر کے باپ کو چیلنج دیا ہے لیکن سر رہ گزر نہیں بلکہ آفس سے۔

تو کون ہے آہوں سے مجھے روکنے والا
آفس ہے ترے باپ کا یہ گھر تو نہیں ہے

بعض لوگ آج کل ریسرچ کے سلسلے میں بڑی بڑی موشگافیاں کرتے ہیں اور شاعر کے کلام سے شاعر کے باپ دادا اور اس کے پیشے اور مشاغل، امراض اور حلیہ کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک بار خنداں کے منہ سے نکل گیا تھا:

کوئی پتھر نکلوائے تو بس ہم سے نکلوائے
کہ فن طب میں خنداں پیشۂ فرہاد کرتے ہیں

خندانیوں کو بڑی فکر تھی کہ اس شعر کو خنداں کے مسلک سے کیسے متوازن کیا جائے۔ اسی تلاش اور جستجو میں خنداں کا ایک اور شعر نظر آیا۔ یعنی:

غیر سمجھے تھے یہ خنداں کو کہ بس حلوا ہے
منہ جو آئے تو عجب کلفت دنداں نکلا

اس کے بعد دقتیں اور بڑھ گئیں اور خنداں کی طرف سے مایوسی ہونے لگی تھی کہ ایک جگہ نسخہ پر یہ اشعار لکھے ہوئے پائے گئے۔

کہتے ہیں ترے پاس کھیر تو نہیں ہے
اٹکا ہوا ان کے کوئی پتھر تو نہیں ہے

عشق و عاشقی کی ایسی مجازی تعبیر بہت کم دیکھی گئی ہے۔اس کے بعد کے اشعار بھی کافی معنی خیز ہیں۔فرماتے ہیں:

کیوں میری بلا جائے بلاتا ہے جو ہر دم
خنداں کوئی اس شوخ کا نوکر تو نہیں ہے

انھیں باتوں کا اثر تھا کہ لوگ خنداں سے کافی مرعوب ہو چکے تھے مثلاً:

آتا ہے کبھی غیر تو دروازہ پہ پہلے
یہ پوچھے ہے خنداں کہیں اندر تو نہیں ہے

لیکن رسوائے محبت کے سلسلے میں اکثر یہ بھی پیش آیا ہے:

غیر کو ساتھ لیے آپ تو اندر بیٹھے — اور خنداں کو دیا حکم کہ باہر بیٹھے
بھیجا پیغام کہ خنداں ہے ابھی تک بیٹھا — سُن کے دربان سے کہنے لگے بہتر بیٹھے
آخرش اُٹھ کے چلے آئے بصد حسرت و یاس — غیر اندر ہو تو کیسے کوئی باہر بیٹھے

خنداں نے ایک قسم کا روحی رقص بھی دکھایا ہے۔جن لوگوں نے اس رقص کو دیکھا ہے، وہ خنداں کی شاعرانہ صفائی اور ریاضت کی داد یقیناً دیں گے۔کہتے ہیں:

مے کدے سے کیسے آئے کیا کہیں — نشہ میں سرشار اُٹھتے بیٹھتے
میں نہ جانے دوں گا اپنے گھر سے آج — آپ ہیں بے کار اُٹھتے بیٹھتے
کیسے خنداں زندگی کیسے کٹے — جب خفا ہو یار اُٹھتے بیٹھتے
زندگی کا کیا ٹھکانہ غیر آج — ہو گیا فی النار اُٹھتے بیٹھتے
وہ خنداں تم نے باندھے کس قدر — آج مارا مار اُٹھتے بیٹھتے

اس کے ساتھ ذرا اس مطلع کے ترنم اور رقص ترکیب کی داد دیجیے۔

پھرتے ہیں مارے مارے بیدادِ آسماں سے

آوارہ خانماں سے گم کردہ آشیاں سے

اس شعر کے سننے کے بعد ''خندانیت'' کی طرف کس کا ذہن منتقل ہوگا، لیکن کب تک،

آخر میں فرماتے ہیں:

تم کو ہوئی نفرت خنداں سے نوجواں سے

بہتر اب اس سے کوئی لائے کہو، کہاں سے

دشمن کے گھر سے دلبر آتا تھا رات چھپ کر

خنداں وہ سخت جھینپا ہم دیکھ کر جو کھانسے

قابو میں اپنے خنداں آ ہی گئے وہ آخر

کچھ ان کا میل خاطر کچھ یار خاں کے جھانسے

تعطیلوں کا زمانہ تھا۔ خنداں کو طبابت سے ذرا فرصت ملی تو طبیعت گدگدائی، فرمایا:

یہ کہنا ان سے اے قاصد کہ کالج میں تو چھٹی ہے

چلے آؤ کہ خنداں آج کل بالکل اکیلا ہے

معلوم نہیں کہ وہ آئے یا نہیں، لیکن اس سلسلہ کا آخری شعر ایسا ہے جس سے پتہ چلتا

ہے کہ خنداں کا پروگرام کچھ کامیاب نہیں ہوا۔ فرماتے ہیں:

بجز نقصان کے کب کچھ ملا ہے دل لگانے میں

اجی چھوڑو اسے خنداں بڑا اس میں جھمیلا ہے

ایک جگہ اپنی طبابت اور حذاقت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً:

عجب انفلوئنزا کا تھا زور شور — عدو سارے نذرِ اجل ہوگئے

طبابت میں خنداں کی ایسی چلی — کہ آخر حریف اجل ہوگئے

جناب ڈاکٹر خنداں بھی شاکی ہیں گرانی کے

وبا کے دور میں حضرت نے گو خاصی رقم ماری

ایک جگہ تو کمال ہی کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:

غیر کو دیتے ہیں اب اس کے اعزا یہ صلاح
آخری وقت میں خنداں کی دوا اور سہی

شاعروں نے زاہدوں کی ہمیشہ خبر لی ہے۔ خنداں نے بھی اپنے رنگ میں ایک شعر کہا ہے۔ یعنی:

تیرے معیار معیشت سے خطر ہے زاہد
خلد میں بھی نہ تری سے کہیں ٹھرا نکلے

ایک دوسری ردیف اور قافیہ میں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آفس کی سمت دیکھیے جاتا ہے تیز تیز
اس شوخ کا نہ خط کہیں لایا ہو ڈاکیا
خنداں یہ کوتوال کا آفس ہے یا کہ بزم
دشمن تمام رات سنا ہے پٹا کیا
بگڑے ہوئے بہت تھے مگر ہنس پڑے وہیں
چلمن سے جھانک کر جو نہیں خنداں نے تا کیا
خنداں ہے غیر ساکن ''معلوم کچھ نہیں''
کہتا ہے اتفاقیہ کو ''اتفاکیا''

اب ذرا خنداں کا ''جانا'' ملاحظہ فرمائیے: یہ سواری روزمرہ

میں نے ان سے جو کہا آیئے کچھ ٹھہریئے نا
جھینپ کر ناز سے کہنے لگے 'ہم جاتے ہیں'
کہیں ان باتوں سے خنداں نہ بھرم کھل جائے
شام سے آپ جو کہتے ہیں کہ ہم جاتے ہیں
غیر نا کے پہ کھڑے ہیں تو کھڑا رہنے دو
جو کوئی روک سکے روک لے ہم جاتے ہیں

نہیں معلوم کہ کیا زور ہیں خنداں اس کے
اب تو ہم بزم میں اس شوخ کے کم جاتے ہیں

خنداں نے ایک جنگ نامہ بھی لکھا ہے۔ غالب پہ ہاتھ صاف کرتے کرتے انیس ودبیر کے میدان میں کھیت ہو گئے۔ اس جنگ نامہ کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے، لیکن اس کے دُہرانے کا موقع نہیں ہے۔ آپ ایک آدھ بند سنیے۔

اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

اک شہ سوار عرصۂ ہمت نکل پڑا — خورشید آسمانِ جلالت نکل پڑا
ضرغامِ نیستانِ شجاعت نکل پڑا — تمساحِ بحر صولت وشوکت نکل پڑا
اب دہر نور عدل سے معمور ہو گیا
دنیا سے دور جور وستم دور ہو گیا

دشمن کے کرتوت بیان کرتے ہیں:

دنیا میں جنسِ رنج والم بانٹتا تھا وہ — گنجینۂ جفا وستم چھانٹتا تھا وہ
روز ایک طرز جور نیا چھانٹتا تھا وہ — کہیے جومنہ سے کچھ بھی تو پھر ڈانٹتا تھا وہ
القصہ اس کے ہاتھ سے جب تنگ ہو گئے
سب لوگ مل کے مستعد جنگ ہو گئے

رجز ملاحظہ ہو:

ٹھوکر کی اپنی میں جو ذرا سی تھپیڑ دوں — لوہے کا ہو پہاڑ تو جڑ سے اُکھیڑ دوں
دشمن جو آئے سامنے چمڑی اُدھیڑ دوں — مردود کو زمین میں یک سر گھسیڑ دوں
لے آئے غیر فوج کی ایک بھیڑ بھاڑ بھی
تھمتا نہیں کبھی مرے آگے پہاڑ بھی

خنداں کے مطب میں ہر مرض کی دوا علاحدہ علاحدہ ظروف میں رکھی ملے گی۔ ہر شیشی یا بوتل پر دوا کا نام لکھا ہوا ہے، لیکن ایک مرتبان سب سے علاحدہ ہے۔ اس پر صرف متفرقات لکھا ہوا ہے۔ خنداں سے اس مرتبان کا راز پوچھا گیا، تو پہلے اظہارِ تخلص (یعنی تبسم) کیا،

اور پھر فرمایا۔ بعض مرض یا مریض ایسے آتے ہیں جن کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا اور نہ سمجھ میں آتا ہے۔ اسی طور پر بعض دوائیں ایسی ہیں جن کے خواص یا ماست نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے میں نے اس مرتبان کے اجزا کو متفرقات میں داخل کر دیا ہے، یعنی یہ نامعلوم اور غیر متعین مرض یا مریض کے کام کی ہیں۔ چنانچہ اسی اصول پر بعض اشعار بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

غیر عاجز ہو گئے خنداں سے جب — وصل دلبر کی صلائے عام دی
کیا کہوں اس سے بھلا احوال دل — بات کرتے ہی مجھے دشنام دی

اپنی گت اور عدو کی شکستہ حالی کا نقشہ ذوق کی غزل پر کھینچا ہے:

خنداں کی گھا گھیت کو عدو کیا پہنچ سکے
اُلّو ہے اک سراغ سے دور اور شکستہ پر

جب سے ہم اہل توکل ٹھہرے — سوٹ پہنے بھی تو فرغل ٹھہرے
نہ ہوا یاروں کا اُلّو سیدھا — زاغ اغیار کے بلبل ٹھہرے

دو چار شعر ذرا گھلاوٹ کے سنیے:

غیر اور اس سے پیار کی باتیں — دیکھنا اس چمار کی باتیں
پھر سنا اور مجھے سناتا رہ — میرے قاصد نگار کی باتیں
آخرش کام کر گئیں خنداں — بھولی بھولی نگار کی باتیں
نوجوانی میں حضرت واعظ — ہم سے روز شمار کی باتیں

اب خنداں کی ایک غزل اور سن لیجیے اور میری تقصیر معاف فرمایئے۔

دشمن جو اڑا ہوا کھڑا ہے — خنداں بھی ڈٹا ہوا کھڑا ہے
خنداں سے یہ جل کے بولے اغیار — جب دیکھو گھسا ہوا کھڑا ہے
ہے آج مزاج اس کا برہم — غصہ میں بھرا ہوا کھڑا ہے
عشاق میں کھلبلی مچی ہے — جو ہے وہ چھپا ہوا کھڑا ہے
یہ دیکھ کے آج بزم کا رنگ — خنداں بھی پھٹا ہوا کھڑا ہے
محو رُخ یار ہے ہر اک شخص — تمثال بنا ہوا کھڑا ہے

جو بیٹھ گیا وہ پھر نہ اُٹھا جو اُٹھ کے کھڑا ہوا کھڑا ہے
خنداں بوسے اُڑا رہے ہیں اور غیر گھٹا ہوا کھڑا ہے

خنداں کے کلام کا انتخاب ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ریڈیو سننے والوں کا انتخاب بھی ممکن نہیں ہے۔ ہزاروں اشعار ایسے ہیں جو کاغذ پر سے زبان پر نہیں منتقل ہو سکتے۔ اتنے ہی ایسے ہیں جو زبان سے صفحہ کاغذ پر نہیں منتقل ہو سکتے اور مشکل یہ ہے کہ یہی اشعار ایسے ہیں جو خنداں کی جدت طبع کا پورا پورا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔

ریڈیو سننے والوں کی طرف سے مجھے کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ لیکن معلوم نہیں کس کا مزاج کیسا ہے۔ کون کس قماش کا ہے۔ کون خوش ہو اور کون بُرا مان جائے۔ اس لیے اگر خنداں کی شاعری اور شعریت کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے تو ہرج نہیں۔ سننے والوں کا احترام اور اپنی خیرو عافیت بہرنوع مدنظر رکھنی چاہیے۔ خنداں ان امور کو ایک بار نظرانداز کر گئے جس کا انجام ذرا عبرت ناک ہوا۔ جس کا انھوں نے ''استعارۃً'' ایک جگہ اشارہ کیا ہے۔

وہ تاکتے تھے غیر کو خنداں اُلٹ گئے
کتنا پڑا ہے دیکھیے تیر نظر غلط

گو اس کے ساتھ ساتھ خنداں کے منظور نظر کی آنکھوں کی ساخت کے بارہ میں بھی کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔

(نشریہ)

●●●

ایڈیٹر

تکلف برطرف میں سب سے پہلے اپنی ایک پیدائشی کمزوری بتا دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ مجھے اپنے حلیے بُشرے پر بہت کم اعتماد رہتا ہے اور ممکن ہے یہی سبب ہو کہ میں دوسروں کے حلیے بشرے کا مطالعہ شوق اور اتنی ہی عجلت سے کرتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے اخذ کیے ہوئے نتائج بیش تر غلط ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے اپنی یہ عادت بہت پسند ہے۔ یہ بات آپ کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہوگی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تو سوچئے کہ انسان سے غلطی کرنے کا امکان اُٹھالیا جائے تو انسان انسان کب رہ جائے۔ وہ کچھ ایسی چیز بن جائے جس کو نہ اشتہاری دواؤں سے دلچسپی باقی رہے اور نہ چیکوسلوواکیہ سے۔

اسی شب برات کا واقعہ ہے، میں حلوا کھاتا، آتش بازی چھوڑتا، پاس کی مسجد میں اذان دینے جا رہا تھا کہ مجھے راستے میں ایک بزرگ ملے۔ شکل عین میں سقراط کی، جثہ خانساموں کا، بات بھٹیاروں جیسی اور بحیثیت مجموعی ایسے کہ انھیں دیکھ کر نوجوان آمادہ فساد ہوں، مہاجن چوکنے ہوں اور پولیس والے سیٹی بجا کر گرفتار کرلیں۔ میں نے سلام کرنے میں سبقت کی۔ انھوں نے جواب دینے میں تامل کیا۔ میں نے سمجھا یہ مسجد میں جوتیاں چُراتے ہیں۔ پھر سلام کا جواب بھی نہیں ملا تھا۔ مجھے فوراً محسوس ہوا کہ دین خطرہ میں ہے۔ میں نے جرأت کر کے قدم بڑھایا، لیکن جرأت وہیں تک کی جہاں ہر جرأت خطرہ سے خالی اور مصلحت سے پُر ہوتی ہے۔

میں نے اپنے دوست کو اپنی طرف مائل کیا، وہ اس طور پر کہ ان کے قریب پہنچ کر اور انھیں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نہایت رازدارانہ لہجہ میں بولا۔ ''بھئی معاف کرنا کوکین کی کیسی رہے گی'' وہ یک بہ یک اس طور پر ٹھٹکے گویا کوکین تو ضرور کوئی قابلِ اعتراض چیز تھی، لیکن اس کا ذکر چھیڑنا میری شرافت کی بیّن دلیل۔ تھوڑی دیر تک تو ہم نے انگریزی تہذیب کے مطابق گفتگو کی۔ یعنی موسم اچھا تھا یا بُرا، آج کا اخبار دیکھا یا نہیں۔ دونوں کی بیویاں پیانو کیسا بجاتی ہیں، اور دونوں کے اولڈ گوز ''بوڑھے قاز'' یعنی باپ کب تک بقید حیات رہیں گے وغیرہ۔ اس کے بعد ہندستانی تہذیب پر اُتر آئے، یعنی قوم کی تباہ حالت پر قوم کو گالی گلوج اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ اپنے اپنے امراض ایک دوسرے کو بتائے اور ان کے مختلف طریقۂ علاج پر حکیم یا ڈاکٹروں کو بُرا بھلا کہا۔ لڑکی کے شوہر اور لڑکے کے روزگار نہ ملنے پر ایک دوسرے سے ہمدردی کی اور تھوڑی ہی دیر میں ایسے شیر و شکر ہو گئے جیسے امن عالم کے قیام و بقا اور تہذیب انسانی کی نگہ داشت کی خاطر بڑی بڑی حکومتیں نیاز مند حکومتوں کو صبر و شکر کی تلقین کرتی ہیں، اور خود بھی صبر و شکر کے ساتھ اسلحہ جات جنگ کی مزید فراہمی پر غور کرنے لگتی ہیں۔

مسجد پہنچ کر ہم نے مزید گفتگو شروع کی۔ سقراط بولے، ''بھئی دیکھو یورپ میں جنگ چھڑنے والی ہے اور ہندوستان میں جلسے ہو رہے ہیں۔ یہ بڑے اچھے آثار ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ تم مؤذن ہو، پیشہ ظاہر ہے، نہایت مبارک ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمھارے اطوار ایسے ہیں کہ پلِ صراط سے تو درکنار چاندنی چوک سے بھی صحیح سلامت نہیں گزر سکتے۔ میری ایک اسکیم ہے۔ تمھارے بشرہ سے پتہ چلتا ہے کہ تم اس اسکیم میں بڑی خوبی سے کھپ جاؤ گے۔ سب سے بڑی خوبی تم میں یہ ہے کہ تم کو دیکھ کر غصہ آتا ہے اور تم سے مل کر ہلسی آتی ہے۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ تم موذن ہو یعنی گھر پر فاقہ ہی کیوں نہ کرتے ہو بلند بانگ ہونے سے باز نہ آؤ گے۔''

میں اپنے بارے میں یہ معقول باتیں ایک نامعقول شخص سے سُن کر سوچ میں پڑ گیا۔ مجھ جیسے آدمی کا سوچ میں پڑنا ہی قیامت تھا۔ سقراط نے اُٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور بولے، ''دیکھو اس وقت تمھارے چہرہ سے ایک عزم کا اظہار ہو رہا ہے۔'' اب تک سوچ میں پڑنے کو عزم بتانا میں نے کبھی نہیں سُنا تھا، لیکن چوں کہ یہ بات مجھی سے متعلق تھی اس لیے میں نے زیادہ

چھان بین نہ کی اور ہمہ تن سقراط کی اسکیم سننے پر آمادہ ہو گیا۔ سقراط بولے، ''دیکھو جب رزق اور موت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ہندوستان میں اخبار نویسی کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اخبار نویس ہو جاؤ۔ تم تو مولانا حالی مرحوم سے واقف ہو۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ غور سے سنو!

کسی شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جا کر کہا کہ مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو نہ بہت بڑے قد کا۔ جب راستہ صاف ہو تو اُچھلتا کودتا چلے اور جب راستہ میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اُٹھائے۔ نہ دیوار و در سے اڑتا چلے، نہ گنجان درختوں میں سوار کو لے کر گھس جائے۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھر اؤ دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے اور جب تھان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے۔

سوداگر نے جواب دیا، چند روز صبر کرو۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا؛ آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں کہ'' آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اس کو قاضی کی جگہ اخبار نویس کا نام لینا چاہیے۔''

اس کے بعد سقراط نے نہایت سنجیدہ ہو کر کہا، مولانا حالی کے زمانے میں اس قسم کے اخبار نویس ہوتے ہوں گے، لیکن وہ عہد گزر گیا۔ ان شرائط کو آج کل اخبار نویس نہیں بلکہ شوہر پورا کرتے ہیں۔ میں تم کو بعض نہایت مجرب اصول بتاؤں گا، جن کی پیروی کر کے ایک اخبار نویس بہت نام ور بن سکتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ آج کل اخبار نویس کو بعض حواسوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً آنکھ اس کے لیے بالکل زائد ہے۔ اس کا کام کان سے لیا جا سکتا ہے۔ بس جو سُنا لکھ دیا۔ گو ایسی حالت میں اکثر ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ ایڈیٹری شروع کرتے وقت کانوں کا جو سائز ہوتا ہے، وہ ایڈیٹری ختم کرتے کرتے بہت بڑھ جاتا ہے۔ مجھے چوکنا ہوتے دیکھ کر سقراط نے کہا،'' کان کھڑے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ کان کے دو بڑے نقص ہیں۔ ایک تو ان کا کچا ہونا دوسرے ان کے کھینچے جانے کا احتمال۔ تم تو جانتے ہو جو کان کے کچے ہوتے ہیں، ان کے کان بھی کھینچے جایا کرتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی میں نے کان ڈال دیے اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ سقراط نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،'' اخبار نویس کو اس اصول پر

چلنا چاہیے کہ اخبار سے کسی کو فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے، اخبار کو برابر فائدہ پہنچتا رہے۔ اخبار نویس کو کوئی ایسا موقع نہ دینا چاہیے جس سے اس پر سمن یا نوٹس تعمیل ہو، بلکہ اس کے اخبار کے ذریعہ سمن اور نوٹس دوسروں پر تعمیل ہوتے رہیں۔ اخبار نویسی شروع اس طور پر کرنی چاہیے جیسے دین خطرہ میں ہے۔ قوم فنا ہورہی ہے۔ حکومت ناشدنی اور قابلِ گردن زدنی ہے، لیکن ختم یوں کرو گویا تم نے دین کی خاطر یا قوم کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں اخبار بند کر دیا اور بینک میں حساب کھول دیا۔

ایک غلط فہمی یہ ہے کہ اخبار حکومت اور رعایا کے باہمی تعلقات کو ٹھیک رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ باتیں دنیا کے کسی حصہ میں پائی جاتی ہوں، لیکن دنیا ہی کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جہاں اخبار ایسے لوگ نکالتے ہیں جو بہت کم لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ ان کے خریدار پڑھنے لکھنے کے معاملہ میں اور بھی نیاز مند ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا ایک اخبار کے ایڈیٹر پر مقدمہ چلا۔ وارنٹ جاری ہوا تو ایڈیٹر صاحب اپنے گاؤں میں دوسرے کا کھیت جوتتے ہوئے ملے۔ عدالت میں لائے گئے تو پتہ چلا کہ لکھنا پڑھنا تو درکنار نشان انگوٹھا کی اہمیت سے بھی ناآشنا ہیں۔ اصلی ایڈیٹر وہ تھے جو مدعی کے وکیل تھے۔

سقراط نے سلسلہ کلام قائم رکھتے ہوئے اپنا ایک واقعہ سنانا شروع کیا۔ آپ بھی سنیے۔ ''میرے ایک پٹھان دوست اپنے زمانہ کے بڑے جلادا ایڈیٹروں میں شمار ہوتے تھے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ جب کوئی بڑا جلسہ ہونے والا ہوتا تو نہایت اچھے کپڑے پہن کر ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر ایڈیٹروں اور نامہ نگاروں کی گیلری میں جا بیٹھتے۔ جلسہ ختم ہوتے ہی سیدھے گھر واپس آتے اور مجھے راستہ سے پکڑ لیتے۔ ایک بوسیدہ مکان میں ان کا پریس تھا اور وہیں قیام بھی فرماتے۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کوئی خدمت گار بھی نہیں۔ سارے کپڑے اُتار کر کھونٹی سے لٹکا دیتے، صرف لنگوٹ زیب تن رہنے دیتے۔ سب سے پہلے حقہ بھرتے، اس کے بعد چھاپے کا ایک پتھر دوسرے پتھر پر رکھ کر ایک دوسرے کو گھسنا شروع کرتے اور مجھ سے کہتے، ہاں بھئی پتھر صاف کرلوں۔ تم ایک چار صفحے کا مضمون تو آج کے جلسہ پر لکھ ڈالو۔ میں نے کہا، آپ تو جلسہ میں موجود تھے، کچھ روئداد لکھ لائے۔ بولے، شرارت مت کرو، میں تو بغیر ٹکٹ کے جلسہ

میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ دیکھو جلدی لکھ ڈالو، میری طرف سے آج سنیما ہو آنا۔ میں نے کہا، کچھ تو بتایئے آخر لکھوں کیا۔ بولے، جی کوئی نئی بات تھوڑی ہی ہے۔ وہی ساری باتیں جو اخبار میں لکھی جاتی ہیں۔ جی چاہے تو یہ پُرانے اخبار پڑے ہیں دیکھ ڈالو۔ میں نے کہا، خاں صاحب کچھ تو معلوم ہو کہ کیا ہوا۔ کہنے لگے، میاں ہوتا کیا ہے۔ اچھا سُن ہی لو۔ اس کے بعد جو جی میں آئے لکھ ڈالنا۔ بات یہ ہے مجمع بہت تھا اور پنڈال چھوٹا۔ صدر صاحب ایک پاؤں سے لنگ کھاتے تھے اور دوسری آنکھ سے بھینگے تھے۔ مجمع اُن کو دیکھ کر جوش میں آ گیا۔ عنقریب بلوہ ہو جاتا کہ پولیس پہنچ گئی۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ مفسدوں نے اصلی صدر کو بدل دیا اور ایک نقلی صدر لا بٹھایا تھا۔ بالآخر اصلی صدر کے حلیہ سے موجودہ صدر کا حلیہ ملایا جانے لگا۔ چنانچہ ہیڈ کانسٹبل کی نگرانی میں موجودہ صدر کو دس پانچ آدمیوں نے خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور آزمایا۔ بالآخر طے یہ پایا کہ صدر کے معاملہ میں گول مال ہوا ہے، لیکن کام ان سے بھی چل سکتا ہے۔ یعنی شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اس مصرعہ پر حاضرین نے صدر زندہ باد کا نعرہ لگایا، نظمیں پڑھی جانے لگیں، تالیاں بجنے لگیں۔ ہار پھول پہنائے جانے لگے کہ ایک قلفی والے نے آواز لگائی۔ ایک صاحب کا بچہ قلفیوں کے لیے مچل گیا۔ انھوں نے مجمع کے اندر ہی سے قلفی والے کو آواز دی۔ صدر نے قلفی والے کو ڈانٹا۔ بچہ کے والد صاحب نے سمجھا کہ یہ ان کی قلفی حاصل کرنے کی آزادی میں خلل اندازی تھی۔ للکار کر بولے، یہ جلسہ آزادوں کا ہے۔ آزادی پر جان دینے والوں کا ہے۔ ہماری آزادی کو دنیا کی کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ مجمع نے نعرہ لگایا۔ بے شک بے شک آزادی خطرہ میں ہے۔ قلفی ضرور کھائی جائے گی۔ دغا بازوں کا ستیاناس ہو۔ قریب تھا کہ مار پیٹ ہو جائے۔ جناب صدر نے نہایت پاٹ دار آواز سے گانا شروع کر دیا۔ مجمع نے بھی گانا شروع کر دیا۔ قلفی والا بھاگا اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد جناب صدر نے قوم کی حالت پر اور حاضرین نے صدر صاحب کی معلومات پر ایسے دردناک لہجے میں ماتم کیا کہ سارا مجمع واویلا کرنے لگا۔

''جناب صدر کی اچکن میلی، پاجامہ ملگجا، غرارہ دار، ایک آنکھ پتھرائی اور دوسری غالباً مصنوعی تھی۔'' میں نے ٹوکا اور کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے فرمایا۔ ''بھئی لکھ ڈالو۔ بحث کا موقع نہیں۔ کاپی میں درست کر دینا، ورنہ پتھر پر تصحیح ہو جائے گی۔'' میں نے عرض کیا، لیکن یہ

تو بتایئے کہ خطبہ میں کیا تھا۔ کہنے لگے، "میاں تم اس پھیر میں پڑو۔" خطبہ میں کیا تھا وہی۔ "بڑے افسوس کی بات ہے۔" "ڈوب مرنے کا مقام ہے۔" "خواب غفلت" "غلامی" "بھوک" "ہم دنیا پر حکومت کریں گے" "ہم سب کو کچا کھا جائیں گے" "سب کچھ خطرہ میں ہے" "ہندوستان جنت نشان"، "بھائیو اہلِ اسلامو" میں رُکا اور عرض کی، جناب اس میں واؤ زائد ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے جھلا کر کہا، "تم سے کہہ چکا بکواس نہ کرو۔ کاپی یا پتھر پر سے واؤ ہی نہیں داؤ کی سات پشت غائب کر دینا۔ اس وقت تو لکھ چلو، اور ہاں کہیں موقع سے یہ بھی لکھ دینا کہ "پولیس کا انتظام بہت اچھا تھا۔ کلکٹر صاحب کے اقبال سے کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائی۔ ڈپٹی صاحب اور تحصیل دار صاحب کو بھی پوچھ کچھ دینا، اور ہاں یہ بھی لکھ دینا کہ پریس کے قریب گندا نالا ہے۔ سڑک خراب ہے، روشنی غائب ہے، چوہے مر رہے ہیں۔" میں نے کہا، یہ سب خطبہ صدارت ہی میں آ جائے۔ "بولے اور کیا۔" میں نے کہا، اچھا تو بس کیجیے۔ اب ذرا یہ البتہ بتا دیجیے کہ تقریریں کیسی ہوئیں۔

بولے، "ہاں خوب یاد دلایا وہ مسخرا تو رہا ہی جاتا ہے۔ دیکھو وہ بھلا سا نام ہے۔ خیر نام بعد میں لکھ لیا جائے گا۔ صدر کا خطبہ ختم ہونے کو ہی تھا کہ یہ مسخرہ چیختا ہوا ڈائس پر پہنچا۔ بڑے گندے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ پان کی پیک سے تمام لباس داغ دار تھا۔ شکل سے سرکس کا جوکر معلوم ہوتا تھا۔ چلّایا، بھائیو! دین دھرم چوپٹ ہو گئے۔ یہ سب تعلیم کا اثر ہے۔ ہمارے تمھارے باپ دادا کی روح بھٹک رہی ہے اور تم سب بیٹھے ہوئے ہو۔ مجمع سے نعرہ بلند ہوا، 'ہم نہیں بیٹھے رہیں گے ہم جان دے دیں گے۔' اتنے میں مجمع سے کچھ لوگ آگے بڑھے۔ صدر نے سمجھا ارواح کی یورش ہے۔ خود بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور انا اللہ پڑھ کر نعرہ مارا۔ بھائیو! جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا تو پکارے۔ بچو! اس پر بھی مجمع بڑھتا ہی رہا۔ گھبرا کر آواز بلند فرمایا۔ ہند کے سپوتو، دلاورو۔ اب مجمع میں مزید ہلچل پیدا ہوئی۔ اس پر سرکس کا مسخرہ ایک چیخ مار کر صدر کے سامنے کی میز پر جست کر کے کھڑا ہو گیا اور پکارا، تلوار اور آگ سے کھیلنے والے جاں بازو۔ جناب صدر کو سچ مچ کی تلوار اور آگ نظر آنے لگی اور فریاد کی۔ پولیس، پولیس اور خود بے ہوش ہو گئے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس غل پکار میں بدھن کے لونڈے نے مسخرے کی جوتیاں اور صدارت کی میز کا کپڑا بغل میں داب، 'دیکھو کوئی جانے نہ پائے' کہتا چلا تا مجمع سے صاف نکل گیا۔

میں نے مضمون تیار کر دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے پھر سے حقہ بھرا اور مضمون کی کتابت شروع کر دی۔ میں بولتا گیا وہ لکھتے گئے۔ ہجے مجھے بھی بتانے پڑتے۔ آخر میں معنی پوچھنے چھوڑ دیے، کہنے لگے۔ ''میاں چھپنے کے بعد سب صحیح ہو جاتا ہے۔ تم نے لکھا تو زور ہی کا ہوگا۔'' غرض شام تک کاپی لکھ، پتھر جما اخبار چھاپ کر نکال دیا۔

سقراط نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''دیکھو اخبار چلانے میں دقت ہو تو رسالہ نکالو۔ اس میں فرضی لوگوں کی طرف سے ایسے سوالات دریافت کراؤ جس کے جوابات ہمیشہ کتابوں میں لکھے ملتے ہیں۔ انھیں اپنے نام سے جواب کی صورت میں شائع کر دو۔ عورتوں کی طرف سے فرضی خطوط اپنے نام لکھوا اور جواب کی صورت میں ان فرضی عورتوں کو اس طرح ڈانٹو کہ سچ مچ کی عورتیں خط و کتابت شروع کر دیں۔ لوگ مہمل مضامین شائع ہونے کے لیے بھیجیں گے اور اسی شرط پر خریدار بنیں گے کہ وہ مضامین شائع کر دیے جائیں۔ تم کو چاہیے کہ ان کو ٹھیک ٹھاک کر کے شائع کر دو اور کچھ ستائشی کلمات بھی لکھ دو۔ یہ لوگ تمھارے لیے جان دینے پر تیار ہو جائیں گے اور تم کو ملک کا سب سے بڑا انشا پرداز ہی نہیں، بلکہ تمہارے بارے میں بعض ایسی باتیں بھی مشہور کر دیں گے جو تمہاری سات پشت گذشتہ یا آئندہ کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوں گی۔

''موجودہ عہد میں سب سے کامیاب اخبار وہ ہے جس میں نیم عریاں تصاویر، ناگفتہ بہ امراض کے دواؤں کے اشتہار اور ظرافت کی آڑ میں رکیک جذبات کی اشاعت کی جاتی ہو۔ جو نامہ نگاروں کی رائے کو بھلے مانسوں کی خاموشی پر ترجیح دے۔ جو معاملہ کی اصلیت پر نہ غور کرتا ہو، صرف عوام کی ذہنیت کا تابع ہو، جو اخبار کی اشاعت کو دوسروں کے ناموس پر مقدم سمجھے۔''

میں نے کسی قدر رو کر کہا۔ ''بھائی سقراط بس کرو، تمہارا لب و لہجہ اب ریڈیو کے بس سے باہر ہو چلا ہے اور سننے والے بھی کچھ اپنے بس میں نہیں معلوم ہوتے۔ بہت ممکن ہے ہم تم تو ریڈیو پر گفتگو کر رہے ہو اور یہ ریڈیو والے پولیس سے ٹیلی فون پر سرگوشی کر رہے ہوں۔ پھر تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ قیامت آنے والی ہے۔ رمضان شریف آپہنچے اور دہلی کی فضا خراب ہو چکی ہے۔ اس لیے خدا حافظ! (نشریہ)

●●●

شیخ پیرو

ہماری بستی میں دو اشخاص بہت مشہور تھے، ایک شیخ پیرو اور دوسری چھیتا خاتون۔ چھیتا سے ہر شخص ڈرتا تھا اور پیرو کو ہر شخص چھیڑتا تھا۔ چھیتا جدھر سے نکل جاتی ادھر کے کتے بھاگ جاتے تھے اور شیخ پیرو گھر سے نکلے نہیں کہ

شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد
بند سے دیوانہ رہا ہوگیا

چھیتا سے میں خود ڈرتا تھا اور اب بھی میری ہمت نہیں ہوتی کہ اُن کا تذکرہ آسانی سے کرسکوں، گو ان کو رحلت کیے ہوئے مدت ہوچکی۔ مگر وہ شہرت ہی کیا جو مرنے کے بعد تک قائم نہ رہے اور وہ ڈرنا کیسا جو ڈرانے والے کے بعد ہی ختم ہوجائے۔

پیرو غدر میں تھے اور اس کے فرو ہوجانے کے بعد بھی عرصہ تک زندگی کے ہنگامے کے تماشے دیکھتے رہے۔ اصل یہ ہے کہ غدر کے فرو ہوجانے کے کچھ عرصہ بعد تک غدر کی ہولنا کی قائم رہی۔ زلزلے کے بعد بھی زلزلے کے جھٹکے آتے رہتے ہیں۔ غدر سے بہت پہلے ہی پیرو وطن سے دور کھانے کمانے چل دیے تھے اور کچھ ایسے لاپتہ رہے کہ وطن میں ان کے رحلت کرجانے کی خبر مشہور ہوگئی۔ غدر ختم ہوا تو یہ عازم وطن ہوئے۔ ادھر پولیس والوں کو میرو نام ایک ڈاکو کے ظلم وستم سے بڑی پریشانی تھی۔ میرو کی گرفتاری کا انعام مقرر تھا، جس کے حاصل کرنے میں بہت

سارے گرفتاری حیات سے آزاد ہو چکے تھے۔ پولیس والے اس فکر میں تھے کہ آبرو بھی قائم رہے اور جان بھی اور میرو گرفتار ہو جائیں۔ پولیس والوں کے لیے یہ پوزیشن بڑی مشکل تھی، کیوں کہ ان پر تین فرائض عائد ہوتے تھے۔ میرو کو صرف اپنی جان کی فکر تھی اور جسے صرف جان کی فکر ہو، اس کا مقابلہ ایسا شخص کب کر سکتا ہے جسے جان کے علاوہ اور باتوں کی بھی فکر ہو۔ انسان جب بہت پریشان ہوتا ہے تو صرف دو باتیں کر سکتا ہے، یا جان پر کھیل جائے یا بے ایمانی پر اُتر آئے۔ گو اس دنیا میں ایسے بے ایمان بھی دیکھے گئے ہیں جو بے ایمانی کی خاطر جان پر کھیل جاتے ہیں۔ بعض ایسے نالائق بھی ملتے ہیں، جو بے ایمان ایمان دار ہوتے ہیں۔

لیکن ان باتوں کو چھوڑیے۔ رات کے وقت بے ایمانوں کی بحث چھیڑنے سے نیک بیویاں ڈراؤنے خواب دیکھتی ہیں اور نیاز مند شوہر ڈراؤنی صورتیں!

مشکل یہ تھی کہ پیرو آدمی مرنجاں مرنج تھے، لیکن شکل سے بڑے خونخوار معلوم ہوتے تھے۔ کالے، موٹے، سرخ سرخ آنکھیں، گنجان داڑھی کسی قدر سرخی مائل، آواز ڈراؤنی، بڑے مضبوط جیسے کوئی نیم سوختہ تناور ببول۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ ان کا خاندان غدر میں تباہ و تتر بتر ہو چکا تھا۔ پردیس سے ایسے چلے آتے تھے جیسے سنتے ہیں محشر میں عشاق خراماں ہوں گے۔ جو کچھ کمایا تھا وہ سب اپنے اوپر لادے ہوئے تھے۔ کئی پلسیری بان جسے پورب میں بادھ بھی کہتے ہیں، کچھ ناریل کھوپرے، ایک گٹھر کپڑوں کا، پان سات تانبے پیتل کے برتن، تھوڑی بہت نقدی، کچھ تماکو کے پتے، ایسا شخص جہاں سے گزرتا لوگوں کو دھوکا اور خطرہ ہونا حق بجانب ہوتا۔ چہ جائیکہ ابھی ابھی غدر ہو چکا تھا اور مفرور و مشتبہ لوگوں کی تلاش جاری تھی۔ پولیس والوں کو خبر ہو گئی، انھوں نے میرو کے بدلے پیرو کو گرفتار کر لیا۔ بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے، لیکن ایک پیش نہ گئی۔ ان کے خلاف ان کا حلیہ اور ان کی کمائی ہوئی چیزیں تھیں، جنھیں وہ لادے پھاندے آ رہے تھے۔

استغاثہ کی طرف سے یہ بیان کیا گیا کہ میرو اور پیرو کے لکھنے میں ممکن ہے کچھ اختلاف ہو، لیکن پڑھنے میں دونوں یکساں تھے۔ پیرو کو میرو پڑھ سکتے ہیں اور میرو کو پیرو۔ دوسرے یہ کہ پیرو کا حلیہ ایسا تھا جو پیرو کا ممکن ہے ہو یا نہ ہو، میرو کا ضرور ایسا ہی ہے۔ تیسرے یہ کہ

جو مال مسروقہ ان کے جسم پر مسلط تھا وہ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کے قبضہ سے بہ یک وقت برآمد ہوسکے۔ ملزم نے یقیناً مختلف لوگوں کو مختلف اوقات میں لوٹا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی سی بات تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ امن وامان اور تمدنی برکات کے عہد میں قانون کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اصل مجرم کا چھوٹ جانا اس سے بہتر ہے کہ بے گناہ سزایاب ہوجائے۔ اس لیے ملزم کا قصور مشتبہ ہو تو اسے رہا کردینا چاہیے، جس کو دوسرے الفاظ میں یوں کہتے ہیں کہ شبہ کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے۔ لیکن جہاں اور جس زمانہ میں امن وامان کا معاملہ کچھ یوں ہی سا ہو، وہاں کا دستور یہ ہوتا ہے کہ شبہ کا فائدہ پولیس کو دیا جائے۔ یعنی الزام مشتبہ ہو تب بھی ملزم کو احتیاطاً سزا دے دینی چاہیے۔

پیرو کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا جہاں یہ سزا پا گئے۔ ایک طول طویل فیصلہ کے آخر میں یہ درج تھا کہ میرو اور پیرو میں تجنیس خطی ہے، تضاد شخصی نہیں۔ ممکن ہے پیرو کوئی اور ہو اور میرو کوئی اور، لیکن جو شخص اس وقت عدالت کے سامنے لایا گیا ہے، وہ قرائن وقانون دونوں کے رو سے پیرو اور میرو دونوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے حاصل ضرب سزا ہے۔ قانون نام کا پابند ہے اور عدالت حلیہ کی۔ حاکم مسل دیکھتا ہے، واقعات سے بحث نہیں کرتا۔ حاکم کے نزدیک واقعہ وہی ہے جو مسل میں مقید ہو۔ واقعہ کے مقید ہوجانے کے بعد ملزم کا آزاد رہنا امن عامہ کے منافی ہوگا۔ غرض پیرو حلیہ پر سزا پا گئے، لیکن اس فیصلہ کا ردِ عمل یعنی Reaction ایسا ہوا کہ اُن تمام لوگوں نے جن کا حلیہ مشتبہ تھا اس پر سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ بعد میں عدالت نے حلیہ سے متاثر ہونا چھوڑ دیا اور ان تمام لوگوں کو جن کا حلیہ پیرو یا میرو سے ملتا جلتا تھا یا جن کی صورت دفعات تعزیرات ہند سے دور کی بھی نسبت یا مشابہت رکھتی تھی اُن سب کو ایک بڑی آفت سے نجات مل گئی۔ چنانچہ آج وہ تمام لوگ جو حلیہ کے اعتبار سے پیرو یا میرو کے نہایت قریبی عزیز معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے مناصب پر فائز ہیں کہ انھیں دیکھ کر پولیس اور عدالت دونوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے!

بے چارے پیرو سزا کاٹ کر آئے، غدر میں سارا گھرانا تباہ اور مکان مسمار ہو چکا تھا۔ شادی پہلے اس لیے نہیں کی تھی کہ کما کے آئیں گے تو کریں گے۔ اب ہو نہیں سکتی تھی، اس لیے کہ

جیل خانہ کاٹ آئے تھے اور پیسے پاس نہ تھے۔ اپنے ہی ویرانہ پر کھپریل ڈال لی جس میں دن رات بیٹھے حقہ پیا کرتے تھے، گالی بکا کرتے تھے، بوڑھاپا آ چکا تھا۔ کوئی آگے پیچھے نہیں تھا اور نہ کوئی آس پاس سے گزر سکتا۔ انہیں کی طرح بستی کا نکالا ہوا ایک کتا بھی وہیں آ کر ٹک گیا۔ ایک دن انھوں نے اُسے گھورا۔ اس نے دم ہلانی شروع کر دی۔ دونوں کی نظریں نیچی ہو گئیں اور بہت سے ایسے مسائل پل مارتے طے ہو گئے جو مدتوں نہ انٹروڈکشن سے طے ہوتے ہیں، نہ مشین گن سے۔ اب پیرو کو گھر کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو افیون شروع کر دی!

پیرو کے لیے یہ کتا سب کچھ تھا۔ ان کا خاندان، ان کا دوست، ان کا مکان، ان کی جائداد۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ خانہ داری کے خرخشوں سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے۔ ایک بوجھ تھا جو سر سے اُتر گیا تھا۔ خانہ داری کا جھگڑا ہی وہاں کیا تھا، لیکن کتے کی موجودگی کو وہ ایسا مہرہ سمجھتے تھے جو گرہستی کے ہر خانہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا۔ گرہستی خارج میں موجود نہ تھی، لیکن گرہست تو موجود تھا۔ گرہستی اس کے ذہن میں تھی۔ پیرو اپنی اسی ذہنی گرہستی کی بساط کی خانہ پُری کتے سے کر کے مطمئن ہو جاتے تھے۔ اس طور پر وہ دنیا کو دھوکا دے رہے تھے، لیکن اپنے سے سچے تھے۔

خوش ہوتے تو کتے سے باتیں کرتے، اس کو اپنے قریب جگہ دیتے، اسے ہر آنچ سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے آپ میں شجاعت و ایثار کے ولولے بیدار پاتے۔ حقہ پیتے تو کبھی کبھی دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے، وہ آنکھیں کھولنے بند کرنے لگتا تو مسکراتے اور اس وقت مسکراہٹ ان کے چہرہ پر ایسی ہی معلوم ہوتی جیسے گھوڑے پر جنگلی پھول۔ اس کے جسم سے جوئیں نکالتے، زخموں کے داغ پر ہلکے ہلکے اُنگلیاں پھیرتے۔ کتے کی رفاقت پر بھروسہ کرتے، اس لیے نہیں کہ اس سے ان کو کوئی امداد ملے گی بلکہ اس کی مدد خود کر سکیں گے۔ خود ملول ہوتے تو کتے کی دل دہی کرتے۔ خفا ہوتے تو اس پر بگڑتے، پھر تسلی دیتے اور نئی چلم بھرتے!

کتے کو وہ اپنا مکان سمجھتے تھے۔ محل بھی، جھونپڑی بھی، قلعہ بھی، ہوائی قلعہ بھی۔ وہ کتے کے اعضا، اس کی ساخت، اس کے جسم کی نیچ اونچ، اس کی گرمی و سردی، اس کی نرمی و سختی کو مکان کا نقشہ مکان کے در و دیوار، فرش اور چھت، کوٹھری اور برآمدہ، طاق اور گوشے، بوریا و بستر سمجھتے تھے۔ جیسے کوئی مکان میں رہتا ہے، یہ کتے میں رہتے۔ کتے کی مسکینی، کس مپرسی، وفاداری،

اس کا بھونکنا، اس کی آوارہ گردی، اس کی قناعت، صفات کے وہ مہرے تھے جو پیرو کی ذات پر قائم تھے۔

پیرو کی کمائی کا ذریعہ حقہ پلانا تھا۔ ایک جھولی میں کوئلہ تما کو ڈال لیتے، ایک ٹوٹا سا حقہ تھا جیسے کوئی بوڑھا مفلوج پہلوان۔ اسے لے کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ کتا ساتھ ہوتا، کبھی کتا آگے یہ پیچھے اور کبھی یہ پیچھے کتا آگے۔ یہ واقعہ ہر روز اس تواتر اور پابندی سے پیش آتا کہ لوگ کتے کو پیرو اور پیرو کو انھیں کا کتا سمجھنے لگے تھے اور دونوں کے مجموعہ کو حقہ کا ایک گہرا کش، تیز و تند بھی خوشبودار اور پُر کیف بھی، کثیف اور پُر اسرار بھی!

پیرو ہمیشہ کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہتے، لوگ سمجھتے کتے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ کتا سر جھکائے ساتھ رہتا اور اس طور پر ان کی باتیں سنتا جیسے کوئی تیماردار چڑچڑے یا غافل مریض کی ہذیان سنتا رہتا ہے۔ خود حقہ کسی کو نہ پیش کرتے، لیکن پینے والے پی لیتے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر شخص پیرو کو پہچانتا ہے اور ان کے مشن کو سمجھتا ہے اور پیرو ہر شخص کو جانتے اور اس کے مقصد سے آگاہ ہیں۔ کوئی اجنبی ہوتا تو پیرو گم ہو جاتے اور کتا کان کھڑے کر لیتا۔

جس کے جو دل میں آجاتا دے دیتا۔ یہاں تک کہ نانبائی اور قصاب کوئی ٹکڑا یا چھیچھڑا کتے کے سامنے پھینک دیتا تو پیرو اسے بھی اپنا معاوضہ سمجھ کر حقہ پلا کر آگے بڑھ جاتے۔ بستی کے لڑکے ان کو چھیڑتے، کوئی ان کو دیکھ کر چیختا چڑھاتا، کوئی ان کی جھولی کھینچ کر بھاگ جاتا۔ یہ ڈانٹتے گالی دیتے۔ کسی کو پکڑ لیتے تو حقہ کے چمٹے سے اس کی ناک پکڑنے کی دھمکی دیتے اور غراتے، لیکن سب جانتے تھے کہ یہ ہر لڑکے کو اپنا کتا سمجھتے ہیں۔ نہ نقصان پہنچائیں گے اور نہ نقصان پہنچنے دیں گے۔ لیکن اگر کوئی لڑکا کتے سے شوخی کرتا یا ستاتا تو پھر ان کے تیور ایسے ہو جاتے اور ایسی گھن گرج قسم کی آواز نکالتے کہ آس پاس کے سارے لڑکے اور کتے ادھر اُدھر بھاگنے لگتے!

بستی میں ہیضہ پھیلا، لوگ مرنے بھاگنے لگے۔ چند ہی دنوں میں ساری بستی سنسان ہو گئی۔ چوروں کی بن آئی، لوگ بیماری اور چوری کے بھنور میں تباہ ہونے لگے۔ پیرو اور ان کے کتے نے دن کے بجائے رات کو چکر لگانا شروع کیا۔ بیماروں کا علاج یا تیمارداری کون کرتا،

مردوں کو دفن کرنا جلانا مشکل ہوگیا۔ پیرو اور ان کا کتا ہر جنازہ یا اُرتھی کے ساتھ دیکھے جاتے۔
کہیں جنازہ کاندھے پر کہیں مردہ جلانے کی لکڑیاں سر پر۔

چور اور پیرو دونوں رات بھر بستی کا گشت لگاتے رہتے۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی، رات کا وقت تھا۔ آگے پیچھے کچھ سوجھائی نہیں دیتا تھا۔ رات زیادہ بیت چکی تھی۔ کہیں کہیں سے گھر گرنے یا مرنے والوں کے عزیز اقارب کے رونے پیٹنے کی آواز آجاتی تھی۔ پیرو حسب معمول کتے سمیت گشت لگا رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں بانس کا بڑا موٹا ڈنڈا دوسرے میں حقہ نظر تاریکی میں اور دھیان خدا جانے کہاں۔ ایک جگہ پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ کتا جھجکا، پیرو بڑھے۔ معلوم ہوا کچھ لوگ سرگوشی کر رہے ہیں۔ آوازیں یک بہ یک رُک گئیں اور ایک لاٹھی ہوا میں سنسناتی ہوئی پیرو کے بازو پر پڑی۔ حقہ چھوٹ پڑا، کتا بھونک کر پیچھے ہٹا، پیرو اندھیرے ہی میں سایہ پر جھپٹے۔ پھنکار کر، گالی دے کر۔ پیچھے سے آواز آئی۔ حقہ والا بدمعاش ہے۔ جانے نہ پائے۔ پیرو کچھ غصہ سے کچھ کراہ کر کچھ لاچار سے ہو کر بولے۔ ''ارے سامنے تو آ، بستی تباہ ہوگئی۔ حقہ والے بدمعاش کو اس مہامری میں کوئی پوچھنے والا تو ملا۔ بادلوں سے چاند نکل آیا۔ چاندنی پھیل گئی، اُلتیاں موتی رول رہی تھیں اور گلی میں گندا گدیلا پانی بہہ رہا تھا۔ پیرو کا مقابلہ تین آدمیوں سے تھا۔ ہر ایک کے پاس لاٹھی اور کلہاڑی تھی۔ ان کے پاس بانس کا ڈنڈا، کتا ٹانگوں سے لپٹا ہوا۔ یہ اس فکر میں کہ کتا دور ہو تو دشمن سے اُلجھیں۔ جب خطرہ بڑھا تو قوت فیصلہ بیدار ہوئی۔ جھکے اور کتے کی ٹانگ پکڑ کر سامنے چھت پر پھینک دیا۔ اسی دوران میں دشمن نے ایک لاٹھی رسید کی، پیرو نے بروقت وار خالی دیا، لیکن ان کے بانس کے پرخچے اُڑ گئے۔ لاٹھی ہوا کو چیرتی ہوئی ٹین کے ایک سائبان کے لکڑی کے ستون سے ٹکرائی۔ ایک تڑاقا ہوا جیسے بجلی کسی درخت پر گری ہو۔ سائبان کا گرنا پیرو کے لیے تائید غیبی ہوا۔ انھوں نے ستون اُٹھالیا اور آنکھ بند کر کے ایک ہاتھ رسید کیا تو حریف زمین سے اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور بتاشے کی طرح زمین پر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اتنے میں بقیہ دونوں نے کلہاڑی سے حملہ کر دیا۔ پیرو نے ایک کی ضرب کو ستون کے الجھیڑے سے رد کیا دوسرے کا وار کمر پر پڑنے والا ہی تھا کہ چھت پر سے کتے نے ایک حزین آواز کے ساتھ جست کی اور کلہاڑی اور پیرو کی کمر کے درمیان آگیا۔ کتے کا تو وہیں

خاتمہ ہو گیا، لیکن کلہاڑی پیرو پر بھی اپنا کام کر گئی۔ پیرو نے کتے کا انجام دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے ان میں کسی عفریت کی روح حلول کر گئی ہو۔ ستون پھینک دیا، کلہاڑی کو ہاتھ سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو حریف چکرا کر قریب آ گیا۔ غرا کر دونوں ہاتھ سے گردن پکڑ لی، اک ذرا دیر کے لیے گرفت کو تولا اور پھر ایک نہایت ہی بھیانک قسم کا نعرہ لگا کر دشمن کو ہوا میں چکر دے کر تیسرے کے اوپر دے پٹکا۔ یہ ساری باتیں چند ہی سکنڈ میں ختم ہو گئیں۔ تینوں حریف اور کتا زمین پر خون اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

پیرو نے کراہ کر کتے کو اُٹھا لیا۔ تھوڑی دور لڑکھڑاتے چلے، پھر گر پڑے۔ ہوا کا ایک تیز سرد جھونکا آیا اور نکل گیا۔

صبح کے وقت خبر مشہور ہوئی کہ پیرو مارے گئے۔ ان کے جنازہ میں بستی کے تمام لوگ تھے جو مرنے سے بچ رہے تھے یا جو بھاگ گئے تھے۔ پیرو کو سپرد خاک کر کے لوگ براہِ راست اپنے اپنے گھروں کو واپس آئے۔ کیوں کہ عوام کا عقیدہ تھا کہ بستی کے سب سے بڑے آدمی کے مر جانے کے بعد وبا کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے!

(نشریہ)

●●●

کنوِسر

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی یعنی جو باتیں جنت کی نعمتیں بتائی جاتی ہیں وہ دنیا کی شامتیں کیوں قرار دے دی گئی ہیں۔ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ انھیں باتوں کا سمجھ میں نہ آنا، ابتدائے آفرینش کا راز ہے اور دوسرے بعض بزرگوں کا عقیدہ ہے کہ یہی بات قربِ قیامت کی بھی دلیل ہے۔ لیکن چوں کہ میں اپنا شمار بزرگوں میں نہیں کرتا، اس لیے بزرگوں کے ان خیالات کا احترام تو ضرور کرتا ہوں اور ضرورت ہوئی تو پروپیگنڈے سے بھی دریغ نہ کروں گا، مگر ان سے اتفاق نہیں کرتا۔

باتوں کا سمجھ میں نہ آنا اور بات ہے، اور ان کا صحیح یا غلط ہونا دوسری بات ہے۔ آفرینش کا راز یا قربِ قیامت کی دلیل ان لوگوں کو اپیل کرسکتی ہے جو کسی امر کے صحیح یا غلط ہونے نہ ہونے پر زور دیتے ہوں، لیکن آپ کو صحیح یا غلط سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم آپ تو

اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

کے اصول پر ایک دوسرے سے قریب آگئے ہیں۔ پھر ریڈیو پر آفرینش کے راز یا قربِ قیامت کی دلیلیں پیش کی جانی لگیں، تو کتنے لوگ کب تک اپنے حواس بجا رکھ سکیں گے۔

کہنے کو تو میں اتنی ساری باتیں کہہ گیا، لیکن شاید آپ یہ محسوس کرتے ہوں کہ میرا یہ کہنا محض ردیف و قافیہ کی بنا پر تھا، مضمون کوئی نہیں پیدا ہوا۔ آپ سے کیا پردہ بات یہ ہے کہ چالاک

مقرر یا ادیب وقتاً فوقتاً مخاطب کو دل آویز یا حواس افگن فقروں کے لقمے دیتے رہتے ہیں، تا کہ وہ مقرر کے فریب یا نالائقی پر غور نہ کر سکیں اور کبھی اس قسم کی حرکت اس لیے بھی کی جاتی ہے کہ گفتگو کے سفر میں مناظر و ماحول بدلتے رہیں۔ ورنہ سفر کرنے والا ممکن ہے سفر سے اُکتا کر مقرر یا رہبر کو کاٹ کھائے یا مار بیٹھے!

ترقی یافتہ زمانہ اور نالائق لوگوں کا دستور ہے کہ جب کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی یا سمجھنا نہیں چاہتے تو تحقیقات شروع کر دیتے ہیں اور تحقیقات جیسا کہ دنیا جانتی ہے یا تو پولیس کرتی ہے یا یونیورسٹی۔ ایک سزا دلواتی ہے اور دوسری سند دیتی ہے۔ میرا تعلق یونیورسٹی سے ہے۔ پولیس سے بھی بے تعلق نہیں ہوں۔ اس لیے میری تحقیقات یا ریسرچ کا جو انجام ہوگا، وہ ظاہر ہے۔ لیکن ریسرچ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جس بات کی تحقیقات کی جاتی ہے، وہ تو جہاں کی تہاں رہ جاتی ہے اور جو بات جہاں کی تہاں ہوتی ہے، وہ دریافت کر لی جاتی ہے۔ ریسرچ کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ جس امر کی تحقیقات کے لیے ستو یا کفن باندھ کر نکلے تھے، وہ تو جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس کے علاوہ دوسری باتیں ظاہر یا ثابت ہو گئیں۔ اس طور پر آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تحقیقات میں گھاٹا نہیں رہتا۔ سزا یا سند اور فہوالمراد!

تو یہاں تک کہ گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ میں راز آفرینش اور قرب قیامت پر ریسرچ کرنے کے لیے آمادہ ہوا ہوں۔ جب قرب قیامت ہو تو آفرینش کا راز دریافت کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں، آپ میں سے بعض حضرات میری ان غیر متعلق باتوں سے کچھ بدحظ ہونے لگے ہیں۔ آپ کا بدحظ ہونا میری ہمت افزائی کا باعث نہیں ہے، لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ "مہمان را با فضولی چہ کار" کہا گیا ہے۔ "مقرر را با فضولی چہ کار" تو کسی نے نہیں کہا ہے۔ مقرر فضولی چھوڑ دے تو کیا آپ چاہتے ہیں وہ فاقہ کرے! بہر حال آپ شریف آدمی ہیں۔ اس لیے میرے شریف ہونے کے بھی منکر نہ ہوں گے۔ اسی بنا پر میں تمہید سے گزر کر اصل مطلب پر آ جاتا ہوں۔

غالباً یہاں تک پہنچنے کے بعد آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ میں نے کنوسنگ شروع کر دی ہے۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو میرا یہ کہنا حقیقت پر مبنی ہونے کے باوجود بیکار

''گیاہوا'' معلوم ہوتا ہے کہ آپ اور میں دونوں شریف ہیں۔ آپ کو شریف کہہ دینے کے بعد کنوسنگ کے صحیفہ اخلاق کے رو سے میرا شریف ہونا مسلّم ہوگیا۔ لیکن ابھی ریسرچ شروع نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال چوں کہ میرے آپ کے تعلقات اس وقت کافی خوش گوار ہیں اور میں عمر کے اس حصہ سے جب حرام بھی حلال معلوم ہوتا ہے، زندگی کے اس حصہ میں آ گیا ہوں جب حلال بھی حرام ہو چکا ہے۔ آپ سے جھگڑا مول لے کر نہ آپ کی دنیا خراب کرنا چاہتا ہوں اور نہ اپنی عقبیٰ برباد۔ اس لیے فرض کر لیجیے ریسرچ شروع ہوگئی اور میں آپ کو لیے دیے اس جگہ پہنچ گیا، جہاں لوگ بڑی آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اتنی ہی آسانی سے نکال دیے جاتے ہیں۔ یعنی جنت، یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حوا نے آدم کو کینوس کر کے اس فن کی بنیاد رکھی جس کو آج کل ''کنوسنگ'' پروپیگنڈا، خوشامد یا جھوٹ یا پتے بازی، سب کچھ کہتے ہیں۔ اسی کنوسنگ کا انجام آدم نے دیکھا اور ان کی اولاد دیکھ رہی ہے۔

لیکن اک ذرا توقف فرمایئے، میں نے کنوسنگ کا لفظ اس طور پر استعمال کیا ہے گویا مجھے یقین تھا کہ آپ میں سے ہر شخص اس کے معنی مطلب سے واقف ہے۔ لیکن آپ کے واقف یا ناواقف ہونے سے مجھے کوئی سروکار نہیں، میں تو اپنے پیشہ سے مجبور ہوں جس کا تقاضا ہے کہ جانو یا نہ جانو بتاؤ ضرور۔ اس لیے آپ اس لفظ کے مفہوم سے آشنا بھی ہوں تو بھی مجھے بتانا ضروری ہے۔ بھلے مانسوں کا یہ طریقۂ کار ہو یا نہ ہو کنوسنگ کا تقاضا یہی ہے۔

کنوسنگ کے معنی جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے اور یہ جملہ معترضہ میں اکثر محض اخلاقاً استعمال کیا کرتا ہوں، یہ ہے۔ کسی کو ہم خیال بنانا، ترغیب دینا، مائل کرنا، اپنانے کی کوشش کرنا، شیشے میں اُتارنا یا سبز باغ دکھانا۔ یہ معنی تو ہوئے اس زبان میں جس کو ہم آپ بولتے یا سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بولی اور ہے جس کی اصطلاح میں کنوسر کو پھسلیا یا اپنویا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کنوسنگ کی وبا الیکشن کے زمانہ میں پھیلتی ہے تو بھلے مانس پگڑی اور پولیس ڈنڈے سنبھالتی ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں اشارہ کر چکا ہوں، یہ چیز یعنی کنوسنگ سب سے پہلے جنت میں شروع ہوئی۔ سبز باغ دیکھنے دکھانے کی شانِ نزول غالباً اسی باغ جنت سے وابستہ ہے۔ کنوسنگ سبز باغ کے مفہوم بغیر بے معنی سی بات ہے۔ سانپ نے حوا کو ورغلایا، چنانچہ حوا نے آدم کو

شجر ممنوعہ کے قریب جانے یا گیہوں چکھنے پر مائل کیا۔اس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے ہم آپ جانتے یا نہ جانتے ہوں، جھیل ضرور رہے ہیں۔ سانپ نے حوا کو سبز باغ ضرور دکھایا، لیکن کبھی آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ خود سانپ کو کس نے کس قسم کا سبز باغ دکھایا۔ یہ مسئلہ بڑا نازک ہے، بڑا خطرناک بھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شیطان نے سانپ کا بھیس اختیار کیا اور اس طور پر اُس نے آدم سے اس سزا کا انتقام لیا جو آدم کو سجدہ نہ کرنے پر اسے دی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ شیطان کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا، اُسے صرف سزا دی جاسکتی ہے۔ شیطان اپنی پوزیشن کو خوب سمجھتا ہے اور شاید اسے اپنے شایانِ شان بھی سمجھتا ہے۔ ایسا نہ سمجھتا تو وہ اپنے موجودہ پوزیشن پر راضی نہ ہوتا۔ بہرحال اس جھگڑے میں آپ کیوں پڑیں، ہم آپ تو کنوسنگ کی فکر میں ہیں۔ سزا جزا سے کب سروکار رکھتے ہیں۔

سانپ نے کس قسم کی کنوسنگ کی ہوگی، یعنی حوا کو کیا سبز باغ دکھایا ہوگا اس کا اندازہ ہم آپ کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ بھی کر سکتے ہوں پھر بھی اس میں شک نہیں، اس نے حوا کی پوزیشن کو واضح اور بلند کرنے میں اس کی بڑی مدد کی۔ یہ بحث بڑی طویل ہے اور بہت دلچسپ بھی، لیکن یہاں صرف اتنا ہی بتا دینے کا موقع ہے کہ سانپ یا شیطان یا معلوم نہیں کس نے حوا کو سب سے پہلے سبق یہ پڑھایا کہ اس کا اپنا گھر ہونا چاہیے، جس کی مالکہ یا ملکہ وہ خود ہو۔ وہ کسی ایسے مقام پر اکتفا نہیں کر سکتی تھی جہاں کے سیہ سپید میں اس کا دخل نہ ہو۔ وہ ہوٹل اور کلب کی پابند نہیں ہو سکتی تھی، خواہ وہ ہوٹل یا کلب جنت نظیر ہی کیوں نہ ہوتا۔ وہ بنی بنائی چیز کی قائل نہ تھی، وہ خود بنانا بگاڑنا چاہتی تھی۔

سانپ اور حوا کے درمیان آدم کی حیثیت اُس مہرہ کی تھی، جس کا بازی جیتنے کے لیے پٹوا دیا جانا ضروری تھا۔ سانپ اور حوا نے کنوسنگ سے جو انقلاب برپا کر دیا وہ آج ہمارے سامنے ہے۔

لیکن مقرر را درونِ خانہ چہ کار۔ مجھے تو آپ کو اب یہ دکھانا ہے کہ حوا نے آدم کو کس ڈھب سے کینوس کیا کہ وہ گندم چشی پر مائل ہو گئے۔ یہاں سے بحث کے عنوانات بدلنے لگیں گے اور مجھے اُمید ہے آپ اور نہیں تو اب تک کا کہا سُنا معاف فرمائیں گے۔

کنوسنگ مختلف انداز سے کی جاتی ہے۔ بعض کنوسنگ ایسی ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسے کنوسر ہوتے ہیں کہ آپ یہ محسوس تک نہیں کر سکتے کہ آپ پر کنوسنگ کا اثر ہو رہا ہے یا کنوسر کا جادو

چل رہا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن مثالیں دینے سے جہاں بات صاف ہوتی ہے وہیں لوگوں کو ہاتھ صاف کرنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ اس لیے آپ زیر بحث مسئلہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، مجھے آپ کی شرافت اور خدا ترسی سے اُمید ہے کہ آپ کوئی ایسا مطالبہ نہ کریں گے، جس کے سبب بعضوں کو مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع ملے۔

ہاں تو غور فرمایئے اور توفیق ہو تو عبرت حاصل کیجیے۔ ایک کونسنگ تو وہ ہوتی ہے جو عام طور پر الیکشن کے موقع پر نظر آتی ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص جن میں مجھے اُمید ہے آپ یقیناً نہ ہوں گے۔ الیکشن کی وبا میں مبتلا ہوا۔ میں نے وبا کا نام نہیں لیا ہے اور اس کا ایک خاص سبب ہے، جو شخص الیکشن کی وبا میں مبتلا ہوتا ہے اس میں وہ تمام علامات مرض ہوتی ہیں جو علاحدہ علاحدہ ہر مرض میں ملتی ہیں۔ میں ان کے نام لے کر آپ کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا، لیکن یہ بشارت البتہ دینا چاہتا ہوں کہ ان علامات میں عجیب خوبی یہ ہے کہ ان کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے، لیکن ان سے موت نہیں واقع ہوتی اور نہ جسم و جان کو کوئی خطرہ ہوتا ہے۔ بس مظاہرہ ہی ہوتا رہتا ہے۔

ہاں تو میں نے کہا تھا، فرض کیجیے کوئی شخص الیکشن کی وبا میں مبتلا ہوا۔ لیکن معاف کیجیے، یہ بات میں نے ذرا قبل از وقت کہہ دی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ الیکشن میں مبتلا ہونا بھی کسی نہ کسی قسم کی کونسنگ کے سبب سے ہوتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کونسنگ کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوتا، بلکہ ہم خود اپنے آپ کو کونس کرتے ہیں۔ الیکشن میں شریک ہونے کا خیال آپ کو کیوں کر ہوا۔ یہی نہ کہ آپ کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ دنیا فانی ہے، روزی نایاب ہے، خود احمق ہیں، بیوی پردہ نہیں کرتیں۔ دل کا چور کہتا ہے الیکشن میں کھڑے ہو جاؤ۔ چند فاقہ کش وکیل بہت سارے گنڈے، ایک آدھ شاعر، کچھ باجے والے، دو ایک اخبار نویس اور سینکڑوں بھک منگے یا بے فکرے شریک ہو جائیں گے۔ نام چھپے گا، نعرہ لگے گا، باجا بجے گا، جلوس نکلے گا۔ ہو گئے تو انقلاب زندہ باد ورنہ پھر عدالتی چارہ جوئی، تبدیلی آب و ہوا، مار کٹائی، جگ ہنسائی وغیرہ تو کہیں گئی نہیں!

دل میں خوب سمجھتے ہیں کہ عقل نہیں ہے، قابلیت نہیں ہے، روپے نہیں، فرصت نہیں، ہمت نہیں، صورت دیکھ کر عورتیں ہنستی ہیں، بچے تالیاں بجاتے ہیں، بوڑھے گردن جھکا لیتے ہیں، بھلے مانس دل بہلاتے ہیں، ایمان دار کترا جاتے ہیں، فقیر ڈرتے ہیں، مرغیاں کٹ کٹ

کرتی ہیں۔لیکن کیا کیجیے جاہ کی ہوس نصیبے کے پھٹن، معقول بات سمجھ میں کیوں آئے۔فلاں شخص بڑا کہلاتا ہے، ہم کیوں نہ بڑے کہلائیں۔بڑے نہ کہلائیں تو پیٹ کا پانی کیسے پچے گا۔

اس طرح کی کنوسنگ، مشینوں کی اصطلاح میں آٹو نچہ کہلاتی ہے، یعنی خود اپنے آپ کو دھوکے دے رہے ہیں اور خوش ہور ہے ہیں۔یہاں تک کہ وہ حادثہ پیش آجاتا ہے، جس کی طرف انیس نے اشارہ کیا ہے۔

آنکھیں تو کھلی رہ گئیں پر مرگئی بکری!

لیکن اس کو کیا کیا جائے، دنیا بجائے خود ایک مستقل اور مسلسل کنوسنگ ہے اور دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کنوسنگ نہ کرتی ہو یا کنوسنگ سے متاثر نہ ہوتی ہو۔تمام دنیا کے شعر وادب اس کنوسنگ سے بھرے پڑے ہیں۔اُردو شعر و شاعری ہی کو لیجیے، جس میں بتایا گیا ہے کہ پیڑ، پودے، آگ، مٹی، پانی، ہوا، حشرات الارض یا حشرات السما، چرند، پرند، درند، اعضائے جسمانی، حواس انسانی، غرض کائنات کی تمام موجودات اپنے اپنے طور پر کنوسنگ کرتی رہتی ہیں۔نرگس آنکھوں سے، سنبل بالوں سے، سوسن زبان سے، آگ آتش نمرود یا تجلی طور سے، مٹی گنج ہائے گراں مایہ سے، پانی تر دامنی یا عرق پیشانی سے، ہوا شراب کی تاثیر یا نسیم مصر سے، پروانہ بادبان کشی سے یا اُس خاکستر سے جس میں شمع شبستان کے سارے انداز جذب ہوں، قمری حلقۂ بیرون در سے، اُلو گنبد افراسیاب سے، دیدان انگشت درخور گہر سے، پتھر تیشہ فرہاد سے، دل و جگر نالہ وفریاد سے، سر سودا سے، جام شراب سے یا آنکھوں میں تو دم سے، دانت موتیوں سے یا جملہ در دہان اند سے، لب اور تشنگی مردگاں یا جان بخشی مسیح سے، زبان ہاں و نہیں سے، سینہ مشرق آفتاب داغ ہجراں سے، کبھی کبھی کھانسی بخار سے، کمر اپنے عدم وجود یکساں سے، ناخن ہلال سے، ابرو کھینچی ہوئی تلوار سے، ناک شمع کی لو سے اور خدا جانے کیا کس سے!

لیکن یہ باتیں تو شعر و شاعری کی ہوئیں، جن سے ہم جتنے ہی ناواقف ہوتے ہیں اتنا ہی اس سے بیزار ہوتے ہیں۔کنوسر اور کنوسنگ کو آپ گوشت پوست میں دیکھنا چاہتے ہوں تو یہ بھی کوئی مشکل مرحلہ نہیں ہے۔خانقاہوں میں، مدرسوں میں، مزاروں پر، کونسلوں میں، کارخانوں میں، بازاروں میں، نوکریوں میں، دفتروں میں، عدالتوں میں، شادی بیاہ میں، ہندو مسلم اتحاد

میں، اشتہاری دواؤں میں، انجمنِ اقوام میں، یکہ بانوں میں، ہم میں، آپ میں، ہر جگہ کنوسنگ کا بازار گرم ہے۔

خانقاہوں میں دنیا سے بیزاری اور آخرت کی قوالی، مدرسہ میں بقول شخصے دانہ نہ گھاس کھر یرا تو نو دفعہ، مزاروں پر ایمان بالصبر واستحصال بالجبر، کونسلوں میں کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے، بازاروں میں ہر چیز چھ چھ پیسے، کارخانوں میں کام زیادہ مزدوری کم، اسٹرائک گھلوے میں، نوکریوں میں شریف خاندان اور مقابلہ کا امتحان، دفتروں میں جان کا صدقہ مال، عدالتوں میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی، شادی بیاہ میں ایک سے ایک شمس وقمر، آنکھ کھلی تو صفر، غرض زندگی کی ہر جلوہ گاہ کا نظام شمسی کنوسنگ کی محور پر گردش کرتا ہے اور ہماری زندگی کا ادنیٰ سے ادنیٰ شعبہ بھی کنوسنگ کی ہمہ گیری سے آزاد نہیں ہے۔ دور کیوں جایئے اپنے ہی گھر میں دیکھیے کس کس طرح سے کنوسنگ کی جاتی ہے۔ ماں اپنے شیر خوار بچے کو کنوسنگ کی کیسی کیسی لوریاں تھپکیاں دے دے کر سلا دیتی ہے۔ شوہر کس کس طرح اپنی بیوی کے سامنے اس کی خوب صورتی کا قصیدہ اپنے وفا شعاری اور خدمت گزاری کا مرثیہ سناتا ہے اور دوسرے شوہروں کا اپنی بیویوں سے جو نامعقول سلوک ہوتا ہے، اس پر لعنت کا ووٹ پاس کرتا ہے اور یہ سب محض اس لیے کہ نیک بخت ساری پر اصرار نہ کریں۔ سنیما تشریف نہ لے جائیں اور روئی یا ڈراؤنی صورت نہ بنائیں۔

الیکشن میں ووٹ کی ضرورت پیش آتی ہے تو کنوسر کبھی ووٹر کو آسمان پر پہنچا دیتا ہے اور اپنی نیاز مندی کا اعلان کرتا ہے۔ کہتا ہے میرے امیدوار کو ووٹ دیجیے تو وہ حکومت کا منہ نوچ لے گا۔ جاپان کو کچا کھا جائے گا، سڑکوں کی تعمیر ومرمت کا ٹھیکا آپ کو دلا دے گا۔ آپ کے نالائق لڑکوں کو جنگی میں بھرتی کرا دے گا۔ چلتی گاڑی کے نیچے آ جائے گا اور موقع آن پڑا تو اپنی بیوی بچوں کو تہ تیغ کر دے گا۔

طالب علمی کا زمانہ تھا۔ یونین کے الیکشن کی کنوسنگ ہو رہی تھی۔ ایک فریق کا پلّہ ہلکا پڑ رہا تھا۔ الیکشن شروع ہونے میں صرف گھنٹہ بھر کی دیر تھی۔ ان کا ایک کنوسر بڑا ہی بلائے بے درماں تھا۔ فریق مخالف کے ایک بڑے بیوقوف اور جھلے ووٹر سے معلوم نہیں بیٹھے بیٹھے کیا کہہ دیا کہ اس نے انھیں ایک چانٹا رسید کر دیا۔ آناً فاناً تمام ووٹروں میں خبر پھیل گئی اور مضروب کنوسر سے

ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ الیکشن کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔ جس کی ہار یقینی تھی اس نے اپنے حریف کو ایسی فاش شکست دی کہ آج تک اتنے ووٹوں سے کسی نے اپنے مقابل کو شکست نہ دی تھی۔

آپ نے دواؤں کے اشتہارات اور کنوسر بھی دیکھے ہوں گے۔ اسی طرح بیمہ کے کنوسر یا ایجنٹوں سے بھی آپ کا سابقہ رہا ہوگا۔ دواؤں کا کنوسر آپ کو اس طور سے ڈرائے گا، سمجھائے گا اور ہمدردی کا اظہار کرے گا کہ آپ خواہ مخواہ بھی اعضائے رئیسہ میں تذبذب محسوس کرنے لگیں گے۔ اس کے بیان کے مطابق اس کی دوا کے استعمال سے آپ اس قابل بن جائیں گے کہ دہن شیر میں بھی جا بیٹھیں گے اور خوبانِ دل آزار کے پاس بھی۔

خدا نہ کرے آپ کسی بیمہ کے ایجنٹ سے دوچار ہوں۔ اس کی باتوں میں آکر آپ فوراً محسوس کرنے لگیں گے کہ مرنے سے زیادہ نفع بخش دنیا کا کوئی اور شغل ہو نہیں سکتا۔ انجمن بین الاقوام کا ایجنٹ آپ کو یقین دلا دے گا کہ انجمن کا دم بھرنے لگیے تو یورپ کے سارے مطلق العنان آپ کے پاس جوابی تار بھیجیں گے اور آپ کی وفات پر آپ کا بم پروف مجسمہ ہر ملک کی سرحد پر نصب کیا جائے گا۔

غالب کے دو مشہور اشعار آپ کو ضرور یاد ہوں گے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

....

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ باتیں یا اس قسم کی کنوسنگ غالب کے زمانہ میں ہوتی تھی۔ ہمارے آپ کے عہد میں دشنہ و خنجر مقصود ہوتا ہے، لیکن کام ناز و غمزہ سے لیتے ہیں۔ مقصود بادہ و ساغر ہوتا ہے، بات مشاہدۂ حق کی کی جاتی ہے۔

کچھ اسی قسم کی باتوں میں ہم آپ بھی اس وقت مشغول تھے!!

●●● (علی گڑھ میگزین، جولائی 1939)

دیہاتی ڈاکٹر

دراصل میں دیہاتی ہوں۔ تفنناً شہری کہلاتا ہوں اور اخلاقاً تعلیم یافتہ۔ اب یہ کام آپ کا ہے کہ مجھے تعلیم یافتہ دیہاتی سمجھیں یا دیہاتی تعلیم یافتہ۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں دیہاتی پہلے ہوں اور تعلیم یافتہ بعد میں یا تعلیم یافتہ پہلے اور دیہاتی بعد میں۔ کسی زمانہ میں اسی قسم کے ہیر پھیر میں بڑا فرق پڑ جاتا تھا۔ بلوے ہو جایا کرتے تھے، یا اخباروں میں لوگ گالی گلوج پر اُتر آتے تھے۔ لیکن جب سے بلوے اور گالی گلوج کے اور اسباب دریافت کر لیے گئے ہیں، پہلے اور بعد کا سوال باسی سا ہو گیا ہے!

میں اپنے دیہاتی ہونے کا کبھی اقرار نہ کرتا، لیکن جب سے گاؤں سدھار اور مویشیوں کی پرورش اور نسل کشی کی مفید اور اخلاقی اسکیمیں جاری ہوئی ہیں، مجھے اپنے دیہاتی قرار دیے جانے میں فائدہ بہت کچھ اور ذمہ داری بالکل نظر نہیں آتی، اور سب سے مفید مطلب بات یہ ہے کہ دیہاتی کو غلطی سے مویشی سمجھ لیجیے یا مویشی کو دیہاتی، تب بھی موجودہ حالات کے اعتبار سے نفع ہی نفع ہے۔ اتنی سوجھ بوجھ کی بات کرنے کے بعد مجھے اُمید ہے آپ کو میرے تعلیم یافتہ ہونے میں کوئی شک نہ ہوگا۔ پھر تعلیم بجائے خود ایسی چیز ہے جو ہر جگہ کھپ جاتی ہے۔ دیہاتی یا مویشی جس کے ساتھ چاہے تعلیم یافتہ کا لفظ لگا دیجیے، نتیجہ بہر حال نورٌ علیٰ نور!

خدا بھلا کرے ریڈیو والوں کا، ان کے واسطہ سے دیہات کی بھولی بسری دنیا یاد آ گئی۔

یہ واقعہ بہت عرصہ کا ہے اور جن لوگوں کا میں تذکرہ کرنے والا ہوں ان میں سے بہت سے تو اپنے اپنے وقت سے مر گئے اور یہ اس زمانہ کا حال ہے، جب مرنے والوں پر اس کا الزام نہیں دھرا جاتا تھا کہ وہ بے وقت مرے، اور کچھ ایسے تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں کہ ان کو اپنی اصل ونسل بھی یاد نہ رہی۔ اس کے علاوہ میں نے اس کی بھی احتیاط رکھی ہے کہ نام فرضی رکھے جائیں۔ گو میں اس سے بھی ڈرتا ہوں کہ جس کو میں فرضی بتاؤں وہی اصلی نکل آئے۔ فرضی کو اصلی اور اصلی کو فرضی قرار دے کر سزا دے دینا کوئی تعجب کی بات تو ہے نہیں۔ ایک وکیل، دو گواہ، دو چار جلسے، اتنے ہی بلوے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آپ سزایاب ہو گئے۔

لیکن ڈرنے والا ہر حال میں ڈرتا ہے، خواہ ڈرنے کی بات ہو یا نہ ہو۔ میرے اس اقرار صالح کے بعد مجھے اُمید ہے کہ میں جو واقعہ عرض کروں گا، اسے آپ قصہ ہی سمجھیں گے یا وہ اپنے آپ ہی قصہ معلوم ہوتا ہو تو اسے اور مجھے دونوں کو جوں کا توں یا جہاں کا تہاں رہنے دیں گے۔

ہاں تو وہ بات یہ ہے کہ میرے گاؤں میں پہلے پہل ہسپتال قائم ہوا۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ گاؤں میں بیماری یا ڈاکٹروں میں بے روزگاری پھیل گئی تھی، بلکہ گاؤں کے زمین دار کو حاکم ضلع کو خوش کرنا تھا اور حاکم ضلع کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ دسمبر کا زمانہ تھا، حاکم نے ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھا۔ دیہاتیوں نے آشربا دی، رئیس نے آتش بازی چھوڑی اور دیہات میں ہسپتال قائم ہو گیا۔ پُرانے امراض کو نئے نام دیے گئے، نئے امراض کو پرانی تکلیفوں میں منتقل کیا گیا۔ پہلے جو بے قاعدہ مرتے تھے، اب باقاعدہ مرنے لگے۔ جہاں آسیب کا دخل تھا، وہاں ڈاکٹر نے دخل پایا۔ سرسوں پھولتی، چیچک پھیلتی رہی، جن گھروں میں تلسی کے درخت تھے، ان میں کونین مکسچر کی شیشیوں کو جگہ ملی۔

نئے ہسپتال کے پہلے ڈاکٹر صاحب میرے بڑے دوست تھے۔ نہایت موٹے بھدّے کالے رنگ کے بڑی پاٹ دار آواز تھی۔ بڑے زور سے ہنستے تھے، ہر کام جلد سے جلد کرنے کے عادی تھے۔ چیر پھاڑ کے بڑے شائق تھے، کہا کرتے، کیا کہیں چیر پھاڑ کے مواقع نہیں ملتے۔ کاش کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ ملیریا اور مغالطہ کا علاج چیر پھاڑ سے کیا جاتا۔

دیہاتیوں سے اس طور پر گھل مل کر باتیں کرتے کہ اکثر یہ دریافت کرنا دشوار ہو جاتا تھا کہ گنوار کون ہے اور ڈاکٹر کون۔ نسخہ لکھنے کے بعد نبض دیکھتے اور نبض دیکھ کر ایسا قہقہہ لگاتے کہ گنوار سمجھتا انھوں نے اپنے قہقہہ سے دکھ بھگا دیا۔ دوا تجویز کرنے میں جتنا وقت سوچ بچار میں صَرف کرنا چاہیے تھا، اس سے زیادہ وقت قہقہہ اور دوا کی ترکیب استعمال بتانے سمجھانے پر صَرف کرتے تھے۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے دوا میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سارا اثر ڈاکٹر میں ہوتا ہے۔ میں ان کے اس مقولے پر کوئی جرح نہ کرتا، ورنہ مجھے یقین ہے، وہ یہاں تک بھی کہہ گزرتے کہ ڈاکٹر میں کوئی اثر ہو یا نہ ہو، ڈاکٹر کے قہقہے میں ضرور ہوتا ہے۔

ہسپتال کے عملہ میں ایک نہایت دھان پان سے کمپاؤنڈر تھے، پان زیادہ اور کھانا کم کھاتے تھے۔ کپڑے نہایت باریک اور ستھرے پہنتے تھے، کبھی کبھی کچھ گنگنایا بھی کرتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایک بار نہایت ہی گھن گرج قسم کا قہقہہ لگا کر کہا۔ بھائی اس مہنگی سے میں قہقہے لگاؤ، ورنہ بس ٹیلی فون بن کر رہ جاؤ گے۔ مجھے بالکل نہیں معلوم ٹیلی فون سے ڈاکٹر صاحب کا کیا مطلب تھا، لیکن ٹیلی فون کا تلفظ جس لہجہ اور جس اداکاری یعنی ایکٹنگ سے انھوں نے کیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ کمپاؤنڈر صاحب نے ہنسنا قہقہہ لگانا تو درکنار اس دن سے گنگنانا بھی ختم کر دیا۔ ہمارے دوست کوشش یہ کرتے تھے کہ مریض چھوٹ نہ جائیں اور بوتلیں چھوٹ نہ پڑیں۔ بالخصوص جب کہ ڈاکٹر صاحب قہقہے لگا رہے ہوں۔ ایک بھنگی بھی تھا، تن و توش میں ڈاکٹر صاحب سے دُگنا، رنگت میں گہرا، آواز میں چوتھائی۔ اس بھنگی کا نام بھگا تھا۔ نام کچھ اور تھا۔ یہ نام میں فرضی بتا رہا ہوں کیوں کہ آپ جانتے ہیں، زمانہ ایسا آ گیا کہ معلوم نہیں کس بات پر کس کے جذبات کو ٹھیس لگ جائے۔ دوست دشمن سبھی کے ہوتے ہیں، زمانہ کسی کا نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں کون کہاں یہ سمجھ لے کہ بھنگی ہونا اس پر صادق آتا ہے۔ دنیا کا قاعدہ ہے جب کوئی کسی کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو اس کو بھنگی بننے اور دوسروں کو بھنگی قرار دینے میں کوئی عار نہیں ہوتا۔ پھر آج کل کا زمانہ دیکھیے جب کسی کو کسی بات میں عار نہیں ہوتا۔

بھگا ملازم تو بھنگی ہی کی حیثیت سے ہوا تھا، لیکن اس نے ڈاکٹر صاحب کے کاموں میں ڈاکٹر صاحب کا اتنا ہاتھ بٹایا کہ اب اس کا درجہ ہسپتال کے تمام عملے سے زیادہ اور

ڈاکٹر صاحب سے کچھ ہی کم تھا۔ چیر پھاڑ میں بھگا ڈاکٹر صاحب کا دست راست تھا۔ اس زمانہ میں سپٹک یا اسپٹک قسم کی مرہم پٹی کا کوئی قصہ نہ تھا۔ یعنی بے احتیاطی سے زخم کا بگڑ جانا یا احتیاط ملحوظ رکھنے سے زخم کا جلد بھر آنا۔

چیر پھاڑ کا کوئی مریض آ جاتا تو ڈاکٹر صاحب ایک نعرہ لگاتے بھگا!! اور بس!! بھگا کے چارج میں ایک جھاڑو تھا اور ایک کیتلی۔ کیتلی میں نیم کی پتی اُبلتی رہتی تھی۔ جھاڑو سے کوڑا کرکٹ جمع کر کے کیتلی کے لیے ایندھن فراہم کیا جاتا۔ چیر پھاڑ سے پہلے آج کل بہت سے بے معنی تکلفات کیے جاتے ہیں۔ ایک دن پہلے سے جہاں نشتر لگانا ہوتا ہے اس کی مالش اور دستار بندی کی جاتی ہے، کچھ پہلے مورفیا کا انجکشن دیا جاتا ہے۔ پھر ایک ناچ گھر قسم کے مکان میں مریض کو لاتے ہیں، میز پر لٹاتے ہیں، کلوروفارم سنگھاتے ہیں اور پھر جو چاہے کرتے ہیں۔ ہمارے دیہاتی ہسپتال میں یہ تکلفات کہاں۔ بھگا مریض کے پاس آیا، املی کے درخت جہاں کیتلی تھی، اس کی جڑ پر بٹھا کر زخم کا معائنہ کیا، پھوڑا نرم نہ ہوا تو دبا دبا کر اُسے وہیں پولٹس بنا ڈالا، اور جو کچھ مقویات برآمد ہوئے اسے مریض ہی کے میلے کچیلے انگوچھے سے صاف کر دیا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آ گئے۔

مریض کراہا، ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگایا اور بھگا نے کیتلی سنبھالی۔ ڈاکٹر صاحب کلوروفارم یا بے ہوشی کی دوا سنگھانے کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے، بھئی کلوروفارم میں جھگڑا ہی جھگڑا ہے۔ اوّل تو حاکم لوگ اس کا حساب مانگتے مانگتے ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا اثر بعد میں ایسا خراب پڑتا ہے اور متلی اور دردِ سر کی وہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ گنوار ڈاکٹر کو گدھا سمجھنے لگتے ہیں، اور ان کو انگریزی دوا سے نفرت اور عداوت ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک دیہات میں، میں نے کلوروفارم استعمال کرایا تھا۔ مریض بے ہوش ہوا تو اس کے رشتہ داروں نے ڈنڈا سنبھالا۔ کہنے لگے، تو نے چاچا کی جان لے لی۔ بڑی مشکل سے میری جان بچی۔ اس کے بعد چاچا ہوش میں آئے، تو کچھ ایسی حرکتیں کرنے لگے کہ بھتیجوں کو خیال ہوا، میں نے کوئی آسیب کرا دیا۔ جب تک ان کا دردِ سر اور متلی نہ گئی، میں اپنے گھر میں مقفل رہا۔ اب اس جھگڑے میں کون پڑے۔

اب کلوروفارم کا بدل ملاحظہ فرمائیے۔ مریض کی ران میں پھوڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بات کرتے کرتے ایک قہقہہ لگایا اور آناً فاناً اس کی دونوں ٹانگیں اپنی ٹانگ کے شکنجے میں کس لیں۔ بھگا نے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، پہلے تو مریض منت سماجت کرتا رہا اور ڈاکٹر صاحب بھی نرم نرم باتوں سے اس کو تسکین دیتے رہے اور برابر یہی کہتے رہے کہ پھوڑا دیکھ رہا ہوں، کچھ کروں گا نہیں۔ اتنے میں جیب سے نشتر نکالا اور ایک قہقہہ لگا کر ہاتھ مارا تو ہاتھ اور نشتر دونوں پھوڑے میں تیر گئے۔ مریض نے چیخ ماری اور ڈاکٹر صاحب کو گالی دینی شروع کی اور ان تمام گالیوں کو دُہرا گیا جو کھیت جوتتے وقت بیلوں کو دیتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اور بھگا کی گرفت ایسی نہ تھی کہ اس کی ایک بوٹی بھی کہیں سے جنبش کر جاتی۔ پاس ہی کیتلی رکھی تھی۔ اسے جوں کا توں زخم پر انڈیل دیا اور سر یض کی پگڑی سے زخم کو باندھ دیا۔ اس دوران میں مریض کی گالی، ڈاکٹر صاحب کا قہقہہ، رشتہ داروں کی چیخ پکار ایک ایسا سماں تھا، جو اَب بھی کبھی کبھی میلوں کے زمانہ میں تھرڈ کلاس کے مسافروں میں نظر آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فارغ ہوئے اور ایک ہلکی سی چپت مریض کو رسید کر کے قہقہہ لگاتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ کہا بھاگ جاؤ چنگے ہو گئے۔ مریض اور رشتہ داروں نے دعا دینی شروع کی اور ڈاکٹر صاحب نے کیتلی کے بقیہ جوشاندہ سے ہاتھ اور نشتر دھو کر ہسپتال کا راستہ پکڑا۔ بعد میں زخم کی ڈریسنگ بھگا کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ جب تک نیم کا جوشاندہ اور بھگا کی گرفت ہے، زخم خراب نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ کو بہت دن ہو گئے، لیکن حال میں ہی ایک اور بزرگ سے سابقہ پڑا۔ یہ دنداں ساز بھی تھے اور دنداں شکن بھی۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا ایک ہاتھ بڑا اور ایک چھوٹا تھا۔ ایک دن ایک غریب گنوار کراہتا ہوا آیا کہ ڈاڑھ میں سخت درد ہے۔ انھوں نے دریافت حال کیا تو اس نے ایک گال کی سمت اُنگلی سے اشارہ کر کے کچھ غوں غاں کر دیا۔ انھوں نے فوراً چھوٹے ہاتھ میں زنبور لیا اور بڑے ہاتھ سے مریض کی کنپٹیاں پکڑ، زنبور سے ایک دانت کو جکڑ ہی لیا۔ مریض یہ کہنا چاہتا تھا کہ انھوں نے غلط دانت پکڑ رکھا ہے، لیکن جس کے منہ میں زنبور داخل ہو اور چھوٹے بڑے دو ہاتھ، سر اور گردن کو گرفت میں لیے ہوں، وہ غیں غیں کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے زور لگانا شروع کیا اور مریض نے اکڑوں بیٹھے بیٹھے اُبھرنا

شروع کیا۔ یہ جتنا زور اوپر کی سمت لگاتے تھے، اسی اعتبار سے مریض بھی اوپر اُبھرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار دونوں کھڑے ہوگئے۔ اب ڈاکٹر صاحب کو چھوٹے ہاتھ کے چھوٹا ہونے کا احساس ہوا۔ تھوڑی دیر کے لیے ڈاکٹر صاحب سٹ پٹائے، لیکن فوراً ہی مریض کو بیٹھ جانے کی ہدایت دی۔ ابھی غریب پورے طور پر بیٹھا بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اُچک کر مریض کے کندھے پر بیٹھ گئے۔ اب جو زور لگاتے ہیں تو دانت کو جڑ سے اُکھاڑ لیا۔ مریض کو دانت اور ڈاکٹر دونوں کے بوجھ سے فرصت ملی تو وہ غائیں غائیں اور ہائے ہائے کرتا ہوا بھاگا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا تو معلوم ہوا غلط دانت نکل آیا تھا۔ یہ آواز لگاتے ہوئے اس کے پیچھے لپکے کہ جلد آ، دوسرا دانت نکالوں گا۔ لیکن مریض بھاگتا ہی گیا۔

اس دفعہ مریض ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ نہیں آیا۔

ان ڈاکٹر صاحب کے دوسرے معزز بھائی بندوں کا حال آئندہ صحبت میں سناؤں گا۔ بشرطیکہ اس دوران میں ان میں سے کسی ایک کا خود نہ شکار ہوگیا۔

(نشریہ)

●●●

فدوی

جس سلسلہ میں اس وقت مجھے گفتگو کرنے پر مامور کیا گیا ہے اس کا عنوان انگریزی میں ''لائٹ ریفرشمنٹ'' ہے۔ یعنی یوں سمجھ لیجیے جیسے کھانے کے بعد فواکہات۔

چنانچہ اب جب کہ کھانے پینے کا سلسلہ چھڑ گیا ہے تو اسے کچھ دیر قائم رکھنا چاہیے۔

سنیے ایک تھے شیخ صاحب اور دوسرے تھے خاں صاحب۔ شیخ صاحب نے خاں صاحب کی دعوت کی۔ کھانے پر دونوں بزرگ بیٹھے تو شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ اگر خاں صاحب نے خالی الذہن ہو کر کھانا کھانا شروع کیا تو کھانے کی خیر نہیں۔ چنانچہ شیخ صاحب نے فرمایا، اور کیوں خاں صاحب روہیلوں کی لڑائی میں آپ نے دشمنوں کو کس طرح نیچا دکھایا۔ خان نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اور آپے سے باہر ہو کر جنگ روہیلہ کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ کھڑے ہو ہو کر پیترے بتاتے، کبھی نعرے لگاتے، کبھی خیالی دشمن پر ایسا وار کرتے کہ شیخ صاحب دسترخوان کی ایک طرف دُبک جاتے۔ غرض خاں صاحب ابھی دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ ہی رہے تھے کہ شیخ صاحب نے کھانے کا ستھراؤ کر دیا۔ خاں صاحب آپے میں آئے تو دیکھا کہ شیخ نے نقشہ جنگ ہی بدل دیا ہے، اور دسترخوان پر نہ کشتے باقی ہیں نہ پشتے اور نہ کہیں مالِ غنیمت کا نشان۔ ناچار خون کا گھونٹ پی کر بھوکے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

دوسرے دن خاں صاحب نے شیخ صاحب کی دعوت کی۔ کھانا چنا گیا۔ دونوں دوست آمنے سامنے بیٹھے۔ کھانا شروع ہوا تو خاں صاحب نے فرمایا۔ کیوں بھئی شیخ صاحب! یوسف زلیخا کی داستان بڑی مشہور ہے۔ میں نے تفصیل سے نہیں سُنی۔ ذرا سناؤ تو سہی۔ شیخ نے دسترخوان پر سے توجہ ہٹائے بغیر کہا۔ ارے ماں خاں صاحب کوئی قصہ میں قصہ بھی تو ہو! سوا تضیع اوقات کے کچھ بھی تو حاصل نہیں۔ خاں صاحب نے شیخ کی اس بے توجہی یا سرد مہری کو مشتبہ اور کسی قدر مایوسی کی نظر سے دیکھا۔ پھر بولے، یار ہرج ہی کیا ہے۔ یہ قصہ بچپن میں سنا تھا، اب بھول گیا ہوں، کچھ تو سناؤ۔ تفریح ہی رہے گی۔ شیخ صاحب نے ایک پورا کوفتہ منہ میں رکھا اور ایک بھر پور بڑا چمچہ بریانی کا اس کے تعاقب میں روانہ کرتے ہوئے کہا۔ خاں صاحب بات کچھ نہیں، واقعہ صرف اتنا تھا۔

پیرے بود پسرے داشت گم کرد باز یافت!

اللہ اللہ خیر سلا۔ ذرا میٹھے کی قاب بڑھانا!

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ واقعتاً قصہ میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہ صرف قصہ کہنے والے کا کمال ہے کہ پڑھنے یا سننے والا ہائے وائے یا واہ واہ کرنے لگتا ہے۔

کسی زمانہ میں قصہ کو دیو، پری، جادو اور کرامات سے آراستہ کرتے تھے۔ اس کے بعد ہیرو، ہیروئن سے اس کی تعمیر ہونے لگی اور اب یادش بخیر، ہم سے آپ سے یہی کام لینے لگے ہیں۔ پہلے فرضی کو اصلی سمجھ کر خوش ہوتے تھے۔ اب اصلی کو فرضی سمجھ کر سرؑ دھنتے ہیں۔ قصہ گوئی کا گُر ہی یہ ہے کہ ہم اصلی کو فرضی اور فرضی کو اصلی سمجھنے لگیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات کچھ فلسفیوں جیسی ہوئی اور آپ فلسفی ہوں بھی جب بھی یہ نہیں پسند کریں گے کہ لوگ آپ کو فلسفی کے لقب سے مشہور کریں۔ اس لیے کہ زمانہ ایسا آگیا ہے کہ لوگ فلسفی کو وہ نہیں سمجھتے جو فلسفی اپنے آپ کو سمجھتا ہے، اور آپ تو جانتے ہی ہیں، کوئی شریف شخص ایسا نہیں ہے جو اپنے بارہ میں ایسے اتہامات سننا گوارا کرلے جو خود اس کی نظر میں بے بنیاد ہوں، اور یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ فلسفی نہ ہونے کے باوجود میں فلسفیوں سے ہمدردی رکھتا ہوں۔

یہاں تک تو آپ نے قصہ کے فن پر میرے خیالات سن لیے۔اب ذرا ارا کین قصہ کے بارہ میں کچھ سنیے۔ ہر قصہ کو قصہ بنانے والا ایک کیرکٹر فدوی کا ہوتا ہے۔فدوی سے مراد واحد متکلم سے نہیں۔اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے، ورنہ اندیشہ ہے کہ بعض ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں جن سے میری گھریلو زندگی تلخ ہو جائے۔آپ سے آخرت میں مواخذہ ہو اور ریڈیو والے گناہ بر بادِ نیکی لازم کے مصداق بن جائیں۔

بہت دن ہوئے ایک تھانے دار تھے۔تھانہ دار تھے تو پھر ڈاکو کا بھی کہیں نہ کہیں ہونا لازم آیا۔ چنانچہ فرض کر لیجیے ایک ڈاکو بھی تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکو چھپے چھپے پھرتے تھے اور تھانے داران کی گرفتاری کی فکر میں ہوتے، ایسا زمانہ نہ تھا، جب ڈاکوا کڑتے ہیں اور تھانے دار چھپتے ہیں۔اتفاق سے تھانہ کے ایک کانسٹبل کو خبر لگ گئی کہ فلاں مشہور ڈاکو فلاں جگہ روپوش ہے۔ اس نے جا کر بڑی دلاوری سے ڈاکو کو گرفتار کر لیا اور کشاں کشاں تھانہ تک لایا۔تھانہ دار صاحب کو خبر ہوئی انھوں نے دیکھا، سپاہی نے بازی مار لی۔فوراً روز نامچہ منگایا اور اسے یوں شب نامچہ میں منتقل کرنا شروع کیا۔

''فدوی بسلسلۂ سراغ رسانی جرائم و بہ نگرانی بدمظنگانِ دیہہ بمر ہی دیوی سنگھ کانسٹبل فلاں گاؤں سے گزر رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ فلاں مشہور ڈاکو پاس کے جنگلوں میں روپوش ہے اور فلاں مہاجن کے ہاں ڈاکہ ڈالنے کا تہیہ کر رہا ہے۔فدوی نے فی الفور دیوی سنگھ کانسٹبل کو ڈاکو کی نقل و حرکت پر مامور کر کے خود براہِ راست جنگل کا راستہ لیا۔ڈاکو پاس کے ایک جھنڈ میں چلم پی رہا تھا اور بعض ساتھیوں کے ساتھ خفیہ مشورہ کر رہا تھا۔فدوی نے سامنے پہنچ کر للکارا تو ڈاکو کے تمام ساتھی فرار ہو گئے، لیکن خود اس شورہ پشت ڈاکو نے چلم پھینک دی اور بندوق سنبھالی۔فدوی نے ایک درخت کی آڑ پکڑ کے سیٹی دی تو عقب سے دیوی سنگھ کانسٹبل بھی پہنچ گیا۔دیوی سنگھ کو عقب سے آتے دیکھ کر ڈاکو نے اس پر بندوق تانی ہی تھی کہ فدوی نے جھپٹ کر ڈاکو کو دبوچ لیا۔ چنانچہ فدوی اور دیوی سنگھ کانسٹبل بڑے عرصہ تک ڈاکو سے گتھے رہے، بالآخر فدوی نے ڈاکو سے بندوق چھین لی اور فدوی اور دیوی سنگھ کانسٹبل نے ڈاکو کو گرفتار کر کے حراست میں لے لیا اور تھانہ میں لا کر بندوق مال خانہ میں اور ڈاکو کو حوالات میں بند کر دیا وغیرہ۔''

تھانے دار صاحب نے اپنی یہ رپورٹ دیوکی سنگھ کو سنائی۔ جب ختم کر چکے تو دیوکی سنگھ بہت کچھ متعجب اور کسی قدر برہم ہوکر بولا، دروگا جی ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ ڈاکو تو میں نے اور آپ نے پکڑا، یہ فدوی کون ہے۔ دیوکی سنگھ نے فدوی کے ساتھ کچھ ایسے توصیفی الفاظ بھی استعمال کیے جن کو اس سارے قصہ کی جان کہنا درست ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ الفاظ بعض مصالح کی بنا پر ریڈیو سے نشر نہیں کیے جاسکتے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ الفاظ یوں براڈ کاسٹ نہیں ہوسکتے کہ اُن کا تحمل کرنے والی لہریں ابھی ریڈیو والوں کے قابو میں نہیں آئی ہیں اور بعضوں کا خیال ہے کہ یہ خاص قسم کی منشیات کی تحت میں آتی ہیں۔ جن کا سد باب ہر گورنمنٹ پر فرض ہے۔

آپ غور کریں گے تو دنیا کے ہر کاروبار میں اس فدوی کو کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور برسر کار پائیں گے۔ فدوی یا فدوزم ہماری سوسائٹی کے وہ جراثیم ہیں جن کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہر زمانہ میں پایا جاتا ہے، ہر قوم میں ملتا ہے، ہر ملک کا جزو ہے، ہر آب و ہوا میں پنپتا ہے، ہر رنگ و بو میں ملے گا۔ وہ جیل خانہ میں بھی ملے گا، کونسل میں بھی، مسجد میں بھی، مندر میں بھی، شبستان عیش میں بھی، کلبۂ افلاس میں بھی، اکلیل شہر یاری میں بھی اور کلاہ نمد میں بھی، گوشۂ خانقاہ میں بھی اور صف مصاف میں بھی!

فدوی کا مسلک ہر مسلک سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ فرض کر لیجیے جماعت ایسوں کی ہے جو ہمیشہ آخری وانتہائی حربہ استعمال کرنے کے قائل ہوں گے۔ ان کا فدوی ایسا ہوگا جو اس حربہ کو استعمال کرنے کے بجائے اس کی صرف نمائش کرے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں قطعیت کہیں نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حربہ کی ضرب کاری ہونے کے بجائے خود حربہ کی پول کھل جائے۔ ممکن ہے جس پر وہ حربہ استعمال کیا جائے وہ سخت جان نکلے۔ وہ حربہ کے امکان استعمال سے پورا فائدہ اُٹھائے گا، لیکن اس کے استعمال سے ہمیشہ گریز کرے گا۔ وہ ان لوگوں کے دوش بدوش چلے گا جو اپنے فعل کے لیے سخت سزا پانے کے مستوجب ہوں گے۔ لیکن فدوی ہمیشہ اس فکر میں رہے گا کہ اس کا انجام لیڈر کے ساتھ نہ ہو، بلکہ انجام خود اُسی کے ہاتھ میں ہو۔ یوں سمجھ لیجیے کہ وہ جیل خانہ جانے سے نہ جھجکے گا، لیکن اس امر کو سب سے پہلے متیقن کرلے گا کہ

جیل خانہ میں اسے ''اے'' کلاس ملے گا۔ میں ذرا خود جیل خانہ سے گھبراتا ہوں۔ ممکن ہے جیل خانہ سے آپ کو بھی کوئی اُنس نہ ہو، اس لیے آیئے جیل خانہ سے نکل کر ایک دوسرے واقعہ کا جائزہ لیں۔ ایک تھے مولوی صاحب، انھوں نے کسی نیچی ذات والے کو مسلمان کرلیا۔ نومسلم کو مولوی صاحب ہمیشہ ساتھ رکھتے اور اسے ہر قسم کا نیچ اونچ سوجھاتے سمجھاتے رہتے۔ ایک دن کہیں باہر جارہے تھے، مولوی صاحب آگے تھے اور یہ غریب پیچھے پیچھے چلا جارہا تھا۔ مولوی صاحب گفتگو کرتے جاتے تھے اور یہ ہوں ہاں کرتا جارہا تھا۔ ایک جگہ یک بہ یک ہوں ہاں کی آواز رُک گئی۔ مولوی صاحب نے مُڑ کر دیکھا تو ان کا ہیرو ایک پیپل کے درخت کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ مولوی صاحب نے طیش میں آکر کہا، کیوں بے مردود یہ کیا! اس غریب نے کہا، ''مولبی صاحب تو ہار کہل سب ٹھیک مُدا (مگر) (پیپل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بگاڑ انھوں سے اچھا نا ہیں'' (بگاڑ ان سے بھی اچھا نہیں) فدویت یا فدوزم کی بہترین تعبیر یہ ہے۔

فدویت کا مظاہرہ آپ ہر جگہ پائیں گے۔ یہ فن بھی ہے اور سائنس بھی، جس طرح فطرت میں کوئی نہ کوئی عجوبہ پیدا ہوکر سائنس کے بعض اصولوں کو درہم برہم کردیتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی خاص قسم کے فدوی بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ جن سے بڑے بڑے مبصروں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی فدوی اور فدائی میں تمیز کرنا دشوار ہوجاتا ہے، لیکن اس بات کو یاد رکھیے کہ فدائی کا فدوی بن جانا ممکنات سے ہے۔ فدوی کا فدائی بن جانا محال ہے۔ آپ نے گھاگ کو گھاگس میں منتقل ہوتے دیکھا ہوگا، لیکن آپ کوئی ایسی مثال نہیں پیش کرسکتے جہاں گھاگس گھاگ بن گیا ہو۔

وقت کم ہے اور فدویت کی داستان طویل۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو صرف مثالیں دے دے کر بعض خاص خاص قسم کے فدویوں سے آشنا کرادوں۔ ہم ہندوستانیوں کو مفلسی اور عاشقی سے ازلی مناسبت ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان کو افلاس نے تباہ کیا یا عاشقی نے، لیکن یہ چیز مسلّم ہے کہ عاشقی کو مفلسی نے چمکایا اور مفلسی کو عاشقی نے ڈبویا۔ اصل یہ ہے کہ مفلسی سائنس ہے اور عاشقی آرٹ۔ ابھی دنیا نے اس حد تک نہیں ترقی کی ہے کہ ہم آرٹ اور سائنس کو

یکجا رکھ یاد کیے سکیں۔ آرٹ کو سائنس کا غیر تسلیم شدہ اعجاز اور سائنس کو آرٹ کا نادیدہ جواز سمجھنے میں ہمیں ابھی بڑی دیر لگے گی۔

آیئے میں آپ کا تعارف فدوی عاشق سے کراؤں۔ یہ محبوب کی پرستش اس خیال سے نہیں کرتا کہ اسے حاصل کر لے، بلکہ وہ اس ڈر سے کرتا ہے کہ کہیں محبوب اسے مار نہ بیٹھے۔ آشوب عاشقی سے اس کا رنگ زرد ہوتا ہے لیکن اس کے جواز میں وہ

اُڑنے سے پیش تر بھی مرا رنگ زرد تھا[1]

—— کی آڑ پکڑتا ہے۔ وہ عشق کا سفری گماشتہ ہوتا ہے۔ عاشقی کا مقصد اس کے نزدیک وہی ہوتا ہے جو ایک پیشہ ور سود خوار جماعت کے فرد کا تھا، جس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو جج نے جھنجھلا کر کہا

ارے کم بخت تیرا اٹھکا نا نرک ہوگا پاپے کنٹھ

فدوی نے ہاتھ جوڑ کر فوراً عرض کیا:

سرکار جہاں چار پیسے کا منافع ہوگا

وہ عاشقی میں محبوب سے کچھ فائدہ نہ اُٹھائے گا تو رقیب ہی سے ساز کر کے چار پیسے نکال لے گا۔

فدوی کی پالیٹکس بھی اس کی فدویت پر دال ہے۔ ان کو نہ عوام سے محبت ہے اور نہ حکومت سے اُلفت۔ وہ چار پیسے کا منافع چاہتا ہے۔ پالیٹکس ننگ و عار کی دشمن ہے۔ سیاسی فدوی اس کا کبھی احساس نہیں کر سکتا کہ دنیا میں شکست یا رُسوائی یا فضیحت بھی کوئی چیز ہے۔ اس کو اپنی فدویت پر اتنا بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام حقیقی و اخلاقی بھروسوں کو ٹھکرا دیتا ہے، جس پر دوسروں کی زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو فعل سے سروکار رکھتا ہے، انجام کا قائل نہیں۔ وہ کھانے کا قائل ہے، ہضم پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ سفر کرتا ہے، منزل مقصود یا وسیلۂ سفر سے تعلق نہیں رکھتا۔ اکثر ٹکٹ بھی نہیں خریدتا!

---

1 مکمل شعر:

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا　　مرنے سے پیش تر ہی مرا رنگ زرد تھا　　غالب

پالیٹکس، مذہب، اخلاق، تجارت، معیشت، پبلک لائف، شعروشاعری، غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں فدوی کا گھن نہ موجود ہو۔ آپ اس کا قلع قمع نہیں کر سکتے، آپ کریں تو بہت ممکن ہے گیہوں پس جائے، گھن برقرار رہے۔ اس لیے کہ پس جانے کی آفت کا سامنا ہوگا تو یہ گیہوں سے منہ موڑ کر چکی سے ساز کر لے گا!

جس طرح دیکھے ہوئے ستاروں کے محور یا راستوں میں کہیں نہ کہیں مقررہ قواعد کے خلاف کجی یا انحراف ملتا ہے تو اس سے ستارہ شناس کسی غائب فدوی قسم کے ستارہ کا پتہ نکالتے ہیں۔ اسی طرح جب آپ یہ دیکھیں کہ کسی مقصد کے حصول میں باوجود آپ کی سخت کوشش کے کامیابی نظر نہیں آتی اور صرف ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے تو آپ فوراً سمجھ لیجیے کہ راستہ میں کوئی فدوی حائل ہے اور کبھی نہ کبھی آپ کو پتہ لگ کر رہے گا کہ کوئی نہ کوئی فدوی حائل تھا۔

●●●

مقرّر

میں ایک مشہور مقرر اور واعظ ہوں اور میں نہیں تو کوئی اور بزرگ سہی، اس میں جھگڑنے کی کون سی بات ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ ابھی تقریر شروع بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مان لیجیے کہ دو چار دن کی تعطیل ہونے والی ہے۔

گویا تقریروں اور جلسوں کی فصل آگئی، جس طرح مارچ کی ابتدا موسم بہار کا پتہ دیتی ہے۔ شعرا بک جھک کرنے لگتے ہیں۔ عشاق آمادۂ فساد اور شرفا افیون کھانے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں تعطیلوں کی آمد پر جلسوں، جلوسوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ایسٹر کی تعطیلوں کا ہے۔ خطوط اور ڈپوٹیشن آنے شروع ہو گئے۔ مقرروں اور واعظوں کے کان کھڑے ہوئے۔

شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی![1]

پہلا خط آتا ہے:

"حضور والا ضرور تشریف لائیں۔ ہماری آنکھیں فرشِ راہ ہیں۔ قوم اور ملک بڑی آفت میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کی نجات آپ کے ہاتھ میں رکھی ہے۔"

---

1 یہ میر تقی میر کا شعر ہے۔ پورا شعر اس طرح ہے:

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی   شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دوسرے خط میں آتا ہے:

''حضور کی مصروفیتیں مسلّم، لیکن غریب قوم کا دست گیر کون ہو۔ ہم سب ظلمت اور جہالت میں اسیر ہیں۔ کوئی راہ نظر نہیں آتی سوائے آں جناب کی ذات مبارک کے۔''

تیسرے بزرگ رقم طراز ہیں:

''فلاں قوم نے ہم سب کو نرغہ میں لے لیا ہے۔ اگر آں حضور نے جلد سے جلد توجہ نہ فرمائی تو ہم سب موت کے گھاٹ اُتار دیے جائیں گے۔ ہم سب رات کو اُٹھ اُٹھ کر گڑگڑاتے ہیں کہ خدا آں جناب کو ہم میں بھیج دے۔ رات ہم نے خواب میں دیکھا کہ حضور کے ہاتھ میں ایک مضبوط عصا ہے۔ سبز چغا ہے، سفید گھوڑا ہے اور سفید ہی داڑھی ہے۔ فرماتے ہیں، گھبراؤ نہیں، دشمنوں پر غلبہ پاؤ گے۔ وے ککڑی مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیے جائیں گے۔''

چوتھے بزرگ یوں گل فشانی فرماتے ہیں:

''ہم سب ایک دور افتادہ مقام پر رہتے ہیں۔ کھیتی باڑی سے گزر کرتے ہیں۔ اب ہماری توجہ تعلیم کی طرف مائل ہوئی ہے۔ یہاں کوئی اسکول نہیں ہے اور ہو بھی تو اس کے اخراجات بہت ہوں گے۔ حضور نے تعلیم کا جو نیا طریقہ نکالا ہے اس کے برتنے کے ہم سب بہت شائق ہیں۔ کیوں کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کے طریقۂ تعلیم میں خرچ کچھ نہیں اور آمدنی بہت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم سب نے ارادہ کرلیا ہے کہ کھیتی باڑی بند کر کے آپ کے اسکول میں داخل ہو جائیں۔''

پانچویں فرماتے ہیں:

''جناب والا ہمارے یہاں تعلیم وغیرہ کا تو نہایت معقول انتظام ہے، لیکن ہم نے سنا ہے کہ آپ نے تعلیم کا جو منصوبہ باندھا ہے اس کی بڑی

شہرت ہے۔ آپ سے کیا چھپانا، ہم لوگ تو دوکان دار ہیں اور دکان داری میں میل کا سامان رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ آپ تشریف لا کر اپنی اسکیم کی ترکیب استعمال بتا جائیں۔"

ایک اور صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ نے تعلیم کا جو نیا اصول ایجاد کیا ہے، اس میں ہم کو یہ نقص نظر آتا ہے کہ بقول آپ کے یہ نظامِ تعلیم خود کفالتی ہوگا۔ آپ ایسے ماہرِ فن نے کبھی اس مسئلہ پر غور کیا ہے کہ اس زمانہ میں خود کفالتی کام مردود قرار دیا جا چکا ہے۔ جس طرح کسی قوم میں تعیشات پر زیادہ پیسے کا صَرف ہونا اس قوم کے متمدن ہونے کی دلیل ہے، اسی طرح آمدنی سے خرچ کا زیادہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ کام یا نظام نہایت منظم یا باقاعدہ ہے۔ ترقی کا معیار کم کھانا اور خوش رہنا نہیں ہے، بلکہ اچھا کھانا اور مقروض رہنا ہے۔ لیکن یہ باتیں اسی وقت طے ہو سکتی ہیں جب آپ خود تشریف لا کر تبادلۂ خیالات فرمائیں۔ ہم نے آپ کی اسکیم کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے۔ کوشش کی جائے تو اس میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے اور ایک ایسا تعلیمی نظام مرتب کیا جا سکتا ہے جس کے نافذ ہو جانے پر لڑکے مادرزاد تعلیم یافتہ پیدا ہوں۔ اس طور پر تعلیم کے اخراجات بمنزلہ صفر کے ہو جائیں گے اور جو کچھ پس انداز ہوگا وہ زنجبار کے لوگوں پر صَرف کیا جا سکے گا۔"

چنانچہ مکتوب الیہ آمادۂ سفر ہوئے۔ کسی سے قرض لے کر تھرڈ کلاس کے ٹکٹ خریدے۔ ایک آدھ جوڑے نئے کپڑے سلوائے، کچھ دھوبی سے کرائے پر لیے۔ دری اُدھار لی، غلاف دُھلوایا، چادر بدلی، ناشتہ بندھوایا، لوٹا چرایا اور روانہ ہو گئے۔

سفر میں بہت کچھ دھکے، پان سات مکّے، دو چار دہی بڑے کھاتے منزلِ مقصود کے قریب پہنچے۔ اسٹیشن نظر آنے لگا، ساتھ ہی ساتھ گنواروں کا ہجوم، نعروں کی صدا، پٹاخوں کا

چھوٹا،غرض گاڑی پلیٹ فارم سے آ گئی۔ معزز مہمان یا ان کے کسی بھائی بند کا نام لے لے کر مجمع نے نعرہ لگانا شروع کیا اور جو بچ رہے تھے انھوں نے مہمان کو ہاتھ لگایا۔ گیندے کے پھولوں کے ہار پہنائے اور پھول برسانے لگے۔ کسی نے ہاتھ چومنے شروع کیے، کسی نے سجدہ کرلیا، کوئی رونے لگا، کوئی شعر پڑھنے لگا۔ کسی نے زور سے نعرہ لگایا، کسی نے اسٹیشن ماسٹر پر دھول جمادی اور قلی کی پگڑی چھین لی۔ ایک نے چپکے سے مہمان کی جیب کتر لی۔ اسٹیشن سے باہر ہوئے ساتھ ہی ساتھ وہ لوگ بھی نکل گئے جو اسی موقع کے منتظر تھے اور جس گاڑی میں کوئی لیڈر قسم کا آدمی سفر کرتا ہے اس میں بغیر ٹکٹ سوار ہو جاتے ہیں اور ریل پیل میں اسٹیشن سے باہر ہو جاتے ہیں۔

اسٹیشن کے باہر چوکڑی یا موٹر نظر آئی۔ پھولوں اور رضا کاروں سے لدی ہوئی، مہمان بٹھائے گئے۔ لوگوں نے گاڑی کھینچی اور مہمان نے اپنی تقریر دل ہی دل میں دہرانی شروع کی اور کنکھیوں سے جہاں تہاں اپنی آمد اور مقوی دواؤں اور مخصوص بیماریوں کے اشتہارات بھی دیکھتے رہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ مقرر کو براہِ راست اس مقام پر کشاں کشاں لاتے ہیں، جہاں تقریر شروع ہونے والی ہوتی ہے۔ ورنہ ایک طول طویل جلوس شہر میں پھرایا جاتا ہے۔ اس میں دو چار گھنٹے صَرف ہوتے ہیں۔ اس دوران میں کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ غریب مقرر کو بعض ایسی نازک و ناگفتہ بہ ضروریات بھی پیش آسکتی ہیں، جن کو وہ ایسے مجمع میں ظاہر نہیں کرسکتا تھا، جس میں وہ تقریر کرتے وقت یہ جتانا چاہتا تھا کہ وہ ان ضرورتوں سے بے نیاز ہے اور بے نیاز نہ ہوتا تو یہ دن کیوں دیکھنے پڑتے۔

اب وہ اپنے میزبان کے یہاں پہنچتا ہے جہاں اور بہت سے دردمندانِ قوم موجود ہوتے ہیں، جن سے اس کو دل پر جبر کر کے ہنس ہنس کر یا بسور بسور کر گفتگو کرنی پڑتی ہے۔ ایک طرف اخبار کے نمائندے ہوتے ہیں۔ سوال کرتے ہیں، فلاں مقام پر جو جنگ ہو رہی ہے، اس میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ عورتوں کی ترقی اور شکار ہونے والے جانوروں کے تحفظ میں حکومت کا کیا رویّہ ہونا چاہیے۔ نوکریوں میں مختلف اقوام کے تناسب اور زنجبار کی لوگوں کی درآمد برآمد میں کیا اصول مدِّنظر رکھنا چاہیے۔ نشہ لانے والی اشیا سے آپ کو کہاں تک دلچسپی ہے

اور اس کے ممنوع قرار دیے جانے پر آپ کا کیا رویہ ہوگا۔ جنگ حبش میں آپ کہاں تھے اور آئندہ جنگ میں آپ کا انجام کیا ہوگا۔

رات گئے کسی بڑے ہال یا اُجڑے پارک میں جلسہ ہوتا ہے۔ مقرر صاحب اسی شان وشوکت کے ساتھ تشریف لاتے ہیں جس شان وشوکت کے ساتھ کوئی جاہل مال دار کسی تعلیم گاہ میں لایا جاتا ہے۔ ایک صاحب کھڑے ہوکر مقرر کی وہ تمام صفات بیان کرتے ہیں جو اس میں موجود نہیں ہوتیں۔ لوگ تالیاں بجاتے ہیں۔ غریب تقریر شروع کرتا ہے۔ 3-2 گھنٹہ تک اس کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، تالیاں بجتی رہتی ہیں۔ نعرے لگائے جاتے ہیں، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ آخر وہ دن آ گیا جب ساری قوم منظم ومتحد ہو جائے گی اور دوسری جتنی بیدار ومنظم قومیں ہیں وہ سب مردود منتشر ہو جائیں گی۔

تقریر ختم ہوتی ہے۔ صدر صاحب مقرر کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مجمع منتشر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے دست بوسی اور سلامت روی کے سلسلہ میں مقرر کو باہر نکلنے میں دیر ہوتی ہے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو نہ کوئی آگے ہے نہ کوئی پیچھے۔ ہر طرف اندھیرا ہے اور یہ نفس بے چارہ۔

کوئی خدا رسیدہ نیم برہنہ بیڑی والا سامنے آ کر بیڑی بیچنا چاہتا ہے، اور یہ مجسم شکوۂ ہند حالی کے کمال اور اپنے زوال پر خلال کرتے ہوئے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ٹوٹا سا یکہ یا تانگہ مل جاتا ہے، تو آدھی رات گئے میزبان کے دروازے پر پہنچتے ہیں۔ تانگہ والا پیسے مانگتا ہے۔ نیند اور بھوک اپنا مطالبہ کرتی ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو جیب تک غائب ملتی ہے۔ نوکر سے تھوڑے پیسے قرض لیتے ہیں اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اس کے بارے میں تانگے والے سے شہر آشوب سُن کے نوکر ہی کے آس پاس اور اسی کے بچے کھچے ٹکڑوں پر اکتفا کر کے سو جاتے ہیں اور صبح اسٹیشن پہنچ کر پہلی ٹرین سے روانہ ہو جاتے ہیں۔

وطن مالوف پہنچ کر میزبان کا خط ملتا ہے۔

''حضور کی تقریر نے یقیناً وہ کام کیا جو غالباً صور اسرافیل سے نہ ہو سکتا۔ حضور عندالناس مشکور ہوں یا نہ ہوں عنداللہ یقیناً ماجور ہوں گے۔ ہم غریب لوگ ہیں، بے روزگاری نے کہیں کا نہ رکھا۔ شراب تاڑی کا

کاروبار اور خوردونوش دونوں بند ہیں۔ اس لیے سفر خرچ کا بندوبست
نہیں کر سکتے۔ آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے اسے ہم تاحشر نہ
بھولیں گے۔ انشاءاللہ العزیز آئندہ سال حضور کے رُخ انور کی زیارت
نصیب ہوگی۔"

اس قسم کے عقیدت مندانہ خط و کتابت کے بعد مقرر کو اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ وہ تمام عمر اپنی سعادت مندی سے بیوی کو ہموار اور اپنے خرچ سے ملک و قوم کو بیدار کرتا رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تصویر کا دوسرا رُخ بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے اور ہاں ذرا ٹھہر یے گا۔ دیکھیے خلاف معمول میں نے اب تک موضوع تقریر سے انحراف نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ بہت سے مواقع ایسے آئے کہ میں شاہراہ سے ہٹ کر پگڈنڈیوں پر آ جاتا اور آپ کو بھی میرے ساتھ گھسیٹنا پڑتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب جب کہ تصویر اور اس کے رُخ کا مسئلہ سامنے آ گیا ہے تو مجھے تصویر کے خدوخال سے بحث کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ تصویر کے ساتھ ہمیشہ اس کا رُخ کیوں بحث میں آ جاتا ہے۔ آخر ایسی تصویریں کیوں معرض بحث میں آتی ہیں جن کے رُخ ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف یا متضاد ہوتے ہیں۔ پہلے زمانے کی تصویروں میں یہ عجائبات نہیں ہوتی تھیں۔ ایسا تو نہیں کہ یہ باتیں صرف آج کل کی جدید مصوری میں ملتی ہوں۔

آج کل کی تصاویر کا جہاں تک میں مطالعہ نہیں، مشاہدہ کر سکا ہوں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں لمبائی، چوڑائی، موٹائی نہیں بلکہ صرف بوجھ گوشے اور کھانچے ملتے ہیں۔ چنانچہ اب اچھی تصویر کا معیار یہ نہیں ہے کہ آپ کو تصویر اچھی یا اصلی معلوم ہو، بلکہ سوا تصویر کے سب کچھ معلوم ہو۔ ایک دفعہ اس قسم کی تصویر دیکھ کر میں نے لاحول ولاقوۃ کہہ دیا تھا۔ اسی دن سے لوگوں نے میرے جمالیاتی نقطۂ نظر کے بارے میں کچھ ایسی عجیب و غریب رائے قائم کر لی ہے کہ اب میں اس بارۂ خاص میں نہایت اہتمام کے ساتھ سہا رہتا ہوں اور احتیاطاً اپنے اس چھوٹے بچے سے بھی کچھ نہیں کہتا جو اکثر میری عدم موجودگی میں میرے کاغذات پر میرے ہی قلم سے کھینچ تان کرتے کرتے سیاہی اُنڈیل دیتا ہے، جس پر میں دل ہی دل میں ایک خاص قسم کا

گھونٹ پی کر خاموش رہ جاتا ہوں، اور محض اس خیال سے کہ ممکن ہے مصوّری کی شریعت میں نہیں، مصوّری کے تصوف میں یہ بھی کوئی تصویر ہی ہو۔

میر نے تصویر کا معیار دلّی کے گلی کوچوں کو بتایا تھا۔

''جو چیز نظر آئی تصویر نظر آئی''۔[1]

میرے کہنے کا مقصد کچھ یہ تھا کہ ان جدید اور جدت طراز تصویروں میں ایک دو نہیں سینکڑوں رُخ نظر آتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ان تصاویر کا صدقِ دل سے مطالعہ شروع کیا تو ایک طرف سے ایسا معلوم ہوا جیسے گندھک کے پگھلانے سے گندھک کی قلمیں بن گئی ہیں۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سیمنٹ کی عمارت کا اشتہار ہے۔ کبھی یہ معلوم ہوا کہ بعض قوموں کی قبرستان کا نقشہ ہے، کبھی یہ محسوس ہوا کہ جدید قسم کے کرگہہ یا سوئی اور ٹاپٹی کے نمونے ہیں۔ ایک دفعہ آنکھیں میچ کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ایک خاص قسم کی موچھیں ہی موچھیں ہیں۔ پھر یہ ٹھان کر مطالعہ شروع کیا کہ اس میں کسی جاندار کی تصویر نظر آنی چاہیے۔ تصویر تو نظر آئی، لیکن یہ نہ تیقن ہو سکا کہ جانور کی تھی یا انسان کی۔ میں نے دل کو یہ سمجھا کر مطمئن کر دیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بہ یک وقت جانور اور انسان دونوں کی ہو!

مقرر پر گفتگو کرتے کرتے تصویر پر اُتر آنا ایک ضمنی سی بات تھی، جس کے بغیر مجھے بات کرنے اور خوش مذاق لوگوں کو بات سننے میں لطف نہیں آتا۔ سننے والے کے بارے میں تو میں کچھ کہتا نہیں، لیکن اپنے بارے میں ضرور کہوں گا کہ یہ عادت بُری ہے۔ عادت بجائے خود بُری چیز ہے چہ جائیکہ وہ بُری بھی ہو، لیکن انسان عمر کے ایک خاص درجہ میں پہنچ کر صرف بُری عادتوں کے سہارے جیتا رہتا ہے۔ اس لیے اب جب کہ میں نے اپنی بُری عادت برت لی، مجھے تسکین سی ہو گئی ہے۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمایئے۔ یعنی ایک تو وہ مقرر تھے، جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب ان کے دوسرے بھائی کا حال سنیے:

---

1 میر کا مشہور شعر ہے:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے　　جو چیز نظر آئی تصویر نظر آئی

یہ اپنے مقام سے اس وقت تک نہ ہلیں گے جب تک سکنڈ کلاس کا کرایہ پیشگی نہ وصول ہو جائے۔ وارد ہوتے ہی یہ کھانا بالکل ترک کردیں گے۔ یعنی جو کھانے عمر بھر کھاتے آئے ہیں، اسے ترک کر کے نئے نئے کھانے کی فرمائش کریں گے۔ مثلاً صرف وہی کھائیں گے، چھاچھ پئیں گے، ایک آدھ بیسن کی روٹی، گاجر کا مربا، ندی کا پانی اور سوتے وقت اسپغول کی فیرینی! تقریر کر کے واپس آئیں گے تو چائے طلب کریں گے۔ خواہ رات کے دو بجے ہوں اور سردی ایسی پڑ رہی ہو کہ ناک، تھوک برف کی قلفی بن گئے ہوں۔ نوکر غائب، بیوی بچے آرام سے لحاف کے اندر اور میزبان چولھے پھونک اور راکھ پھانک رہا ہو۔ چلتے وقت ایک آدھ دری، دو چار سیر علی گڑھ کی صابونی، ایک آدھ ٹین سگریٹ کے نذر گزرانیے اور دو چار تصانیف خریدیے۔

مقرروں کی ایک "حال وارد قسم" بھی ہے، یعنی ریڈیو کے مقرر۔ ان کا شمار رمضان کے نمازی اور محرم کے سپاہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ صرف ایک بات کی البتہ کمی محسوس ہوتی ہے، یعنی اس قسم کی تقریر کا موقع نہیں ملتا کہ جو زبان پر آئے کہہ ڈالے اور جو سر پر پڑے اسے جھیل لے۔

اُمید ہے کہ پولیس اور ہسپتال کی مزید اصلاحات کے بعد یہ دقتیں بھی دور ہو جائیں گی۔

●●●

لیڈر

جی ہاں اب میں تقریر کروں گا جس کے بول ہیں:

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہیں جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی[1]

ممکن ہے اکبر کے زمانہ میں ایسے ہی لیڈر ہوتے ہوں، لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے، اور کچھ اس طور پر بدلا ہے کہ اس شعر کی مزید تشریح جان جوکھوں سے کم نہیں۔ شعر کتنا بولتا ہوا ہے، خصوصاً ریڈیو پر جہاں اناؤنسر صاحب ہر قسم کے بول کی دعوت دیتے رہتے ہیں اور اس کا لحاظ نہیں رکھتے کہ جاڑے کی رات اور دہلی کی فضا اس کے لیے موزوں بھی ہے یا نہیں!

میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ اس زمانہ میں لیڈر کا تخیل یکسر بدل گیا ہے۔ اب زلیخا خود لیڈر ہے اور برادران یوسف برسرِ اقتدار۔ پھر نسیم مصر کو پیر کنعاں کی ہوا خواہی مدِ نظر رہی ہو یا نہیں۔ جنوری کی کولڈ ویو (Cold Wave) سے یعقوبوں کی یقیناً خیر نہیں۔ ابھی ابھی لیڈروں کی سہاگ کا زمانہ ختم ہوا ہے، ہماہمی کسی قدر مدھم پڑ گئی ہے۔ اس زمانہ میں لیڈر پر گفتگو کرنا کچھ مناسب بھی نہیں، لیکن یہ مصرعہ طرح کچھ ایسا بولتا ہوا ہے کہ اس پر طبع آزمائی نہ کرنا بڑی بدمذاقی ہے!

---

1 اکبرالہ آبادی۔

میرا خیال ہے کہ جس قوم میں جتنے لیڈر ہوتے ہیں، اتنی ہی اس قوم کی شامت متیقن ہوتی ہے۔ اسی دسمبر میں کتنی کانفرنسیں، کتنی انجمنیں، کتنی سبھائیں اور کتنے لیڈر دُم دار ستاروں کی مانند فضائے سیاست میں نمودار ہوئے اور کتنے منجموں کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی کہ ان ستاروں کی دُم سے ٹکرا کر یہ دنیا پاش پاش ہو جائے گی۔ اتنا البتہ معلوم ہوا کہ بجائے کرۂ ارض سے ٹکرانے کے ان ستاروں کی دُمیں خود ایک دوسرے سے اُلجھ کر تتر بتر ہو گئیں، اور ہم اور ہماری دنیا جہاں کی تہاں رہ گئی۔ یہ تو اخباری لیڈر تھے جن کے نام مشہور ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ وہ ہیں، جن کو نہ اخبارات میں کبھی جگہ ملی، نہ جیل میں، لیکن وہ اپنے مخصوص حلقہ میں اپنی اہمیت دسمیت پھیلاتے رہتے ہیں۔

لیڈروں کے اقسام متعین نہیں ہو سکے ہیں۔ بعض فصلی ہوتے ہیں، بعض ذیلی، بعض مادرزاد ہوتے ہیں، بعض اللہ واسطے کچھ وبائی ہوتے ہیں۔ بعض شمسی ہوتے ہیں، بعض خود کاشت اور بعض شرح معین۔ بعض اشتہاری ہوتے ہیں اور بعض خاموش۔ بعض ایسے لیڈر ہوتے ہیں جن کی صحت خراب ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اپنی بیماری اور لیڈری کا ساتھ ساتھ اعلان کرتے ہیں اور اس طرح خرابی صحت کی تلافی شہرت مرض سے کرتے ہیں۔ بعض لیڈر در لیڈر ہوتے ہیں، وہ گمراہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، بلکہ گمراہ رہنے کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

میں نے ان لیڈروں کی اقسام بتانے میں بظاہر کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے، لیکن آپ یقین رکھیے یہ فہرست قطعاً جامع نہیں ہے۔ لیڈروں کی اقسام اور ہندوستان کے امراض کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔ گو امراض و لیڈر میں ایک فرق بھی ہے۔

امراض کا احساس ہم اسی وقت کرتے ہیں جب ہم ان میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ورنہ بہت سے ایسے جراثیم ہیں جو صرف ''حقیقت منتظر'' ہیں، ''لباس مجاز'' میں نہیں آئے ہوتے۔ لیڈر پھر لیڈر ہے۔ وہ صرف لباس مجاز کا قائل ہے۔ منتظر یا غیر منتظر کے امکان یا عدم امکان کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ وہ یورپ کے تجارتی اصول کا قائل ہوتا ہے، یعنی ضرورت پہلے پیدا کی جائے اور مال بعد میں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں لیڈر کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس کی ضرورت بعد میں پیدا ہوتی رہے گی، ورنہ اسے اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضرورت

پیدا ہو جائے اور لیڈر غیر حاضر ہو۔ اسلحہ جنگ موجود ہونا چاہیے۔ لڑائی چھڑنے میں کتنی دیر لگتی ہے!

اب لیڈروں میں سے بعض کا حال سنیے۔ میں نے ایک قسم فصلی لیڈر کی بتائی تھی۔ یہ لیڈر فصل کی پیداوار کی مانند ہوتا ہے۔ جس طرح برسات میں کھیرے، ککڑی، پھوٹ اور بھٹے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح خاص خاص فصل میں فصلی لیڈر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بقرعید، محرم، دسہرہ، دیوالی کے زمانہ میں آپ دیکھیں گے ہر جگہ مارنے مرنے کے لیے لیڈر رونما ہو جاتے ہیں۔ مارنے مرنے کا لفظ محض برسبیل تذکرہ آ گیا ہے اور یہ محض لیڈر کی آمد سے متعلق ہے۔ خود لیڈر کے مارنے مرنے سے اس کا بہت کم علاقہ ہے۔ اصلی لیڈر نہ مار کھاتا ہے اور نہ مرنا گوارا کرتا ہے۔ لیڈر مار کھانا شروع کر دے تو پھر قوم کی رہبری کون کرے۔ مارنا اور رہبری کرنا دونوں کام ایک ہی لیڈر سے کیوں کر سرانجام پا سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے اگر فصلی بلوؤں میں ایک آدھ لیڈر کی آنکھ پھوٹ جائے۔ دو ایک دانت ٹوٹ جائیں، ایک کان غائب ہو جائے، تھوڑی بہت ناک کٹ جائے۔ اللہ اللہ خیر سلا، اور یہ باتیں ایسی ہیں جنھیں بطور فوجی اعزاز یا قومی امتیاز کے ہر لیڈر انگیز کر ہی لیتا ہے۔ تاہم دستور یہی چلا آتا ہے کہ مار کھانا قوم کا حق ہے اور مار سے بچنا لیڈر کا فرض! یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جس طرح پلیگ کے آثار پاتے ہی میونسپلٹی چوہوں کا قلع قمع شروع کر دیتی ہے، اسی طرح جب تیوہار آنے والے ہوتے ہیں تو لیڈروں سے محکمہ ضمانت لی جانے لگتی ہے۔ تیوہار ختم ہوتے ہی انھیں رہا کر دیا جاتا ہے۔ ان کی لیڈری کی ابتدا و انتہا یہی ہے۔

ذیلی لیڈر فصل، مقام اور وقت سب سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ بجائے خود لیڈر نہیں ہوتے، بلکہ لیڈروں کے مصاحب ہوتے ہیں۔ جلوس میں ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور ڈائس پر صدر کی کرسی سے قریب یا میز کے نیچے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہار پہننے میں لیڈر کے ساتھ اور نعرہ لگانے میں مجمع کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جب لیڈر جیل خانہ جاتا ہے تو یہ اپنے گھر آ جاتے ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو یا کیسی ہی بات ہو، یہ اسے اپنا لیں گے۔ کسی قدر سنجیدہ اور رونی صورت بنائے ہوئے ہر شخص سے ملیں گے اور اس طور پر تبادلۂ خیالات کریں گے گویا مسئلہ کے انجام سے خود

ان کا انجام وابستہ ہے۔ افریقہ میں کوئی مسئلہ پیش آنے والا ہو یا ماما کی بچی کو چیچک کا ٹیکہ لگایا جانے والا ہو وہ دونوں باتوں پر اس فکر و تدبر خشوع و خضوع سے ہر جگہ بیٹھ کر گفتگو کریں گے، جیسے خود انھیں اپنے بارے میں طے کرنا ہے کہ شادی کریں یا خودکشی!

لیڈر اپنی دانست میں قوم کی رہبری کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، یہ اپنی دانست میں لیڈر کی رہبری کرتے ہیں۔

گشتی لیڈروں کی مثال ان بڑھیوں کی ہے، جنھوں نے صبح ہوتے ہی اوزار بسولے ساتھ لیے اور کام بڑھئی کا پکارتے گھر سے نکل پڑے۔ کسی کی چارپائی کی چول درست کردی، کسی کے دربے کی مرمت کردی اور کچھ نہ ملا تو جنگل سے لکڑیاں کاٹ لائے۔ پولیس والوں نے دھرا تو ساری لکڑیاں اور نصف اوزار ان کی نذر کردیے اور گھر لوٹ آئے۔ آپ نے کن میلیوں کو دیکھا ہوگا، اس کی گھیردار پگڑی اور سلائی چمٹیاں بھی، کسی درخت کی جڑ پر یا پلیٹ فارم کے کسی گوشہ میں بیٹھے کان میں خلال کر رہے ہیں۔ خلال اپنا کان دوسرے کا۔ ان کی صدائیں بھی آپ نے سنی ہوں گی۔ میں نے بھی سنی ہیں، لیکن دُہرانا نہیں چاہتا۔ ریڈیو کا سارا کھیل کان کا ہے۔ معلوم نہیں کون صاحب کیا سمجھ لیں یا کیا محسوس کریں۔ غالب نے ایک جگہ انھیں "گشتی لیڈر" کو مدنظر رکھ کر شاید کہا ہے:

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

اس قسم کے لیڈروں کی کمی نہیں ہے، اور وہ دن بھی دور نہیں ہے جب قوم و ملک میں آپ ان کو اس طرح عام دیکھیں گے۔ جیسے شہروں میں جابجا عرائض نویس، مونگ پھلی والے، رمّال، موچی اور سپیرے ملتے ہیں۔

مادرزاد لیڈر اندھے کی مانند ہوتا ہے۔ اس کو کچھ نہیں معلوم صورت حال کیا ہے۔ اس کو شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ صورت حال کیا ہونی چاہیے۔ وہ صرف "ہونا چاہیے" کے درپے ہوتا ہے۔ اسے نہیں معلوم خوب صورتی کسے کہتے ہیں۔ بدصورتی کیا ہے؟ وہ صورت ہی کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ وہ زندگی کی کتاب میں فصل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تفصیل سے اسے سروکار نہیں، وہ دیکھے

بغیر سمجھنا چاہتا ہے اور یہی نہیں بلکہ سمجھے بغیر کرنا چاہتا ہے۔ ہر واقعہ کو وہ انقلاب و ہنگامہ کا پیش خیمہ سمجھتا ہے۔ وہ پیش خیمہ کا بھی نہیں قائل ہے، وہ صرف حادثہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے تسلسل اور تسلسل کے حسن و مقصد کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ گہرائیوں اور پہنائیوں سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ صرف انتشار و ہیجان سے سروکار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کھیلنا چاہتا ہے، سنوارنا نہیں گوارا کرتا۔ وہ نفی کا قائل ہے۔ حقائق سے گریز کرتا ہے! لیکن ذرا ٹھہریے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آپ سوچتے ہوں گے لیڈر کے سلسلہ میں یہ طوفان تکلم کہاں سے چھڑ گیا۔ اچھا ''مادرزاد لیڈر'' کے یہ معنی سمجھ لیجیے 24 گھنٹے لیڈر۔ آپ نے بعض حاکموں اور افسروں کو دیکھا ہوگا جو 24 گھنٹے حاکم یا افسر بنے رہتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ بیوی، بچوں، دوست، احباب اور بھلے مانسوں میں بیٹھ کر کبھی کبھی ان بلندیوں سے اُتر بھی آنا چاہیے، جن پر ان کی شامت اعمال نے انھیں پہنچا دیا ہے۔

اللہ واسطے لیڈر وہ ہیں جن کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے صرف دوزخ کی بشارت دینے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ صرف وہ جنّتی ہے اور بقیہ دوزخی۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا اور اس میں رہنے بسنے والوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ جنت و جہنم کا پروپیگنڈا ہوتا رہے۔ یہ لیڈر گمراہوں سے التفات کم کرے گا۔ اس کا کچھ تو یہ سبب ہے کہ خود گمراہ اس سے مطلق التفات نہیں کرتے اور کچھ یہ کہ وہ سمجھتا ہے کہیں یہ گمراہ راہِ راست پر آ گئے تو یہ جنت کے حق دار ہو جائیں گے، اور خود اس کو جنت میں طعام و قیام کی دقت محسوس ہوگی۔ وہ خدا اور اس کی لامحدود اور بہت سی لامعلوم قدرتوں کو ریلوے کمپنی کی مانند سمجھتا ہے، جہاں فرسٹ اور سکنڈ کلاس کے ڈبے محدود ہوتے ہیں۔ اگر مسافر زیادہ ہوئے تو ان ڈبوں میں اسے تکلیف ہونے لگے گی۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ انسان نے خدا کو نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا ہمارے افعال سے متاثر ہونے پر مجبور نہیں ہے۔ اپنی منشا کا مختار ہے، جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس کا شاہ کار ہم انسان ہیں نہ کہ جنت و دوزخ۔ منشا الٰہی کون سمجھ سکتا ہے، لیکن اتنا مسلّم ہے کہ اعمال انسانی منشا و مشیت الٰہی کی میزان میں تولے جائیں گے۔ ہماری آپ کی میزان میں نہیں اور بھلے مانسوں کی تقویت کے لیے یہ تصوّر کافی ہے۔

وبائی لیڈر وہ ہیں جن کے آنے سے کچھ دیر یا دنوں کے لیے اچھے خاصے بھلے چنگے لوگ اُچھلنے کودنے چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ ان کا اثر مقامی ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اب بھی وبائی امراض کا مقابلہ، بھینٹ اور چڑھاوے سے کیا جاتا ہے۔ ان لیڈروں کو چندے اور دعوتوں سے قابو میں لایا جاتا ہے۔ بعض امراض میں تیز دوائیں یا شدید تدابیر سے کام لینا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، بلکہ ان کا دفعیہ اچھی غذا، اچھے لباس اور اچھی فضا سے کیا جاتا ہے۔

جدید ترین تحقیقات کی رو سے بھی امراض کا تدارک انھیں باتوں سے کرنا زیادہ بہتر سمجھا گیا ہے۔ وبائی لیڈروں کا انسداد بھی نہایت آسانی اور کامیابی سے کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کے لیے بھی اچھی غذا، اچھا لباس اور تفریحی سیر و سیاحت کا معقول انتظام کر دیا جائے۔

شکمی خود کاشت اور شرح معین لیڈروں میں اب بڑا انقلاب ہوگیا ہے۔ زراعتی اصلاحات نے شکمی اور خود کاشت کو شرح معین کی حیثیت دے دی ہے۔ اب ان کا بے دخل کیا جانا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ اس میں فائدہ یا نقصان صرف اتنا ہے کہ زمین دار معزول ہوگئے ہیں، زمین داری قائم ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ لیڈر معزول ہوگئے ہیں، لیڈری قائم ہے۔

خاموش لیڈر بڑا بس بھرا ہوتا ہے، وہ کبھی کھل کر بات نہیں کرتا۔ بحث کرنے کی اس میں جرأت نہیں ہوتی محض اس وجہ سے کہ کہیں اس کے دل کی بات نہ ظاہر ہو جائے۔ اکثر وہ آپ سے زبانی اتفاق بھی کرلے گا، لیکن اخبار میں ہمیشہ اختلاف کرے گا۔ وہ شکل، حرکات و سکنات سے اپنے آپ کو بے وقوف اور مریض ظاہر کرے گا اور واقعتاً وہ ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ جتانا ہوتا ہے کہ محض قوم و مذہب کی خاطر اس نے اپنے آپ کو مجہول بنا رکھا ہے اور قوم و مذہب کی خدمت صرف رونی صورت اور میلے کچیلے کپڑوں سے کی جاسکتی ہے۔ ایک دوسرے بزرگ ''مضمون خواں لیڈر'' ہیں، ان سے کسی مسئلہ پر گفتگو کیجیے۔ وہ ہمیشہ کہیں گے، میں نے اس پر مضمون لکھ دیا ہے۔ جلسہ کرایئے تو پڑھ دوں۔ یہ گفتگو نہیں کرتے ہیں، انٹرویو دیتے ہیں اور انٹرویو بھی انھیں کو دیتے ہیں جو اسے شائع کرنے پر آمادہ ہوں۔ یہی نہیں بلکہ سوال اور جواب دونوں خود ہی تصنیف فرماتے ہیں۔ آپ کوئی سوال کریں جواب یہ وہی دیں گے، جو

اُن کے مضمون میں درج ہو۔ اگر درج نہ ہوگا تو پھر آپ کے سوال کا جواب وہ دیں گے جو کسی بڑے آدمی کو کسی دوسرے سوال پر دے چکے ہوں گے۔ آپ میں ہمت ہو اور پھر کوئی سوال کر بیٹھیں تو ان کا جواب کسی ایسے واقعہ کا اظہار ہوگا جب انھیں کسی بڑے آدمی نے ڈانٹ دیا تھا۔ آپ مجبور ہو کر چپ ہو جائیں گے تو یہ نہایت خوشی سے اسے شائع کر دیں گے۔ ان کے دوسرے بھائی جھوٹ بولنے کے لیڈر ہیں۔ وہ جھوٹ میں پورا ''خطبہ صدارت'' سنا دیں گے۔ آپ گرفت کریں گے تو یہ کوئی دوسرا جھوٹ تصنیف فرما دیں گے۔ آپ جھنجھلا کر انھیں مار ڈالنے یا خود مر جانے پر آمادہ ہوں گے تو یہ سب سے بڑا جھوٹ بول کر آپ کو اپنی زندگی کے دو سب سے بڑے مواقع یعنی انھیں مار ڈالنے یا خودکشی سے محروم کر دیں گے!

ان دونوں کے برادر کلاں ایک لیڈر ایسے دیکھے گئے جو تقریر کرنے میں اپنے جسم کے تمام حصّوں کو تھرکاتے ہیں۔ کچھ حصّے سے بولتے ہیں، کچھ سے چیختے ہیں، کچھ سے پھڑکتے ہیں۔ ان کی رگ رگ میں قوم کا درد ہے۔ جس کی مرہم پٹی قوم کے ایثار سے کرتے ہیں۔ لیڈری کا گُر تو انھوں نے اپنے وطن میں سیکھا تھا، البتہ اس کی تکمیل سرائے میں کی۔ انھوں نے قوم کے لیے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ ایک زمانہ میں انھوں نے تقسیم عمل اور اصول یہ رکھا تھا کہ مونچھیں اپنی اور کاسمیٹک قوم کی۔ اب داڑھی ان کی ہوتی ہے، خضاب قوم کا۔ قوم کو خطرہ میں پاتے ہیں تو چندہ وصول کر کے اپنے آپ کو خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ روپیہ پیسہ خطرہ کی چیز ہے جس کے پاس ہوگی وہ خطرہ میں ہوگا اور وہ لیڈر ہی کیا جو قوم کی خاطر اپنے آپ کو خطرہ میں نہ پھنسا دے!

ایک لیڈر اس کے قائل ہیں کہ لڑائی صرف میدان جنگ کے نقشے تصنیف کرنے سے جیتی جا سکتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فتح و شکست نصیبوں سے نہیں منصوبوں سے ہوتی ہے اور ہار جیت کا مدار لڑائی کی عاقبت پر نہیں جنرل کی عافیت پر ہے۔ اپنی طاقت سے زیادہ دشمن کی کمزوری پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ وہ جنگ دوسردار پر ایمان نہیں رکھتے، ان کا خیال ہے کہ جنگ دوسر نہیں بلکہ وہ سرے سے دردِ سر ہے!

ان کے نزدیک سب سے قابل اعتماد سپاہی وہ ہیں جو جان دیں یا نہ دیں ووٹ دیں اور ایسے سپاہی اسی وقت مہیا ہو سکتے ہیں جب ان میں جنگ کا ولولہ نہیں، مال غنیمت کی تقسیم کا

جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ لڑائی پہلے اپنے ہاں لڑی جاتی ہے، اس کے بعد دشمن کا مقابلہ کرنے نکلتے ہیں۔ بزدلی، تنگ نظری، عافیت جوئی، جاہ طلبی، مشیخت اور خودغرضی پر قابو پانے سے پہلے دشمن کو دعوت جنگ دینا غلطی نہیں غداری ہے۔

گرم ممالک کے مخصوص امراض وادویات پر تحقیقات کرنے کے لیے حکومت نے مخصوص ادارے اور انسٹی ٹیوٹ کھول رکھے ہیں۔ ان اداروں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ لیڈری کے مرض اور اس کے انسداد کی تدابیر پر بھی غور کرے۔ یہ ہندوستان کا خاص مرض ہے، جس سے باشندوں کی عافیت خطرہ میں ہے۔ اس مرض کا سدباب حکومت اور پبلک دونوں کی متفقہ کوشش سے ہوسکتا ہے۔ ٹڈی دل کی طرح اس آفت کے انسداد کا اب تک کوئی موثر و معقول طریقۂ کار نہیں دریافت ہوسکا۔ گورنمنٹ صرف یہ کرسکتی ہے کہ ہر خطرہ کے وقت سائرن بجایا جائے، جس کے اسٹیشن جابجا موجود ہوں گے۔ جیسا کہ ہوائی جہازوں کے حملہ سے بچنے کے لیے یورپ میں کیا جارہا ہے۔ اس وقت ہر باشندہ کو جھاڑو، راکھ اور مشعلیں لے لے کر جو حکومت کی طرف سے مفت تقسیم کی جائیں گی، نکل پڑنا چاہیے اور وہی سلوک ان سے کرنا چاہیے جو ٹڈیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے!

ابھی ابھی اسٹیشن آتے ہوئے حقہ کا ایک کش لینے کے لیے چہار درویشوں کے کلب پہنچا تو معلوم ہوا کہ خداترسوں کی ایک کانفرنس منعقد ہے، جہاں اس چیز پر بڑی برہمی پھیلی ہوئی ہے کہ ادھر کئی سال سے امریکہ کے جتنے سیاح نوادر جمع کرنے ہندوستان آتے ہیں، وہ بڑی بڑی رقمیں صَرف کرکے لیڈروں کی کھیپ کی کھیپ امریکہ کے عجائب خانہ کے لیے بھیج رہے ہیں۔ جہاں ان کو دیکھنے کے لیے لوگ جوق جوق آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب وہاں کے سرکس اور سنیما کمپنیوں کی طرف سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے، جس پر کمپنی کے مالکوں نے انقلاب برپا کرنے کی دھمکی دی ہے۔ بالآخر طے یہ پایا ہے کہ عجائب خانہ کے منتظمین ان لیڈروں کو عاریتاً تماشہ کمپنیوں کو دیتے رہیں گے۔ ایک دوسرے ممبر نے جناب صدر کو چونکا کر جو آنکھیں بند کیے غالباً امریکہ کے زیر بحث عجائب خانہ کی سیر کررہے تھے۔ بتایا کہ حکومت نے ابھی ابھی ایک سرکلر جاری کیا ہے کہ امریکن سیاحوں کے اس مشغلہ میں مداخلت کرنے سے بین الاقوامی

پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ البتہ حکومت جاپان سے یہ تحریک کی گئی ہے، اگر وہ اپنے کارخانوں سے ایسے لیڈروں کے کھلونے تیار کرادے تو امریکہ والے انھیں کافی تعداد میں خرید لیا کریں گے اور جب تک ہندوستان اور امریکہ میں اس بارہ میں کوئی قابلِ عزت سمجھوتہ نہ ہو جائے، حکومت امریکہ ان کھلونوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگائے گی۔ حکومت اس مسئلہ پر بھی غور کر رہی ہے کہ لیڈروں کے تحفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مسئلہ کو اس قانون کے تحت کیوں نہ لایا جائے جو شکار کیے جانے والے جانوروں کے حق میں نافذ ہے!

کانفرنس شغل کے لیے ملتوی ہوئی تھی کہ میں بھاگا بھاگ ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ محض یہ اطلاع کرنے کہ اس کانفرنس کی روئداد نشر کرنی ہو تو موقع غنیمت ہے۔

●●●

بابو

انسان کی ترقی کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس نے پہلے پہل اپنی کمزوری محسوس کرنی شروع کی، یعنی اس کو اپنے اوپر اعتماد باقی نہ رہا۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا وسیلہ ڈھونڈھا، جس سے وہ جب چاہے اپنی کمزوری کی پردہ پوشی کرلے اور جب جی چاہے، دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھالے۔ اس کا نام اس نے رکھا قانون، لیکن قانون بھی ایسی چیز نہ تھی جو خامیوں سے بالاتر ہوتی یا کبھی کبھی تکلیف دہ نہ محسوس ہوتی۔ اس کا تدارک اس نے آفس سے کیا۔ قانون کا ہاتھ پاؤں تو توپ اور تلوار ہے، لیکن اس کا ذہن و دماغ آفس ہے۔ ایجاد ہونے کو تو آفس ہو گیا، لیکن جیسا کہ ہر ایجاد کا خاصہ ہے جب وہ عملی زندگی میں دخیل ہو جاتی ہے تو اس کے مطالبات یا اس کا ردِّعمل اکثر نا قابلِ قبول یا نا قابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ یہی حال آفس کا ہوا کیوں کہ اس کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی گئی تھی اور اس کا منشا صرف اتنا تھا کہ ہم غیر ضروری پیچیدگیوں یا طوالتوں کو دوام بخشیں۔

اب آیئے اس سلسلہ میں ایک قصّہ سنیے۔ ہندوستان کی مائتھالوجی میں مَیں نے ایک جگہ پڑھا ہے کہ بھگوان کے مخصوص بھگتوں نے ایک بار بھگوان سے پرارتھنا کی کہ کوئی اُپائے ایسی ہونی چاہیے جس سے بھگتوں کی یہ اُمت یا زندۂ جاوید ہو جائے۔ بھگوان نے فرمایا کہ سمندر میں امرت موجود ہے، اسے حاصل کرو اور پی کر زندۂ جاوید ہو جاؤ۔ چنانچہ سمندر متھا گیا، اس متھنے

میں بھگت اور راکشش دونوں برابر کے شریک تھے۔ بڑی محنت کے بعد متعدد چیزیں برآمد ہوئیں، جن میں ایک امرت بھی تھا۔ اب بھگتوں اور راکششوں میں لڑائی ہونے لگی کہ امرت کون پئے۔ چنانچہ بھگوان خود ایک حسینہ کی شکل میں نمودار ہوئے۔ بھگتوں اور راکششوں نے حسینہ کو اپنانے میں بڑی جدوجہد کی، لیکن حسینہ نے راکششوں کا ساتھ ہی نہیں دیا، بلکہ امرت کے بارہ میں بھی راکششوں کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ چنانچہ دونوں فریق علاحدہ علاحدہ قطار میں بٹھا دیے گئے۔ اب ساقی مہوش نے امرت کے بجائے پانی تو راکششوں کو اور امرت بھگتوں کو پلانا شروع کیا، لیکن راکششوں میں ایک مہا مہو راکشش تھے جو چھپ کر بھگتوں کی قطار میں سورج اور چاند کے درمیان بیٹھ گئے تھے۔ چنانچہ امرت انھیں بھی پلایا گیا، لیکن ابھی آبِ حیات ان کے گلے سے اُترنے ہی والا تھا کہ ساقی کو ان ذات شریف کی خبر لگ گئی۔ حسینہ بھگوان نے فوراً تلوار کا ایک ہاتھ رسید کیا، لیکن امرت کا اثر ہو چکا تھا۔ اس لیے نصف بریدہ حلقوم کے ساتھ یہ زندہ رہ گئے۔ اس کے آگے تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہی بزرگ راہو کے نام سے مشہور ہیں اور اپنے ہم نشین چاند و سورج کو ہر سال نگلنے اُگلنے کی کوشش فرماتے رہتے ہیں اور اسی واقعہ کو ہم چندر گرہن اور سورج گرہن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ابھی ابھی اس قصہ سے پہلے میں آفس کی شانِ نزول پر گفتگو کر رہا تھا اور عرض کر رہا تھا کہ ہماری ساری مصیبتوں کا سوتا آفس ہی سے پھوٹتا ہے۔ چنانچہ اس حالت سے تنگ آکر زمانہ جدید کے بعض دیوتاؤں نے آفس کو متھنا شروع کیا یا یوں سمجھ لیجیے کہ اس کی پتھالوجی پر تجربات کرنے شروع کر دیے۔ نتیجہ ایک ہی ہوا یعنی بابو بروزن راہو برآمد ہوا۔ بابو کے کارنامے چاند سورج نگلنے سے کہیں زیادہ سنگین ہیں۔ یہ خود اپنے آپ کو جب چاہتا ہے نگل جاتا ہے اور جب چاہتا ہے اُگل دیتا ہے۔

عدالت اور آفسوں میں بابو کی پوزیشن وہی ہے جو انجن پر ڈرائیور یا مستری کی ہوتی ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جس مشین کو ڈرائیور یا مستری بگاڑ دے وہ حشر تک درست نہ ہوگی۔ اسی طور پر یہ بھی صحیح ہے کہ جس معاملہ کو آفس بگاڑ دے یا بگاڑنا چاہے، وہ عمر بھر سرسبز نہیں ہو سکتا۔ آفس میں بابو کی وہی حیثیت ہے جو گاؤں میں پٹواری کی ہوتی ہے۔ ان دونوں کے نوکِ قلم سے

جو گھاؤ لگ جاتا ہے وہ دیکھنے میں بالکل بے حقیقت ہوتا ہے، لیکن اس کی کسک زندگی بھر قائم رہتی ہے۔

کسی زمانے میں مشہور تھا کہ حاکم یا حکمران زمین پر خدا کا نائب ہوتا ہے اور غالبًا اسی اعتقاد کی بنا پر حکمراں کی پرستش کی جاتی تھی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو صفات خدا کی ہیں وہی کم و بیش حکمراں کی ہوتی ہیں۔ لیکن سائنس اور مشین کے موجودہ دور میں بجائے اس کے کہ ہم حکمرانوں کی تعبیر خدا سے کرتے، خدا کی تعبیر دنیاوی حکمرانوں سے کرنے لگے ہیں۔ اسے آپ روشن خیالی سمجھ لیجیے یا گمراہی، خدا کی تعبیر اب اسی طور پر کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بحث تو خواہ مخواہ چھڑ گئی۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ خدا یا خدا کی تعبیر ایسے مسائل نہیں ہیں جو آج کل روٹی اور عورت کے مسائل کے سامنے فروغ پاسکیں۔ دراصل میں کہنا صرف اتنا چاہتا تھا کہ آج کل حاکم اور حکمرانوں کے اقتدار اور اعتبار کا تمام تر دارومدار بابوؤں پر ہے۔

عدالتوں یا دیگر اداروں میں آپ ہر روز دیکھتے ہوں گے کہ فریقین کے وکلا بحث کرتے ہیں، اور عدالت ان میں سے کسی ایک سے اتفاق کر کے فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ لیکن آپ نے کبھی یہ بھی محسوس کیا ہے کہ حاکم عدالت کا فیصلہ جس کاغذ پر لکھا ہوتا ہے، اس پر واٹر مارکس کس کس قسم کا ہوتا ہے۔ وہ صرف بابو کا لکھا ہوا آفس نوٹ ہوتا ہے۔ بابو کی مہر نہ لگی ہو تو فیصلہ میں وہ وزن یا وقعت نہ پیدا ہو جس کی بنا پر وہ قابلِ تعمیل سمجھا جاتا ہے۔

بابو کو کبھی غصہ نہیں آتا۔ میرا مطلب اس غصہ سے ہے جس کا انجام مارنا یا مار کھا جانا ہوتا ہے۔ وہ شور زیادہ مچاتا ہے، لیکن بہت ہلکی شرائط پر صلح کر لیتا ہے۔ لیکن بزرگوں نے آگاہ کیا ہے کہ بابو سے جنگ کرو تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ صلح کرو تو ہوشیار رہو۔ بابو جنگ کا نہیں صلح کا جنرل ہے۔ اسی قسم کی صلح جس کو جنگ کا پیش خیمہ کہتے ہیں۔ صلح وارسائی کے بعد مسٹر لائڈ جارج کے متعلق کہا گیا کہ انھوں نے جنگ جیت لی، لیکن صلح ہار دی۔ برخلاف اس کے بابو جنگ ہمیشہ ہارتا ہے اور صلح ہمیشہ جیتتا ہے۔ ارشمیدس کا قول تھا کہ مجھے مرکز توازن دے دو تو میں کرۂ زمین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دوں۔ بابو کا مقولہ ہے کہ مجھے آفس دے دو تو میں نظامِ شمسی کو درہم برہم کر دوں۔

آپ آئے دن بڑے بڑے لوگوں کے بیانات سنتے یا پڑھتے ہوں گے ، انھیں بیانات پر افراد یا جماعت کی قسمتوں کا فیصلہ ہوتا ہے، لیکن آپ نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ حقیقتاً یہ بیانات بڑے لوگوں کے نہیں ہوتے ، بلکہ ان معمولی یا معزز بابوؤں کے ہوتے ہیں جو تحریروں اور دستاویزوں کو آفس میں متھتے رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ دیوتاؤں نے سمندر متھا تھا تو اس میں سے ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئی تھیں جو متھنے والوں کے ذہن میں نہ تھیں۔ لیکن آفس کے دیوتا بابو لوگ جب آفس کے ریکارڈ متھتے ہیں تو اس میں سے وہی چیزیں برآمد ہوتی ہیں جن کو یہ برآمد کرنا چاہتے تھے۔ قدیم وجدید دیوتاؤں کو سمجھنے کے لیے یہ امر نہایت درجہ اہم ہے اور ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

ان باتوں کے باوجود بابو بڑا خوش طبع بھی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک آفس میں ایک کلرک بابو تھے۔ اس آفس کے حاکم اعلیٰ حال ہی میں ولایت سے آئے تھے اور رشوت یا دست غیب سے بڑے بیزار تھے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ کچہری کرتے کرتے یک بہ یک آفس میں آجاتے تھے اور تمام کلرکوں کی جامہ تلاشی لینے لگتے۔ اس کے بعد ڈسک، الماری فرش فروش سارے کے سارے اُلٹ پلٹ دیتے اور رشوت کا گمان بھی ہوجاتا تو ملزم کو کھڑے کھڑے برخاست کردیتے۔ تمام آفس ان کے رعب اور اپنی رُسوائی سے کانپتا تھا۔ ایک دن صاحب اچانک آفس پہنچے اور ایک بابو کی تلاشی لینے لگے۔ ان بابو کا عجب عالم تھا۔ نہایت یار باش، خوش طبع، ذہین اور خراچ تھے۔ بیوی مرچکی تھی۔ ایک بڑھیا ماں تھی اور چھوٹے بڑے یا تلے اوپر آٹھ دس لڑکے لڑکیاں۔ آفس آتے تو ہر لڑکا یا لڑکی کچھ نہ کچھ فرمائش کردیتی اور گھر جاتے تو ہر ایک کی فرمائش ساتھ لے جاتے۔ پہلے ماں کا قدم چھوتے پھر بچے بچیاں اپنے فرمائشوں کی گٹھری گھسیٹے لاتے۔ بوڑھی دادی سب کی فرمائش تقسیم کرتی اور یہ شام تک ہر چھوٹے بچے کے لڈو گھوڑے بنے رہتے۔ ہنہناتے، ہنستے، دولتیاں جھاڑتے، پھر یہ ماں سے وہی تفریح کرتے جو بحیثیت ایک ادھیڑ عمر کے بچے کے ان کے لیے موزوں تھا۔ رات ہوتے ہی لڑکے لڑکیاں کھا پی کر دادی کی کوٹھری میں دادی سے قصّہ سنتیں یا اس کے پاؤں دباتیں اور بابو صاحب دفتر سے لائے ہوئے بستے کھولتے اور کام کرنا شروع کردیتے۔

صاحب نے تمام جگہ کی تلاشی لے لی تو فرمایا، سامنے کا ڈسک کھولو۔ بابو صاحب ڈسک کے سامنے مطمئن بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے، حضور اس میں کچھ نہیں۔ صاحب نے ڈانٹ کر کہا تو کھولتا کیوں نہیں۔ انھوں نے عرض کی، حضور کچھ ہو تو کھولوں، اس میں تو کچھ بھی نہیں۔ صاحب کے غضب ناک تیور دیکھ کر منصرم، اہلمد، پیشکار آگے بڑھے اور چاہا کہ خود ہی ڈسک کھول دیں۔ بابو صاحب نے سب کو یوں روکا کہ خود ڈسک کے اوپر بیٹھ گئے اور کہنے لگے، آپ لوگ خواہ مخواہ ضد کر رہے ہیں۔ ڈسک میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اب صاحب غصہ سے بے اختیار ہو کر آگے بڑھے۔ لوگوں نے ڈر کر کہ بابو پر خدا جانے کیا گزر جائے، بابو کو کھینچ کر ڈسک سے علاحدہ کر دیا۔ صاحب نے خود بڑھ کر ڈسک کھول دیا تو یا مظہر العجائب ڈسک کا نچلا تختہ سرے سے غائب تھا اور پھٹی ہوئی دری خندہ دنداں نمائی ہوئی تھی۔ سارا عملہ ہنسی ضبط کر کے آفس سے باہر بھاگا، اس کے بعد صاحب نے پھر کبھی تفتیش و تجسس کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔

بابو قومیت سے آزاد ہوتا ہے۔ نہ مسلم، نہ عیسائی، نہ ہندو، نہ پارسی، نہ چھوت، نہ اچھوت۔ اس کی تو جنس ہی مختلف ہوتی، جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ تو آفس میں مسلسل بیٹھے رہنے سے اور کچھ اس سبب سے کہ سارا دفتر و دفتری راز اس کے سر میں ہوتے ہیں۔ اس کے بوجھ سے اس کی گردن مختصر اور توند بڑھ جاتی ہے۔ جس کو بھرنے کے لیے اس کو اوروں سے زیادہ فکر ہوتی ہے۔ اس کا معدہ اکثر کمزور ہوتا ہے، باتیں بہت کرتا ہے اور جتنا خود سمجھتا ہے اتنا دوسروں کو نہیں سمجھنے دیتا، یہ ہر چیز قبول کر لیتا ہے۔ اس اصول کی بنا پر کہ کچھ آتا ہی تو ہے، جاتا تو نہیں، یہ بُرا بھلا سن لیتا ہے بُرا بھلا کہتا نہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس کو اپنی سنجیدگی پر جتنا بھروسہ ہوتا ہے دوسروں پر نہیں ہوتا۔ جس طرح قانون کا اصول ہے کہ بادشاہ سے کوئی بے جا بات سرزد نہیں ہوتی، اسی طرح بابو سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ بابو کی نظر ہمیشہ غلطی کی شناخت و دریافت پر ہوتی ہے۔ وہ ہر معاملہ یا ہر کاغذ کو اس نظر سے جانچتا ہے کہ کہیں کسی کو ناجائز فائدہ تو نہیں پہنچ رہا ہے، لیکن ناجائز نقصان پہنچ رہا ہو تو وہ اسے نظر انداز کر دینا گوارا کر لے گا۔

عذاب وثواب برگردن راوی سنا ہے، ایک زمانے میں جنگ کے لیے سپاہی بھرتی کیے جا رہے تھے۔ ایک بابو نے بھی فوج میں بھرتی ہونے کی درخواست دے دی۔ بھرتی کرنے والے افسر کو بڑا اچنبھا ہوا، اس نے ان کو بلا کر دریافت کیا۔ کیا یہ واقعی سپاہی بننا چاہتے تھے۔ انھوں نے بڑی مضبوطی کے ساتھ کہا 'ہاں'۔ افسر نے کہا، اچھا میں تمھاری ہمت اور جرأت کا امتحان لیتا ہوں۔ اگر تم امتحان میں پورے اُترے تو میں نہایت خوشی اور فخر کے ساتھ تم کو بھرتی کرلوں گا۔ اچھا دیکھو تم اپنا ہاتھ سامنے کر دو، تمھاری چوڑی آستین لٹکنے لگے گی۔ میرا دفعدار کچھ دور سے فیر کرے گا۔ گولی آستین سے نکل جائے گی، لیکن دیکھو ہاتھ کو جنبش نہ ہو، ورنہ گولی سے تمھارا ہاتھ اُڑ جائے گا۔ اگر ہاتھ میں کسی قسم کی حرکت نہ ہوئی تو تم مطمئن رہو۔ گولی صاف آستین پھاڑتی نکل جائے گی۔ بولو تیار ہو، انھوں نے کہا، ہاں۔ میں تیار ہوں، لیکن کرتا پھٹ جائے گا تو نقصان کون بھگتے گا۔ افسر نے جواب دیا، اس کی فکر نہ کرو۔ میں ذخیرہ سے تم کو نئی قمیص دلوا دوں گا۔ بابو صاحب پریڈ پر آئے، ہاتھ سامنے کر دیا۔ دفعدار نے گولی چلائی جو لٹکتی ہوئی آستین سے صاف نکل گئی۔ افسر نہایت خوش ہوا اور فوراً حکم دیا۔ ذخیرہ سے ایک قمیص لاؤ اور ان کے حوالے کر دو۔ قمیص حوالے کی گئی، لیکن بابو صاحب اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ افسر نے کہا، شاباش تم بڑے بہادر ہو۔ تم کو نئی قمیص مل گئی؟ انھوں نے کہا جی حضور مل گئی۔ اس نے کہا تو پھر جاؤ اپنا نام وغیرہ لکھاؤ۔ انھوں نے کہا، ''حضور' اور ''حضور'' کہہ کر چپ ہو رہے۔ افسر نے ہمت دلاتے ہوئے کہا، ہاں ہاں کہو کیا چاہتے ہو۔ انھوں نے نہایت مری ہوئی آواز سے کہا اور حضور ''دھوتی''!

(علی گڑھ میگزین۔ جولائی 1937)

●●●

بیرا

میرے حافظہ کا عجیب حال ہے، یعنی میں جس چیز کو یاد رکھنا چاہتا ہوں وہ یاد نہیں رہتی اور جو کچھ پہلے سے یاد ہوتا ہے اسے عین وقت پر بھول جاتا ہوں۔ ایسی حالت میں جب اُلجھن بڑھتی ہے تو پھر کوئی ایسی بات یاد آ جاتی ہے جس کو قطعاً یاد نہ آنا چاہیے تھا۔ لیکن موقع ایسا ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے، اس لیے میں کہہ گزرتا ہوں۔ یہ تو میری کمزوری ہوئی۔ ممکن ہے آپ کی بھی کوئی ہو۔ اس قسم کی کمزوریاں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو نتائج عموماً نہایت سنگین ہوتے ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ اگر مجھ سے کوئی ناواجب بات سرزد ہو جائے تو آپ بُرا نہ مانیں۔ میں بھی بُرا نہ مانوں گا۔ لیکن اگر آپ سے بغیر بُرا مانے رہا نہ جائے تو پھر مجھ سے رجوع کرا لیجیے گا۔ بہت ممکن ہے ہم آپ اپنی اپنی غلطیوں پر نادم ہو جائیں اور بات جہاں کی تہاں رہ جائے۔

تو بات میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے عرصہ سے ایک انگریزی مثل یاد تھی، جسے میں بھول گیا ہوں، لیکن وہ غالباً کچھ اس قسم کی تھی:

A "Sahch" is known by the "beara" he keeps.

اگر میری یادداشت دوبارہ غلطی نہیں کرتی تو اس کا مفہوم یہ ہے اور بقول ریڈیو والوں کے ہمارے دیہاتی بھائیوں نے اپنا اپنا باجا بند نہ کر لیا ہو تو اس مثل کو یوں سمجھ لیں۔ کاٹھ کے میاں پورا کا گنجا

یعنی کاٹھ کے میاں ہوں گے تو غالیچہ بھی پیال ہی ہوگا۔ اسی کو عربی میں جیسی روح ویسے فرشتے بھی کہتے ہیں۔

یہاں آپ جائز طور پر مجھ سے یہ توقع رکھتے ہوں گے کہ بیروں کے ساتھ ساتھ صاحب کے بارہ میں بھی مجھے کچھ بتا دینا چاہیے۔ اگر آپ یہ توقع نہیں رکھتے تو یہ آپ کا قصور ہے۔ میں اپنے فرض سے کیوں باز آؤں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ کا کبھی صاحب یا بیروں سے سابقہ بھی پڑا ہے یا نہیں، بشرطیکہ آپ خود صاحب یا بیرہ نہ ہوں۔ ورنہ ممکن ہے میں بتاؤں کچھ اور آپ سمجھیں کچھ۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اکثر لوگ شادیاں کر لیتے ہیں اور بعضے اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں، یعنی شادی منقطع کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ لوگوں کے پرائیویٹ معاملات سے مجھے کیا سروکار تو "بھائی رام لال" اصل بات تمھارا سمجھنا ہے نہ کہ میرا سمجھانا۔ اللہ اللہ خیر سلا!

تو میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ صاحب اور بیرے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ معزز بیرا صاحب کہلاتا ہے اور اوھوڑی استر صاحب بیرا۔ صاحب آپ نے بہت سارے دیکھے ہوں گے۔ ان کی بھی بہت سی اقسام ہیں، جن پر علاحدہ علاحدہ اظہار خیال کرنا ناممکن ہے۔ ایک قسم البتہ عام ہے، جس کو آپ یوں سمجھ لیجیے، جیسے

"صاحب میڈان جاپان"

لیکن یاد رکھیے اور گواہ رہیے کہ میں جاپانی صنعت پر اظہار خیال کر کے جاپان کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ مجھ سے بھی زیادہ عقل مند لوگوں کا خیال ہے کہ جاپان کی ہر چیز سستی ہوتی ہے۔ لا اس کی دشمنی، یہی سبب ہے کہ آج بڑی سے بڑی طاقت والا بھی جاپان کی اس پیداوار کی قیمت ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

بہر حال ہم کو تو اپنے صاحب سے سروکار ہے۔ جاپان اور آپان سے خواجہ صاحب نپٹیں۔ "ہاں تو آمدم بر سر صاحب"۔ "صاحب" عام طور پر ان لوگوں کو کہتے ہیں جو صبح آنکھ کھلتے ہی بغیر کلی کیے چائے پی لیتے ہیں اور دوسروں کی بیوی کا اپنے باپ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ جتنا بڑا صاحب ہوگا اتنی ہی اس کا بیت الخلا اس کی چارپائی کے قریب تر اور بھائی بند دور تر

ہوں گے۔ میرے ایک اُستاد، صاحب کا ڈیفینشن یا تعریف ان الفاظ میں کرتے تھے۔

''خود نالائق ہیں بیوی پردہ نہیں کرتیں''

لیکن آپ معاف فرمائیں۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ میں کچھ غیر متعلق باتیں کرنے لگا ہوں۔ اس لیے صاحب کو تو میں ان کے حال پر چھوڑتا ہوں، اور بیرے پر آجاتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ بیرا کو سمجھنے کے لیے صاحب کو پہچاننا ضروری تھا۔ اس لیے میں نے صاحب کا تذکرہ کر دیا۔ ورنہ آپ یقین مانیے مجھے صاحب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگر کوئی صاحب میری تقریر سن رہے ہوں تو میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ میری نیت بخیر ہے۔ کیوں کہ بزرگوں کا قول ہے نیت شب بخیر!

معلوم نہیں کیا سبب ہے کہ جہاں کہیں کوئی تھپہ یا پٹی والا بیرا موجود ہو، وہاں میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے یا تو کوئی قصور کر کے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ قبل اس کے کہ سزا بھگتنی ہو۔ میں معافی مانگ لوں یا پھر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے میں کسی ایسے مقام پر ہوں جہاں بھوت پریت کا دخل ہے اور بہت ممکن ہے میں جن صاحب کا مہمان ہوں یا جن سے باتیں کر رہا ہوں وہی بھوت ہوں یا پھر میں خود بھوت ہوں۔ لیکن آدمی ہونے کا شبہ بھی دل میں ہے۔

لیکن میں اب قطع کلام کرتا ہوں، آپ کا نہیں اپنا۔ بات یہ ہے کہ میں بات کرنے کا ذرا زیادہ عادی ہوں اور مجھے ریڈیو اس لیے اور زیادہ پسند ہے کہ اس میں بات کرنے کا خوب موقع ملتا ہے۔ آرام سے بیٹھ کر بغیر کسی خوف وخطر یا شرم وحیا کے گفتگو کیے جایئے، نہ قطع کلام کا اندیشہ نہ پٹ جانے کا خطرہ۔ گو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تنہائی میں خود بخود گفتگو کیے جانا کچھ اچھی علامت بھی نہیں ہے، لیکن اگر گفتگو کرنے کی بدعادت پڑ ہی جائے تو خیر اسی میں ہے کہ لوگ موجود نہ ہوں، ورنہ یہ عادت اس قسم کی ہے کہ اکثر بدقسمت گفتگو کرنے والے کو یہ محسوس کرنے کی بھی مہلت نہیں ملتی کہ کب بات ختم ہوئی اور کب کچھ اور شروع ہو گیا۔

اچھا اس قصہ کو چھوڑیے اور ایک دفعہ پھر بیرے پر آجایئے۔ اصل یہ ہے کہ بیروں کے ساتھ مجھے ایسے ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ اب مجھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ڈر

معلوم ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ اس وقت میرے پاس کوئی بیرا نہیں ہے، بلکہ میرے مکرم انا ڈنسر صاحب ہی ہیں۔ جن کے بارے میں مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ ان کو بیروں کے ساتھ کچھ ایسی ہمدردی ہوگی کہ وہ حقوق میزبانی فراموش کر جائیں گے۔ پھر بھی ڈرنے والا ڈرتا ہی ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کوئی ڈرانے والا بھی موجود ہو۔ بہر حال میں اپنا قصہ شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلا سابقہ مجھے بچپن میں ایک بیرے سے پڑا۔

مجھے سول سرجن سے ایک سرٹیفکٹ لینا تھا۔ ڈرتے ڈرتے سول سرجن کی کوٹھی پر پہنچا۔ اندر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ سفید صافہ کر میں خوب چوڑی پٹی دونوں میں ای۔ آر قسم کا پیتل کا طغرا لگا ہوا۔ داڑھی چڑھی، مونچھیں گری، پیٹ نکلا، چہرہ بھرا، میں نے سمجھا سول سرجن نہیں تو ان کے حقیقی قسم کے کوئی بزرگ ہیں۔ ابھی میں ان سے پورے طور پر ڈرنے بھی نہ پایا تھا کہ جھک کر انھیں سلام کیا، اور گلا صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔ مجھے ایک سارٹیفکٹ چاہیے۔ انھوں نے غالباً اس قسم کے تماشے اکثر دیکھے تھے، اس لیے بغیر کسی جھجک کے فرمایا، ٹکٹ لاؤ۔ میں نے کہا، میں تو پیدل آیا ہوں۔ جھنجلا کر بولے، کارڈ۔ میں نے کہا، آج تو اتوار ہے۔ اس پر وہ مسکرا پڑے اور کہا، بیٹھ جاؤ۔ ابھی صاحب حاضری پر ہیں۔ میں نے سوچا الٰہی خیر، وہ صاحب کیسے ہوں گے جن کو یہ جی۔ آئی۔ پی قسم کا بڑا صاحب بھی صاحب کہتا ہے، اور یہ صاحب لوگ کیسے ہوتے ہیں جو اتوار کو بھی حاضری دیتے ہیں۔

میں بیٹھ گیا۔ کہنے لگے، میری فیس لاؤ۔ سول سرجن کے لیے جو فیس لایا تھا ان کی نذر کر دی۔ انھوں نے اس میں سے ایک روپیہ نکال کر بقیہ مجھے واپس کر دیا اور کہا، باقی فیس گیارہ بجے ہسپتال میں لانا۔ ہسپتال پہنچا تو انھوں نے دروازہ ہی پر خیر مقدم کیا۔ میں سول سرجن سے نہ مل پایا، لیکن انھوں نے نام وغیرہ پوچھ کر سارٹیفکٹ لا کر دے دیا۔ اور بقیہ فیس بھی نہ لی۔ میں نے بغیر فیس کا سارٹیفکٹ لینے میں تامل کیا، لیکن مارے ڈر سے واپس آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سارٹیفکٹ بالکل کھرا تھا۔ البتہ جن کو میں سول سرجن سمجھتا تھا، وہ ان کے بیرے تھے!

دوسرا واقعہ سنیے۔ ایک بہت بڑے رئیس تھے، جو افیون کھاتے تھے اور بیرار کھتے تھے۔ دن رات اپنے محل میں دنیا کی بے ثباتی اور افیون کی گھلاوٹ پر غور کیا کرتے تھے۔ ان کا بیرا بھی

عجیب قسم کا تھا۔ ہر وقت ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مرچیں کھائے ہوئے ہے یا بیوی کے قتل کرنے کے منصوبے میں غلطاں پیچاں ہے۔ عید کا دن تھا، چار پانچ اصحاب بہ یک وقت رئیس صاحب سے ملنے آئے۔ سب نے اپنے اپنے ٹکٹ دیے اور بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ بیرا اندر گیا اور کوئی پندرہ بیس منٹ بعد تاش کے پتوں کی مانند سارے ٹکٹ لیے ہوئے برآمد ہوا۔ ٹکٹ پڑھ کر ایک صاحب کا نام پکارا، وہ بڑھے۔ اس نے کہا، سرکار سیر کرنے باہر گئے ہوئے ہیں۔ دوسرے کا نام پکارا، وہ بڑھے۔ بولا، سرکار غسل خانہ میں ہیں۔ تیسرے صاحب کا نام پکارا، وہ آگے بڑھے۔ بولا، سرکار سو رہے ہیں۔ چوتھے کو آواز دی۔ وہ بڑھے تو اس نے کہا، سرکار خاصہ تناول فرما رہے ہیں۔ پانچویں کو پکارا۔ وہ بھی بڑھے تو اس نے کہا —— سرکار مر گئے۔

ایک دفعہ مجھے اپنے ایک عزیز دوست کا جو پولیس میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے، مہمان ہونا پڑا۔ ان کے یہاں ایک بیرا تھا۔ اس نے میری شکل دیکھ کر کچھ ایسے تیور کا اظہار کیا جس سے ممکن ہے، آپ کا خون اُبلنے لگتا۔ کچھ ایسے بھی ہیں، جن کا خون جوش مارنے لگتا۔ میرا تو صرف خشک ہونے لگا۔ پولیس افسر کے بیرے اور دیہاتی زمین دار کے گھوڑے ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے کسی کو ہر روز سابقہ پڑے اور وہ ریڈیو پر تقریر کرنے کے قابل رہ جائے۔ میں جب تک مہمان رہا، اس بھلے مانس بیرے نے میرا ایک کام نہیں کیا، اور یہی نہیں بلکہ جب کبھی میرا سامنا ہو جاتا تو یہ بھنگی بھشتی اور دوسرے نوکروں کو اس کلے، جبڑے سے ڈانٹتا اور برا بھلا کہتا گویا روئے سخن میرے ہی جانب ہے، آپ جانیے انسان کی جان پر آبنتی ہے تو وہ بزدلی اور شرافت دونوں کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ خواہ وہ یا اس کی بیوی کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھ میں بزدلی اور شرافت اتنی موجود ہے کہ للّے تللّے خرچ کرنے پر بھی باقی بچ رہے۔ لیکن یہ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اس بیرے سے نبٹنے کے لیے مجھے ان صفات میں سے کم سے کم ایک کو ضرور خیر باد کہنا پڑے گا اور ضرورت آن پڑی تو دونوں سے ہاتھ دھوؤں گا۔ ایک دن میں نے ان کو اپنے پاس بلایا۔ کہا بھائی میں تمھاری مستعدی و وفاداری اور دیانت کا قائل ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ تمھاری قابلیت یا کارگزاری کے مطابق تمھیں معاوضہ بھی ملتا ہو گا۔ آخر تمھیں کیا ملتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا، پندرہ روپیہ۔ میں نے کہا، خیر اگر کبھی تم یہاں کی نوکری چھوڑنے پر

مجبور ہو جاؤ تو میرے یہاں آ جانا۔ میں تم کو پچیس روپیہ اور کھانا دوں گا۔ سال میں چار جوڑے کپڑے اور آمد و رفت کا کرایہ۔ اس گفتگو کے بعد میری ان کی بڑی گہری دوستی ہو گئی۔ جب تک مقیم رہا، انھوں نے میزبان سے زیادہ خاطر مدارات کی۔ میں واپس ہوا، ہفتہ عشرہ ہی کے اندر کیا دیکھتا ہوں کہ یہ صاحب میرے یہاں وارد ہیں۔ اس کے بعد ان سے مجھ سے کیا بات ہوئی، اس کا دُہرانا بیکار ہے۔ قصہ کوتاہ ہم دونوں ایک نہایت مختصر انٹرویو کے بعد ایک دوسرے سے رُخصت ہو گئے اور انھوں نے غالباً میرے بارے میں وہی رائے قائم کی جو میں نے ان کے بارے میں پہلے سے قائم رکھی تھی۔

ایک دفعہ شب برات کے موقع پر اپنے بڑے حاکم کو سلام کرنے گیا۔ ان کے یہاں عجیب عجیب قسم کے بیرے تھے۔ کوئی موٹا، کوئی پتلا، کوئی بڈھا، کوئی جوان، کوئی نیچا اور کوئی اونچا، لیکن وہ ای۔ آئی۔ آر والی قسم کی چیز ہر ایک کے صافے اور پیٹی میں نصب تھی۔ دوسرے یہ کہ اُچکن دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک نے دوسرے کی پہن لی ہے، یعنی یا تو بہت زیادہ تنگ تھی یا بہت ہی ڈھیلی۔ بہت زیادہ نیچی یا ضرورت سے زیادہ اونچی۔ سہ پہر کا وقت تھا اور سب کے سب آتش بازی چھوڑنے میں مصروف تھے۔ غل غپاڑہ سے کوٹھی سر پر اُٹھائے ہوئے۔ میرا حلیہ کچھ ایسا ویسا بھی نہیں ہے کہ لوگ دیکھتے ہی ہنس پڑیں یا خواہ مخواہ بدظن ہو جائیں۔ یہ اور بات ہے کہ تہوار کے موقع پر لٹھے کا کورا پائجامہ، جاپانی قسم کی شیروانی، ایک ذرا روغنی چہرہ، تھوڑی بہت اپنے یا دوسروں سے بے اعتمادی، نیا دباتا ہوا انگریزی وضع کا جوتا، جس کو پہن کر یوں بھی لوگ قدم چلنے لگتے ہیں۔ راستہ کنکریلا اور ہر قدم پر یہ اندیشہ کہ اب گرے اور گھٹنا پھوٹا یا تھوڑی لہولہان ہوئی، لیکن اس کے یہ تو معنی نہیں ہیں کہ کوئی میرا آپ کو وہ سمجھ لے جو آپ بالکل نہ ہوں۔ مجھے اس طرح آتے دیکھ کر ان بیروں میں سے ایک جو سب سے جغادری تھا، آگے بڑھا۔ قریب سے دیکھ کر میرے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ پہلے تو میں نے ذرا اُچک کر اور پھر مڑ کر دیکھا کہ کہیں اس کے دونوں طرف پان، سات منہ اور اتنے ہی ہاتھ تو نہیں ہیں، کیوں کہ اس قسم کے لوگ میں نے بعض تہواروں میں بچپن میں دیکھے تھے۔ چھوٹتے ہی بولا، ابھی فاتحہ نہیں ہوا ہے۔ مغرب بعد حلوا تقسیم ہوگا، اُس وقت آنا۔ میں نے کچھ احتجاج کرنا چاہا تو بولا، صاحب آرام

کرر ہے ہیں، شور نہ مچاؤ۔ حالاں کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ سب خود آتش بازی چھوڑ رہے
تھے اور شور و شغب سے کوٹھی سر پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ اور گفت شنید کرنی چاہی تو
اس نے ایک اپنی ہی جیسے کتے سے کچھ سرگوشی شروع کر دی۔ میں اپنی طبیعت سے صلح پسند واقع
ہوا ہوں۔ تیوہار کا دن تھا، میں نے یہ چاہا کہ معاملہ کو طوالت نہ دی جائے اور یہ کچھ اچھی بات بھی
نہیں ہے کہ کسی ایسے مناقشہ کی چارہ جوئی میں وقت اور روپیہ صَرف کیا جائے، جس میں فریق
ثانی صرف کتا ہو۔ چنانچہ میں نے شان دار پسپائی اختیار کی، میرے ایسا کرنے سے گو شور و
شغب میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، لیکن میں نے مڑ کر نہ دیکھا کیوں کہ کتابوں میں پڑھتا آیا تھا کہ
ایسی حالت میں کوئی مڑ کر دیکھتا ہے تو پتھر کا ہو جاتا ہے یا کوئی اور آفت آ جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ مستثنیٰ حالتوں کے سوا بیرا اور بیویوں سے زیادہ مزاج دان کوئی اور
نہیں ہوتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ بیرا کے مزاج داں ہونے سے مالک کو آرام اور نفع حاصل ہوتا
ہے۔ بیوی کے مزاج داں ہونے سے ذرا شوہر کچھ یوں ہی سا رہ جاتا ہے۔ بیرا کے مزاج داں
ہونے سے دنیا میں راحت ملتی ہے اور بیوی کے مزاج شناس ہونے سے عقبیٰ سنورتی ہے۔
بشرطیکہ عقبیٰ کو بیوی پر ترجیح دی جائے۔

مشکل یہ ہے کہ انسان تنہائی میں بیٹھ کر معلوم نہیں کیا کیا سوچتا ہے اور دل سے باتیں
کرتے کرتے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بہت ساری باتیں ایسی بھی منہ سے نکل جاتی
ہیں، جو خاصی نازک اور کافی خطرناک ہوتی ہیں۔ ریڈیو نے اس لطف کو تو زائل کر ہی دیا جو تنہائی
میں بیٹھ کر دل سے باتیں کرنے میں آتا تھا۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ کسی دن مار کھانے کی نوبت نہ
آ جائے۔ ریڈیو اسٹیشن پر نہیں بلکہ ایسے موقع پر جہاں اکثر کمزور قوی پر غالب آتا ہے۔

(علی گڑھ میگزین۔ اگست 1938)

●●●

بجرو

میں جس گاؤں کے ایک بزرگ کا حال سنانا چاہتا ہوں، وہ شہر یا قصبہ کی آبادی سے بہت دور ایک پہاڑی مقام میں واقع تھا۔ جہاں موجودہ زمانہ کی نعمتوں سے اب تک کسی ایک کا بھی گزر نہیں ہوا تھا۔ مثلاً تعلیم، ہسپتال، کوتوال، الیکشن، ہندو مسلم فساد، گاؤں سدھار اور اسی طرح کی ریڈیو قسم کی اور اور چیزیں۔ بجرو یہاں کے سردار تھے، جن کے بارہ میں لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ ان سے زیادہ مفید اور مضبوط آدمی گاؤں بھر میں کوئی اور نہیں ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان سے زیادہ جہاں دیدہ اور کارکردہ آدمی وہاں کوئی اور تھا بھی نہیں۔ اس گاؤں میں نہ کبھی چور آئے اور نہ وبا پھیلی۔ چور اس لیے نہیں آتے تھے کہ بجرو خود کسی زمانہ میں ڈاکو رہ چکے تھے، ایسے ڈاکو کہ ان کی زندگی میں چور اور تھانہ دار دونوں نے عہد کر لیا تھا کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے گی جس سے بجرو سے سابقہ پڑنے کا امکان ہو، اور بیماری یوں پاس نہیں آتی تھی کہ بجرو کے حکم سے نہ تو کوئی شخص گاؤں میں بیکار رہ سکتا تھا اور نہ سورج نکلنے اور سورج چھپنے کے درمیان گھر کے اندر قدم رکھتا تھا۔

بجرو بوڑھے ہو چکے تھے اس لیے سخت کام کرنے کے بجائے اب انھوں نے یہ مشغلہ اختیار کیا تھا کہ گاؤں بھر کے لوگ دن میں کھیتی باڑی کے کاموں میں مصروف ہو جاتے تو یہ گاؤں والوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا چارج لے لیتے۔ ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے، کسی

کے ساتھ کھیلتے، کسی کو کھلاتے پلاتے، کسی کو قصے سناتے اور کسی کی گوش مالی کرتے۔ شام کو ان کی مائیں واپس آ کر اپنے اپنے بچے ساتھ لے جاتیں اور مرد بیٹھ کر "بجرو" کو دن بھر کے کاموں کی تفصیل سناتے۔ یہ یہ ہوا، یہ یہ دقتیں ہیں، یہ یہ ہونے والا ہے۔ ہر ایک کے کام اور ہر ایک کی کارکردگی سے بجرو واقف تھے۔ بجرو ہوں ہوں کرتے جاتے اور جہاں کسی نے واقعات میں گرہ لگانی شروع کی بجرو نے آنکھ اُٹھا کر اس طور سے گھورا گویا وہ اس کے بیان کو سمجھنے سے معذور ہیں اور معذور ہی نہیں بلکہ اس کو سزا دینے پر بھی آمادہ ہیں۔

ایک دن برسات کے موسم میں جب کہ کئی دن مسلسل بارش ہو چکی تھی بعض نوجوان دیہاتیوں نے بجرو سے کہنا شروع کیا۔ بجرو دادا سنا ہے یہاں سے بہت دور ایک دیس ہے جہاں انوکھی انوکھی باتیں ہوتی ہیں، بغیر کنویں یا تالاب کے پانی ملتا ہے، بغیر دیے کے روشنی ہوتی ہے، بغیر جانور کے سواریاں ہیں، بغیر خط پتر کے حال حوال معلوم ہو جاتا ہے، بغیر کھیتی باڑی کے غلّہ ترکاری مل جاتی ہے۔ عورت مرد ہر وقت کھیلتے کودتے رہتے ہیں۔ بھوت پریت پکڑ لیے گئے ہیں جو ناچا گایا کرتے ہیں۔ ایک آدمی کسی کو مار ڈالے تو دس آدمی اسے مار ڈالتے ہیں اور پھر ان دسوں کو مارنے والا کوئی نہیں ملتا۔ کھیتی کوئی نہیں کرتا، کھاتے سب ہیں۔ بجرو دادا ایک دن ہم کو بھی لے چلو ہم بھی دیکھ آئیں۔

بجرو دادا پہلے تو چپ رہے پھر تمباکو کا ایک نہایت آب دوز قسم کا کش لے کر چلم کو دوسرے کے حوالہ کیا اور بولے بیٹا ٹھیک ہے۔ ہمارا دیکھا بھالا ہے۔ اس بستی کو شہر کہتے ہیں۔ ان شہروں کا عجیب حال ہے۔ میں یہاں کے لوگوں کے ساتھ رہا ہوں اور انھیں خوب جانتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے ناواقف نہیں۔ ان کے مکانات بڑے مضبوط، بڑے خوب صورت اور بڑے ہی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ان کو کھلی ہوا اور روشنی میسر نہیں آتی، یہ کوٹھری میں نہاتے ہیں اور جہاں سوتے ہیں، وہیں پاخانہ پھرتے ہیں۔ یہ کام نہیں کرتے، ورزش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کھانا دُکان پر پکتا ہے اور وہیں کھایا بھی جاتا ہے۔ ان کے کھانا کھانے پکانے کا برتن بھی گندہ ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ گندی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں یہ کھانا کھاتے ہیں۔ شہر کی دُکان پر کھانا پکتا دیکھو تو تم کو کئی کئی دن بھوک نہ لگے اور ان کے یہاں کے غل غپاڑے سن پاؤ تو رات کو نیند نہ

آئے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں درجنوں گھسے پلے سوتے، جاگتے، جیتے، مرتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے چوڑے راستے ہیں، لیکن ہرروز اس میں کوئی نہ کوئی کچل کچلا کر مرجاتا ہے۔ جتنا کام نہیں کرتے اس سے زیادہ دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود لڑتے ہیں، دوسرے صلح کراتے ہیں۔ اس لیے ہر صلح دوسرے جھگڑے کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

ان کے عجیب عجیب کھیل ہیں۔ تم کو تھوڑی دیر میں سارا حال کیسے بتاؤں کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں۔ اچھا آؤ تم کو ان کے لڑنے کا حال سناؤں، ان کے ہاں لڑائی ایسے شروع ہوتی ہے۔

کسی نے کہا میں اُلّو، دوسرے نے کہا میں چمگاڈر، تیسرے نے کہا میں نیل کنٹھ مہادیو! ان میں سے ایک اس پر لڑنا جھگڑنا شروع کرتا ہے کہ دنیا میں سب کے سب اُلّو کیوں نہیں ہوجاتے۔ دوسرا کہتا ہے جہاں چمگاڈر ہو، وہاں اُلّو کا گزر کیوں ہو۔ تیسرا کہتا ہے نیل کنٹھ مہادیو کے ہوتے ہوئے اُلّو اور چمگاڈر کو جینے کا کب حق حاصل ہے۔ کوئی ان احمقوں سے پوچھے کہ جس جنگل میں صرف اُلّو، چمگاڈر اور نیل کنٹھ مہادیو ہی ہوں، وہاں سادھارن سے رہن سہن کیسے ہوسکتی ہے۔ اُلّو کو اس پر اصرار کہ ویرانہ میرا، چمگاڈر کہتا ہے ویرانہ تیرا ہو تو بسیرا میرا اور نیل کنٹھ مہادیو کا دھرم یہ کہ ویرانہ یا بسیرا سے مجھے سروکار نہیں، نرم چارہ میرا، اس پر ان میں خوب خوب جنگ ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ایک چیز ہوتی ہے، جس کا نام انھوں نے اخبار رکھ چھوڑا ہے۔ سارے رگڑے جھگڑے کا گھر یہی ہے۔ جس طرح وبا کے کیڑے ایک جگہ سے دوسری جگہ لائے لے جائے جاتے ہیں اسی طرح جھگڑے فساد کے کیڑے مکوڑے ان اخبارات سے ہر ہر جگہ پھیلائے جاتے ہیں۔

تم کو وہ مثل تو یاد ہوگی۔ ایک نے کہا کوا کان لے گیا، اب یہ کوئی نہ دیکھے گا کہ کان موجود بھی ہے یا نہیں۔ ہاتھ دھو کر جھاڑ کوّے کے پیچھے ہولیں گے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوے کے پیچھے جانے سے پہلے کان موجود تھا، لیکن کوا گو ہار کے بعد دیکھتے ہیں تو کان تو غائب ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ کسی کی ناک کٹی ہوئی ہے، کسی کا ہونٹ کٹا ہوا ہے، کسی کی ایک آدھ ناک گھلوے میں گئی اور کسی کی دم بٹے کھاتے ہیں۔

اس کو آگو ہار پر خوب خوب بغلیں بجائی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ میں بھی اس میں پھنس گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے، تمھیں اُلو پسند ہے یا چگاڈر یا نیل کنٹھ مہادیو۔ میں نے کہا، اس سے تمھارا مطلب کیا ہے۔ کہنے لگے، جنگل کی سرداری کا چناؤ درپیش ہے۔ میں نے کہا، ظاہر ہے میں اُلو کا ساتھی ہوں۔ اس پر چگاڈر نے کہا۔ اُلو کیوں بنتے ہو، میرا ساتھ دو۔ میں نے کہا، یہ کیوں کہنے لگے، مجھ میں خاصیت اُلو کی ہے اور ولولہ نیل کنٹھ کا۔ اتنے میں نیل کنٹھ مہادیو ٹائیں ٹائیں کرتے آئے اور میری پگڑی جھپٹ کر چل دیے۔ اُلو نے یہ دیکھا تو لپک کر ایک ٹھلنٹھ پر جا بیٹھا۔ چگاڈر اُلٹا لٹک گیا اور میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

ان کے یہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ ان میں بعض تو ایسی ہیں جنھوں نے سورج اور آسمان بھی نہیں دیکھے ہیں۔ گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں۔ بچے پالتی ہیں اور چکی پیستی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن در و دیوار کی چکی خود انہیں پیس ڈالتی ہے۔ بعض ایسی ہیں جو صرف پان کھاتی ہیں، چھالیہ کترتی ہیں، شوہر کو گالی دیتی ہیں اور اپنے میکے والوں کی پرورش کرتی ہیں۔ لیکن اب اس میں ایک اور قسم پیدا ہوگئی ہے۔ یہ انگریزی بولتی ہیں، ساری پہنتی ہیں اور سنیما دیکھتی ہیں۔ شوہر اُن کی خدمت کرتے ہیں اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہیں۔ گھروں کی چہار دیواری سے بھاگ کر انھوں نے پارک کی جھاڑی میں پناہ لی ہے۔

شہروں میں ایسے ایسے گھر بنے ہیں جہاں ہر قسم کے جنگلی جانور اور پرند پکڑ پکڑ کے رکھے گئے ہیں۔ جن کو یہ چڑیا گھر یا جانوروں کا عجائب خانہ کہتے ہیں۔ میں ان شہر والوں کی تعریف کروں گا کہ انھوں نے ہر چوپایہ یا پرند کے لیے ایسی جگہ بنادی ہے گویا وہ اسی حالت میں اور اسی مقام پر ہیں، جہاں کہ وہ پکڑے جانے سے پہلے تھے۔ جانوروں کو شہری بنانے کی کوشش کرتے کرتے ان کے دل میں یہ سماگئی ہے کہ شہریوں کو جنگلی بنایا جائے۔ ان میں جو سب سے زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ اب تک جو لوگ خیالات کے ننگے تھے ان کو جسم کا بھی ننگا ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان شہریوں میں جو سب سے زیادہ مہذب ہے وہ سب سے زیادہ ننگا ہے۔ ان کے مرد عورتوں نے کپڑے اُتار کر پھینک دیے ہیں اور اب جنگلوں میں ننگے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس سے تندرستی بڑھتی ہے اور مرد عورت کے

تعلقات سدھرتے رہتے ہیں۔ ننگا پن سات سمندر پار سے آیا ہے۔ اب تک ہندوستان میں بھوکوں کی کیا کمی تھی کہ اس میں ننگوں کا اور اضافہ ہوا۔ یہ ننگوں کا عجائب خانہ ہوا۔

لیکن ان سب سے زیادہ انوکھا عجائب خانہ وہ ہے جس کو ان شہریوں نے اسکول، کالج، یونیورسٹی یا بورڈنگ ہاؤس کا نام دے رکھا ہے۔ اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ جو اصول انھوں نے چڑیا گھر میں ملحوظ رکھا تھا، اس کو انسانوں کے اس عجائب گھر میں بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں یہ ان کو ایک قسم کا منتر پڑھاتے ہیں اور ایک ہی قسم کے سانپ سے کھیلنا سکھاتے ہیں۔ اس عجائب گھر کے عجوبے اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان انسانی جانوروں کو ان کے نگراں ایک ہی طرح کی فضا میں رکھتے ہیں، ایک ہی قسم کا راتب دیتے ہیں، ایک ہی قسم کا کام لیتے ہیں اور ایک ہی قسم کے مداری رکھتے ہیں جو ایک ہی قسم کے کرتب سکھاتا ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے، اے احمقو! جو جانور اپنے اصلی گھر میں شکار پر زندگی کرتا ہے اسے مردار کیوں کھلاتے ہو، جو میدان میں گھومتا پھرتا تھا، چاند، سورج، پھل، پھول، گرمی، سردی، محنت مشقت کی گردش میں پلا ہے اس کو کالے، اکھر بھینس برابر کا سبق کیوں پڑھاتے ہو۔ جو نقش و نگینے کا کام کرتا تھا، اس سے مگدر کیوں ہلواتے ہو، جو کھیت جوتتا تھا اسے گورکنی کیوں سکھاتے ہو، جو تیل بیچتا تھا اسے فارسی کیوں پڑھاتے ہو، جو مہابھارت میں شریک تھا اس سے شکنتلا کا ناٹک کیوں کھلواتے ہو، جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، اسے یورپ کا خواب کیوں دکھاتے ہو۔ ہرن پر گھاس لادنے سے کیا حاصل، مجنوں کو منطق سے کیا سروکار۔ لیکن یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔

البتہ اب جب کہ اس کو انسانوں کے اس چڑیا گھر سے نکل کر روٹی کی تلاش ہوئی تو معلوم ہوا کہ تیلی کا بیل بجلی کی طاقت نہیں بن سکتا۔ اب بھوکوں مرتے ہیں، روتے ہیں کہ روزگار نہیں ملتا۔

چڑیا گھر والے چونکے تو معلوم ہوا کہ چڑیاں چگ گئیں کھیت! مرض کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اب ان کو کون بتائے، بھوک کا مرض تحقیقات سے نہیں خوراک سے جاتا ہے۔ لیکن چڑیا خانہ کا روگ ان کو اس طرح لگا ہے کہ روٹی سے پیٹ بھرنے پر اکتفا نہ کریں گے، جب تک روٹی کے ساتھ بوٹی نہ ہو۔ کیوں کہ تم جانتے ہو، چڑیا گھر میں ہاتھ پاؤں ہی شل نہیں کر دیے

جاتے، ذائقہ بھی خراب ہو جاتا ہے۔ چٹخارے کا لپکا پڑ جاتا ہے اور تم جانو پیٹ تو بھرا جا سکتا ہے لیکن ذائقہ بہت دیر میں سدھرتا ہے۔

شہر والے اس پر بڑا ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی کلیں ایجاد کر لی ہیں کہ ہم کو اپنے جسم کے کل پرزوں کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اب ہر چیز کل سے بنائی جاتی ہے۔ ہاتھ لگانا حرام ہو گیا ہے۔ بونا، جوتنا، کاٹنا، بُنتا، بھرنا، لانا، لے جانا، ہنسنا، بولنا، لڑنا، جھگڑنا، بگڑنا، سنورنا، مرنا، جینا، سب مشین سے ہوتا ہے جو ہاتھ پاؤں سے کام کر سکتے تھے ان کو کام نہیں ملتا۔ جن کو کام مل سکتا ہے ان کو ہاتھ پاؤں چلانا نہیں آتا۔ شرافت اور ذلت، عفت و عصمت، بہادری و بزدلی، قابلیت اور ناقابلیت ہر ایک کی پشت پناہ مشین بن گئی ہے۔ مجھے اس وقت ہنسی آتی ہے جب شہر والے ہمارے حال پر ترس کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گاؤں والے جاہل ہوتے ہیں۔ ہماری بیوقوفی اور غریبی نے ہمیں تباہ کر رکھا ہے۔ ان کو کون بتائے کہ جب تک وہ ہماری فکر میں رہیں گے، ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود ان کے حال پر ترس کھائیں اور ذہن و دماغ کی گمراہیوں نے انھیں جس تاریک دلدل میں پھنسا دیا ہے، اس سے ہم اپنے ہاتھ پاؤں کی فیض بخشیوں سے ان کو نجات دلائیں۔

ان میں بڑے بڑے ودوان لوگ ہیں جن کے سامنے آکاش اور پاتال کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کی نت نئی ایجاد نے قدرت کے کھیلوں کو ماند کر دیا ہے، لیکن زندگی کے کھیل نے ان کو زچ کر دیا ہے۔ وہ زندگی کے کھیل کو بے ایمانی سے جیتنا چاہتے ہیں۔ ہم دیہاتی زندگی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ کھیل کی زندگی پر مرتے ہیں۔ وہ ایجاد کر سکتے ہیں، ایثار سے محروم ہیں۔ ہم ایثار کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ایجاد کے چکر میں نہیں پھنستے۔

ان کی ایک بڑی ایجاد روپیہ ہے۔ جس کو انھوں نے یہ خاصیت دے رکھی ہے کہ اس سے ضروریات کی تمام چیزیں خرید سکتے ہیں۔ پیدا کرنے کو تو انھوں نے روپیہ پیدا کر لیا، لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ اس کو خرچ کیسے کیا جائے۔ اب دنیا کی دقت یہ نہیں ہے کہ پیٹ کے لیے غلّہ کیسے پیدا کیا جائے، بلکہ روپیہ کا کیا کیا جائے۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ روپیہ کے اعتبار سے غلّہ کی قیمت گھٹتی بڑھتی ہے۔ حالاں کہ چاہیے یہ تھا کہ غلّہ کے اعتبار سے روپیہ کی قیمت گھٹتی بڑھتی۔

غلّہ کاشت کاروں کی چیز ہے اور روپیہ دولت مندوں کی اور تم جانتے ہو کہ اس کھیل میں کس کا پلّہ بھاری رہے گا۔ روپیہ کا حال یہ ہے کہ اس کا گھٹنا بھی بُرا اور بڑھنا اس سے بُرا، شہر والے اب تک کوئی تدبیر ایسی نہیں سوچ سکے ہیں جس سے پیداوار اور روپیہ میں تعلقات ہموار رکھے جاسکیں۔ ہماری تباہی اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم غلّہ پیدا کرتے ہیں، ہم مریض یا جاہل ہیں۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ شہر والے روپیہ ایجاد کرتے ہیں۔ اب تک ہم کو صرف اس مصیبت سے سابقہ تھا کہ بارش وقت پر نہیں ہوتی، یا سیلاب آ گیا۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت اب یہ ہے کہ شہر والے جب چاہتے ہیں روپیہ کا رُخ بدل دیتے ہیں، اور ہماری تمام کوششیں دم کی دم میں رائیگاں ہوجاتی ہیں۔ وہ اپنی پوری کوشش اس پر صَرف کرتے ہیں کہ غلّہ پیدا کرنے کے جتنے جدید ترین اصول ہیں، ہم ان کو کام میں لائیں۔ لیکن ان کو کون سمجھائے کہ ان کو پوری کوشش اس پر صَرف کرنی چاہیے کہ روپیہ ایجاد کرنے کے جتنے جدید ترین اصول ہیں انھیں بھول جائیں۔ ہم کو وہ ہمارے فرائض طرح طرح سے ریڈیو پر سناتے ہیں اور اس ہنسی دل لگی سے اپنا اور بعض دوسروں کا جی بہلاتے ہیں، لیکن ان کے فرائض دوسرے جب ہوائی جہاز اور مشین گن سے سناتے ہیں تو ہم کو ان پر بڑا ترس آتا ہے۔

ان شہر والوں نے ہماری دیکھا دیکھی اپنی گرد آلود دھواں دھار شہروں میں چھوٹے بڑے باغ اور پارک بنا رکھے ہیں، جن کا مقصد یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کو صاف ہوا اور کھلی جگہ مل جایا کرے۔ ان کے پھل پھول کی کیاریاں بھی اتنی ہی مصنوعی ہوتی ہیں جتنے کہ ان کے مرد و عورت اپنی زندگی، اپنی رہن سہن، اپنے لباس اور وضع اور اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے مصنوعی ہوتے ہیں۔ ان کو وہ تفریح کہاں نصیب جو گاؤں والوں کے حصہ میں آئی ہے۔ ہم محنت کرتے ہیں اور اپنے باغ اور کھیت خود بناتے ہیں اور پھر ان کی شادابی، نمو اور فراوانی پر خوش ہوتے ہیں۔ یہ خوشی ہمارے جسم اور روح دونوں کو تازہ کرتی اور قوی بناتی ہے۔ ہمارے پیڑ پودے ہمارے رنج و راحت سے متاثر ہوتے ہیں۔ شہر والوں کو شہر کے پارک میں یہ چیزیں کہاں نصیب، ان میں وہ ربط اور وابستگی کہاں پیدا ہوسکتی ہے جو زندگی کے دھارے پر ہم کو اُبھارے رہتی ہے۔

ہم بیمار پڑتے ہیں تو اپنے ہی گھاس پات سے اپنا علاج کرتے ہیں۔ یہ بیمار ہوں تو جب تک ولایت کی دوائیں اور ولایت کی اسلیے میسر نہ آئیں، یہ اچھے نہیں ہو سکتے۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی وجہ سے ولایت سے یہ چیزیں آنی بند ہو جائیں تو شہر والے کتنے دن تک زندہ رہیں، یہ ہماری بیماری پر بڑا شور مچاتے ہیں اور ہر روز ہمیں بیماری سے بچنے کی ترکیبیں بتایا کرتے ہیں۔ لیکن ان کو نہیں معلوم ان کے صحت مندوں سے ہمارے بیمار اچھے ہیں۔ اگر تحقیقات کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم میں تندرستوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے۔

شہر والوں کو سب سے بڑا فخر اس پر ہے کہ وہ مہذب ہیں اور انھوں نے دنیا کی ترقی میں بڑے کارنمایاں کیے ہیں۔ ان کے علم، ان کے ادب، ان کی سائنس نے دنیا کی نعمتوں میں اضافہ کیا ہے، اور ہم دیہاتی جہاں کے تہاں پڑے ہوئے ہیں اور دنیا کی لذتوں سے بے خبر ہیں۔ یہ دیہات کا قصور نہیں ہے۔ ممکن ہے دیہاتیوں کا ہو، وہ بھی ہندوستان کے دیہاتیوں کا۔

لیکن انجام کے اعتبار سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون خسارہ میں ہے اور کون فائدہ میں، کون غلط راستہ پر اور کون صحیح راستہ پر۔ دنیا کی تاریخ اور دنیا کے تمدن دونوں پر ابھی اتنی مدت نہیں گزری کہ ہم زندگی کے نیک انجام یا نافرجام ہونے پر کوئی صحیح حکم لگا سکیں۔

(علی گڑھ میگزین۔ اپریل 1937)

●●●

ملّاح

بعض ملکوں کے بارہ میں سنتے آئے ہیں کہ وہاں کے لوگ کشتی بانی کرتے کرتے
جہاں بانی کرنے لگے۔ ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ لوگ ناخدائی کرتے کرتے ملاحی پر اُتر
آتے ہیں۔ یہاں ملاحی گالی گلوج کے معنوں میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ ملاحی کے اس مفہوم کو
جلد سے جلد بیان کر دینے میں، میں نے ذرا کم قابلیت سے کام لیا ہے۔ ورنہ قاعدہ کی بات تو یہ
ہے کہ آپ جس بات کو جس قدر اُلٹ پھیر کر دیر میں کہیں اور کہہ نہ پائیں تو بھی کوئی ہرج نہیں،
اتنا ہی آپ کی قابلیت کا رعب دوسروں پر پڑے گا۔ لیکن آپ یقین مانیے ملاح کا مفہوم بتانے میں
مَیں نے جو ذرا جلدی کو دخل دیا ہے، اس میں میرے خلوص کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا ریڈیو والوں کی
ستم ظریفی کی کاٹ مقصود ہے۔ آپ کو معلوم ہے یہ ریڈیو کے حضرات گانا تو خود سناتے ہیں اور
ملاحی مجھ سے سنوانا چاہتے ہیں۔

اب میری دعا ہے اور آپ سے گزارش کہ آپ میری اس کوشش میں مدد فرمائیں کہ
ریڈیو والے تو ملاحی سنیں اور میں اپنی تعریف میں آپ کے گانے سنوں۔ گانے سے میری مراد وہ
ورزش نہیں ہے جو سنانے والے کے حلقوم اور آپ کے کانوں سے متعلق ہے۔ میرا مقصد اس
گانے سے ہے جس کو گن گانا کہتے ہیں۔ اسے آپ کہیں گنگنانا نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہ میں اس لیے بتا
دینا چاہتا ہوں کہ موسم تو خراب ہے ہی کہیں ایسا نہ ہو آپ جن صاحب کے ریڈیو پر میری تقریر

سن رہے ہوں اور حاشا یہ کوئی عیب کی بات نہیں، بشرطیکہ ریڈیو کے مالک کو آپ کی موجودگی کی خبر ہو۔ وہ ریڈیو ہماری آپ کی زبان سے واقف نہ ہو۔

اچھا تو میں یہ بات مانے لیتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ میری خوش نیتی کے قائل ہو سکے ہیں اور ملاح کے بارہ میں میرے خیالات سننا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ یقین کیسے آئے کہ آپ میں کوئی ملاح بھی میری تقریر نہ سن رہا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ میں آدمی ذرا شکی واقع ہوا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ کہہ جاؤں جس سے دشمنوں کو زہر اُگلنے کا موقع ملے، اور فرض کیجیے ایسا نہ بھی ہو، پھر بھی یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے کہ میرے ملاح دوست مجھے غیر ملاح سمجھیں اور غیر ملاح، ملاح۔ شیخ سعدی کے ایک دوست تھے جن کے بارے میں انہوں نے کہا ہے۔

پیش ملاّ، قاضی، پیش قاضی مُلاّ پیش ہیچ ہر دو، و پیش ہر دو ہیچ! شیخ سعدی نے یہ بات کچھ سمجھ ہی کے کہی ہوگی کیوں کہ سمجھ کی بات اگر بے سمجھی میں کہہ دی جائے تو اس میں سننے والے کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ البتہ سنانے والے کے بارے میں بعض لوگ اچھی رائے قائم نہیں کرتے۔ ہاں تو میں یہ کہنے والا تھا کہ اس وقت آپ میرے خیالات ملاح کے بارے میں سننا چاہتے ہیں، لیکن خود میں آپ کو وہ خیالات سنانا چاہتا ہوں جو ملاحوں کے میرے بارہ میں ہیں۔ بات صرف ایک ہی ہے، لیکن ذرا گھوم پھیر سے، اور ملاح کے سلسلے میں تھوڑی بہت گھوم پھیر ہو جائے تو کوئی ہرج کی بات نہیں۔

تو وہ بات یہ ہے کہ یہی ستمبر کا زمانہ تھا۔ اب تو سن و سال بھی یاد نہیں آتے، صرف واقعہ یاد ہے۔ والدین نے اپنا آخری فرض ادا کیا اور اس فدوی نے اپنی پہلی سنت اور آپ سے کیا پردہ میری شادی ہوئی۔ فریقین کے دولت خانے اور غریب خانہ کے درمیان دو ندیاں بطور رین بسیرا حائل تھیں، اور یہ وہ زمانہ تھا جب دونوں ندیاں سیلاب کی زد میں آج کل کے نوجوانوں کی مانند ہر قید و بند سے آزاد تھیں۔ پہلی ندی کے کنارے پہنچے تو چند ملاح نظر آئے، جن کے بارہ میں مَیں سن چکا تھا کہ یہ دن بھر کشتی چلاتے ہیں اور رات میں ڈاکے ڈالتے ہیں۔ دونوں واقعات کی تصدیق ان کے ڈیل ڈول اور لب و لہجہ سے بھی ہوئی۔ ندی کا تیور دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ

ملاحوں کا رات کا مشغلہ ندی دن ہی کو پورا کر کے چھوڑے گی۔ معلوم نہیں کیا سمجھ کر ملاحوں نے ہم سب کو قابلِ رحم تصور کیا۔

ان میں سے ایک سب سے زیادہ خوف ناک اور بے پناہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ہم سب کو ہچکچاتے دیکھ کر کہا۔ میاں ندی اور عورت کا ایک ہی بیوہار ہے۔ یہ دونوں طاقت اور رُفاقت پسند کرتی ہیں۔ پہلے ان کا مقابلہ کرو، اس کے بعد ان کے ساتھ ہولو۔ ناؤ پار لگ جائے گی۔ ملاحی کا بھی یہی گُر ہے۔ پہلے تو بہاؤ کی اُلٹی سمت چلو پھر بہاؤ کے ساتھ ہو جاؤ۔ کشتی ٹھکانے پر جا لگے گی۔ میں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے، لیکن شادی تو میری ہوئی ہے۔ ملاح اور ندی کی تو ہوئی نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر بیچ میں پہنچ کر ندی کی نیت بدل جائے۔ ملاح نے کہا، ندی کی نیت بدل جائے تو کوئی ہرج نہیں، ملاح کا ارادہ نہ بدلنا چاہیے۔

میں نے کہا، بھائی یہ باتیں تو تم شاعروں اور مہاتماؤں جیسی کرتے ہو، میں ٹھہرا خالص دین دار۔ یہ باتیں مجھے بھی معلوم ہیں، لیکن اس قسم کی باتوں پر مجھے یقین اسی وقت آتا ہے جب میں خود آرام سے اپنے گھر بیٹھا ہوں۔ ملاح نے کہا، لکھے پڑھوں کا یہی بیوہار ہے، میں تو ہوں ملاح۔ ندی ہمیشہ ندی ہے خواہ گھٹی ہو یا بڑھی۔ ملاح ہمیشہ ملاح ہے خواہ اس کا مقابلہ موجوں سے ہو یا مورکھوں سے۔ میں نے کہا، بھائی جو چاہو کہہ لو۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس کا جواب میں بھی دے سکتا ہوں۔ ملاح ہنسا اور کہنے لگا ٹھیک، لکھے پڑھوں کا یہی بیوہار ہے۔ اچھا اب آیئے اور سب لوگ کشتی میں بیٹھ جایئے۔ کشتی خشکی سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ملاح نے ہم سب کو اُٹھا اُٹھا کر کشتی پر اس طرح رکھ دیا جیسے لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے گڈے گڑیاں اودھر سے اُدھر رکھ دیتے ہیں۔ پالکی بھی کشتی میں رکھ دی گئی۔ ملاح نے ڈپٹ کر کہا اور کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے کشتی اپنی پوری طاقت کے ساتھ چٹان سے ٹکرا گئی۔ چپ بیٹھو، ناؤ ڈوبے تو ٹھینگے سے۔ ملاح یا سواری ڈوبے تو ٹھینگے سے۔ سب ڈوبیں تو ٹھینگے سے!!

پانی برسنے لگا۔ سرمئی بادلوں نے فضا کو سمیٹ کر بھوکے مگر مچھ کا کھلا دہانا بنا دیا۔ بجلی کی گرج اور چمک نے قلب کی رگوں کو جھٹکے دینے شروع کیے۔ کشتی پرائی موجوں کے تھپیڑے اور دریا کے بہاؤ پر ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے خزاں کا مارا پتا طوفان کی زد میں ہو۔ کوئی بولا، کشتی

میں پانی بھرا آرہا ہے۔ ملاح چپو پر زور دیتے ہوئے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری چھوٹی بڑی رگیں جلد پھاڑ کر باہر نکل آئیں گی۔ غرایا، ''ٹھینگے سے۔'' ایک طرف سے آواز آئی۔ ''بھگوان کر پا کرو ناؤ منجھدار میں ہے۔'' ملاح نے گھرگھراہٹ سے جواب دیا۔ ٹھینگے سے۔ میں نے کہا، سواریاں زیادہ ہوگئیں۔ ملاح نے دانت پیس کر اور آنکھیں نکال کر کہا: ''ٹھینگے سے۔'' پھر ذرا سنبھل کر بولا، میاں ناؤ میں زبان نہیں چلاتے، چپو چلنے دیتے ہیں!

کشتی کنارے لگی سب لوگ اُتر پڑے۔ میں نے ملاح سے کہا بھائی تمہاری وِدّیا کے قائل ہو گئے، ہم کو بھی کوئی گُر بتاؤ۔ ملاح ہنسا۔ کہنے لگا، وِدوان تو آپ لوگ ہیں، ہم تو نپٹ جاہل، چور، اُچکے۔ باپ دادا سے البتہ یہی سنتے آئے ہیں کہ سنسار کا سارا کھیل تین اچھر پر ہے۔ اگر کام کرنا ہے تو یہ تین اچھر یاد رکھو۔ ہم مرے تو ٹھینگے سے، تم مرے تو ٹھینگے سے، دونوں مرے تو ٹھینگے سے!!

دیکھئے آپ اس لفظ ''ٹھینگے'' کی وجہ سے خواہ مخواہ مجھ پر برس نہ پڑیں۔ مجھے معلوم ہے یہ لفظ ثقیل ہے، رکیک ہے اور خدا جانے اور کیا کیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرے مخاطب کون کون لوگ ہیں، لیکن آپ مجھے معاف کر دیں۔ ملاح نے جو لفظ ادا کیا تھا اس کا سب سے زیادہ بلیغ مفہوم اسی لفظ سے ادا ہو سکا۔ ورنہ خود اس نے جو لفظ ادا کیا تھا، اُس کے دُہرانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ چہ جائیکہ آپ اسے سُن سکیں۔ پھر ملاح کا ذکر ہو تو ملاحی سے کیوں بد کیے۔

بہرحال ہم لوگ آگے بڑھے اور بہ ہزار خرابی دوسری ندی کے کنارے پہنچے۔ سورج ڈوب چکا تھا اور ہم سب ڈوبنے کی فکر میں تھے۔ تمام دن بارش میں بھیگتے بھیگتے کچھ تو یوں ہی جل ترنگ بن گئے تھے۔ ندی کا دم خم دیکھ کر رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ایک دن پہلے جہاں ملاح کی جھونپڑی اور ایک بڑا اجید پیپل کا درخت تھا، وہاں اب جو دیکھتے ہیں تو درخت بھی بیچ دھارے میں کھڑا ہے اور ملاح کی جھونپڑی درخت پر ٹکی ہوئی ہے۔ ملاح کا پتہ نہ تھا بڑی بڑی مصیبتوں سے ملاح صاحب دھارے کی سمت مخالف ایک میل کے فاصلے پر ملے اور اُن کی موہن جو دارو قسم کی کشتی بھی دکھائی دی۔

آپ کو تو معلوم ہے یونانی دیومالا میں آیا ہے کہ پاتال میں ایک ندی ہے جس کو اسٹائیکس کہتے ہیں۔ اس کے کنارے ایک ملاح رہتا ہے، جس کا نام شیراں ہے۔ اُس زمانے کے عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد مُردے کے وارث مردے کے منہ میں ایک سکّہ رکھ دیا کرتے تھے۔ جس اسٹائیکس کو عبور کرانے کے لیے شیراں بطور اپنی فیس کے لے لیتا اور روح کو اپنی کشتی میں سوار کرا کے دریا سے گزار دیا کرتا تھا۔ اس قصہ کو اُس زمانہ کے شعرا نے بڑے موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کو یہاں بیان کر کے اپنی تقریر کی دلچسپی یا دلکشی کم نہیں کرنا چاہتا۔

مجھے جس شیراں سے سابقہ تھا اس کا حلیہ اپنے مورث اعلیٰ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بڈھا، دُبلا، چڑ چڑا اور ڈراؤنا۔ کشتی بھی اسی سے ملتی جلتی ہوئی۔ شام کے دھندلکے، پانی کے خروش اور فضا کی اُداسی میں یہ یک نظر یہ بتانا دشوار تھا کہ کشتی ملاح یا ملاح کشتی۔ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ خاموش، نافرجام اور شکستہ حال۔ ہمارے ساتھیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس طور پر خاموش ہو گئے گویا قافلہ اس منزل پر پہنچ چکا تھا جس کے بارے میں ایک شاعر نے کہا ہے:

یہیں تک ہر مسافر نے پتہ پایا ہے منزل کا

اب میں نے سوچنا شروع کیا، لیکن سوچنے میں وہی خرابی ہوئی جو ایسی حالتوں میں اکثر لاحق ہوا کرتی ہے۔ یعنی صرف سوچتا رہا اور جتنا سوچتا اتنا ہی سوچنا دلچسپ معلوم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اب میں یا تو بھاگنے والا ہوں یا اسی ندی میں کود پڑوں گا۔ لیکن آپ یقین مانیے میرا اس قسم کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ ندی بھی کیسی گئی گزری ہوگی کہ اس کو ذرا بھی غیرت نہ آئے گی اور ہم سب کو بخیریت گزر جانے دے گی۔ میں نے ملاح کی طرف ایک دفعہ پھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شیراں کے چہرے پر کسی قسم کے آثار پیدا نہیں ہیں۔ اگر کوئی جھلک کبھی نظر بھی آجاتی ہے جس کو جھلک کے بجائے سایہ کہنا زیادہ مناسب تھا تو یہ کہ ہم لوگوں کے منہ میں ندی سے گزرنے کی فیس بھی رکھی ہوئی ہے یا نہیں۔

میں نے شیراں کو مخاطب کیا اور بولا، کیوں بھائی ناؤ پار بھی لگے گی یا نہیں۔ اس نے چلم کو منہ سے جدا کرتے ہوئے کہا، بیاہ کرنے گئے تھے جب مجھ سے رائے نہیں لی تھی۔ میں نے کہا، بھئی ناؤ پار لگنے سے میری مراد بیاہ سے نہیں ہے۔ میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ اس وقت ہم تمھاری کشتی میں بیٹھ کر اُس پار پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ شیراں نے کہا، تم کشتی کا مضحکہ اُڑاتے ہو۔ حالاں کہ کشتی تمھاری زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ یقین مانیے شیراں کی اس سنگ دلی پر مجھے بڑا تاؤ آیا، لیکن آپ کو تو معلوم ہے بے بس کا غصہ اور مفلس کا شباب یوں ہی گزر جاتا ہے۔

میں نے کہا، دوست معاف کرو اس وقت سوال کشتی کا نہیں ہے، سوال مدد کرنے کا ہے۔ شیراں نے کہا، سوال مدد کرنے یا انتقام لینے کا نہیں ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ تم لوگ تو دنیا کے لطف و آرام میں پلے ہو اور تمھاری رگ و پے ہی میں نہیں بلکہ تمھارے خدا اور خلق میں بھی اسی کا رنگ جھلکتا ہے۔ تم پر آفت آئے تو مدد کے خواستگار ہوتے ہو اور موقع مل جائے تو انتقام لینے سے دریغ نہیں کرتے۔ دونوں حالتوں میں اپنے فعل کو حق بجانب ثابت کرتے ہو۔ علم و تہذیب کا جادو یہی ہے کہ جو چاہو کرلو اور اسے حق بجانب ثابت کردو۔ میں ٹھیرا ملاح، میرا علم و تہذیب اور میرا خدا یہی ملاحی ہے۔ ملاح کا کام ملاحی ہے۔ اس کو امداد، انتقام کسی سے سروکار نہیں۔ موافق یا مخالف حالات سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ تم کو پار اُتارنا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ ہم تم دونوں ندی کا لقمہ بن جائیں۔

میں نے کہا، بھائی للہ رحم کرو اور میرے لب و لہجہ سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی گویا شیراں میں اس کی قدرت تھی کہ وہ راضی ہوجائے تو ہم سب یقیناً ندی سے بخیر یت گزر جائیں گے۔ شیراں نے بغیر لب و لہجہ بدلے کہا، دیکھو تم جوانوں کا عجیب وطیرہ ہے۔ اگر خطرہ سے محفوظ ہو تو ہر چیز کا مذاق اُڑاتے ہو اور خطرہ میں پھنس جاتے ہو تو گھگھی بندھ جاتی ہے۔ بہرحال کچھ دیر تک ہم دونوں میں بحث ہوتی رہی، جس کی تفصیل بے موقع تو نہیں ہے لیکن کیا کروں ایک صاحب جو کراماً کاتبین کی طرح میرے اوپر تعینات ہیں، ان کے تیور سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت مقررہ سے پہلے مجھے نہ تو یہاں سے بھاگ جانے دیں گے اور نہ وقت معینہ کے بعد کچھ بولنے دیں گے۔ باربروش فرشتوں اور گوش برآواز ریڈیو میں فرق یہ ہے کہ فرشتے جو کچھ

دیکھتے ہیں لکھ لیتے ہیں کاٹ نہیں سکتے۔ ریڈیو والے لکھتے نہیں کاٹ لیتے ہیں۔ کاٹنے سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، زیادہ مناسب فقرہ یہ ہوگا کہ کاٹ دیتے ہیں۔ کاٹنے کا مسئلہ میں کم از کم اس وقت تک تو تُغلک نہیں رکھنا چاہتا، جب تک ان لوگوں کے قبضہ قدرت میں ہوں۔ آپ البتہ نہ گھبرائیں، آپ ہر حال میں ہم دونوں کی کاٹ سے محفوظ ہیں۔

غرض ہم سب کشتی پر سوار ہو گئے۔ شیران نے کہا دیکھو تمہاری زندگی سے زیادہ قیمتی کشتی کی زندگی ہے۔ میں نے کہا، بھائی ٹھیک کہتے ہو، ہماری زندگی اس وقت سب سے زیادہ نامعقول اور ہیچ ہے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ اسے ہر وقت یاد بھی دلاتے رہو۔ کشتی جوں توں پار لگی، ہم سب اُتر پڑے۔ شیراں نے کہا، دیکھو میں تم لوگوں سے برابر کہتا رہا ہوں کہ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے کشتی کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے۔ تم اپنی خودغرضی اور بدحواسی کے سبب سے اس اظہارِ حقیقت کو میری سنگ دلی پر محمول کرتے ہو، لیکن کیا تم نے اس حقیقت کو بھی کبھی سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ انسانیت کی کشتی میں انسانی افراد کی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ تم افراد کی زندگی کو اہم سمجھتے ہو۔ میں نوعِ انسان کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں اور یہی وہ کشتی ہے جس میں افرادِ زندگی کے ناپیدا کنار اور اتھاہ سمندر میں ڈوبتے اُچھلتے رہتے ہیں۔

آپ گھبرائیں نہیں۔ میں نے تمہید ختم کر دی اور اب نفسِ مضمون پر آتا ہوں، لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے وقت قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ زندگی ایسی ہی ستم ظریف واقع ہوئی ہے۔ جب ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب سمجھ آئی ہے اور کچھ نہ کچھ کر جانے کا موقع ملا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی وقت دنیا کو خیرباد کہنے کا بھی ہے اور ساری حسرتیں دل میں رہ جاتی ہیں۔ لیکن میں طالب علم رہا ہوں اور اب بھی طالب علموں ہی سے واسطہ ہے۔ طالب علم امتحان میں جب دیکھتا ہے کہ وقت گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے، اُس وقت جتنا کچھ معلوم ہوتا ہے، نہیں معلوم ہوتا یا غلط معلوم ہوتا ہے ان سب کو کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ میں بھی یہی کرنا چاہتا ہوں تو پھر جلد جلد سنیے اور کبھی نہ بھلا یئے۔

1۔ ملاح اور کشتی کے بارہ میں ریسرچ کا سلسلہ حضرت نوح سے ملتا ہے۔

2۔ انگریزی ملاحوں نے اسپین کے ملاحوں کو جو آرمیڈا ساتھ لائے تھے دریابُرد کر دیا۔

3۔ ناروے اور سویڈن میں مچھلی پکڑنے کا پیشہ بہت مقبول ہو چکا ہے، جس کا ثبوت کاڈلیور آئل ہے۔

4۔ عاشق ومعشوق شاعر اور صوفیا، آکسفورڈ اور کیمبرج، بنارس کا بڑھوا منگل، ناؤ، ندی اور ملاح سے خاص قسم کا تعلق رکھتے ہیں۔

5۔ مہذب ممالک کے سواحل پر کچھ ملاح اور کچھ کشتیاں اس لیے رکھی جاتی ہیں کہ ان لوگوں کی مدد کریں جو خودکشی کرنا چاہتے ہوں۔ بعض بعض جگہ سیلرس ہوم بنے ہوئے ہیں۔ یعنی جو لوگ سمندر میں جان دینے سے بچ گئے ہوں وہ خشکی پر ٹھکانے لگا دیے جائیں۔

6۔ طارق نے ساحل ہند پر پہنچ کر اپنا سفینہ اس لیے جلا ڈالا تھا کہ ملک تو خدا کا ہے، لیکن شفع کا حق مسلمانوں کو حاصل ہے۔

7۔ پہلے کشتیاں تھیں اس لیے تجارت کو فروغ نہ تھا۔ اب تجارت کو فروغ ہے، اس لیے تارپیڈو کی ضرورت ہے۔

8۔ ملاحوں کو شکایت ہے کہ کونسلوں میں ان کی نیابت تو ہوتی ہے لیکن ان کا نمائندہ کوئی نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ انتخابات میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

9۔ وقت بالکل نہیں رہا۔

(علی گڑھ میگزین۔ جنوری 1937)

●●●

ہونڈار

میں آج آپ سے ایک بزرگ کے بارہ میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کا نام کچھ اس قسم کا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید پہلی کوشش میں ان کے نام کا صحیح تلفظ نہ کر سکوں یا ریڈیو کے انجینئر صاحب اپنی مشین کی عافیت خطرہ میں سمجھ کر مجھے اس کے تلفظ سے روک دیں یا میرے سننے والوں کا ریڈیو جواب دے جائے یا پھر کچھ نہ ہو تو مجھے خواہ مخواہ کی خفت اُٹھانی پڑے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آج بڑا دن ہے جو ہماری سننے والی برادری میں سے ایک جماعت کا نہایت مبارک تیوہار ہے۔ بچے تحائف کی اُمید میں کچھ سو چکے ہوں گے۔ کسی کو نیند نہ آتی ہوگی، کوئی محل کرسمس یا ''کرسمس ٹری'' کے سامنے بیشمار روشنی اور مٹھائیوں کا لطف اُٹھا رہا ہوگا۔ کچھ روٹھے منائے جا رہے ہوں گے، اور کچھ منے منائے روٹھے جاتے ہوں گے۔ کسی کو اپنا وہ زمانہ یاد آتا ہوگا جو گیا پھر نہ آئے گا۔ کوئی اس سوگ میں مبتلا ہوگا کہ وہ زمانہ آ گیا جو کبھی نہ جائے گا۔ بعض ایسے بھی ہوں گے جو موجودہ حالت میں ایسے مسرور ہوں گے گویا دنیا میں نہ کوئی ماضی رہا ہے نہ غیب میں مستقبل کا کوئی وجود۔ ہاں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو مسلسل اونگھ رہے ہوں گے۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن میں کیا کروں، مجھے رہ رہ کر ان بزرگ کا نام یاد آتا ہے، جن کا تذکرہ میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ رات کا وقت ہے، اور ہمارے سننے والوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو رات کو ایسے نام یا واقعات سننے کے متحمل نہ ہو سکتے ہوں گے، جن کا تلفظ غیر معمولی ہو اور کارنامہ غیر معمولی تر۔

بہرحال آج واقعتاً بڑا دن ہو یا نہ ہو بڑی رات ضرور ہے، اور اب تو نہیں لیکن کسی زمانہ میں مجھے چھوٹے دن اور بڑی راتیں بہت پسند تھیں۔ بڑی راتیں ناپسند اب بھی نہیں ہیں، لیکن پسند ہونے اور ناپسند نہ ہونے میں جو فرق ہے وہ صاحبانِ نظر یا اربابِ فن سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ہاں تو میں ان بزرگ کا نام ہی بھول جاتا تھا، جن کے تذکرہ سے میں نے گفتگو کی تھی اور اب جب کہ ان کا نام یاد آ گیا ہے، تو کیا حرج ہے اگر اس سلسلے میں ایک قصہ بھی سناتا چلوں۔ بہت ممکن ہے، اس اثنا میں ان کا نام نامی بھی آ جائے اور میں آپ دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں سے بہ یک وقت فارغ ہو جائیں۔ ذمہ داریوں کا نام میں نے یوں ہی لے دیا ہے ورنہ ذمہ داری ہو یا نہ ہو، یہاں تو اس کا سوال ہی نہ تھا، تاہم ہرج ہی کیا ہے۔ دورانِ گفتگو میں اس قسم کے الفاظ آتے رہتے ہیں، تو کہنے اور سننے والے دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ بات معقول ہی ہو رہی ہے اور ہم میں سے کوئی اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا ہے۔ اس قسم کا احساس خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور جب تک خود اعتمادی پیدا نہ ہو تضیع اوقات کا ولولہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن یہاں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایک ہی سانس میں اپنے ہی قول کی تردید کر دی ہے۔ مگر کوئی پروا نہیں توقع یہی ہے کہ آپ کو ساری باتیں یاد نہ رہتی ہوں گی، ورنہ آپ جانتے ہیں پبلک کا حافظہ قائم رہے تو لیڈر کی آبرو کہاں۔

لوگ کہتے ہیں بات میں بات نکلتی ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو، لیکن آج کی صحبت میں مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات میں بات نکلتی کم ہے اور غائب زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ممکن ہے بات نکلنے کا محاورہ تو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہو، لیکن بات میں بات نکلنے کا واقعہ غلط ہو۔ آپ ہی دیکھیے اور سنیے بھی تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میں بتانا تو چاہتا تھا، ایک بزرگ کا نام اور بتا گیا بہت سی ایسی باتیں جن سے آپ یقیناً خوش ہوئے ہوں گے اور محض اس خیال سے کہ میں نے مردِ معقول ہونے کی حیثیت سے ضرور ایسی ہی بات کہی ہوگی جس سے دوسرے مردِ معقول خوش ہوں۔ لیکن یقین مانیے گو میں اور آپ دونوں کم و بیش مردِ معقول ہیں، لیکن ہم دونوں کے بھی بزرگ کچھ ایسے مردِ معقول گزرے ہیں جو اس واقعہ سے ہم دونوں کے بارے میں ایسی رائے قائم کریں گے جو

ہماری ہمت افزائی کا موجب نہ ہوگی۔ گو اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد ہم بھی کوئی ایسی بات کر گزرتے جس سے ان کی بزرگی اور ہماری خوردی دونوں مجلس بین الاقوام کی ایک چیز بن جاتی۔

ہاں تو خوب یاد آیا۔ میں آپ کو ایک قصہ سنانا چاہتا تھا۔ قصہ نہیں واقعہ اور جی تو یہ چاہتا ہے کہ قصہ اور واقعہ پر بھی کچھ بحث کرنے لگوں، لیکن اتنی تقریر کرنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں باتوں باتوں میں بہک جاتا ہوں اور یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ ہر جگہ معقول ہی بات کرنا بھی نامعقولیت کی ایک دلیل ہے۔ بالخصوص ریڈیو پر جہاں عام طور پر معقول لوگ تھوڑی بہت نامعقول باتیں سننا چاہتے ہیں۔ نامعقول باتوں سے یہاں مراد سرمایہ و مزدور کی سی باتوں سے نہیں ہے، بلکہ ایسی باتیں جن سے کہنے والے کی نامعقولیت ظاہر ہوتی ہو اور کبھی سننے والے کی، اور بحیثیت مجموعی دونوں کی۔

ان باتوں سے آپ نے اتنا اندازہ تو لگا ہی لیا ہوگا کہ میں بات کرتے کرتے بہکنے لگتا ہوں، لیکن جہاں کلیلہ دمنہ کا ایک دوسرے سے سابقہ ہو، وہاں اس قسم کی باتیں ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ اس لیے بگڑنے کے بجائے صرف چگونہ بود ست آں پر اکتفا کرنا چاہیے، پھر مجھے یقین ہے کہ آپ نے مکتب میں انوار سہیلی اور چھپ چھپ کر الف لیلہ بھی پڑھی ہوگی۔ شہرزاد و یاد نیازاد قسم کی اس میں کوئی خاتون تھیں۔ بات یہ ہے کہ الف لیلہ پڑھے ہوئے مجھے اتنے دن ہو گئے کہ اب نہ تو الف لیلہ کی یاد رہی اور نہ شہرزاد اور دنیازاد کی یاد میں کوئی دلچسپی رہی۔ اس لیے ان ناموں سے جی چاہے تو آپ مزا لے لیں، میں تو صرف اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو اُن میں سے کسی ایک غالباً شہرزاد سے وابستہ ہے، یعنی ایک بادشاہ تھا۔ وہ ہر شام شادی کرتا اور ہر صبح عروس کو قتل کرا دیا کرتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں ممکن ہے شوہر یہ کر سکتا ہو۔ آج کل یہ منصب خواتین کو حاصل ہے۔ ہاں تو الف لیلہ میں آیا ہے کہ وزیر کی لڑکی نے اپنے آپ کو بادشاہ کی زوجیت میں دیا اور شب میں ایک قصہ سنانا شروع کیا۔ بادشاہ کو قصہ سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ صبح ہو گئی، اور شہزادی نے قصہ کو ناتمام چھوڑا۔ بادشاہ نے قصہ کے انجام کو شہرزاد کے انجام پر ترجیح دی۔ اسی طور پر شہرزاد ہر رات ناتمام قصہ سناتی رہی اور ہر صبح قتل سے بچتی رہی۔ چنانچہ قصہ

طوالت پکڑتا گیا اور بادشاہ کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ شہزادی کی جان بخشی کی گئی اور قصہ ختم ہو گیا۔ یہی حال میرا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ جہاں سانس ٹوٹی، ریڈیو والوں نے گلا دبایا۔ اس لیے جوں توں بات کرتے ہی چلے جاؤ، لیکن غالب نے کہا ہے:

''کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے''

آپ یقین مانیے مجھے آپ سے قطعاً اتفاق ہے کہ یہاں غالب کو زحمت دینے کی بالکل ضرورت نہ تھی اور یہ مصرع بالکل بے محل ہے مگر مژدہ ہو کہ مجھے ایک جلسہ میں شریک ہونے کے لیے ایک جگہ جانا پڑا، اور ایک نہایت ہی عزیز دوست لیکن نہایت ہی نامعقول پڑوس میں قیام کرنا پڑا۔ ایک طرف میونسپلٹی کی گندگی ڈھونے والی گاڑیوں کا ذخیرہ اور اس کا دفتر، دوسری طرف شراب خانہ، تیسری طرف بجلی کا خزانہ۔ چارپائی میں اتنے اور ایسے کھٹمل جن پر کتنے فاقوں پر حرام بھی حلال ہو گیا تھا اور ہر چہار طرف مچھر جو گاتے بھی تھے کاٹتے بھی تھے اور آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کا کاٹنا ہی مسلسل گانا ہے، یا گانا مسلسل کاٹنا۔ اس صورت سے تو میں نے صبح پکڑی۔

غرض مچھروں کو میں نے اور میزبان نے مجھے کھلا پلا کر رخصت کیا اور میں جلسہ میں پہنچا۔ بحث یہ چھڑی تھی کہ مشترک زبان کی جو ریڈریں رائج ہیں وہ بالکل مہمل ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ریڈروں کا مہمل ہونا ہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جس دن ریڈریں غیر مہمل ہوئیں، آپ یقین مانیے ہندوستان کی خیر نہیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ میری بات کو سب نے مہمل سمجھا، ورنہ ہندوستان کا جو حشر ہوتا وہ بعد میں ہوتا، میری خیر نہ تھی۔ اس کے بعد کچھ اور بحث ہونے لگی اور بالآخر یہ طے پایا کہ جن نقائص کی شکایت کی جاتی ہے، ان کی مثالیں پیش کی جائیں۔ ابھی ریڈروں کی ورق گردانی ہی ہو رہی تھی کہ ایک دوست نے کان میں کہا کہ ہندی رسم الخط میں ہر جگہ پرمیشور آیا ہے۔ حالاں کہ اردو رسم الخط میں ہر جگہ خدا موجود ہے۔ مضمون دونوں یکساں، لیکن خدا اور پرمیشور کے اختلافات نے بات کہاں کی کہاں پہنچا دی۔ اس سے اندیشہ ہے کہ ہندو مسلمانوں میں نفاق اور بددلی پیدا ہو۔ میں نے کہا یہ بات نہایت نازک اور بے حد سنگین ہے۔ خدا اور پرمیشور کا فرق ہندو مسلمانوں کا فرق ہے۔ پرمیشور کا لفظ قرآن میں

کہیں نہیں آیا ہے اور جب تک مصنف کا نام ہی اس کی تصنیف میں نہ ہو، ظاہر ہے اس کا حق طباعت و اشاعت کیوں کر محفوظ رہ سکتا ہے اور جب قرآن کے مضامین ہی محفوظ نہیں رہے تو لعنت ہے مجھ پر اور تھُف ہے آپ پر۔ میری لعنت کو تو وہ پی گئے، لیکن اپنی تھُف پر میری طرف انھوں نے اس طور پر گھورا جیسے وہ مجھے مارنا تو چاہتے ہیں، لیکن اپنے بیوی بچوں کا خیال کر کے خاموش رہنے پر مجبور ہیں۔ میں نے عرض کیا، جناب غور تو کیجیے پرمیشور اور خدا دو نہیں ہیں، لیکن ریڈروں میں ان کو دو قرار دیا گیا ہے اور خدا ہوں یا پرمیشور جب دوئی کی بوئی تو ہم آپ دونوں مشرک ہوئے۔ یہی ریڈریں ہماری اولادیں پڑھیں گی، تو وہ بھی مشرک ہوئیں۔ اس طور پر ایک زمانہ ایسا آجائے گا جب دنیا میں صرف مشرک اور یہ ریڈریں باقی رہ جائیں گی۔ دوسری دقت یہ ہے کہ خدا اور پرمیشور کے امتیاز نے رسم الخط کی دقتیں بھی بڑھا دیں۔ آج ہمارے سامنے ایک سوال یہ بھی ہے کہ رسم الخط کیوں کر مشرک ہو۔ فرض کیجیے رسم الخط ہندی یا رومن ہو جائے پھر آپ اس پر چراغ پا ہوں گے کہ اس رسم الخط میں خدا کا لکھا جانا کیوں کر گوارا کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ خدا کو رسم الخط سے علاحدہ نہیں کر سکتے۔ ان سے آپ کیوں کر عہدہ برآ ہوں گے۔ ابھی ہم دونوں اسی گلخپ میں مبتلا تھے کہ جلسہ سے ایک شور اُٹھا۔ ہونڈار، ہونڈار، اور وہاں قطع کلام ہوتا ہے۔ یہی بزرگ ہیں جن کے سبب سے میں اب تک بہکتا بھٹکتا رہا۔ آپ ان کا نام یاد رکھیے گا۔ میں بھی دُہراتا رہوں گا۔ ہم دونوں نے خدا اور پرمیشور کو جہاں کا تہاں چھوڑا اور حاضرین کی طرف مخاطب ہوئے۔ یہ ہونڈار بھی ریڈر ہی سے برآمد ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ پچھم میں جن ذات شریف کو بھیڑیا کہتے ہیں ان کو پورب والے ہونڈار کہتے ہیں۔ پورب والے مصر تھے کہ ہم ہونڈار ہی کہیں گے۔ پچھم کے لوگ کہتے تھے کہ بھیڑیا موجود ہے، پھر ہونڈار پر کیوں اصرار کیا جائے۔ ایک صاحب پورب اور پچھم کے ذرا اوسط میں تھے۔ بولے، حضرات نہ بھیڑیا نہ ہونڈار ہم تو ہونڑار کہتے ہیں۔ یہ جانور کہیں کا کیوں نہ ہو، تلفظ ہمارا ہی رہے گا۔ بحث میں وہ خلفشار تھا، گویا واقعی ہم میں دو ایک بھیڑیے دو چار ہونڈار اور ایک آدھ ہونڑار موجود تھے۔ بعض لوگ جو بالطبع صلح پسند اور صورت سے گورخر معلوم ہوتے تھے، کہنے لگے بھئی ہونڈار بھیڑیا یورپ میں بھی ہوتا ہے لیکن وہاں اس قسم کے مناقشے ناموں پر سننے میں نہیں آئے۔ دوسرے صاحب چمک کر بولے،

حضرت بسنت کی بھی خبر ہے۔ ہندوستان کے ہونڈار اور یورپ کے بھیڑیے میں بڑا فرق ہے۔
تیسرے صاحب بولے، حضرات خاموش، ہماری جماعت فرقہ بندی اور ملکی غیر ملکی جھگڑوں سے بہت بلند ہے۔ ہم ایسی بات چھیڑنا پسند نہیں کرتے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ ایک طرف سے آواز آئی اور اپنی گرفتاری ہو۔ جناب صدر نے سب کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور تھوڑی دیر میں پھر وہی خالص علمی فضا پیدا ہو گئی جس میں روئی اور روڑا دونوں یکساں رفتار سے گرتے ہیں تو جناب والا، جب آپ نے ہونڈار کو سُن لیا لیکن قطع ساعت یہ فقرہ میری زبان سے ذرا بے خبری میں نکل گیا ہے۔ ممکن ہے آپ انگریزی داں ہوں اور میرے اس فقرے سے یہ اخذ کر لیں کہ میں بحیثیت ہونڈار تقریر کر رہا ہوں۔ حاشا یہ نہیں ورنہ آپ جانتے ہیں، ریڈیو والے اسے کب پسند کریں گے کہ ان میں کوئی ہونڈار آ جائے۔ گو ایک صاحب میرے کان میں یہ کہہ رہے ہیں اور یہ کافی ہونڈار شناس معلوم ہوتے ہیں کہ ان کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر یہ تقریر کوئی ہونڈار سن رہا ہو، لیکن احتیاط شرط ہے۔ اس بات کو سن کر سننے والوں میں سے کسی کا کان کھڑا ہو تو فوراً سمجھ لیجیے فہو الہونڈار۔

ہونڈار کے باب میں ہمارے دیہاتی بھائیوں کا خیال ہے اور ریڈیو والوں نے اس برادری میں کافی اضافہ کر دیا ہے کہ یہ جانور چپکے سے مویشیوں میں آ کر مل جاتا ہے اور نگہ بانوں کو غافل پا کر کسی حقیر فقیر پر تقصیر قسم کے جانور کو دبوچ کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ مدتوں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ گم شدہ عزیز پر کیا گزری، جب متواتر اس قسم کے حادثات پیش آنے لگتے ہیں تو سارے گاؤں میں اور آس پاس اس خطرہ کا اعلان کر دیا جاتا ہے کہ لوگو اپنی اپنی مویشیوں اور بچوں بچیوں سے ہوشیار، گاؤں میں ہونڈار آیا ہوا ہے۔

اس ہونڈار کے باب میں گاؤں والوں کا واہمہ یہ ہے کہ یہ ہجوم میں اس طور پر گھل مل جاتا ہے کہ کسی کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مجمع میں کوئی غیر معمولی بزرگ شامل ہو گئے ہیں اور یہی سبب ہے کہ یہ صاحب اپنا کام کر گزرتے ہیں اور کسی کو ان کے کارناموں کی خبر نہیں ہوتی۔

آپ یقین فرمایئے، میں نے جنگل کا ہونڈار نہیں دیکھا ہے، لیکن آپ کی دعا سے شہری و تمدنی ہونڈاروں سے کافی سابقہ رہا ہے۔ آپ بھی غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہماری

موجودہ تمدنی زندگی میں اس قسم کے ہونڈاروں کی کمی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ نے اس کے نام اور رکھ دیے ہیں۔ سیاست، حکومت، مذہب، تمدن غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جس میں آپ کو ہونڈاروں سے سابقہ نہ ہو۔ حکمران ہونڈار، تاجر ہونڈار، لیڈر ہونڈار، مذہبی ہونڈار، گاؤں سدھار ہونڈار، شہر اُجاڑ ہونڈار، بوڑھا ہونڈار، جوان ہونڈار، ہونڈارن، ہونڈار چہ، ہونڈارک، ہندستانی ہونڈار، یوروپین ہونڈار، جاپانی ہونڈار، چینی ہونڈار، بین الاقوامی ہونڈار، صاحب ہونڈار، خانساماں ہونڈار، شاعر ہونڈار، پروفیسر ہونڈار، غرض دلی کی دُکان چیل ہی چیل کے مانند ہونڈار ہی ہونڈار۔

(علی گڑھ میگزین۔ جنوری 1938)

●●●

اگر میں فاؤنٹین پین ہوتا

معلوم نہیں وہ کون بزرگ تھے، اور کون سی وہ ساعت جب یہ بات مشہور ہوئی کہ ہنسا اور رونا کسے نہیں آتا۔ ان بزرگ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں وہ زمانہ بھی آنے والا تھا کہ جب ریڈیو کا دور دورہ ہوگا جو اس مثل کے مفہوم ہی کو بدل دے گا۔ یعنی ہنسا یا رونا ہر شخص کے بوتے کا ہو یا نہ ہو، ہنسانا یا رُلانا سبھی کو آتا ہے اور یہی نہیں بلکہ ہر بات پر ہنسایا یا رولایا جاسکتا ہے۔ آپ ہی انصاف فرمایئے اور انصاف فرمانا نہ آتا ہو تو خود ہنسئے اور دوسروں کو رُلایئے۔ اس میں کون سی ہنسی کی بات ہے کہ میں فاؤنٹین پن ہوتا تو کیا ہوتا جس کو غالب نے یوں کہا ہے:

نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اور ہاں اس بات کو یاد رکھیے کہ میں جو ادھر اُدھر جہاں تہاں غالب وغیرہ کی سند پیش کر دیا کرتا ہوں یا اس قبیل کے دوسرے بدقسمتوں کو معرض بحث میں لاتا ہوں اس سے توضیح مطالب ہوتی ہے، ہرگز نہیں۔ یہ تو ہم لوگوں کے پیشے کی کمزوری ہے جہاں زبان رُکی یا مطلب خبط ہوا یا کسی کو جلد سے جلد دھوکا دینا ہوا، ان بزرگوں کا نام لیا اور آگے بڑھ گئے!

ابھی ابھی جو میں نے مثل بیان کی تھی اس کے سلسلے میں ایک دوسری مثل بھی یاد آئی تھی، جو غالب کے بیچ میں آجانے سے معرضِ التوا میں پڑ گئی۔ یہ دوسری مثل اس لیے پیش کرتا ہوں کہ یہ تھوڑی بہت مجھ پر اور بقیہ ریڈیو والوں پر صادق آتی ہے، یعنی جس کی کھائے اس کی

گائے۔ اب تک ریڈیو والوں کا یہ اصول رہا کہ کھلاتے تھے گواتے تھے۔ اب انھوں نے یہاں تک ترقی کر لی ہے کہ کھلاتے ہیں اور ہنسواتے ہیں۔ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے، بشرطیکہ کھلانے اور ہنسوانے کا وہ مفہوم لیا جائے جو کھلانے سے کم اور ہنسوانے سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن میں ریڈیو والوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میری نیت وہ نہیں ہے جو میرے الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے اور غالباً ان کی نیت بھی وہ نہیں جو ان کے مقصد سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن نیت کسی کی ہو، ریڈیو سننے والوں کا ہر حال میں فائدہ ہے۔

تو جناب ریڈیو والے مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ ایسی باتیں کہوں جس سے آپ مجھے بے وقوف سمجھ کر ہنسیں اور میں کچھ آپ کو زیادہ عقل مند نہ سمجھ کر ہنسانے کی کوشش کروں۔ ظاہر ہے کہ آپ کے فرائض نہایت آسان ہیں اور میرے نہایت مشکل، یعنی آپ تو مجھے نہایت آسانی سے بے وقوف سمجھ لیں گے۔ رہا میرا سوال سو آپ سے کیا تکلف۔ بات یہ ہے کہ اگر میں آپ کو بے وقوف سمجھوں تو آپ یقیناً خفا ہوں گے اور کبھی نہ ہنسیں گے۔ کیوں کہ خفا ہونا اور ساتھ ہی ساتھ ہنسنا اچھی خاصی مشتبہ بات ہے، لیکن اگر آپ ابھی سے خفا نہ ہو گئے ہوں تو میں آپ سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ ہنسنے اور نہ ہنسنے کا فن سائیسی کی طرح ''علم دریاؤ'' ہے۔ یہ تو صرف بڑے پہنچے ہوؤں کو آتا ہے کہ کہاں اور کب ہنسنا چاہیے اور کہاں اور کب ایسا نہ کرنا چاہیے۔ آپ کی خاطر میں فرض کیے لیتا ہوں کہ آپ بھی انھیں میں سے ہیں، لیکن اس کے آگے ایک اور بڑی سخت منزل آتی ہے، یعنی کس طرح ہنسنا چاہیے۔ میری بعض باتوں پر بعض لوگ اس طور پر ہنستے ہیں کہ میں نے اپنے اوپر لعنت بھیجی ہے کہ میں نے کیوں کوئی بات ایسی کہی کہ اس شخص کے ہنسنے کا منظر مجھے دیکھنا پڑا۔ لوگوں نے افراد کی سیرت دریافت کرنے کے متعدد اور مختلف اصول بتائے ہیں۔ ممکن ہے آپ ان سے واقف ہوں، لیکن ایک اصول اس خاکسار کا بھی یاد رکھیے، جس شخص کے بارے میں آپ کوئی رائے قائم کرنا چاہتے ہوں سب سے پہلے دیکھیے وہ کس طرح ہنستا ہے۔ ایسے لوگوں سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے جن کو ہنسنا نہ آتا ہو۔ انسان کی تعریف میں جس نے یہ کہا ہے کہ آدمی ہنسنے والا جانور ہے، اس نے انسانوں کے ساتھ نہیں جانوروں کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جانوروں کو ہنسنے کی

استعداد بخشی گئی ہوتی، تو آپ دیکھتے کہ وہ انسان سے کہیں زیادہ انسان معلوم ہوتے۔ بات طوالت پکڑتی جاتی ہے لیکن اس سے عہدہ برآ ہونے کا موجودہ موقع سے بہتر کوئی اور موقع نہ ملے گا، اس لیے عرض کیے دیتا ہوں۔

آج ہی دلّی آرہا تھا، ایک اسٹیشن پر ایک دیہاتی عورت نظر آئی۔ یہ عورت ایسی ہی تھی جسے دیکھ کر مجھ سے زیادہ قابل اور کم عمر لوگ شعر کہنے لگتے، اور مجھ سے زیادہ مفلوک الحال اس عورت کے لیے سونے کا کنگن بنوانے کی فکر میں انقلاب کی دعوت دے دیتے۔ تھوڑی دیر تک تو میں بھی سوچتا رہا کہ قدرت کا شاہکار یہ عورت ہے اور ہریجن کار یہ خاکسار ہے۔ لیکن معلوم نہیں کس بات پر یہ عورت ہنسی۔ اس کی ہنسی ایسی لغو، ایسی احمقانہ اور ایسی پھوہڑ تھی کہ میں بدحواس ہوگیا اور گو اس وقت یہاں ریڈیو کے کمرہ میں ہوں، لیکن ڈرتا جاتا ہوں کہ خدانخواستہ ان باتوں پر آپ میں بھی کوئی اسی قسم کی ہنسی نہ ہنس رہا ہو!

معاف فرمائیے جملہ معترضہ کی بجائے یہ دفتر معترضہ ہوگیا۔ بات یہ چھیڑی تھی کہ آپ خفا ہو گئے تو ہنسیں گے کیوں کر، اور خفا ہوئے اور ہنسے بھی تو یہ آپ کے حق میں کچھ اچھا اضافہ ہوگا، اور خدانخواستہ آپ واقعی بے وقوف ہوئے اور ہنس پڑے تو آپ کا ہنسنا میرے لیے بڑا عبرت ناک ہوگا۔ خیر ریڈیو والوں کی خاطر میں اسے انگیز کرلوں گا۔ اسی طرح جس طرح انھیں ریڈیو والوں کی خاطر آپ ریڈیو کا ہر سال لائسنس بدلوالیا کرتے ہیں۔ اچھا عقل مندی اور بے وقوفی کو ذرا دیر کے لیے علاحدہ کیجیے، اور اس بات پر غور کیجیے۔ اور ظاہر ہے جب عقل مندی اور بے وقوفی دونوں سے بے نیاز ہوجائیے تو پھر غور کرنے کے سوا چارہ ہی کیا رہ جاتا ہے کہ کسی کا فاؤنٹین پین بن جانا کون سی ہنسی کی بات ہے، تاوقتیکہ فاؤنٹین پین بجائے خود کوئی ہنسنے کی بات نہ ہو۔

فاؤنٹین پین کے بارے میں تو میں کچھ بہت جانتا نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بعض اوقات بعض لوگ خاص شکل وصورت کے ملے ہیں، جن کو دیکھ کر سنجیدہ رہنا بڑا مشکل ہوگیا ہے۔ مثلاً یہی کہ کسی کی شکل فاؤنٹین پین سے ملتی جلتی ہو۔

میں ایک بزرگ سے واقف ہوں، جنھیں مرغیاں پالنے کا بڑا شوق تھا۔ یہ واقعہ میرے بچپن کا ہے۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس کے قریب ایک بوڑھے خاں صاحب کا جوتوں کا

کارخانہ تھا، جہاں انگریزی وضع کے جوتے بنائے جاتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے خاں صاحب رُحلت فرما گئے۔ کارخانہ بھی درہم برہم ہوگیا۔ مرغیاں کچھ ہمارے کام آئیں کچھ ''مرغیاں شاخ درخت لا ہوتیم'' بن گئیں۔ ان کے ہاں ایک مرغ تھا، لیکن اس مرغ کو صرف مرغ کہہ کر ختم کر دینا اس کے اور آپ دونوں کے ساتھ بڑی بدسلوکی ہوگی۔ اس مرغ کا اصلی تصوّر کچھ اس تلفظ سے ہوسکتا ہے جو ہماری طرف عام ہے، یعنی مرغا۔ اس مرغے اور خاں صاحب میں بھی کچھ ایسی مشابہت تھی کہ میں اب تک کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ شاید وہ مرغا ہی خاں صاحب تھا، یا خاں صاحب دراصل مرغا تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص اس مرغ کو دیکھ کر خاں صاحب کو نہ یاد کر لیتا ہو، یا خاں صاحب کے نام کے ساتھ ان کے مرغے کی طرف دھیان نہ جاتا ہو اور یہ کچھ خاں صاحب اور ان کے مرغے ہی کا حال نہ تھا، بلکہ خاں صاحب کے ہاں کے بنے ہوئے جوتے بھی کچھ ان دونوں کے مجموعی شکل سے ملتے جلتے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم سب ادھر سے نکلتے ہوئے بھی یہ محسوس کرنے لگتے کہ ہماری صورتیں یا اطوار بھی خاں صاحب کے ہاں کی موجودات یا مصنوعات سے ملنے جلنے لگی ہیں۔ ممکن ہے اسی کا نتیجہ ہو کہ اب مرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ ہر شخص کی شکل ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسا کہ اس کا ماحول ہوتا ہے۔ لیکن بعض خدا کے بندے ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جو اپنی شکل کو اپنے ماحول میں منتقل کر دیتے ہیں!

لیکن ذرا ٹھہریے!! مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ابھی جو بات کہی ہے اسے آپ کچھ یوں ہی سا سمجھتے ہیں۔ لیکن سوچیے تو ریڈیو پر کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، جہاں ہر بات کاپی رائٹ قسم کی ہو، اور دن رات میں کئی بار، بیانگ دہل نہیں، بلکہ بیانگ برق، دُہرائی تہرائی جاتی ہو۔ جھوٹ بولنے کی وہاں ضرورت پڑتی ہے، جہاں اب سچ بولنے پر مجبور کیے جاتے ہوں۔ ہاں تو میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ میرا قول ہے اور ممکن آپ کا تجربہ بھی ہو کہ میں ریڈیو پر جھوٹ نہیں بولتا۔ قول تو ظاہر ہے، میرا ہی ہے۔ اس لیے اس میں مجھے شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہا آپ کا تجربہ، اس سے مجھے کیا۔ داناؤں نے آخر کسی کے بارے ہی میں کہا ہے ''بافضولی چہ کار'' تاہم آپ کی خاطر میں اپنی صداقت کے ثبوت میں سند بھی پیش کرتا ہوں۔

ایک تھے شاعر، متخلص بہ اجہل، جن کو اُستاد کا درجہ حاصل تھا۔ ایک دفعہ بیٹھے بٹھائے دماغ میں ایک مصرعہ کوندا، شاگردوں سے کہا لو بھئی ہو گیا۔

''یہ شیریں مصر میں جا کر پکارا''

ایک شاگرد نے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، سخن پناہ۔ اس میں شیریں کچھ مذکر سی نظر آ رہی ہے۔ اُستاد نے فرمایا، کیا مضائقہ۔ دوسرے نے ہاتھ باندھ کر التماس کیا۔ خرد پڑوہا کوئی سند بھی ارشاد ہو۔ کچھ سوچا، پھر بولے، یہ لو۔ سند بھی موجود ہے اور ساتھ ہی للکار کر دوسرا شعر پڑھا، جس میں شیریں چاروں شانہ چت مذکر تھی۔ شاگرد نے خفیف ہو کر پوچھا، یہ شعر کس کا ہے۔ اُستاد نے فرمایا، بے وقوف، ہوتا کس کا، میرا ہی ہے۔

کیوں حضرت اب تو آپ کو اطمینان ہو گیا ہوگا کہ میں نے جو کچھ ریڈیو پر جھوٹ بولنے کے سلسلے میں عرض کیا تھا، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس سے پہلے یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو لوگ جس ماحول میں رہتے سہتے ہیں ان کی شکل بھی اسی ماحول جیسی ہو جاتی ہے۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا اور دیکھنا تو درکنار، بہت ممکن ہے یہ بات خود آپ ہی پر صادق آتی ہو کہ جو لوگ دنیا کی نجات کا باعث عورتوں کو سمجھتے ہیں، یعنی عورتوں کے زیادہ ہمدرد ہوتے ہیں، بالفاظ دیگر عورتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، مطلب یہ کہ عورتوں کے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ زن مرید ہوتے ہیں، ان کو غور سے دیکھیے تو ان میں نسوانی خواص یا نسائی انداز یا...... یا...... یعنی کچھ عورت زدگی سی پائی جاتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ قدرے زن آبی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ کچھ یوں ہی سے ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت بعض عورتوں کی ہوتی ہے جو مردوں کا زیادہ احترام کرتی ہیں..... لیکن میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا، کچھ تو اس وجہ سے کہ عورت تفصیل نہیں اجمال ہے، اور بہت کچھ اس وجہ سے کہ عورتوں سے میں خود اتنا واقف نہیں ہوں جتنا شاید وہ مجھ سے بدظن ہوں۔ ایسی حالت میں احتیاط بہتر ہے کیوں کہ بزرگوں نے کہا ہے:

''بترس از بلائے کہ زن درمیان است''[1]

---

1 مجھ کو ڈرنا چاہیے کہ وہ بلا کہ جس کا نام عورت ہے وہ تیرے درمیان ہے۔

یہ سب میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ میں بہت سی ضروری اور نازک باتیں کہنا نہیں چاہتا، جس کا کچھ سبب تو یہ ہے کہ مجھے یہ باتیں معلوم بھی نہیں ہیں دوسرے مرشد کی نصیحت ہے کہ ایسا موقع آجائے تو ہمیشہ اس امر کی کوشش کرو کہ بات سمجھ میں نہ آئے، مگر مطلب ظاہر ہو جائے۔

یہ سب تو ہوا مگر فاؤنٹین پن والی بات جہاں کی تہاں رہ گئی۔ سو حضرت واقعہ یہ ہے کہ میں فاؤنٹین پن بننا پسند نہیں کرتا، لیکن ریڈیو والوں کے اصرار پر میں نے اپنے فاؤنٹین پن سے استمزاج کیا۔ میرا قلم بہت پرانا ہے، پہلے کچھ ولایتی سا تھا۔ اب اس کی حالت یہ ہے کہ نب انگریزی ہے، ٹیوب جاپانی، خول خدا جانے کہاں کا۔ ایک بار عینک تلاش کرنے میں، پاؤں کے نیچے آرہا تو بقول میر:

یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

چنانچہ اس قلم کے تمام اجزا ترکیبی کو جس نے اب یکجا کر رکھا ہے، وہ ایک دھاگا ہے۔ نجیب الطرفین کھدر کا.... میں نے ان سے دریافت کیا، کیوں جناب کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر کے لیے آپ کا چولا اختیار کرلوں اور آپ میرا۔ انھوں نے ایک ایسی آواز میں جو ان کے نزدیک شاید ہنسی کی تھی، لیکن میں سمجھا کہ صرف گلا صاف کرنے کا اہتمام فرما رہے ہیں، جواب دیا۔

حضرت کیوں تکلیف فرماتے ہیں۔ مری جو کچھ حالت ہے ظاہر ہے اور آپ کا حلیہ نورٌ علیٰ نور۔ میں اور آپ ایک دوسرے کا چولا بدلے بغیر اپنی اپنی جگہ پر بھرپور ہی واقع ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، آپ اس خاکسار کو خواہ مخواہ کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ لیکن سوال میرا آپ کا نہیں ہے، سوال تو ریڈیو والوں کا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کا قالب بدل لوں اور اس کے بعد اپنے تاثرات بیان کروں۔ آخر اس میں کون سی قباحت ہے کہ من تو شدم تو من شدی کی تو اپی ہو جائے۔ قلم نے جواب دے دیا۔ تاثرات کی بھی ایک ہی کہی۔ اوّل تو آپ کیا اور آپ کے تاثرات کیا، انسان خدا بن کر بھی اپنے تاثرات نہیں بیان کرسکتا، چہ جائیکہ اس کی حیثیت صرف ایک قلم کی ہو، اور کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی حیثیت کسی وقت ایک قلم سے زائد رہی ہے۔ کسی کو

کیا معلوم آپ کیا لکھتے ہیں یا آپ سے کیا لکھایا جاتا ہے یا کون لکھاتا ہے۔ یا جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو دوسرے سمجھتے ہیں.... میں گھبرا گیا اور بولا۔ ''بس بس حضرت اگر آپ یوں ہی بولتے گئے تو میں شریفوں میں بیٹھنے کے لائق نہیں رہ جاؤں گا۔ دیہاتی بھائی ہی نہیں، قصباتی والدین اور شہری والدین.... بھی اپنا اپنا باجا بند کر لیں گے۔ یہ تم نے کہاں کا خرافات چھیڑ دیا۔
قلم نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے جواب دیا۔ خرافات میں نے نہیں چھیڑی، اس کے مرتکب تم ہوتے ہو۔ بھلا بتاؤ تو تم یا کوئی اور کبھی وہ لکھ سکتا ہے جو وہ لکھنا چاہتا ہے، یا ایسا وہ کر بھی سکتا ہے۔ سب سے بڑا آرٹسٹ سب سے زیادہ مخلص فریبی ہوتا ہے۔ تمھارے لیے جو بات قابلِ فخر ہے وہ صرف اتنی کہ تم نے تاثرات یا تجربات کے اظہار کے لیے چند وسیلے تلاش کر لیے ہیں اور بس۔
تپش پیمایا تھرمامیٹر سے صرف حرارت کے وجود کا پتہ چلتا ہے، حرارت کا بھید کسے معلوم!
قلم کی اس گفتگو پر میں رو پڑا، اور گڑگڑا کر بولا۔ میرے بھائی وقت ختم ہوا جارہا ہے تم کو کیا معلوم، سننے والوں میں چوّے والے بھی ہوتے ہیں جن کا مہذب لقب کالج کے نوجوان بھی ہیں۔ میں فاؤنٹین پن بنے بغیر ریڈیو اسٹیشن سے نکلا تو بس سمجھ لو، گھر پہنچتے پہنچتے تمھارے اس بھینس کے آگے بین بجانے پر مجھے مسجد کے سامنے باجا بنا ڈالیں گے۔ ان باتوں کو تہ کرو، اب مجھے یہ بتاؤ کہ ہم تم قالب کیوں کر بدلیں۔ قلم نے جواب دیا۔ وہ تم نے فسانۂ عجائب کا بندر والا قصہ تو پڑھا ہوگا جب تک کوئی بے جان جسم نہ ملے، ہم تم قالب کیوں کر بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں ایک وسیلہ یا میڈیم تلاش کرنے چل کھڑے ہوئے۔
سامنے سے ایک خاتون گزر رہی تھیں، جن کے پاس ایک نہایت خوب صورت چھوٹا سا فاؤنٹین پن تھا۔ میں نے اپنے قلم سے عرض کیا، بھئی معاف کرنا میں نے تمھیں خواہ مخواہ تکلیف دی۔ تم چاہو تو گھر جاسکتے ہو۔ موسم بھی تمھارے لیے کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں ان محترمہ کے فاؤنٹین پن سے معاملے کی بات کرلوں گا۔ قلم نے جواب دیا۔ شکریہ، لیکن ایسا تو نہیں ہے کہ مجھے خبر کرنے سے پہلے ہی قالب خالی کر چکے ہو۔ لیکن میرا ارادہ یہ ہے کہ میں ان خاتون سے یہ التجا کروں کہ جب تک آپ ان کے قلم کے قالب میں رہیں، میں ان محترمہ کا پیکر اختیار کیے رہوں۔ مجھے یہ سن کر بڑا طیش آیا، لیکن ہم دونوں نے جھگڑنا اس طور پر شروع کیا، جس طرح لیڈر صلح

کرتے ہیں۔ یعنی زبان سے لڑتے اور دل میں ڈرتے رہے۔ میں نے کہا بھائی قلم، ذرا دیر کے لیے انصاف کرو۔ اگر تم خاتون بن گئے، تو مجھے ان کا فاؤنٹین پن بننے سے کیا حاصل ہو جائے گا۔ قلم نے جواب دیا، لیکن یہ تو بتاؤ، تمھارا مقصد تو محض فاؤنٹین پن بننا ہے۔ اس کا کیا سوال کہ کس کا فاؤنٹین پن بنو۔ میں نے عرض کیا، دیکھو تو انسان بہر حال اشرف المخلوقات ہے وہ کتنا ہی گیا گزرا ہوا کیوں نہ ہو، اپنے انتخاب میں سلیقہ اور ذوقِ جمال کو دخل دیتا ہی ہے۔

اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے وابستہ کرلوں جو اپنے قلم کو اکثر منہ میں داب لیتے ہیں یا اس سے کان یا چلم کریدنے لگتے ہیں، یا دوسروں کی تحریر پر اپنے دستخط کر کے صاحب تصنیف بن جاتے ہیں۔ مرے دوست نے جواب دیا، اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خاتون اس قلم سے اخلاق و مذہب کی کتابوں پر حاشیہ لکھا کرتی ہیں۔ میں قلم کو کچھ جواب دینا چاہتا تھا اور شاید سخت جواب دیتا۔ ممکن تھا کہ بات اور بڑھتی کہ ریڈیو والوں نے کہا، رخصت اب آپ دونوں کی ملاقات کبھی ٹیلی ویژن پر ہوگی اس وقت تو معاف ہی رکھیے۔

●●●

اگر میں چور ہوتا

یہ دلّی ہے۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں۔ یہ باتیں ریڈیو پر آپ ہر روز اسی وقت سنتے ہیں، لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ دلّی اور رات کے آٹھ بجنے کا مطلب کیا ہے۔ ظاہر ہے چوری کرنے کے اس سے بہتر مواقع نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات جو اناؤنسر صاحب نے میرے متعلق فرمائی ہے یعنی میں کون ہوں، اس سے غالباً آپ کو اختلاف نہ ہوگا۔ مجھے بھی اختلاف نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ ریڈیو والوں نے ایک ایسی بات چھیڑ دی جس سے مجھ سے تمام دنیا سے اختلاف ہو جائے۔ اختلاف ہی نہیں بلکہ مخالفت بھی، یعنی میں چور ہوتا تو کیا ہوتا۔ ظاہر ہے اس کا جواب ایک ہی ہے یعنی جو سزا چور کی وہ میری۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہماری آپ کی طبیعتیں کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہیں کہ ہم سیدھی سادھی بات سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ انوکھی باتیں بھی ہوں، مثلاً ایک اچھا خاصا مرد معقول چور کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور اچھے خاصے چور کو مرد معقول ہونے یا بننے کا موقع نہ دیا جائے تو جناب بات یہ ہے کہ اگر میں چور ہوتا تو میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پہلی ہی چوری میں عین موقع واردات پر دھر لیا جاتا اور اس کے بعد جو سلوک ہوتا، اس سے فیض یاب ہو کر ایسا خاصا چور بن جاتا کہ لوگ مجھ سے تعویذ بھی مانگتے اور پناہ بھی۔ لیکن یہ باتیں چوروں جیسی نہیں فلسفیوں جیسی ہیں اور آپ یقین مانیے کوئی چور آج تک فلسفی نہیں ہوا۔ حالاں کہ میں درجنوں ایسے فلسفیوں

کے نام گنا سکتا ہوں جو صرف چور ہیں، لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس وقت جب کہ آپ کا سابقہ ایک چور سے ہے، آپ کا انجام فلسفی کے ساتھ ہو۔ اس لیے فلسفہ بالائے طاق اور چوری مقدم!

تو سوال یہ ہے کہ میں چور ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہوتا تو کیا ہوتا مہمل سی بات ہے۔ ہمارے ہاں کے اچھے خاصے پڑھے لوگ صاف و صریح باتیں سمجھنے سے معذور رہتے ہیں، چہ جائیکہ ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جائے کہ ایسا ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہونے کو تو سب کچھ ہو جاتا، لیکن بقول میرے ایک بنگالی دوست کے ''ہماری سمجھ نہیں آتا'' اس لیے میں اس بحث میں سر دست نہ خود پڑنا چاہتا ہوں اور نہ آپ کو درد سر میں مبتلا کرنا چاہتا ہوں۔

یہ باتیں میں نے محض احتیاط کے خیال سے بیان کر دیں، ورنہ میں جانتا ہوں آپ بہت سمجھدار آدمی ہیں اور جہاں کوئی بات نہ بھی سمجھتے ہوں گے وہاں دوسروں کو ہنستے دیکھ کر خود بھی ہنسنے لگتے ہوں گے، یا نادانستگی میں ہنسی آ جاتی ہو گی تو دوسروں کو خاموش دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہوں گے۔ آپ کے اس اصول یا عادت کے بڑے فوائد ہیں۔ اوّل تو سوچنے کی زحمت نہیں اُٹھانا پڑتی، دوسرے فعل اپنا ہوتا ہے اور ذمہ داری دوسروں کی۔ آپ بُرا نہ مانیں یہ باتیں ریڈیو ہی پر نہیں عید، بقر عید کی نمازوں میں بھی نظر آتی ہے۔ ایک دفعہ دو چور عید کی نماز پڑھ رہے تھے، فرض کر لیجیے۔ ان میں سے ایک میں تھا اور دوسرے آپ۔ ہم دونوں نہایت مقطع صورت تھے، اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جب مقطع صورت چور کم یاب تھے۔ آج کل ہر چور مقطع صورت ہوتا ہے اور آپ یوں بھی کہہ لیں تو غلط نہ ہو گا کہ ہر مقطع صورت چور ہوتا ہے۔ بہر حال ہم دونوں کو یقین تھا کہ دوسرا نیت باندھنے اور ہاتھ چھوڑنے سے واقف ہو گا۔ ہاتھ چھوڑنے اور باندھنے کا وقت آیا تو ہم دونوں نے انکھیوں سے ایک دوسرے کے ہاتھ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ دونوں کورے ہیں۔ نماز تو جوں توں ختم ہوئی لیکن سلام پھیرتے وقت میرا خیال ہے نہ آپ نظر آئے اور نہ میں۔ آج کا دن ہونے آیا، ہمارے آپ کی ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ اگر اس وقت آپ کہیں میری تقریر سن رہے ہوں تو میرا اسلام قبول فرمائیے۔

ظاہر ہے ترکیب نماز چرانے میں، میں نے آپ نے تامل نہیں کیا تو فرض کر لیجیے نمازیوں کی جوتیاں چرانے میں کب تامل کیا ہو گا۔ لیکن آپ نے نمازیوں کی جوتیاں اب تک

نہ چرائی ہوں تو میری رائے ہے کہ اب اس قسم کی حرکت بالکل نہ کیجیے گا۔ کیوں کہ مسجد سے جوتیاں چرانے میں آج کل بڑے خطرے ہیں۔ اس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ اس بے روزگاری اور بیداری کے زمانے میں اکثر لوگ جوتیاں چٹخاتے آتے ہیں اور پگڑیاں اُچھالتے جاتے ہیں۔ پھر مسجد میں خوف خدا اتنا غالب رہتا ہے کہ دنیا کا خوف اس کے سامنے بالکل ہیچ نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں جوتی چور پکڑا جائے تو بس سمجھ لیجیے اس کے دن پورے ہو گئے، تا آں کہ جوتا خور خدا کے اور جوتے مار کسی جج مجسٹریٹ کے قریب نہ پہنچ جائے۔

پھر سوچیے تو آج کل مسجد میں لوگ کیسی کیسی جوتیاں پہن کر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے موچیوں نے اسلحہ جات جنگ کے اضافہ کا تہیہ کر لیا ہے جس کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کی

ان جوتیوں کو دیکھ کر اکثر چوروں نے ارادہ کر لیا تھا کہ چوری بند کر کے فوج داری شروع کر دیں۔ ان جوتوں کے چرانے سے جوتوں کے مالک کی عزّت افزائی ہوتی تھی اور چوروں کی رُسوائی۔ چور کی چوری اور ہیرا پھیری دونوں سے آپ واقف ہیں۔ چنانچہ اب اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ جو لوگ اس خاص قسم کے جوتے پہنے ہوئے مسجد میں پائے جائیں ان کو نظر میں رکھا جائے اور فرصت کے لمحہ میں ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جس سے ان جوتیوں کی دیرینہ شکایات کی تلافی ہو جائے، اور ان لوگوں سے اس بات کی ضمانت لی جائے کہ آئندہ سے جوتے کے معاملہ میں وہ نیک چلن رہیں گے۔

ان جوتیوں پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان پر ریسرچ کرنا بڑا دلچسپ مشغلہ ہوگا۔ ان میں آپ کو ہر قسم ہر زمانہ ہر ناپ ہر نوعیت اور ہر برادری کی جوتیاں مل جائیں گی۔ اس جوتا گوہار میں اس زمانہ کے بھی جوتے ملیں گے جب جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔ بعض جوتیاں چرانے والوں کا بیان ہے اور اس میں آپ کی میری کوئی قید نہیں ہے کہ اکثر جوتوں کی چوری خاص خاص مصالح کی بنا پر بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض جوتے تو تیل اور دہی کے سبب سے کتّوں چیلوں اور گدھوں کے شکار ہو جاتے ہیں اور اس طور پر حفظانِ صحت کے مقاصد پورے ہوتے رہتے ہیں۔ بعض کی چوری اکثر ملّا اور سیانے کرتے ہیں، کیوں کہ ان کو اکثر چور کے خلاف فال

نکالنی پڑتی ہے۔ جوتے کے تلے میں ایک سوا گھونپ کر یہ فال نکالی جاتی ہے۔ آپ معاف فرمائیں بعض خاص مجبوریوں کی بنا پر میں اس فال کی ترکیب نہیں بتانا چاہتا۔

بعض جوتیاں گھر کی بیویاں چوری کرالیتی ہیں۔ بیان تو یہ کیا جاتا ہے کہ بعض بعض بیویاں میاں کو ہموار رکھنے کے لیے ان پر تعویذ گنڈے کا عمل کراتی ہیں، لیکن جو لوگ چور نہیں بلکہ شوہر ہیں ان کا بیان ہے کہ یہ جوتے حاصل تو اسی مقصد کے لیے کیے جاتے ہیں، لیکن عورتیں پھر عورتیں ہیں۔ اکثر عمل کرنے میں کہیں خامی رہ جاتی ہے تو یہ جوتیاں تعویذ گنڈے کا کام پورا کرنے کے بجائے بعض ایسے مقاصد بھی پورا کرنے لگتی ہیں جن سے کسی سعادت مند شوہر کو ہمدردی نہیں ہوسکتی۔

بعض خاص قسم کے جوتے کی چوری بعض خاص قسم کے پروفیسر کرتے ہیں اور جب کبھی غیر ممالک کے سیاح ہندوستان آتے ہیں تو یہ ان کے سر تھوپ دیتے ہیں اور ریسرچ کے زور پر یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ جوتے حقیقتاً پتھر جگ کے ہیں۔ پہلے پہل یہ پتھر سے تراش کر بنائے گئے تھے۔ امتدادِ زمانہ سے پتھر نے چمڑے کی نوعیت اختیار کر لی۔ دوسرے یہ کہتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ جوتے چمڑے کے تھے، لیکن لکد کوب حوادث سے اب پتھر کی نوعیت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ بہرحال ان جوتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پتھر چمڑے میں تبدیل ہوسکتا ہے اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ پتھر میں چمڑے کا قالب اختیار کرنے کی صلاحیت ہے، لیکن اسی سلسلہ میں ماہرین فن یہ بحث بھی اُٹھاتے ہیں کہ پتھر جگ پہلے تھا یا چمر جگ۔

پتھر جگ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اسٹون ایج کو کہتے ہیں۔ رہا چمر جگ، اس کا مفہوم بتانے سے زیادہ سوچنے سے واضح ہوتا ہے۔ میں خود آپ کو پتھر جگ اور چمر جگ کے مقدم موخر ہونے کی بحث میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا اور محض اس خیال سے کہ جن جوتوں سے متعلق یہ بحث چھڑے گی، ان کا خاصا ہے کہ نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے یا فوراً بعد ہی وہ خود چلنے لگتے ہیں۔ پاؤں میں چلتے رہیں تو کوئی ہرج نہیں، لیکن کبھی کبھی یہ جب خود بخود چلنے لگتے ہیں تو یہ وقت نہایت نازک ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم یا آپ کسی نتیجہ پر پہنچیں یہ (جوتے) خود پہنچ جاتے ہیں اور ہمارے آپ کے لیے یہ کچھ ٹھیک نہیں کہ اس موقع کے پیدا ہونے کا موقع دیں۔ لیکن اسے خوب

غور اور احتیاط سے سن لیجیے کہ میں آپ کو جوتی محفوظ رکھنے کا نہ کہ جوتی سے محفوظ رکھنے کا گُر بتا رہا ہوں۔ اچھا آیئے اس جوتی بیزار سے باز رہ کر میں آپ کو جوتی محفوظ رکھنے کا گُر بھی بتا دوں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ مسجد میں جائیں تو اپنی جوتی ہمیشہ ایسی جگہ چھوڑ یے جہاں آپ کی جوتیوں سے زیادہ بہتر جوتیاں آرام کر رہی ہوں۔ جوتی چور کو انتخاب کرنے میں سہولت ہوگی اور آپ کی جوتیاں جو یقیناً زیادہ جمہوری قسم کی ہوں گی محفوظ رہیں گی۔ گو اس کی ضمانت نہیں لی جاسکتی کہ جمہوری قسم کی ہر چیز آج کل محفوظ رہ سکتی ہے۔

آیئے لگے ہاتھوں میں آپ کو چوری کے صحیفۂ اخلاق کا بھی مطالعہ کرا دوں۔ گو زمانہ ایسا آگیا ہے کہ دوسرے معاملات کے مانند چوری کے صحیفہ اخلاق اور چور میں بہت بڑا تفاوت پیدا ہو گیا ہے۔ شاعروں کے مانند چوروں کی بھی بہت سی اقسام ہیں۔ لیکن ذرا توقف فرمایئے، یہ ریڈیو ہے، ممکن ہے ہماری آپ کی برادری میں بعض ایسے تنگ نظر اور بے وقوف چور بھی ہوں جو میری اس حرکت پر مجھ سے ناراض ہو جائیں کہ میں نے ان کو شاعروں سے کیوں تشبیہ دی۔ لیکن ان کے اطمینان کے لیے میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ میری نیت چوروں کی دل آزاری نہیں ہے، شاعروں کی ہمت افزائی ہے، اس لیے کہ بغیر چوری کے شاعری ناممکن ہے۔ چوری کے فروغ سے شاعری کا فروغ ہوتا ہے جیسے بے روزگاری کا فروغ بیداری سے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کسی ملک یا قوم کی بیداری کا معیار وہاں کی بے روزگاری ہے۔ غیر متمدن اقوام میں بے روزگاری نہیں پائی جاتی۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس قوم میں شاعر زیادہ پیدا ہو رہے ہیں وہاں چوری کا بازار یقیناً گرم ہوگا۔ لیکن معاف کیجیے گا، میں چوری کرتے کرتے ذرا بہکنے لگا ہوں۔ اس لیے اصولی باتوں پر بحث کرنے کے بجائے مثالوں پر اُتر آتا ہوں۔ آیئے ''جدیدیت'' کے کسی شاعر کو مدنظر رکھ لیں۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے دیوان کو چوروں کا عجائب خانہ بنادیا ہے۔ یہ دن رات اس فکر میں رہتا ہے کہ کن کن غریبوں نے کہاں کہاں اور کیسے کیسے الفاظ، فقرے، ترکیبیں، جملے، تشبیہ و استعارات استعمال کیے ہیں۔ یہ ان کو چرا لے گا، ان پر ڈاکا ڈالے گا۔ کبھی جیب کتر لیتا ہے، کسی عورت کے ناک کان سے کیل بالی کھسوٹ بھاگتا ہے۔ کسی بچہ کا زیور اُتار لیتا ہے، کسی عورت کی چادر کسی مردے کا کفن، کسی بوڑھے کا خلال، کسی مسخرے کی عینک، غرض جو

ہاتھ لگا اُچک لیا۔ گھر آ کر یہ سب کی کھتونی کرتا ہے اور اپنے عجائب خانہ میں جا بجا رکھتا جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ یہ مصر نہیں صرف چور ہے، اس لیے سرقہ کے صحیح عنوانات نہیں قائم کر سکتا۔ فرض کیجیے اسے انقلاب یا بغاوت کا علم بردار بننے کی ضرورت ہے، وہاں سے اپنے مطلب کی چیزیں اکٹھی کرنی شروع کر دے گا۔ آگ، خون، کفن، صور اسرافیل، ہڈی، مزدور، دریا، پہاڑ، قیامت، اژدہا، جھونپڑا، مذہب، ملا غرض سب کو لیے دیے چورا ہے پر عطائیوں کی مانند اناپ شناپ ہانکنا شروع کر دے گا۔ لیکن اس کو نہیں معلوم اسی آگ و اژدہے وغیرہ کے ساتھ سونے کی بالیاں، کمر کی لچک، زلفوں کی مہک، جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن بھی لپٹے لپٹائے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ اب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ بغاوت کا دیوتا صرف نفس کا بندہ ہے۔ بھوک سے بے تاب نہیں ہے، ہوس کا شکار ہے۔ تلوار کی نہیں چوڑیوں کی جھنکار سننا چاہتا ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر مزدور کو فاقہ سے نہیں بچانا چاہتا، بلکہ دوسروں کا سونا چھین کر مزدور کو طلائی زنجیر پہنانا چاہتا ہے۔

اب میں آپ کا تعارف شاعر چور سے کرانا چاہتا ہوں، لیکن اس کا موقع نہیں ہے۔ ابھی بہت سے چور باقی ہیں۔ شاعری شروع کی گئی تو بہت سے چوروں کا حق تلف ہو جائے گا۔ ریڈیو والوں کا بھی! ہاں جناب تو چوری کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ میں چور ہوتا تو کیا ہوتا، یہ بات جیسا کہ میں پہلے بتا آیا ہوں مہمل ہے۔ اس واسطے کہ دنیا میں کون نہیں چور ہے جو میرا چور ہونا تعجب یا دلچسپی کی بات ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ سب سے دلچسپ سوال یہ ہوتا کہ میں چور نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ سب سے پہلے تو یہ ہوتا کہ ریڈیو والوں کو مجھ سے یا مجھ ایسوں سے بالکل سروکار نہ ہوتا۔ ہم میں آپ میں کون شخص ایسا ہے جو کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی نظروں میں چور نہیں ہے۔ آپ اپنے میلانات، اپنے افعال، اپنے خیالات کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ ہر وقت چھوٹی بڑی چوری کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ کون باپ ہے جو اپنے بیٹے سے چوری نہیں کرتا۔ کون شوہر ہے جو اپنی بیوی کا چور نہیں ہے۔ کتنے دوست ہیں جو اپنے دوست کے چور نہیں ہیں۔ کتنے خدا کے قائل ہیں اور خدا کے چور نہیں ہیں اور کتنے خدا کے منکر ہیں اور اپنے انکار میں سچے ہیں۔ کیا آپ ہمیشہ وہی کرتے ہیں جو آپ کو کرنا چاہیے۔ ہم میں ہر شخص کسی نہ کسی حد تک وہ

ضرور کرتا ہے جو اسے نہ کرنا چاہیے تھا۔ وہ ان حقوق کو تلف کرتا ہے جو اپنی نسبت سے خود اسے حاصل ہیں اور ان حقوق کو بھی تلف کرتا ہے جو اس کی نسبت سے دوسروں کو حاصل ہیں۔

ہاں تو کیا ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کبھی کبھی اپنے عزیز ترین دوست یا رشتہ دار سے مشکوک یا اس کی طرف سے بے پروا ہو جاتے ہوں۔ اسی طور پر اور بہت سی باتیں ہیں جن کے آپ مرتکب ہوتے رہتے ہیں، لیکن اس کا تذکرہ دوسروں سے نہیں کرتے، بلکہ خود اپنے آپ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری اسی تقریر کو لے لیجیے۔ میں بہت سی ایسی باتیں کرنا چاہتا تھا جو مجھے کرنی چاہیے تھیں، لیکن دوسروں کے خیال سے یا اپنے آپ کو دماغ سوزی سے بچانے کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ مجھ سے اس بارے میں ریڈیو والوں سے جو معاہدہ ہوا ہے، میں نے اس کی کہاں تک پابندی کی ہے یا ریڈیو والوں کو مجھ سے جو کچھ توقعات ہیں، ان کو میں کہاں تک پورا کر سکا، یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو ہر شخص کو ہمیشہ پیش آتی رہتی ہیں۔ پھر واقعہ یہ ہے کہ اگر ان حالتوں میں کوئی چوری نہ کرے تو دنیا کا سارا طلسم ہی درہم برہم ہو جائے۔ ہر چوری اپنے کیے جانے یا چھپائے جانے کے لیے چور سے ذہانت، کاوش، ضبط و استقلال کا مطالبہ کرتی ہے اور اسی مطالبہ کے پورا کرنے اور کرتے رہنے میں دنیا کی ترقی مضمر ہے۔

لیکن جناب ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔ ریڈیو والے اس کی شکایت کریں گے کہ انھوں نے دعوت چور کو دی تھی، یہ مولوی کہاں سے برآمد ہو گیا۔ آپ چور کے اعترافات سننا چاہتے تھے، اس نے راہ نجات کی ورق گردانی شروع کر دی۔ میں خود بہت شرمندہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں چور ہوتا تو بہت کچھ کرتا، لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہم چوروں میں تعلیم کی بہت کمی ہے اور میں ریڈیو والوں کا دعوت نامہ پاتے ہی اس امر پر غور کرنے لگا تھا کہ مجھے چوروں کی ایک یونیورسٹی قائم کرنی چاہیے۔ لیکن بعض دوسری یونیورسٹیوں کے کام میں ایسا پھنسا کہ مجوزہ یونیورسٹی کو بالکل بھول گیا، اور اس وقت جب کہ وہ یاد آئی تو ہمارا آپ کا وقت پورا ہو چکا ہے، لیکن مایوس ہونے کی بات نہیں۔

چور زندہ چوری باقی!

●●●

اگر ڈاکٹر نہ ہوتے

اب سے دور ایک حکیم تھے، بے روزگار اپنے سے مایوس دوسروں سے بے زار۔ یہ دیکھ کر کہ وطن میں لوگ بیمار بھی پڑتے ہیں اچھے بھی ہوتے اور مر بھی جاتے ہیں، لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی ایک میں ان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انھوں نے وطن سے ہجرت کی اور دیار غیر میں پہنچ کر قسمت آزمائی پر آمادہ ہوئے۔ قضارا پہلا ہی مریض ان کے ہاتھوں اس دنیا سے چل بسا۔ ورثا اُن کو خبر کرنے آئے۔ انھوں نے بھی رسماً اظہار ہمدردی کیا، لیکن ان کی فرمائش یہ ہوئی کہ حضور والا ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ جو مریض جس طبیب کے علاج سے وفات پائے، اس کی تجہیز تکفین بھی اسی طبیب کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ طب کے قانون میں یہ دفعہ اس سے پہلے ان کی نظر سے نہ گزری تھی۔ مجبوراً یا اخلاقاً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میت کے گھر پہنچ کر غسل میت کے فرائض انجام دیے۔ کفن پہنایا اور میت کو تابوت میں رکھا۔ رسماً تابوت اُٹھانے میں ایک طرف کاندھا بھی دیا، لیکن اب جو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہر طرف کا کاندھا تو لوگ بدلتے رہتے ہیں ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ قبرستان بستی سے بہت دور واقع تھا۔ افتاں خیزاں وہاں تک پہنچے، میت کو قبر میں اُتارا، مٹی دی اور بڑی رات گئے گھر پہنچے۔

دوسرے دن جب کوئی مریض ان کے مطب میں آتا تو اس کا حال سننے سے پہلے پوچھتے، کیوں جناب آپ کا قبرستان کتنی دور ہے؟ ظاہر ہے یہ سوال ایسا نہ تھا کہ مریض یا اس

قبیل کے دوسرے لوگ ان سے مزید گفتگو کرتے۔ یہاں سے بھی پریشان ہو کر نکلے۔ اس درماندگی کے دوران میں ان کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو بظاہر نہایت بھلے مانس معلوم ہوتے تھے اور حکیم صاحب سے نہایت تپاک اور خندہ پیشانی سے ملے، بڑی شفقت فرمائی۔ نام اور پتہ پوچھا، انھوں نے مسکرا کر فرمایا۔ انسان مجھے فرشتہ کہتے ہیں اور فرشتے مجھے شیطان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں تم بڑی مصیبت میں مبتلا ہو۔ میں تم کو ایک ترکیب بتاتا ہوں، جب تمہارا سابقہ کسی مریض سے ہو تو دیکھنا اگر فلاں فلاں علامتیں موجود ملیں تو سمجھ لینا مریض جاں بر نہ ہوگا، اگر یہ باتیں نہ ہوں تو سمجھنا کہ مریض اچھا ہو جائے گا۔ یہ بہت خوش ہوئے، شہر پہنچے۔ ایک مکان میں مطب کھول کر بیٹھ گئے۔ اتفاق دیکھیے صبح کے وقت پہلے ہی جس مریض سے سابقہ پڑا، اس میں وہ تمام علامتیں ملیں جو اُن کے دوست نے بتائی تھیں۔ انھوں نے مریض سے فوراً کہہ دیا کہ علاج کرانے سے کوئی حاصل نہیں، تم جلد ہی مر جاؤ گے۔ یہ گیا تو دوسرا مریض آیا۔ اس میں بھی وہی علامتیں نظر آئیں، اُسے بھی وہی بشارت دی۔ غرض ان غریب کے پاس وہی لوگ آئے جو مرض سے جاں بر نہ ہونے والے تھے۔ جن جن کو انھوں نے بشارتیں دی تھیں، وہ جان بحق بھی ہوتے رہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی شہرت ایسی عام ہوئی کہ مریض تو درکنار، تندرست بھی ان کے پرچھائیں سے بھاگنے لگے، اور یہ بے چارے جہاں کے تہاں رہ گئے۔ یہ واقعہ بجائے خود صحیح ہو یا نہ ہو، اس کے دلچسپ ہونے میں یوں بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اس میں شیطان کا دخل ہو اور شیطان اور ڈاکٹر جب یکجا ہوں تو تندرست اور مریض کا حشر یکساں ہوتا ہے۔ تندرستوں کے ساتھ شیطان کو وہی دلچسپی ہوتی ہے جو مریضوں کے ساتھ ڈاکٹروں کو ہوتی ہے۔

آپ کو تو معلوم ہوگا بعض ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں جو مریض کو صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کتنے دنوں میں اس جہاں سے گزر جائے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آج شب کا موضوع گفتگو یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر یا طبیب نہ ہوں تو کیا ہو۔ میں نے اس سلسلہ میں آپ کو کچھ باتیں سنائیں، جو بظاہر صرف لطیفہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن لطیفہ بجائے خود زندگی کے بعض حقائق کی صرف ایک دلچسپ تعبیر ہوتا ہے۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا بعض ڈاکٹروں کا برزخ ہی ایسا ہوتا ہے، جن کی پیشانی پر مریض کی موت لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تو اکثر اپنے تمدن کا وہ دور اچھا معلوم ہوتا ہے جب ہر شخص ہر کام کے لیے موزوں نہیں خیال کیا جاتا تھا، اور سوسائٹی اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ہر شخص جو پیشہ چاہے اختیار کر لے۔ بعض ڈاکٹروں کو آپ دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ ان کو مطب کے بجائے اسٹاک ایکسچینج پر بیٹھنا چاہیے تھا یا مشرقی لندن میں قہوہ خانہ کی دُوکان رکھنی چاہیے تھی۔ ایسے ڈاکٹروں کو دیکھ کر اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص کبھی کوکین بیچنے میں سزایاب ہو چکا ہے یا بچے یا مویشیاں چرا لے جاتا ہے۔ بجائے خود اپنے آپ کو علاج کرانے کے لیے تو درکنار میں یہ بھی کبھی نہ گوارا کروں گا کہ ایسا شخص میرے قریب آ کر بیٹھے۔ ایسوں سے مردہ شوئی، گورکنی یا میت برداری کا کام لیا جانا بالکل مناسب ہے اور یہ کچھ ڈاکٹروں ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہر پیشہ میں ایسے لوگ ملیں گے جو اس پیشہ کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہوتے۔ بعض پروفیسروں کو آپ ایسا پائیں گے جو نوجوانوں کو علم و اخلاق سے روشناس کرانے کے بجائے امرا کے تفنن طبع کا زیادہ موجب بن سکتے ہیں، جن کو لائبریری کے بجائے نخاس میں زیادہ طمانیت خاطر نصیب ہوتی ہے۔

لیکن یہاں ڈاکٹروں کے ہونے نہ ہونے کا سوال ہے، پروفیسروں کے انجام سے بحث نہیں۔ میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں اور ممکن ہے عرض نہ کر چکا ہوں تو آئندہ کبھی عرض کروں گا کہ سائنس کی ترقی نے ڈاکٹری کے فن کو جتنا نفع پہنچایا ہے اس سے زیادہ نقصان ڈاکٹر کو پہنچایا ہے۔ اب ڈاکٹر اپنی طبیعت یا اپنے صحیح وجدان پر نہ بھروسہ کرتا ہے اور نہ اس چیز کی مشق بہم پہنچانے کی اہمیت کا قائل ہے۔ وہ آلات پر بھروسہ کرنے لگا ہے یا ان پیٹنٹ دواؤں پر جن کو تجارت نے فروغ دے رکھا ہے۔ وہ فوٹو کا عادی ہے اصل کے اسرار سے ناآشنا ہو گیا ہے۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹر کی ذہنیت کا تجزیہ کیا جائے، اگرچہ ایسا کیا جانا ممکنات سے ہے تو معلوم ہوگا کہ اس کو زیادہ سے زیادہ مرض سے دلچسپی ہوتی ہے، مریض سے وہ بہت کم ہمدردی کرتا ہے۔

بقول آپ کے یا اپنے دلّی کے ایک مشہور طبیب کے، اصلی طبیب اور عطائی میں فرق یہ ہے کہ طبیب اور عطائی دونوں مریض کی جان لیتے ہیں، لیکن ایک قاعدہ سے اور دوسرا

بے قاعدہ۔ اس مقولہ کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور یہ کچھ طبابت ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہمارے تمدن کا تمام تار و پود اسی قاعدہ کے لحاظ یا عدم لحاظ پر منحصر ہے۔ ایک بادشاہ اور لٹیرے میں کوئی فرق نہیں ہے، سوا اس کے کہ ایک باقاعدہ لٹیرا ہے اور دوسرا بے قاعدہ بادشاہ۔ اسے بھی جانے دیجیے۔ اس قاعدہ اور بے قاعدہ کے جھگڑے نے ہم کو اپنے خالق سے بھی یگانہ یا بے گانہ بنا رکھا ہے۔ کوئی شخص خدا کے رحم و رحمت کا اس وقت تک مستحق نہیں سمجھا جاتا، جب تک کہ وہ اپنے آپ کو کسی مسلک سے وابستہ نہ کر لے۔ حالاں کہ جہاں تک میری محدود بصیرت میری رہبری کرتی ہے، میں یہ سمجھتا ہوں، خدا اپنی مشیت کو پورا کرنے کے لیے نہ خود کسی مسلک کا پیرو ہے اور نہ اس کی پروا کرتا ہے۔ ہاں تو بات ڈاکٹروں کی تھی یعنی یہ نہ ہوں تو کیا ہو۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہو کہ قاعدہ اور بے قاعدہ مرنے کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ ڈاکٹروں میں ایک قوم یا ماہرین خصوصی کی نکل آئی ہے۔ جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں ہے جس کے مخصوص معالج نہ موجود ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے آپ فرض کر لیجیے کہ آپ کا دماغ بالکل صحیح ہے اور آپ سچائی سے کام لیں تو فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خود اس کا احساس ہوگا۔ بہر حال آپ کسی امراض دماغ کے ماہر کے ہاں چلے جائیے۔ وہ بہت ساری ترکیبیں کر کے آپ پر یہ حقیقت واضح کر دے گا کہ آپ کے دماغ میں فتور ہے۔ اس کے پاس آلات ایسے ہوں گے، اس کی شہرت ایسی ہوگی اور آپ خود کچھ ایسے نیاز مند ہوں گے کہ آپ کو فوراً اس کا یقین ہو جائے گا کہ آپ کی عقل میں فتور ہے۔ اسپشلسٹ ہونا اور ڈاکٹر ہونا مختلف چیزیں ہیں۔ آپ کو ایک دفعہ اس امر کا شک ہوا نہیں، اور آپ ہاتھ سے بے ہاتھ ہوئے نہیں۔ شک کرنا انسانی فطرت کا نہایت آسان اور محبوب وظیفہ ہے۔ جس کے بارہ میں بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا علاج ارسطو اور افلاطون کے پاس بھی نہ تھا۔ گو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جو چیز ارسطو اور افلاطون کے پاس نہ تھی وہ کسی دیہاتی اسکول کے مدرس یا اسی قبیل کے بعض دوسرے لوگوں کے پاس بھی نہ ہو۔

میرے ایک دوست ہیں جو اکثر کہا کرتے ہیں کہ تم کو کوئی آزار نہ ہو تو ڈاکٹر کے ہاں چلے جاؤ۔ جس طرح کوئی نامعقول لیکن قابل وکیل اپنی بے پناہ جرح سے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دیتا ہے، اسی طرح ایک ڈاکٹر اپنی افتادِ طبع اور اپنے آلات کے زور سے آپ کو مریض قرار

دے سکتا ہے، اور آپ اپنے مرض کے قائل بھی ہو جائیں گے۔ایک ڈاکٹر ہیں جن سے مجھے بڑی محبت ہے، بحیثیت ڈاکٹر کے نہیں بحیثیت ایک انسان کے۔آپ کے ایک پھنسی ہو جائے اور آپ ان کے پاس جائیں تو وہ پھنسی کو اس نگاہ سے دیکھیں گے جس طرح کوئی مراقی اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔نہایت پراسرار اور رازدارانہ ہمدردی کے ساتھ دریافت فرمائیں گے، آپ کبھی جذام یا اس قبیل کے دوسرے مرض میں تو نہیں مبتلا ہوئے ہیں اور آپ نہیں تو آپ کے اباواجداد تو اس مرض کے شکار نہیں تھے۔زکام کی ابتداوہ نمونیا سے اور کھانسی کی دق سے کریں گے۔ دواؤں کے بارہ میں انھیں یقین ہے کہ مقررہ مقدار سے کم سے کم دس حصہ کم دینا چاہیے۔اس سے دوا کی تاثیر اور مریض وڈاکٹر دونوں کی عاقبت دس گنا بڑھ جاتی ہے۔اُن کا خیال ہے کہ چالیس سال میں ہر انسان کا انتقال ہو جاتا ہے، اس کے بعد اگر وہ زندہ رہتا ہے تو یہ اس کا قصور ہے۔اس کا علاج بھی وہ اسی اصول پر کرتے ہیں یعنی مرض تو کیا دور ہوگا، سکرات کو آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک دن کھانا کھا کر میں فوراً ہی لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔فرمایا، دیکھیے ایسی غلطی نہ کیا کیجیے۔کھانا کھانے کے بعد دوران خون تیز ہو جاتا ہے اور چالیس سال کی عمر میں شریان سخت ہو جاتی ہیں۔بہت ممکن ہے کوئی شریان پھٹ جائے اور آپ پر فالج گر پڑے۔میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب مجھ میں اس کی علامتیں آپ کو نظر آ رہی ہیں۔فرمانے لگے، تم لوگ تو ہو احمق، مرض کے اس وقت قائل ہوتے ہو جب علامات پیدا ہو جائیں۔ڈاکٹر امکانات کا قائل ہوتا ہے اور اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ہر شخص طبعاً مریض ہوتا ہے، میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، جیسے ہر شخص طبعاً فانی۔اس پر ڈاکٹر صاحب خفا ہو گئے۔میں نے ان کی خفگی کی تو پرواہ کی، لیکن سر پھٹنے سے زیادہ شریان پھٹنے سے ڈرنے لگا ہوں!

لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ میری بے تکی باتوں سے آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔میں کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر نہ ہوں تو موت آسان اور زندگی دلچسپ ہو جائے۔میں ڈاکٹروں سے بدظن ہوں ڈاکٹر کا قائل ہوں۔آپ نے دیکھا ہوگا بعض لوگ نہایت ایمان داری کے ساتھ قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔اس کے بعد وکلا اس کو بہکانا شروع کرتے ہیں، اور کہتے

ہیں کہ پاگل بن جا۔ وہ پاگل بن جاتا ہے پھر بھی پھانسی کی سزا ملتی ہے۔ سزا اس کو ہر حال میں ملتی، لیکن وکیلوں کے بہکانے سے اس نے جس طرح اپنے ضمیر کو مسخ کیا، آخری وقت میں اس کا اثر اس کے نفس مطمئنہ پر نہایت بُرا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ پہلے طبیب کے پیشہ کا محرک خدمت خلق کا جذبہ ہوتا تھا، اب سائنس کا۔ ڈاکٹروں میں دواؤں سے علاج کرنے والوں کے علاوہ سرجن بھی ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ ڈاکٹری کے اس شعبہ نے امراض کے دفعیہ میں بڑے کارنمایاں کیے ہیں۔ ان سے منحرف ہونا ہی بڑی ناانصافی ہے۔ اس فن کی ترقی انسان کی راحت اور عافیت کے لیے بہت نیک فال ہے، لیکن افسوس ہے کہ مخصوص مہارت کے جنون نے اس شعبہ میں بھی خطرہ کے امکانات پیدا کردیے ہیں۔ اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ خود ہم آپ اس نوعیت علاج کے اس درجہ قائل ہوگئے ہیں کہ دوا دارو کے زیادہ قائل نہیں رہے۔ ذرا ذرا سی تکلیف میں بھی اب آپریشن ناگزیر سمجھا جانے لگا ہے۔ گویا فوج وصنعت وحرفت کی مانند طریقۂ علاج بھی مشینی ہوگیا ہے، یعنی آلات اور مشین کو ہاتھوں کے کام پر ترجیح دی جانے لگی ہے۔ اس میں شک نہیں جراحی کے وسیلہ سے ہم بعض تکالیف کا نہایت آسانی کے ساتھ اور نہایت موثر طریقہ پر قلع قمع کرسکتے ہیں، لیکن جس طرح فوج اور صنعت وحرفت کے طریقوں کو مشین آشنا کردینے سے انسانی وجدان یا انسانی جوہروں کا خاتمہ ہونے لگا ہے، اسی طرح فن جراحت یا سرجری نے ذہن کی اُپج کو مسخ کرنا شروع کردیا ہے۔

لیکن یہ باتیں گو جزوی حیثیت رکھتی ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کا ازالہ کرسکتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو بھی خوب محسوس کرتے ہیں کہ اب ہماری زندگی بحیثیت مجموعی مشین آشنا ہوگئی ہے اور انسانیت کا عنصر انسانی زندگی سے رفتہ رفتہ ناپید ہونے لگا ہے۔ غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کے لیے اس وقت دنیا میں کیا کچھ نہیں ہورہا ہے۔ ان کی حالت بہتر بنانے کے لیے زندگی کے تمام قدیم نظریے یا رویے یک لخت ویکسر منقلب کردیے گئے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے، لیکن میرے کہنے سے کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کیجیے کہ یہ سارا نظام کس جذبہ کے ماتحت بروئے کار آرہا ہے۔ اس نظام نے افلاس وغربت کو فنا کردینے کا تو ضرور عزم کرلیا ہے اور نظریہ کے اعتبار سے یہ کتنا ہی مہتم بالشان اور ضابطۂ عمل کے اعتبار سے کتنا ہی جامع اور

مکمل کیوں نہ ہو، غریبوں اور بے کسوں کی دل آسائی کہاں تک ہوتی ہے۔ ان کی حالت بہتر و برتر بنانے کے لیے زندگی کے تمام قدیم رویے یک لخت دیگر منقلب کیے جا چکے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے، لیکن مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تمام انقلاب و ہیجان میں غربت و افلاس کے دور کرنے کی جتنی فکر کی جا رہی ہے اتنی فکر غریب اور مفلس کے لیے روا نہیں رکھی جاتی۔ غربت اور افلاس کے خلاف بغاوت اور چیز ہے اور مفلس و غریب کی دست گیری و دل آسائی اور چیز۔ مشین سے قلوب بدلتے جا رہے ہیں، گداز نہیں ہوتے۔ مطلب یہ کہ وقت پورا ہو گیا اور مختصر یہ کہ ڈاکٹر ہوں تو بُرا اور نہ ہوں تو اور بُرا!

●●●

شاعر ہونا کیا معنی رکھتا ہے

سیدھا سادھا جواب تو یہ ہے کہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ گو معنی نہ رکھنا بھی بعضوں کے نزدیک بڑی پُرمعنی بات ہے۔ ایسوں سے نباہ بڑا مشکل ہے، لیکن ان میں مجھ میں فاصلہ اتنا ہے کہ خواہ مخواہ ڈرنے کے بھی کوئی معنی نہیں۔

شاعری کی تقسیم بڑی مشکل ہے اس کو جنس کے اعتبار سے نہیں تقسیم کر سکتے۔ اس لیے کہ اس کی جنس ہمیشہ مشتبہ رہی ہے۔ جوان بوڑھے کے اعتبار سے بھی تقسیم نہیں کر سکتے، کیوں کہ آج کل کا شاعر منہ زور ہونے کے اعتبار سے جوان خیالات سے بوڑھا اور اعمال کے اعتبار سے کچھ غیر جانب دار سا ہوتا ہے، اور یہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے آپ کا وقت ضائع کرنے کی کوشش کی جائے۔

ایک تقسیم جثہ اور حلیہ کے اعتبار سے کی جا سکتی ہے، لیکن اُس میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ آپ کو جثہ اور ہر حلیہ کے شاعر ملیں گے۔ ایسے شاعر بھی پائے گئے ہیں جن میں عرض وطول لیے حجم نہیں، اور ایسے بھی جن میں حجم ہی حجم ہے، طول وعرض کا گزر نہیں۔ معلوم نہیں آپ آئن اسٹائن کے مشہور ''نظریۂ اضافیت'' سے واقف ہیں یا نہیں۔ یہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں خود واقف نہیں ہوں۔ آپ بھی واقف نہ ہوں تو بڑی سہولت ہوگی، یعنی نظریہ تو رہا ایک جگہ، ہم آپ ایک دوسرے سے خوب واقف ہو جائیں گے۔

آئن اسٹائن کے ''نظریہ'' کی ضمن میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ فاصلہ اور رفتار کے اعتبار سے طول وعرض کا تصور بدل جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے بعض ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو اپنے اشعار کچھ اس دُھن سے پڑھتے ہیں کہ آپ ان کے صحیح رقبہ کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک شاعر کو غزل اس طور پر پڑھتے دیکھا ہے گویا غزل کے معنی عورتوں سے بات کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ ایک XB انجنوں پر دانت پیسنے کے ہیں۔

اچھا آیئے ذرا سنجیدگی سے اس مضمون کی ''تقطیع'' کر ڈالیں۔ یہ کوئی اندیشہ ناک بات نہیں ہے، بشرطیکہ سنجیدگی اپنی ہو اور تقطیع دوسروں کی، دنیا میں ہر شخص کھلونے کھیلتا ہے۔ کھلونوں اور کھلاڑیوں کا شمار نہیں۔ شاعر الفاظ سے کھیلتا ہے، مصور رنگ اور خط سے، مجسمہ تراش پتھر سے، رقاص حرکت سے، سیاست داں اقوام سے، لیڈر جہلا سے، یونیورسٹیاں تعلیم یافتوں سے، تعلیم یافتہ بیکاری سے، بیکاری انقلاب سے، انقلاب زندہ باد سے۔

خود الفاظ کی دنیا بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اور اس میں ہمارے شاعر کو بہت کچھ دخل ہے۔ الفاظ کی اہمیت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ ''تعزیرات ہند'' اور نقشِ سلیمانی دونوں کا مدار اسی پر ہے.... قانون اور تعویذ سے کون محفوظ رہ سکتا ہے۔ تعزیرات ہند کی رو سے سزا ملتی ہے۔ نقشِ سلیمانی سے محبوب۔ الفاظ کو معنی سے کیا نسبت ہے اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ خود الفاظ کو کیسی جامعیت نصیب ہے اور ہم آپ اس سے نت کیسے نئے نئے شگوفے کھلایا کرتے ہیں۔

شاعر کا سارا کھیل الفاظ کا ہے۔ اس کھیل کو ہمارے شعرا نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ میں وہ باتیں پیدا ہوگئی ہیں جو کبھی معنی میں نہیں تھیں۔ پہلے معنی کے لیے الفاظ کی تلاش تھی، اب الفاظ تلاش کر لیجیے، معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ کبھی معنی کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ بڑی ریاضت، بڑی مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی۔ اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں۔ ان کو ادھر اُدھر کرتے رہیں، ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے اور جو بچ رہیں گے ان کو سامعین پورا کر دیں گے۔

آج کل کے بیش تر شاعروں کو صرف ''الفاظ'' یاد ہیں جن کو وہ جس طرح چاہتے ہیں، ترتیب دیتے ہیں۔ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں جب بحروں اور ترکیبوں کی چرخ پر خود بخود

الفاظ آ جاتے ہیں، جن کو لانے میں شاعر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی سامعین کی شعریت خود ہی پیدا کر لیتی ہے۔ سننے والوں میں بھی "شاعر" موجود ہوتا ہے۔

یہاں "شاعر" سے مراد کوئی خاص شخص نہیں ہے۔ جس کا ایک تخلص ہو یا ایک خاص طرح کا حلیہ یا مشتبہ قسم کی صحت بلکہ وہ شعریت ہے جو سننے والے میں موجود ہوتی ہے۔ حقیقی شاعر اپنے سامعین کے دل ودماغ کے تاثرات کو بھی اپنے جذبات یا تخیلات کا جزو بنالیتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو پھر کسی دواساز یا شاعر میں فرق کیا رہ جائے جو ہمیشہ چند ادویات ملا کر عرق، سفوف یا معجون تیار کر سکتا ہے۔ آپ نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو شاعر نہیں صرف دواساز ہوتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے غزل ہی نہیں بلکہ ایک نشست میں پورا دیوان مرتب کر دیں گے۔ ان کے اشعار ملکۂ شعر سازی کے اتفاقی یا میکانکی نتائج ہوتے ہیں۔

اب تصور کیجیے ایسے شاعر کا جسے اطلاع ملی ہے کہ فلاں مقام پر مشاعرہ ہونے والا ہے اور مصرعۂ طرح یہ ہے۔ فرض کر لیجیے وہ ایسے خوش قسمتوں میں نہیں ہے، جس کو تیسرے درجہ کا بھی سفر خرچ مل سکتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر "مصرعۂ طرح" پر زور لگانا شروع کر دے گا۔ اس درمیان میں اس کو مطلق یہ فکر نہ ہوگی کہ بیوی بچوں کے لیے پیٹ بھرنے کو روزی اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسر ہے یا نہیں۔ نہ دن کو دن سمجھے گا نہ رات کو رات۔ بھوک پیاس سے کوئی علاقہ نہیں، دوست دشمن سب سے بے نیاز، تخیل کے زور سے آسمان پر چڑھتا اور پاتال میں اُترتا رہے گا۔ شفق سے عبیر، سپیدۂ سحر سے کافور اُڑاتا، چاند سورج سے رُخسارِ محبوب کی سیر کرتا، ثریا کی مانگ سے افشاں چراتا، زہرہ کی تان اُڑاتا، مریخ سے گھبراتا، قاضی فلک سے گلچھپ کرتا، فرشتوں سے آنکھ ملاتا، حوروں کو ورغلاتا، رضوان سے لڑتا، مالک سے کتراتا، قلم سے لکھتا، لوح کو پڑھتا، طوبیٰ وسدرہ پر جھولتا، کوثر وتسنیم میں ڈبکیاں لگاتا، جبرئیل کو صید زبوں بناتا، اسرافیل سے سرگوشیاں کرتا، میکائیل سے دانہ بدلتا، عزرائیل سے بچتا، پرتوِ خور سے شبنم کو فنا کی تعلیم دیتا، یک بہ یک زمین پر اُتر آتا ہے اور وہاں کبھی خاک سے پوچھتا ہے کہ اے لئیم! تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے، لالہ وگل میں نمایاں ہونے سے جو صورتیں بچ رہی تھیں ان سے آداب وتسلیمات کرتا قارون نے راستہ میں جو خزانہ لٹایا تھا، اسے ٹھکراتا، کسی سوختہ ساماں کو فلس ماہی سے شمع روشن

کرنے کی ہدایت دیتا، ہر موج میں جو صد حلقۂ کام نہنگ ہیں، اُن میں قطرہ کو گہر بنتے یا بگڑتے دیکھتا، عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کرتا، ساحل کو سفینہ اور سفینہ کو ساحل سے اور دونوں کو سبک ساران ساحل سے ٹکراتا پھر اپنے کرایہ کے مکان میں آجاتا ہے، جہاں اس کی غزل تیار ہو رہی ہے اور بیوی بچے فاقہ کر رہے ہیں۔

یہاں کی وقت بھی کچھ کم نہیں، شعر ہے کہ کسی طرح اپنے پاؤں کی ہاتھ پر کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ کبھی لیلیٰ ملتی ہے، تو مجنوں بھاگے جاتے ہیں۔ فرہاد قابو میں آتے ہیں تو جوئے شیر غائب۔ حضرت موسیٰ سے نیاز حاصل ہوتا ہے تو تجلی طور پر پتہ نہیں۔ رود نیل تک رسائی ہوتی ہے تو فرعون ہاتھ نہیں لگتا۔ محمود ملتے ہیں تو ایاز غیر حاضر۔ محبوب بے حجاب نظر آتا ہے تو رقیب مسلح ملتا ہے۔ بہار آئی تو زنجیر نہیں ملتی۔ ہجر میں مرغ سحر نہیں ملتا۔ تو وصل میں موذن حائل ہو جاتا ہے۔ مے خانے تک رسائی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساقی مہوش کے بجائے لٹھ بند والنٹیر موجود ہیں۔ عالم وحشت میں صحرا کی خاک چھاننے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کو ترقی دینے کے لیے مرغیوں اور مویشیوں کو بسا دیا گیا ہے۔ داور محشر سے نپٹنا چاہتا ہے تو جمعیت اقوام معترض ہوتی ہے۔ ان سب سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں تو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کوئی حرف تقطیع سے گر رہا ہے۔ کہیں الف بڑھ گیا ہے، کہیں ی دب گئی ہے۔ ایک طرف روزمرّہ کا منہ سوجا ہوا ہے تو دوسری طرف محاورہ بپھر گیا ہے۔ زحافات میں تذبذب ہے تو مصرعوں میں شتر گربگی۔ کہیں فصاحت سسک رہی ہے تو کہیں بلاغت غرّا رہی ہے۔ بندش کو سنبھالتے ہیں تو ترکیب کی چولیں ڈھیلی ہوئی جاتی ہیں۔

ان دشواریوں سے کسی نہ کسی طرح نجات ملتی ہے تو غزل لے کر مشاعرہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ بہلی میں سوار، نزلہ زکام میں مبتلا، فاقہ کرتے، سردی سے اکڑتے مشاعرہ پہنچے۔ جلسہ شروع ہوا۔ ایک نے مصرعہ اُٹھایا، سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے برسات میں کسی کے بگڑے ہوئے منہ زور دبے لگام ریڈیو سیٹ پر ماسکو سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک صاحب کی باری آئی جن کا لہجہ نکیرین کا اور شاعری عذاب قبر سے مشابہ تھی۔ پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے

معذوری ظاہر کی، جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے سے گریز کر رہے ہیں۔ لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکالا جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد سے اب تک میونسپلٹی کے تمام اندراجات فوتی و پیدائش موجود ہیں۔ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند ہوا۔ اتنے میں کسی من چلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا۔ دوسرے نے شامیانے کی طنابیں کاٹ دیں۔ جناب صدر سکریٹری مشاعرہ، شعرا، مصرعہ طرح، سب کے سب شامیانے کے نیچے گل حکمت ہو گئے۔

یہ تو ہوا شاعر ہونا۔ اس سے زیادہ عبرت انگیز شاعر کا میزبان ہوتا ہے۔ شاعر ہمیشہ مشاعرہ کو بُرا بھلا کہتا آتا ہے، لیکن مشاعرہ پر جان دیتا ہے۔ میزبان کو سب سے زیادہ احتیاط اس امر کی رکھنی پڑتی ہے کہ مہمان کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ برف پڑ رہی ہو تو اسے نمونیا کا اندیشہ نہیں، آگ برس رہی ہو تو اُسے لو لگنے کا خوف نہیں، لیکن اس کی توہین ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ میزبان کو شاعر کے عجیب و غریب معمولات ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی، بلکہ اس کے اناپ شناپ اشعار بھی سننے پڑتے ہیں۔ اس کو داد اس طور پر دینی چاہیے کہ ایسے اشعار نہ اب تک سنے گئے نہ آئندہ اس کی توفیق ہوگی۔ شعر سننے اور داد دینے کے خاص خاص آداب مقرر ہیں۔ اوّل تو فرمائش اس طور پر کیجیے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کی فرزندی میں دینے جا رہا ہے اور شرم، خوف اور تذبذب کی وجہ سے اٹک اٹک کر گفتگو کرتا ہے یا پھر قرض کے بہانے خیرات مانگ رہا ہے۔

اس کے بعد موصوف ''مصرعہ اوّل'' پڑھیں گے۔ اسے آپ اُٹھائیں، یعنی دُہرا دیں۔ آپ کے بعد ممدوح اس مصرعہ کی تکرار کریں گے اور معاً دوسرا مصرعہ پڑھیں گے۔ ''مصرعہ ثانی'' کا ایک تہائی ختم ہوتے ہی آپ کو اپنی آنکھ کھول کر منہ پھاڑ لینا چاہیے۔ دو تہائی پر کلمات تحسین ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیے اور بقیہ تہائی کے ختم ہونے سے ذرا پہلے آہ یا واہ کر کے لوٹ جائیے اور ہوش میں آنے سے پہلے ہی مکرر پڑھنے کی فرمائش کیجیے۔ اس طور پر کوئی دو درجن شعر سنیے اور بغیر ستائے یا دم لیے چلم بھرنے یا پان لینے گھر میں چلے جائیے۔ مجھے اس قسم کی سعادتیں اکثر نصیب ہوئی ہیں۔

مگر بدنصیبی سے مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ میں لکھا ہوا مصرعہ بھی آنکھ سے دیکھ کر اکثر پہلے ہلے میں غلط پڑھ جاتا ہوں، چہ جائیکہ مصرعہ اُٹھانے کے سلسلہ میں اسے سنتے ہی دُہرادوں۔ میری اس کمزوری سے اکثر شعرا واقف ہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ انھیں اپنا مصرعہ بھی خاصا عزیز ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے معذور سمجھ کر مصرعہ اُٹھانے سے معاف کر دیا گیا ہے۔

بدنصیبی سے ایک بار اپنے ایک دوست سے ملنے گیا۔ ان کے ہاں ایک اور ''بزرگ'' بیٹھے ملے۔ دوست نے پذیرائی کچھ غیر معمولی مسرّت سے کی۔ میرے بیٹھتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے زنان خانہ میں چل دیے کہ یہ فلاں شاعر ہیں۔ آپ ان کا کلام سُن کر بے حد مسرور ہوں گے۔ میں کچھ کہنے سننے بھی نہ پایا تھا کہ شاعر نے آداب وتسلیمات وخلوص و احترام کے ایسے پینترے شروع کر دیے کہ میں کچھ نہ کر سکا اور انھوں نے اپنی بیاض کی مشین گن مری طرف کر دی۔ پہلے تو ڈر کے مارے چپ رہا، لیکن ان کی آنکھوں میں طیش ولجاجت کے باری باری کچھ ایسے آثار ملے کہ داد دینے کے لیے سربکف ہوگیا۔ وہ مصرعہ کے دو چار ہی الفاظ پڑھ پاتے کہ میں جلدی سے انھیں کو دُہرانے لگتا۔ انھوں نے پھر سے مصرعہ شروع کیا اور میں نے پھر سے انھیں الفاظ کو دُہرانا شروع کر دیا۔

کئی دفعہ ان کا اسٹارٹ (ابتدا) بگڑا تو ایک دفعہ الف ہی ہو گئے۔ جھلا کر بولے:

''حضرت مصرعہ کو تو ختم ہونے دیجیے۔''

میں نے بھی مری ہوئی آواز میں کہا۔

''قبلہ پورا کر لیجیے۔''

انھوں نے مصرعہ پڑھ کر میری طرف دیکھا تو میں نے جہاں پہلا فقرہ ختم کیا تھا، اُس کے آگے کا فقرہ نادانستہ طور پر تھوڑی ترمیم کے بعد پڑھ دیا۔ انھوں نے چیں بجبیں ہو کر صحت کر دی۔ میں نے بھی عرق عرق ہو کر صحت کر لی۔ ان کو اطمینان نہیں ہوا، اس لیے انھوں نے پورا مصرعہ پڑھ دیا۔ میں نے بھی پڑھ دیا، لیکن ذرا رُک رُک کر، جس کی وجہ سے نظم نثر میں تبدیل ہوگئی۔ میرے اس اضطراری قصور پر انھوں نے ایسا نعرہ لگایا کہ میں وہاں سے بھاگا اور میزبان باہر نکل آئے۔

یہ سب تو ہوا، لیکن اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر یہ بات کیا ہے کہ شاعر اور مشاعرہ ہماری زندگی اور ادب میں اتنا رچ گیا ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے یہ اسی کا فیضان ہو کہ ہم دوسری اہم تحریکوں کو بھی ''مشاعرہ'' ہی سمجھنے لگے ہیں۔ وہی اناپ شناپ خیالات، جن کو کبھی رقص کر کے، کبھی رو کر اور کبھی چیخ کر پیش کرتے ہیں۔ کسی کو گالی دے دی، کبھی اپنا قصیدہ پڑھ دیا۔ خود جی میں خوش ہوئے، دشمنوں کو ہوشیار یا بدگمان کیا۔ اپنوں نے داد دی، دوسروں نے ڈنڈا سنبھالا۔ مشاعرہ سے اُٹھے تو یہ سمجھا کہ سارے جہاں کو زیر و زبر کر دیا ہے۔

●●●

ایم۔ایل۔اے ہونے کے کیا معنی ہیں؟

دُنیا میں جب قابل آدمیوں کی تعداد زیادہ اور خوراک کم ہو جاتی ہے تو ہر چھوٹی بات بڑی اور بڑی چھوٹی معلوم ہونے لگتی ہے، اور ہم اس کے درپے ہوتے ہیں کہ کوئی ایسی بات کہیں کہ لوگ متعجب ہو جائیں اور کوئی کام ایسا کریں کہ پٹتے پٹتے بچیں۔ لیکن ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی وقوع میں نہ آئے تو سمجھ لیجیے کہ جنگ قریب اور دلّی دور ہے!

مانی ہوئی باتوں کے خلاف کوئی بات کہنا اپنی روشن خیالی کی دلیل ہو یا نہ ہو، زمانہ کے ترقی پذیر ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے، اور جب تک زمانہ ترقی پذیر ہے افراد کی کمزوری اور جماعتوں کی دست درازی ہمیشہ نظر انداز کی جائے گی۔ فرض کیجیے ہم کسی بڑے آدمی کو بے وقوف یا ازکار رفتہ قرار دیتے ہیں یا بے وقوف وازکار رفتہ کو بڑا آدمی گردانتے ہیں۔ یہ بات معقول ہو یا نامعقول اس کے دلچسپ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، ایسی ہی باتوں سے ہماری دلچسپی بڑھتی ہے، اور ظاہر ہے دلچسپی کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے جہاں سے مبالغہ شروع ہوتا ہے اور مبالغہ وہ چیز ہے جو دلچسپ ہے تو سب کچھ ہے، ورنہ صرف ناگزیر حماقت۔

روایت ہے کہ جب پرانی دنیا سے نئی دنیا کا جنم ہوا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ اب تک بڑی حماقت میں مبتلا تھے اور آپ تو جانتے ہیں جب کسی کو اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے تو اس کو احمق تر بننے کے علاوہ چارہ نہیں ہوتا۔ اس حماقت کا انکشاف ہوتا تھا کہ دنیا کے مشاعرہ

میں ایک مصرعہ طرح دے دیا گیا، یعنی اب تک افراد نے جماعت کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ وقت آ گیا ہے کہ جماعت اپنے حق پر قابض ہو جائے۔ چنانچہ اس مصرع طرح پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ کہا یہ جانے لگا کہ آج تک ایک عقل مند شخص کے ہاتھ میں ہزار بے وقوفوں کی نکیل تھی۔ وہ جدھر چاہتا تھا انھیں گھما دیتا۔ اس قباحت کا علاج یہ ہے کہ ہزار بے وقوفوں کے ہاتھ میں ایک عقل مند کی نکیل دے دی جائے۔ عقل مند کے لیے یہ زمانہ اور یہ موقع بڑا نازک تھا، لیکن عقل مند پھر عقل مند تھا۔ اس نے اپنی نکیل تو بے وقوفوں کے ہاتھ میں رہنے دی، لیکن اپنا ذہن و دماغ اپنے ہی لیے محفوظ رکھا۔ عقل مند کا کچھ نہ بگڑا بے وقوفوں کو بھی شکایت کا موقع نہ رہا اور الیکشن ہونے لگے۔

قومی بیداری میں الیکشن کا بہت بڑا درجہ مانا گیا ہے، اور جس زور شور کے ساتھ الیکشن لڑتا یا لڑایا جاتا ہے اسی اعتبار سے قومی بیداری کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ کون سی جماعت کس اصول کے لیے الیکشن لڑتی یا لڑاتی ہے۔ مجھے تو اس سے سروکار ہے کہ ہمارے ہاں کس اصول پر الیکشن بازی ہوتی ہے۔

اصول کے لیے لڑنا یا فضول پر لڑنا میرے نزدیک دو علاحدہ باتیں ہیں۔ ممکن ہے آپ کے نزدیک نہ ہوں اور یہ میں اس لیے کہہ دیتا ہوں کہ ہم آپ الیکشن کے سلسلہ میں نہیں، سر پھٹول کی خاطر نہ کہیں لڑنے لگیں۔ فرض کیجیے ہم آپ میں سے کوئی صاحب مریخ پر قبضہ کرنے کے لیے آمادہ ہوں، اس آمادگی کے دو پہلو ہیں۔ اوّل تو مریخ کا تصرف میں لایا جانا، دوسرے مریخ کے سڑکوں کی مرمت کا ٹھیکہ۔ ظاہر ہے کہ مریخ پر قبضہ کرنے سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مریخ پر قبضہ کرنے کے لیے ہم کو جناتوں سے مدد لینی ہوگی یا میونسپلٹیوں سے۔ ہم واقعی مریخ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا اپنے سڑک کوٹنے والے انجن کا مصرف تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے میونسپلٹی اور مریخ کے مسائل ہمارے بہت سے سننے والوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے، کیوں کہ میں نے بھی انھیں کچھ یوں ہی سا سمجھ رکھا ہے۔ اس لیے میں اس مسئلہ کی وضاحت مثال سے کر دینا چاہتا ہوں۔ مثال کو اصل سمجھ کر آپ میری جان کے پیچھے نہ پڑ جایئے گا، کیوں کہ آپ نے سنا ہوگا، مثال را چہ زوال!

جب الیکشن کا زمانہ آتا ہے یا موسم یا ہم خود بدلتے ہیں تو اس کے آثار پہلے سے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔فرض کر لیجیے ہم بچپن سے جوانی کے حدود میں آرہے ہیں۔دل میں خواہ مخواہ ایسی باتیں پیدا ہوں گی جن کا لازمی نتیجہ پٹ جانا ہوتا ہے۔اسی طرح فرض کیجیے برسات کی آمد ہے، ہوا کے پہلے جھونکے میں بلکہ اس سے بھی پہلے آپ کا جوڑ جوڑ گذشتہ واقعات کی یاد تازہ کرانے لگے گا۔یعنی کب اور کہاں کہاں آپ پٹے تھے اور ہم ان سے سبق نہ سیکھتے رہیں تو یقین مانیے آپ بڑھاپے میں پٹ جائیں گے اور یہ زمانہ اس قسم کی تفریحات کے لیے ذرا نازک ہوتا ہے۔

اسی طرح الیکشن کا زمانہ بھی اپنے آثار پہلے سے واضح کرنا شروع کر دیتا ہے، جیسے غازی میاں کے میلے میں ڈفالی اپنی ڈف بجاتے ہیں، اور عورتیں اور جھنڈے اپنے اپنے طور پر وجد کرتے اور سر دُھنتے ہیں۔اسی طرح الیکشن کے زمانہ میں لکچر، پمفلٹ، دعوت، قرض، اُدھار، رونا، گڑگڑانا، چیخ پکار، مار دھاڑ، جوتم پیزار کا بازار گرم ہوتا ہے۔کوئی قرض لیتا ہے، کوئی بیوی کا زیور بیچتا ہے، کوئی پرانی موٹر خریدتا ہے، کوئی پرانی عداوت کو نئی محبت سے بدلتا ہے اور کوئی پرانی محبت کو نئی عداوت پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

صوفیا نے تزکیہ نفس کے لیے بڑی بڑی ریاضتیں تجویز کی ہیں، مثلاً بدنامی اور رُسوائی مول لینا، ذلیل پیشے اختیار کرنا وغیرہ تاکہ غرور اور خود پسندی کا قلع قمع ہو جائے۔الیکشن میں بھی یہی ہوتا ہے۔فرق نیتوں کا البتہ ہوتا ہے۔تصوف و اخلاق میں انسانی فضائل کی برتری اور فرعونیت کا استیصال منظور ہوتا ہے۔الیکشن میں حکومت کی بازی گری، کمیٹی کی ممبری اور ٹھیکے کی نیلم پری مد نظر ہوتی ہے۔آپ اپنی اور دوسروں کی دانست میں کتنے ہی قابل، معقول اور شریف النفس کیوں نہ ہوں، الیکشن میں کھڑے ہو جانے پر آپ کی یہ ساری فضائل چوری کے مال اور لاٹھی کے گز سے ناپے جانے لگیں گے۔یہاں تک کہ آپ میں وہ باتیں ثابت کر دی جائیں گی جو چور، اُچکوں، بے ایمانوں اور احمقوں میں عام طور پر ملتی ہیں۔

اب آیئے تھوڑی دیر کے لیے میں یا آپ کسی الیکشن میں ممبر منتخب ہونے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔اب تک ہمارے آپ کے جیسے شیریں تعلقات رہے ہیں، یعنی میں جو چاہوں

کہتا جاؤں اور آپ سب کچھ سنتے جائیں، وہ ختم ہو جائیں گے۔ اب آپ کے جو کچھ جی میں آئے گا، آپ میرے متعلق کہیں گے اور میرے جو کچھ جی میں آئے گا آپ کے بارہ میں کہوں گا۔ کوئی کسی کی سنے گا نہیں، کہیں گے سب کچھ۔ سنیں گے اسی وقت جب الیکشن بازی کے بجائے مقدمہ بازی پر اُتر آئیں گے۔ اس وقت کوشش یہ کریں گے کہ عدالت میں وہی باتیں کہیں جو نہ کہی گئی ہوں اور نہ کہی جانے کے قابل ہوں اور نہ سنی ہوں اور نہ سنی جانے کے قابل ہوں، جس کو بزرگوں نے ناشدنی اور ناشنیدنی دونوں کہا ہے۔ لیکن ابھی سے عدالت کی بشارت کیوں سنیں یا سنائیں۔ عدالت کا دروازہ تو اس وقت کھٹکھٹایا جائے گا جب ریڈیو اور نجات کے دروازے بند کردیے جائیں گے، اور آپ تو جانتے ہیں اسی قسم کے بعض دروازے بند ہونے لگتے ہیں تو قیامت آجاتی ہے۔

لیکن میں آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں کم سے کم اس وقت تک جب تک کہ آپ میرے مقابلہ میں خود الیکشن میں کھڑے نہ ہو جائیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر جو کچھ گزر چکی ہے، اس کا حال آپ کو سنادوں۔ بہت ممکن ہے آپ الیکشن کے ارادہ سے باز آجائیں، ورنہ موقع آتے ہی رہتے ہیں۔ فوتی فراری کے سلسلہ میں آپ بھی قسمت آزمائی کر لیجیے گا۔ میں الیکشن میں کھڑا ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تھا، لیکن میرے دوستوں نے مجھے بتایا کہ مجھے اپنی قابلیتوں کا بالکل علم نہیں ہے اور میں ان قابلیتوں سے ملک وقوم کو محروم رکھ کر بڑا ظلم کر رہا ہوں۔

اس کے علاوہ دوسرا شخص جو اس جگہ کے لیے کھڑا ہوا ہے، وہ انتہا درجہ کا خودغرض اور نامعقول ہے۔ قوم اور ملک اس کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں گے۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اس شخص کو کامیاب ہونے نہ دوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ مجھے اس کا مطلق فکر نہ تھا کہ اس شخص سے قوم و ملک کو کیا نقصان پہنچے گا، ورنہ مجھے کچھ اس پر بھی اعتماد نہ تھا کہ میں قوم و ملک کو عرش پر پہنچا دوں گا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے میرے طرف داروں اور میرے حریف کے طرف داروں میں چشمک تھی اور وہ دونوں چاہتے تھے کہ ہم دونوں کو لڑا کر خود اپنے جی کا حوصلہ نکال لیں۔ آپ کو نہیں معلوم انسان اپنی تعریف سُن کر اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی نااہلیت سے خوب واقف ہوتا ہے، لیکن یہ نہیں چاہتا کہ اس کی نااہلی سے دوسرے واقف ہوں اور یہی اس کے

نااہلی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس لیے کہ نااہلی وہ چیز ہے جو صرف ظاہر ہونے کے لیے بنائی گئی ہے اور سب سے بڑا نااہل وہ ہے جس کی نااہلی کا انکشاف اس وقت ہو، جب وہ اس کی روک تھام نہ کر سکتا ہو۔

چنانچہ میں اللہ کا نام لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے مواقع پر اللہ کا نام اللہ کے لیے نہیں لیا جاتا بلکہ محض اس لیے کہ اس موقع پر فقرہ کی ترکیب ہی اللہ کے نام سے ہوتی ہے۔ روپے کا سوال ہوا، کچھ قرض لیے، کچھ بیچا، کچھ خیرات مانگا، کچھ چرایا، اشتہارات چھپوائے، سکنڈ ہینڈ موٹر خریدی، دو چار گنڈے نوکر رکھے، ایک آدھ فتوے لکھوائے، ایک پرانا ساریڈیو بھی خریدا، دو چار مایوس الحال وکیلوں کو کرایہ پر لیا، پانسات طالب علموں کو پکڑا، دو چار لیڈروں کو منی آرڈر بھیجے، کچھ مولوی، ایک آدھ اخبار نویس، دو چار گنڈے تعویذ والے، غرض ان سب کو لیے دیے میدان میں نکل پڑا۔

ایک گاؤں میں ووٹروں کی تعداد زیادہ تھی، وہاں پہنچا۔ خبر کی گئی کہ جلسہ ہوگا۔ ڈیرے لگائے گئے، کھانا پکنا اور نفیری بجنی شروع ہوئی۔ اذان دی گئی، دیہاتی جمع ہوئے، مولوی صاحب نے اللہ رسول کا واسطہ دلایا، طالب علموں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا، وکیلوں نے معاملہ کی بات شروع کی، گنڈے تعویذ والوں نے فصل تیار ہونے، قرض ادا کرنے اور بچے پیدا ہونے کی تعویذ دینے شروع کر دیے۔ ریڈیو نے ہیضہ کا پرچہ ترکیب استعمال بتایا اور بازار کا بھاؤ بتانا شروع کیا۔ لیڈروں نے کھانے کی فہرست اور غسل خانہ کے اہتمام پر نظر ڈالی۔ گنڈوں نے ڈنڈے سنبھالے اور اس خاکسار نے وضو کرنا شروع کیا۔ اپنے پرائے سبھی کی نظر پڑ رہی تھی، وضو کرنے کی مشق بھی کچھ یوں ہی سی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ دھونے سے پہلے منہ دھونا شروع کر دیا اور آخر میں پاؤں دھونے کے بجائے ناک میں پانی ڈال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ قیامت یہ ہوئی کہ لوگوں نے امامت بھی میرے ہی سپرد کی۔ نماز پڑھنے ہی کی کب توفیق ہوئی تھی کہ امامت کے فرائض بھی سپرد کر دیے گئے۔ عید بقرعید میں کنکھیوں دیکھ کر ہاتھ باندھتا چھوڑ دیتا تھا، امامت میں کیا کرتا۔ دوسرے یہ کہ موسم ابر آلود تھا، گھبراہٹ تھی، دوسروں کی زبردستی امامت کرنے آمادہ تو ہو گیا لیکن بعد میں یہ شک ہوا کہ عصر کی نماز پڑھائی تھی یا مغرب کی۔ عصر کی چار رکعتیں پڑھوں یا

مغرب کی تین، آواز سے پڑھوں یا بغیر آواز کے۔ نیچے اوپر دیکھ کر اور کچھ نہ سمجھ کر ایک آہ سرد کھینچی اور خود ہی تکبیر کہنے لگا۔ مقتدیوں میں سے کسی نے زور سے تکبیر شروع کی تو سمجھا کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ نماز شروع کی، عصر کی نماز تھی، مغرب کا شبہ تھا۔ گھبراہٹ اوپر سے طاری تھی۔ بے اختیار بلند آواز سے الحمد شروع کر دی۔ کچھ لوگ کھانسے کھنکارے میں نے سمجھا، موسم خراب ہے راستہ کے گرد وغبار اور عام چیخ پکار کے سبب سے لوگوں کا گلا خراب ہو رہا ہے۔ قیامت اس وقت آئی جب میں نے قلیا کی سورہ شروع کر دی۔ میں نے سمجھا یہ تھا کہ چھوٹی سی سورہ ہے جلد ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس میں ایک فقرہ کچھ ایسے موقع سے آ گیا ہے کہ ذرا زبان لڑکھڑائی پھر عمر بھر پڑھتے جایئے، سورہ ختم نہ ہو۔ الٰہی اب کیا ہو، جی چاہتا تھا کہ سجدہ میں چلے جائے اور عمر بھر نہ اُٹھے۔

رُکوع کا تو بہانہ تھا بے اختیار سجدہ میں چلا گیا۔ (ذرا دم لیا) تھوڑا پڑھا بہت کچھ سوچا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ کراہتا ہوا اور کچھ پڑھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس دفعہ صرف قل ھو اللہ پر اکتفا کی۔ دوسری رکعت بھی ختم کی، تیسری رکعت میں اطمینان تھا کہ سورہ نہ پڑھنی پڑے گی۔ التحیات پڑھنے بیٹھ گیا۔ لوگوں پر زلزلہ زکام کا دورہ پڑ ہی رہا تھا۔ اس دفعہ کچھ اس انداز سے شروع ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ نماز اور میرا خاتمہ ساتھ ہی ہوگا۔ سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ اس میں بھی کچھ عربی کے کلمات پڑھنے تھے، التجا عمر بھر کی تھی، دعا کبھی نہ مانگی تھی۔ اردو میں دعا مانگتا تو قبول نہ ہوتی اور اللہ تعالٰی کے رد وقبول کا سوال بھی نہ تھا۔ خیال تھا کہ مقتدی یعنی ووٹر کیا کہیں گے۔ عربی کا فقرہ کوئی یاد نہ آتا تھا۔ خط کتابت یا اخباروں میں اکثر انا للّٰہ وانآ الیہ راجعون سنا تھا۔ نہایت حزین اور رقت آمیز لہجہ میں یہی پڑھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طرف سے آواز آئی جو کافی معنی خیز تھی، آمین یارب العالمین۔ اس کے بعد مجھ پر کیا گزری خدا کرے کسی پر نہ گزرے۔ کام کرنے والوں کی میٹنگ ہوئی، محاذ جنگ بدلا گیا۔ خاکسار امامت سے ہمیشہ کے لیے محروم کیا گیا اور مجذوب مشہور کر دیا گیا۔ لیڈروں نے کھانا کھانے کے بعد تقریر شروع کر دی اور میرے بارہ میں ایسے زوردار کلمات کہے کہ میں نماز والا واقعہ بالکل بھول گیا اور ووٹروں نے میری طرف اس طور پر دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی کسی پر جلال سادھو فقیر یا چیچک کا ٹیکا لگانے والے کی طرف دیکھتا ہے۔

تین چار مہینے مجھ پر کیسے گزرے، اس کی داستان نہایت طویل اور دردناک ہے۔
کہاں کہاں اور کیسی کیسی میں نے تقریریں کیں۔ کہاں کہاں چندے دیے، کتنوں کی شادی
کرائی، کتنوں کے عقیقے کرائے، کتنوں کے ختنوں میں شریک ہوا، کتنوں کی ڈگریاں ادا کیں،
کتنوں کا علاج کرایا، کتنوں کے ہاتھ جوڑے، کتنوں کے پاؤں پکڑے، کتنے فاقے کیے، کتنی
میلادیں پڑھیں، کتنی قوالیاں سنائیں، کتنی ملاحیاں سنیں، کہاں سر کے بل گیا، کہاں منہ کے بل
گرا، کتنے نااہلوں کی جوتیاں سیدھی کیں، کیسی کڑیاں اُٹھائیں، کتنے دھکے کھائے، غرض الیکشن
میں کامیاب ہوا۔ دوسرے ہی دن فریق ثانی نے مقدمہ دائر کردیا کہ الیکشن میں بڑی بے
عنوانیاں ہوئی تھیں۔ بہ ہزار خرابی منتخب ہوا تھا۔ بہ سہولت تمام مقدمہ میں پھنسا اور اب اطمینان
خاطر آپ سے رُخصت ہوتا ہوں اور یہ سب محض ریڈیو کی خاطر۔

●●●

پبلک

بالکل ٹھیک اناؤنسر صاحب نے پبلک کا تلفظ صحیح کیا ہے اور یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ کہیں سننے والوں میں میرے وہ دوست موجود نہ ہوں جو ایک موقع پر مسلسل پبلک کا تلفظ پبلک کرتے رہے اور پٹتے پٹتے بچے! بات یہ ہے کہ میرے یہ دوست صفائی کے جمعدار تھے۔ وظیفے اور اردو اخبارات پڑھنے کے بڑے شائق۔ ایک بڑے بگڑے دل کلکٹر صاحب قصبہ کی صفائی کا معائنہ کرنے آئے۔ ظاہر ہے کہ صفائی کا معائنہ ہوگا تو گندگی کے سوا اور کیا نظر آئے گا۔ جمعدار صاحب سے جواب طلب کیا گیا تو یہ بولے، حضور میرا قصور نہیں ہے۔ قصبہ کی پیلک ہی ایسی ہے۔ صاحب نے کڑک کر پوچھا۔ پیلک کیا۔ انھوں نے بڑی مری ہوئی آواز میں جواب دیا، حضور یہ پیلکان۔ قریب تھا کہ کلکٹر صاحب جمعدار صاحب سے کوئی آل انڈیا قسم کا سلوک کرتے اور ان میں سے کسی ایک کی رُسوائی اور دوسرے کی نام وری کا باعث ہوتا، تحصیل دار صاحب موقع واردات پر پہنچ گئے۔ تحصیل دار صاحب بڑے جہاں دیدہ تھے۔ رشوت لینے اور جھگڑا چکانے میں مشہور تھے۔ بولے، حضور کچھ نہیں۔ پیلکان ہم ہندوستانیوں کے پوجا پاٹ کی ایک چیز ہے! صاحب دم بخود ہو گئے اور فوراً بولے، جمعدار صاحب ہم کو معاف کردو۔ ہم سے بڑا غلطی ہوا۔

تو جناب یہ پبلک وہ چیز ہے جس کے تلفظ کے ذرا اِدھر اُدھر ہو جانے سے کلکٹر صاحب کو جمعدار صفائی سے معافی مانگنی پڑی۔ زبان ہی تو ہے، دورانِ گفتگو کہیں میرا تلفظ بھی ڈانواڈول

ہو جائے تو آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں اُن لوگوں میں ہوں جو کلکٹر صاحب اور جمعدار صفائی دونوں سے ڈرتے ہیں۔ایک کے تخلص سے دوسرے کے تلفظ سے!

پبلک کا مفہوم اس وقت تک پورے طور پر واضح نہیں ہوسکتا جب تک ہم اس لفظ کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہو جائیں۔ یہ فقرہ میں ذرا بدحواسی میں کہہ گیا۔ سوچیے تو بات میں نے کیا کہی، یعنی کسی بات کا مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتا، جب تک ہم اس کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہو جائیں۔لیکن یہ بات آپ کے سوچنے کی نہیں ہے میرے سوچنے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں بغیر لائسنس کے ریڈیو استعمال کرنے والوں کی کچھ ایسی دھر پکڑ ہو رہی ہے کہ میرے حواس بجا نہیں رہے ہیں۔ کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میرے پاس ریڈیو ہے لیکن اس کا لائسنس نہیں ہے اور کبھی یہ خیال آتا ہے لائسنس موجود ہے ریڈیو نہیں ہے۔ اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ دونوں نہیں ہیں۔ رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم! فی الحال میں نے یہ کیا ہے کہ ریڈیو سیٹ اور لائسنس دونوں کو ایک دوسرے سے باندھ دیا ہے اور خود اس کے قریب بیٹھا رہتا ہوں۔ محض اس خیال سے کہ وقت پر ہم میں سے کوئی موجود نہ ہوا تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا۔ تو پھر آمدم برسر پبلک۔ یہ لفظ غالباً انگریزی کا ہے۔ غالباً کا لفظ میں نے بطور حفظ ماتقدم کے رکھ دیا ہے اور یہ محض اس لیے کہ عندالضرورت اردو، ہندی اور ہندستانی قسم کے جھگڑوں میں یہ لفظ کھپ بھی جائے اور میری آبرو ریزی بھی نہ ہو۔ محتاط لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، ورنہ بہت ممکن ہے کہ کوئی صاحب مجھے نیچا دکھانے کے لیے یہ ثابت کر دیں کہ یہ لفظ کسی اور زبان کا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں آج کل سب سے آسان بات ثابت کر دینا ہے۔ دس بے وقوف کسی بات پر متفق ہو جائیں وہ بات ثابت ہے یا دس عقل مند ایک بات پر اختلاف کر بیٹھیں وہ بھی ثابت ہے۔ اگر آپ کو پبلک سے سابقہ ہوگا تو آپ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے!

پھر آپ سے کیا پردہ مجھے ریسرچ قسم کی چیز سے قدرے بغض ہے اور کسی بات کو اس طور پر شروع کرنا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے یا کہاں سے نکلا ہے، ریسرچ کی علامت ہے۔ اس لیے میں یہ بات سب سے پہلے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں لفظ پبلک کے آباواجداد یا اولاد دور اولاد سے بحث نہ کروں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ پبلک کا مفہوم جو لغت میں آیا ہے اسے آپ

وہیں رہنے دیں۔ ریڈیو پر لطف لے کر بیٹھ جانا بڑی بدتمیزی ہے اور یہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے پاس ریڈیو کا لائسنس موجود نہ ہو! میں آپ کو پبلک کے اس مفہوم سے آشنا کرانا چاہتا ہوں جو لیڈر کے ذہن سے شروع ہوتا ہے اور جیل خانہ کے اندر ختم ہو جاتا ہے۔

اچھا اب پبلک کی چند اقسام ملاحظہ فرمائیے۔ ایک پبلک چالو پبلک ہے، یہ چلتی رہتی ہے اندھا دھند، بس چلتی ہی رہتی ہے، تاوقتیکہ ان میں سے کوئی دب کر پوسٹ مارٹم قسم کی چیز نہ بن جائے یا کسی کو پولیس پکڑ نہ لے جائے۔ اسی دہلی میں فتح پوری کے سامنے کھڑے ہو جایئے اور پبلک کا تماشہ دیکھیے۔ وہ دیکھیے سامنے سے جو ریلا چلا آ رہا ہے، اس میں کتنے بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورت، ننگے، بھوکے، مریض، تندرست، حسین، بدقوارہ، جاہل، عالم، حاکم، غلام، پارسا، اوباش، مہذب، وحشی، اُچکے، چلے آ رہے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ ہی گاڑیاں، موٹر، تانگے، ٹریموے غرض ہر قسم کی سواریاں رواں دواں ہیں۔ کہیں رستہ چلنے والوں سے سواری بچتی ہے، کہیں سواریاں رستہ چلنے والوں سے بچ کر نکلتی ہیں، کوئی فاقہ سے مر رہا ہے روٹی کی فکر ہے، کسی کو بدہضمی ہے چورن کا متلاشی ہے، کوئی دیارِ محبوب سے نکالا گیا ہے، ٹریموے سے کٹ مرنے پر، کسی کی جیب کترنے کے درپے ہے، کوئی فراقِ یار میں شعر پڑھتا ناک چھنکتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی ہندوستان کی آزادی کی فکر میں مبتلا ہے تو کوئی اس وسوسہ میں غلطاں پیچاں کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو فدوی کا کیا حشر ہوگا۔ کوئی چاوڑی ہوتا ہوا جامع مسجد پہنچے گا اور کوئی لال قلعہ سے گزرتا وائسرائے ہاؤس۔ کوئی میلا برقع اور پھٹی جوتی پہنے بھیک مانگ رہی ہے اور کوئی توجہ نہیں کرتا تو، کوئی سینما کا متحرک اشتہار بنا ہوا ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، کوئی پھل اور میوہ خریدنے رُک گیا ہے تو کوئی بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر جھک گیا ہے۔ ایک مسجد سے نکل رہا ہے، دوسرا ہوٹل میں داخل ہو رہا ہے۔ کوئی سلام کرتا ہے جواب نہیں ملتا، کوئی جواب دینے کے لیے آمادہ ہے لیکن سلام کرنے والا نہیں ملتا۔ ایک سیل ہے کہ اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ زندگی کے اس بے پناہ روانی میں کس کو فرصت کہ وہ کچھ سوچ سکے۔ کیا ہو اگر کسی طرح اس روانی کو تھوڑی دیر کے لیے روک دیا جائے۔ شاید یہ ناممکن بھی ہے زندگی کا جنون سوچنے یا سوچے جانے کا کب متحمل ہوا ہے۔

یہ تو پبلک کی عام حالت کا منظر ہے۔اب بعض خاص قسم کی پبلک کا حال سنیے۔جلسہ ہو رہا ہے۔ایک جم غفیر ہے، زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ مریخ پر قبضہ کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ رزولیشن پیش ہوتا ہے۔مقرر نے اپنی نالائقی اور حاضرین کے لطف وکرم پر بھروسہ کرتے ہوئے بولنا شروع کیا اور مجمع نے داد دینی شروع کی۔"ضرور قبضہ کرلینا چاہیے،اور جلد سے جلد قبضہ کرلینا چاہیے، ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست، ہم اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک مریخ ہمارے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا گڑگڑاتا نہ ہوگا۔" دوسرے نے کہا،"ہرگز نہیں مریخ پر قبضہ کرنا بڑی زیادتی ہوگی، دنیا میں ہر ملک و ہر قوم کو آزاد رہنے کا حق حاصل ہے۔مریخ والوں سے ہمارے بزرگوں کے تعلقات بڑے اچھے رہے ہیں۔" اس پر مجمع میں کہیں سے نعرۂ تحسین اور کہیں سے نعرۂ نفرین بلند ہوا کہ اتنے میں ایک صاحب نے کوئی پچاس گز کے فاصلے سے پکارا۔'جناب صدر کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ یہ جلسہ قانون کی فلاں دفعہ سے باضابطہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ابھی جناب صدر تک آواز پہنچ بھی نہ پائی تھی کہ راستہ ہی میں ایک صاحب ننگے سر کرسی پر کھڑے ہوگئے اور چیخ کر فرمایا۔"بالکل باضابطہ ہے۔قانون بنانے والے ہم ہیں تم کون پوچھنے والے۔" تیسرے نے للکارا"تم کون ہوتے ہو، مریخ سے مل گئے ہو غدار ہو، لعنت بر غدار۔" اتنے میں ایک گوشہ میں کچھ ہلچل سی نمودار ہوئی جہاں سے مریخ ہی کے زبان میں دریافت کیا گیا۔'مریخ سے جو خط وکتابت کی گئی ہے اس سے ہم کو واقف کیا جائے۔" جناب صدر نے کہا۔"حضرات بیٹھ جائیے۔" آواز آئی،"شرم نہیں آتی، بیٹھنے کو کہتے ہو۔قوم تباہ ہو رہی ہے اور ہم بیٹھ رہیں، ہرگز نہیں بیٹھیں گے۔ہم یہاں بیٹھنے آئے ہیں یا تمھاری قلعی کھولنے۔" پاس ہی سے ایک صاحب نے جواب دیا۔"قلعی کھولنے والے کا منہ کالا۔" اب جن صاحب کا منہ کالا کیا جانے والا تھا انھوں نے چہرہ سرخ کرکے فرمایا۔"مرد ہو تو آجاؤ۔" فریقین کی مردمی کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا کہ آس پاس کے چند مردم بے زاروں نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک کی گردن ایک نے پکڑی اور دوسرے کا کان دوسرے نے، قریب تھا کہ معاملہ اتنے ہی پر طے ہو جاتا کہ ایک صاحب نے جناب صدر کو مخاطب کیا۔"جناب صدر!" "ہم یہ کبھی پسند نہیں کرتے کہ ایسے اہم جلسہ میں جہاں مریخ پر حملہ کرنے کا رزولیشن پیش ہو اور لوگ جائز

طور پر ایک دوسرے کا منہ کالا کرنے کی فکر میں ہوں۔ ان کو تمام ضروری سہولتیں بہم نہ پہنچائی۔ یہاں دو فاضل ممبروں کو بعض لوگوں نے ان کے پیدائشی حقوق سے محروم کر دیا ہے۔'' ایک صاحب نے فرمایا۔'' جناب صدر قطع کلام ہوتا ہے، ابھی ابھی ایک فاضل ممبر نے پیدائشی حقوق کا مسئلہ چھیڑا ہے۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں پیدائشی حقوق سے ان کا کیا مطلب ہے۔'' پاس ہی سے آواز آئی۔ ''بس یہی ایک دوسرے کا منہ کالا کرنے کا حق!'' اتنے میں ایک صاحب نے چراغ پا ہو کر للکارا۔ ''جناب صدر فاضل ممبر نے اس قومی اجتماع کی بڑی توہین کی ہے، یہ مذاق کا موقع ہے یا ڈوب مرنے کا۔'' پہلو سے جواب ملا۔ ''دونوں کا!'' انھوں نے کہا، ''تم جہنمی ہو دوزخ کا ایندھن ہو گے، پاس ہی سے صدا آئی۔ تری آواز مکے اور مدینے'' ایک ستم ظریف نے بڑی پاٹ دار آواز سے جناب صدر کو جو اس وقت کان کریدنے میں مصروف تھے۔ پکارا، ''میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہو۔'' صدر کے ایک مصاحب نے جواب دیا۔ ''مکرر ارشاد ہو۔'' سوال کرنے والے نے پوچھا۔ ''کیا جناب بتا سکتے ہیں کہ حاضرین کے پیدائشی حقوق کیا کیا ہیں۔'' ایک صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''جناب والا، پیدائشی حقوق بتانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم سب کو بتا دیا جائے کہ کون کون سے حقوق پیدائشی نہیں ہیں۔'' اس پر تمام مجمع میں ناراضی کی لہر دوڑ گئی، اور ہر شخص نے تالیاں بجا کر نعرے لگا کر جانوروں کی بولیاں بول کر کہنا شروع کیا۔ ''پیدائشی حقوق کی توہین کی گئی، ہر چیز خطرہ میں ہے۔'' خطرہ کا نام سنتے ہی ہر شخص پیدائشی حقوق کے لیے پیدائشی عادات و کرامات کا مظاہرہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک طرف سے پولیس کا ایک دستہ نمودار ہوا جس نے آناً فاناً تمام پیدائشی حقوق کو شہری ذمہ داری میں تبدیل کر دیا۔

اب آیئے آپ کو مریخی طلبا کے ایک مجمع میں لے چلیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے خود طالب علم بن جائیں۔ بغیر طالب علم بنے طالب علموں کے مجمع میں یا تو کوئی لیڈر داخل ہو سکتا ہے یا شاعر، کیوں کہ لیڈر کہتا سب کچھ ہے کرتا وہی ہے جس میں اس کا نفع ہو اور شاعر کہتا وہ ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتا، کرتا وہ ہے جو دوسروں کی سمجھ سے باہر ہو۔ طالب علم لیڈری اور شاعری دونوں کا بڑا دلدادہ ہوتا ہے۔ یہاں مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ مریخ کی آزادی میں طلبا کہاں تک معاون ہو سکتے ہیں۔ جلسہ کا آغاز ایک گیت سے ہوا، جس

کے ختم ہونے پر ایک نوجوان نے اعتراض کیا کہ جس تال سُر سے یہ گانا گایا گیا ہے اس سے مریخیوں کے جذبات کو ٹھیس لگی ہے۔ صدر نے فرمایا ''یہ قومی جلسہ ہے قوالی کی محفل نہیں ہے، جس میں تال وسُر کا لحاظ رکھا جائے۔ اس پر ایک صاحب نے فرمایا ''جناب آپ نے قومی جلسہ کو قوالی سے نسبت دے کر قوم کی بڑی توہین کی ہے۔ اس پر ایک بڑا اپنڈ ال افگن نعرہ لگایا گیا، لیکن ابھی نعرہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک صاحب نے گیلری سے للکارا۔ لیکن حضرات قوم کو قوالی سے جدا کرنا

''ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا''

اس پر ایک صاحب نے گرہ لگائی۔

''یاد آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا''

مجمع نے پکارا ''بے شک بے شک، قوالی کی توہین کر کے کوئی شخص کرسی صدارت پر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' اتنے میں جناب صدر کا شانہ ہلا کر ایک نوجوان نے فرمایا۔ ''آپ کو نہیں معلوم ہم ان سواروں کے سپوت ہیں۔

''جن کے دوڑوں سے ہیں واقف تیرے دشت وکوہ سارا!''

چنانچہ صدر نے صدارت کی کرسی کو خیر باد کہا اور ایک دوسرے صدر کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا۔ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ اب وہی شخص صدر منتخب کیا جائے جس کے مسلک پر کسی کو شبہ کرنے کی گنجائش نہ ہو۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ ہر اُمیدوار اپنے اپنے مسلک کا اعلان کرے۔ مجمع کے سرے سے ایک صاحب نے پکار کر کہا۔ ''میں مریخ کی حکومت نوجوانوں کے ہاتھ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' مجمع سے آواز آئی، شاباش، مرحبا، جزاک اللہ۔ اس پر ایک صاحب نے فرمایا ''مریخ کی حکومت یقیناً نوجوانوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے، لیکن سوال یہ ہے کہ نوجوانوں کی حکومت کس کے ہاتھ میں ہوگی؟'' اس پر دوسرے صاحب نے آپے سے باہر ہو کر کہا۔ ''غدار، دغا باز، نوجوانوں کو محکوم دیکھنا چاہتا ہے۔ کس کی مجال ہے کہ نوجوانوں پر حکومت کرے۔'' ایک طرف سے آواز آئی، ''نوجوان اپنی قسمت کے خود مالک بنیں گے۔'' لوگوں نے کہا، ''بے شک بے شک، نوجوان زندہ باد۔'' جب نعروں کا زور کچھ کم ہوا تو یہ تجویز پیش کی گئی کہ صدر کا انتخاب ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ اب بحث اس پر شروع ہوئی، کمیٹی

میں کون لوگ شامل کیے جائیں۔ ہر طرف سے ناموں کی سنگ باری ہونے لگی۔ حساب لگایا گیا تو ناموں کی تعداد حاضرین کی تعداد سے کچھ اوپر نکلی۔ اس پر ایک بزرگ نے یہ تجویز پیش کی کہ جو صاحب کمیٹی میں ہوں وہ صدارت کے لیے نامزد نہ کیے جائیں۔ اس پر سارے مجمع پر سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی طرف سے کوئی نام پیش نہ ہوا تو دوسرے صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ آج کا جلسہ برخاست کیا جائے۔ اس پر تمام مجمع نئے سرے سے بیدار ہو گیا۔ ایک نے کہا کہ جس جلسہ میں کوئی صدر نہ ہو، وہ جلسہ برخاست نہیں ہوسکتا۔ بڑی ردوکد کے بعد بالآخر یہ طے پایا کہ جلسہ کو برخاست کرنے کے لیے ایک صدر منتخب کرلیا جائے۔

لیکن یہاں ہم آپ بہت دیر ٹھہرے، اب انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیے۔ ابھی بہت سے اور مجمعوں کا جائزہ لینا ہے۔ کہیں عرس یا اشنان ہونے والا ہے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ گھر کے گرد مسافروں کا ہجوم ہے۔ ہر شخص اس کے درپے ہے کہ اسے سب سے پہلے ٹکٹ مل جائے۔ ہر شخص کے سر پر گٹھری اور بغل میں بستر ہے۔ کاندھا الگنی کا کام دے رہا ہے۔ اُنگلی بچّے کے ہاتھ میں ہے، شلوکے کے بند سے بیوی بندھی ہوئی ہے۔ ہر شخص دوسرے شخص کو پھاند کر روند کر دھکا دے کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ کوئی ہانپ رہا ہے، کوئی کانپ رہا ہے، کوئی چیخ رہا ہے، کسی کا دم نکلا جا رہا ہے، کوئی گڑگڑا رہا ہے، کوئی مونگ پھلی کھا رہا ہے، کوئی پیک ڈال رہا ہے، عورتیں کوس رہی ہیں، مرد ہاتھا پائی کر رہے ہیں، بچّے بلبلا رہے ہیں۔ ہر شخص خواہ وہ کھڑکی سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو، ٹکٹ مانگ رہا ہے اور اسٹیشنوں کے نام بتا رہا ہے۔ مجمع کے آگے اینٹ کی دیوار اور صرف ایک مختصر سی کھڑکی ہے۔ ریلے کا وہ زور ہے کہ کچھ بعید نہیں اگر کسی وقت سارا مجمع ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے یوں نکل جائے جیسے جنتر سے تار۔

مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آتا ہے۔ اسی دہلی کے اسٹیشن پر تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدنا تھا۔ میرے دو اور ساتھی تھے۔ ایک آج ہندوستان کے غالبًا سب سے بڑے مستند آدمی ہیں۔ دوسرے جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ ٹکٹ گھر کے سامنے پبلک کا وہ ہجوم دیکھا کہ پاؤں تلے سے زمین نکلنا چاہتی تھی، لیکن نہیں نکل سکتی تھی۔ کچھ دیر تک تو ہم فیصلہ نہ کر سکے کہ کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر مرحوم دوست نے کہا کہ چلیں گے اور اسی گاڑی سے چلیں گے اور ٹکٹ لے کر چلیں گے۔

ہمارے مرحوم دوست پستہ قد اور نہایت درجہ قوی آدمی تھے۔ کالج میں ہم سب انھیں سیمنٹ کی بوری کہا کرتے تھے۔ اس شخص کو کبھی غصہ نہیں آتا تھا اور میں نے ایسا ہنسنے والا شخص بھی نہیں دیکھا۔ ہنستے ہنستے لوٹ جاتا تھا، بمشکل سے پانچ فٹ دو انچ کا قد ہوگا۔ ہم سب ہاتھا پائی کرتے تو یہ شخص ہنسنا شروع کرتا۔ کسی کو بغل میں اس طور پر دبا لیتا کہ صرف سر اور چہرہ باہر کو نکلا ہوتا۔ کھڑے کھڑے کسی کے پاؤں کے اوپر پاؤں رکھ کر دبا لیتا تو ٹس سے مس کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اُنگلیوں کی گرفت ایسی قوی ہوتی کہ کلائی پکڑ لیتا تو معلوم ہوتا جیسے آہنی شکنجہ میں دبی ہوئی ہے۔ شدید جاڑے کا موسم تھا۔ انھوں نے اپنا جمپر، واسکٹ اور مفلر ہمارے حوالہ کیا۔ روپے مٹھی میں لیے اور انھی ہیئت کذائی اور ہم سب کی سراسیمگی پر ایک زبردست قہقہہ لگا کر مجمع میں سرنگ لگاتے ہوئے گھسے، جس طرح آج کل کے باقاعدہ پیرنے والے غوطہ لگانے کے لیے پانی میں کودتے ہیں۔ کوئی دس منٹ بعد ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے متصل ایک اچھا خاصا آدمی خواہ مخواہ اونچا ہوتا نظر آیا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ہمارے دوست تھے جو ایک آدمی سمیت اُبھر رہے تھے۔ قصہ یہ ہوا کہ ساری مسافت انھوں نے لوگوں کے ٹانگوں کے درمیان سے طے کی تھی اور کھڑکی کے پاس پہنچ کر اُبھرے تو اس وقت اُبھرنے کے راستہ میں جو صاحب حائل تھے وہ بھی اُبھر آئے۔ اپنا اور اپنے شانہ نشین دونوں کے ٹکٹ خریدے اور انھیں جہاں کا تہاں اُتارتے، دوسری سرنگ لگاتے ہم میں آملے اور قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔ سر سے پاؤں تک پسینہ میں شرابور تھے۔

یہ حال تو ہمارے ملک کی پبلک کا ہے۔ یورپ میں بھی بڑے بڑے مجمعے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں ہمیشہ لوگ خود بخود ایک دوسرے کے پیچھے صبر و سکون کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں، میلوں لمبی قطار ہو جاتی ہے، لیکن کسی کی مجال نہیں کہ دوسروں سے جگہ چھیننے کے لیے کوئی شخص ایک انچ بھی آگے بڑھنا گوارا کرتا ہو۔ کھڑے کھڑے یا بیٹھے بیٹھے اکثر 24-24 گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ بارش ہو، برف پڑ رہی ہو، کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کسی قسم کی زیادتی کر سکے! لیکن آپ کو بھلا اس قسم کی پبلک کیوں پسند آئے گی!

●●●

کانفرنس، کونسل، کمیٹیاں

میرے ایک بڑے محترم لیکن بھلے بزرگ تھے، جن کی عادت تھی کہ وہ جب تک دن میں بے شمار جھوٹ نہیں بول لیتے تھے یا اتنی ہی میٹنگ نہیں کر لیتے تھے، اس وقت تک نہ خود چین سے بیٹھتے تھے نہ دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیتے تھے۔ جھوٹ بولنا چاہتے تھے تو میٹنگ کرتے تھے اور میٹنگ کرنا چاہتے تھے تو جھوٹ بولتے تھے۔ کمیٹیاں بنانے اور بات بگاڑنے کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، بات چیت، ہار جیت، مار پیٹ، عمر بکر، بچر مچر، شادی، غمی، دھوکا دھڑی، فوتی فراری، سب کچھ میٹنگ کے ذریعہ عمل میں آتا۔ عقل و ایمان سے زیادہ میٹنگ پر بھروسہ کرتے۔ سوچتے کچھ تھے، کہتے کچھ تھے۔ لکھتے کچھ تھے، پڑھتے کچھ تھے۔ فیصلہ کچھ ہوتا، کرتے کچھ تھے!

اکبر مرحوم آپ کو یاد ہوں گے۔ غالباً ان کا یہ شعر بھی۔

کمیٹی میں چندے دیا کیجیے
ترقی کی ہے کیا کیجیے

اکبر کا نسبتاً فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ ہمارے ان بزرگ نے وہ زمانہ پایا تھا جب روپے پیسے کے اعتبار سے لوگ تحت اللفظ ہو چکے تھے۔ اس لیے موصوف نے اس شعر میں ترمیم کر دی تھی۔

کمیٹی میں ڈال دیا کیجیے
ترقی کی جے کیا کیجیے

جہاں تک میرا تجربہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کا نہ ہو کہ جب کسی کام کو ٹالنا یا نہ کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ منظور ہوتا ہے کہ اس کام کو اس قابل بھی نہ رکھا جائے کہ کوئی دوسرا اسے پورا کر سکے تو اس کی مٹی کسی کانفرنس میں پلید کرائی جاتی ہے۔ کمیٹی، کونسل، کمیشن، بورڈ، چیمبر، جوبلی ڈے وغیرہ ایک ہی مرض کی مختلف دلچسپ علامتیں ہیں۔

پرانے زمانہ میں جب ریڈیو کا دور دورہ نہ تھا، اس وقت امراض دور کرنے، مقدمہ جیتنے، روزی کمانے، اولاد پیدا کرنے، مینہ برسانے، محبوب کو قابو میں لانے اور رقیب کو واصل جہنم کرنے کے لیے ٹونے ٹوٹکے سے کام لیا جاتا تھا۔ اب اس قسم کے کاموں کے لیے کونسل اور کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ عدالتیں کھول دی گئی ہیں، رزولیشن پاس کیے جاتے ہیں، جلوس نکالے جاتے ہیں، نعرے لگائے جاتے ہیں، جیل خانہ کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے ہیں، شریفوں کی پگڑیاں اُچھالی جاتی ہیں اور —— ریڈیو پر تقریر کی جاتی ہے۔

آپ نہیں تو آپ کے بزرگوں نے —— اور اس سے نہ آپ کی تحسین مقصود ہے اور نہ آپ کے بزرگوں کی توہین —— وہ زمانہ یقیناً دیکھا ہوگا جب بارش نہ ہونے پر دیہات کے لڑکے ننگ دھڑنگ، محض ایک لنگوٹی زیب مترکیے، دروازہ دروازہ اُچکتے کودتے شور مچاتے کیچڑ پانی میں لوٹتے چیختے چلاتے تھے۔

''کال کلوٹی وجر دھوتی، کالے میگھا پانی دے''

وہ باتیں اب خواب وخیال ہو چکی ہیں۔ ان کی جگہ اب جلسوں، جلوسوں، زندہ باد کے نعروں اور بہت سی اور باتوں نے لے لی ہیں، جن کا تذکرہ مارے ڈر کے یوں نہیں کرتا۔

دور یم از سواد وطن باز چوں رسیم!

عام طور پر کسی ملک یا قوم یا ادارہ کی ترقی کا اندازہ اس کی کمیٹیوں، کونسل اور کانفرنسوں سے کرتے ہیں۔ لوگ ان کے مہمل ہونے کے قائل بھی ہیں، لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ کمیٹی

اور کانفرنس کی ممبری قوم اور ملک کے لیے مفید ہو یا نہ ہو خود ممبروں کے لیے نہایت نفع بخش ہوتی ہے۔ آپ کے کسی کمیٹی کے ممبر ہو جانے کی دیر ہے۔ آپ کے لڑکے بغیر کسی فیس کے تعلیم حاصل کریں گے، ہسپتال والے آپ کا مفت علاج کریں گے، سفر بلا ٹکٹ کر سکیں گے، نان نفقہ مفت، بھنگی، بہشتی، نائی، دھوبی، درزی، موچی، گرہ کٹ، کوکین فروش، کن میلئے، گورکن، کفن چور، پٹواری، ایڈیٹر، مسخرے سب کی مفت خدمات آپ کے لیے وقف ہوں گی۔ آپ کو سوا اپنی تجہیز و تکفین کے اخراجات کے کسی اور مد میں مالی زیرباری نہ ہوگی —— بشرطیکہ مرد آخرت بین کی حیثیت سے آپ نے اس کا انتظام بھی اپنی زندگی ہی میں نہ کرلیا ہو!

چنانچہ یہ امر مسلّم ہے کہ جو حرکتیں کسی فرد کے لیے جیل خانہ جانے کا موجب بن سکتی ہیں، وہی باتیں کمیٹی یا کونسل کے ممبروں کے ہر دل عزیز اور ذی اثر ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

کمیٹی کانفرنس اور اس قسم کے دوسرے اداروں کو جمہوری نظام کی پیداوار سمجھا جاتا ہے، لیکن جمہوری نظام اس وقت تک جمہوری نظام کیوں کر کہا جا سکتا ہے، جب تک اس قوم کی روایات یا میلانات جمہوری نہ ہوں جس نے اس نظام کو اختیار کیا ہو۔ ہمارے ملک میں کمیٹیوں یا کونسلوں کی کمی نہیں ہے اور ضابطہ کی رو سے آپ ان پر اعتراض بھی نہیں کر سکتے، لیکن یہ کمیٹیاں اور کونسلیں کن افراد پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان افراد کی افتاد ذہنی کیا ہوتی ہے، یہ بھی اپنی جگہ پر جانی بوجھی ہوئی چیزیں ہیں اور اس کا تو آپ کو بھی تجربہ ہوگا۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ باتیں ہوتی ہیں جو جمہوری نظام کی آڑ میں شخصی جبروت یا جماعتی تنگ نظری کی ترجمان ہوتی ہیں۔

لیکن اس قسم کی باتیں ہم آپ برابر دیکھتے سنتے آئے ہیں اور ریڈیو پر وہی باتیں دُہرائی جو اخبارات میں لکھی ہوں۔ لیڈروں کا تکیہ کلام ہوں یا یکہ بانوں کی زبان پر ہوں۔ ریڈیو پر تقریر کرنے والوں کی بدنیتی اور بدمذاقی کا ثبوت ہے۔ اسی کو بدمعاملگی بھی کہتے ہوں۔ میں بدمعاملگی کے بجائے نمک حرامی کا لفظ استعمال کرنے جاتا تھا، لیکن اس خیال سے رُک گیا کہ نمک حرامی کی فہرست یوں ہی کیا کم طویل ہے کہ اس کو براڈکاسٹ بھی کیا جائے۔

بہرحال اس قسم کی باتیں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں سے سرزد ہوتی ہیں یا نہیں، ریڈیو سیٹ کا لائسنس نہ رکھنے والوں سے غالباً ضرور سرزد ہوتی ہوں گی۔ غالباً کا لفظ میں نے

احتیاطاً استعمال کیا ہے۔اس سے آپ میرے خلوص کا اندازہ لگا سکتے ہیں —— اور میری احتیاط کا بھی۔ میری طرح آپ بھی عدالتوں یا بڑے آدمیوں سے ڈرتے ہوں تو غالباً وغیرہ، ممکن اور اس طرح کے بعض دوسرے احتیاطی الفاظ وفقروں کا ورد رکھیے۔ بعض الفاظ میں بھک سے اُڑ جانے والے مادّے کی خاصیت ہوتی ہے۔ ان کے لیے یہ الفاظ پانی کے چھینٹے کا کام دیتے ہیں۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ جس بات کو عام طور پر نہیں کرنا مقصود ہوتا، اسے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کا ایک پہلو اور بھی ہے، یعنی کوئی بات مشتبہ ہو، لیکن آپ اسے متیقن کرنا چاہتے ہوں تو اسے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجیے، وہ کام متیقن ہو جائے گا۔ کوئی بات یقینی ہو لیکن آپ اسے مشتبہ بنانا چاہتے ہوں تو کمیٹی یہ کام بھی انجام دے دے گی۔ آپ کسی شخص کو مجرم قرار دینا چاہتے ہوں اور کوئی سبیل اس کے مجرم قرار دینے کی نظر نہ آتی ہو تو یہ فرض کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجیے، کمیٹی اس کے اسلاف اور اولاد تک کو مجرم ثابت کر دے گی۔ کمیٹی اور کونسل صلح کے زمانہ میں وہی کرتی ہیں جو اسلحہ اور بارود، جنگ کے زمانہ میں کرتے ہیں!

عدالتوں میں جو چیز فردِ جرم کہلاتی ہے وہی کمیٹی یا کانفرنس میں ٹرم آف ریفرنس ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عدالت میں صفائی دینے سے آپ کے بے گناہ ثابت ہونے کا بھی امکان ہے اور آپ بری بھی کیے جاسکتے ہیں۔ کمیٹی یا کمیشن کی زد میں آپ کا جاں بحق ہو جانا مسلّم ہے۔

مثلاً کمیٹی کونسل یا میٹنگ کی کارستانیاں ملاحظہ فرمایئے۔ فرض کیجیے مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ ہندوستان کی چقندر خطرہ میں ہے، سب سے پہلے یہ خبر اخبار میں شائع کی جائے گی، نہایت جلی اور شعلہ ناک سرخیوں کے ساتھ۔ دوسرے دن سے تار آنے شروع ہو جائیں گے کہ مسئلہ چقندر پر غور کرنے کے لیے فلاں فلاں مقامات پر جلسے ہوئے جس میں چقندر زندہ باد کے نعرہ لگائے گئے اور باتفاق آرا یہ تجویز پاس کی گئی کہ ہندستانی چقندر کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی جارہی ہے اور اس کے مقابلہ میں غیر ملکی چقندر کو جو رعایتیں حاصل اور جو سہولتیں فراہم کی جارہی ہیں، اس سے تمام ملک کے چقندر بیزار ہیں۔ اگر حکومت نے چقندر کے تحفظ میں مناسب کارروائی اختیار نہیں کی تو سارے ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔

چنانچہ تجویز پاس کی گئی کہ تمام ملک میں "یوم چقندر" منایا جائے۔ "چقندر" کا جلوس نکالا جائے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس دن صرف چقندر کھائیں۔ جن کو میسّر نہ آئے وہ چقندر کی صورت بنائیں۔ عورتیں بطور فیشن اور بچے بطور کھلونا استعمال کریں۔ چقندر ریلیف فنڈ کھولا جائے۔ لیڈروں کو اس کے ہار پہنائے جائیں۔ اطبا نسخوں میں لکھیں، شعرا بطور قافیہ استعمال کریں، گویّے اس پر تان توڑیں، روشن خیال بطور آرٹ، طلبا بطور اسٹرائک، وکلا بہ شکل نظائر، پولیس بطور چقندر چارج، مصنفین بطور اردو، ہندی یا ہندستانی استعمال کریں، اور ہر شخص اس بات کا عہد کرے کہ جب تک وہ چقندر کو آزاد نہ کرا لے گا، کوئی ایسا نہ کرے گا جو روایات چقندری کے خلاف ہو۔

اس کے بعد ہی کونسل میں یہ سوال پیش ہوگا "کیا حکومت اس عام بے چینی اور ہلچل سے واقف ہے جو چقندر کی حمایت میں کنیا کماری سے کشمیر اور سندھ سے آسام تک پھیل چکی ہے۔ جواب اثبات میں ہو یا نفی میں قوم کو اپنے جذبات چقندری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کونسل کا اجلاس ملتوی کیا جائے۔ اب جن بزرگ کے پورٹ فولیو میں چقندر ہوگا، وہ فرمائیں گے۔ حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ کچھ سرکاری اور کچھ غیر سرکاری اراکین کا ایک چقندر کمیشن مقرر کر دیا جائے جو پوری تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ اس کونسل میں پیش کرے۔

چقندر کمیشن کے اراکین کی نامزدگی کا مسئلہ بعض نوعیتوں سے بڑا دلچسپ ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کون سے ممبر ایسے ہیں، جنھیں کسی اور گوبھی، گاجر، کمیٹی یا کمیشن میں جگہ نہیں ملی ہے۔ ان کے کھپانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ کونسل میں اس قسم کے مرغ، شلجم یا دال، دلیا کا انتظام نہ ہو تو قسم قسم کے ممبروں سے عہدہ برآ ہونا حکومت کے لیے مشکل ہو جائے۔

اب کمیشن کے اراکین ان مقامات کا دورہ کریں گے جہاں چقندر کا کاروبار ہوتا ہے۔ چقندر کے اعداد و شمار فراہم کیے جائیں گے۔ چقندر خوروں یا چقندر خواروں کی عمر، تعداد نمائندگی تعلیم، آمدنی و خرچ، حرکات و سکنات، توالد و تناسل کا جائزہ لیا جائے گا۔ غیر ملکی ماہرین چقندر کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ ہر ممبر اپنے اپنے سفر خرچ کا حساب لگائے گا، اور بالآخر

اس چقندر گردی کو گری کے زمانہ میں کسی پہاڑ پر ختم کر دیا جائے گا، جہاں اس کی رپورٹ تیار کی جائے گی۔

اس رپورٹ کے شائع ہوتے ہی تمام ملک میں نئے سرے سے انتشار و ہیجان برپا ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک گول میز کانفرنس قائم ہوگی۔ اس میں شریک کیے جانے کے لیے لوگ دوڑ دھوپ شروع کر دیں گے۔ کچھ لوگ چقندر کی حمایت میں بھلے مانسوں کی عزت و عافیت کے درپے ہوں گے، کچھ عوام کو ایمان و دھرم کا واسطہ دلا کر اپنا جلوس نکلوائیں گے، کچھ مسجد کے سامنے باجا بجائیں گے، کچھ آرتی پر ڈھیلے پھینکیں گے، کچھ خطبۂ صدارت تصنیف فرمائیں گے، کچھ فاقے کریں گے، کچھ تار بھیجیں گے، کچھ انٹرویو دیں گے، بقیہ بلو مچائیں گے، اسٹرائک کریں گے، جیل خانہ جائیں گے، ایک آدھ مر بھی جائیں گے۔ انجام یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض گول میز کانفرنس کے ممبر بنائے جائیں گے، اور بقیہ سنکھیا کھانے یا سرکاری گواہ بننے کی فکر کریں گے۔

دنیا میں جب تعلیم اور بے روزگاری عام ہوتی ہے تو آمدنی کے عجیب و غریب ذرائع بھی نکل آتے ہیں۔ بے روزگاری سے میری مراد معاش کا میسّر نہ آنا ہی نہیں ہے، بلکہ اکثر معقول مشغلے کا میسّر نہ آنا بھی ہے۔ کسی زمانہ میں ہمارے ہاں کھانے پینے کی کمی نہ تھی تو لوگ پتنگ اُڑاتے تھے، بٹیر لڑاتے تھے اور دوائیں کھاتے تھے۔ اب افواہیں اُڑاتے ہیں، قومیں لڑاتے ہیں اور دعوتیں کھاتے ہیں۔ پہلے معیشت تھی مشغلے نہ تھے، اب مشغلے ہیں معیشت نہیں۔ پہلے رؤسا تھے جن کے مصاحب ہوتے تھے۔ ارباب نشاط تھے اور پکے گانے تھے۔ اب لیڈر ہیں جن کے مصاحب اور ارباب نشاط بھی ہیں (توضیح سے ڈرتا اور آپ سے معافی مانگتا ہوں) پکے گانے کے بجائے قومی نعرے اور خطبۂ صدارت ہیں جن میں کہیں غزل کا لوچ، قصیدہ کا زور، رجز کا آہنگ، مثنوی کی روانی اور مرثیہ کا سوز و گداز ہے، تو کہیں تعصب کی بساند، مشیخت کی بکواس اور حسد کی سڑاند ہے۔ پہلے جو کچھ درباروں اور حرم سراؤں میں ہوتا تھا اب کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے۔ پہلے جو نصیب دشمناں تھا، اب وہی سرودمستان ہے!

کمیٹیاں اور کانفرنسیں بجائے خود معقول چیزیں ہیں لیکن معقول ہی چیزیں جب نامعقول تگ و دو کا وسیلہ بن جاتی ہیں تو شرفا کو پگڑی سنبھالنے اور بھیک مانگنے کے سوا چارہ نہیں

رہتا۔ جمہوری نظام کی جس کے یہ کمیٹی کونسل کھلونے ہیں، سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس میں نامعقول سے نامعقول بات کو بھی فروغ دینے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ لیکن یہاں میں جمہوری اور غیر جمہوری نظام کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس قسم کی بحثیں یا تو اسکول کالج کے طلبا کرتے ہیں ـــــ مثلاً فلاں شخص نے یہ کہا ہے، فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے، میں یہ کہتا ہوں وغیرہ۔ آپ مانتے ہیں تو آپ کی خوش نصیبی ورنہ...

''زمین کسان کی، آسمان نوجوان کا، کمان انسان کی، تیر شیطان کا ـــــ اور گردن آپ کی!'' لیڈروں کی بحث کا کیا پوچھنا، ان کو ہار پہنائیے، نعرے لگائیے ووٹ دیجیے اور جو جی چاہے کہوا لیجیے۔

یہاں سب سے انوکھی بحث کرنی ہے یعنی بات ایسی ہو جو گنوار، تعلیم یافتہ بچے، نوجوان، بوڑھے، خواتین، حاکم محکوم، سب کے لیے یکساں مفید اور دلچسپ ہو۔ کمیٹی کے اراکین اور ریڈیو کے سامعین دونوں کے بارہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون اور کس قسم کے لوگ ہوں۔ فرض کیجیے میں تو گنوار کو سمجھا رہا ہوں، نوجوان یہ سمجھیں کہ ان کی توہین ہو رہی ہے۔ خواتین کی طرف متوجہ ہوں تو بوڑھے بگڑ کھڑے ہوں۔ بوڑھوں کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کروں تو بچے تالیاں بجانے لگیں۔ نوجوانوں سے مخاطب ہوں تو پگڑی فریاد کرنے لگے۔ محکوم سے بولوں تو حاکم گرفتار کرے اور حاکم سے گفتگو کیجیے تو نورٌ علیٰ نور ـــــ نہ گھاٹ کا نہ گھر کا!

●●●

الیکشن

جس زمانہ کا تذکرہ میں کر رہا ہوں، اس میں قانونی عدالتیں کچھ یوں ہی سی ہوا کرتی تھیں اور حاکم عدالت بھی ضابطہ یا قانون دانی کے اعتبار سے کچھ نیاز مندی سے ہوتے تھے۔ وکیل، مختار بھی ایسے نہیں ہوتے تھے جیسے آج کل ہیں۔ آج کل کے قانون یا قانون دانوں کے کمالات دیکھ کر تو اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ افسوس تمام عمر یوں ہی گزار دی، کیوں نہ کوئی سنگین جرم کیا۔ شہرت بھی ہوتی اور بری بھی ہو جاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاً یہ خطرہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ''رب کا شکر ادا کر بھائی'' بغیر کسی جرم کے بھی تو سزا پا جاتے ہیں۔ اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ ان سے دور ہی رہا جائے۔

یہی حال ڈاکٹروں کا ہے، ان کا کمال فن یہ ہے کہ مرض سمجھ میں نہ آئے تو کوئی ایسا مرض پیدا کر دینا چاہیے جو سمجھ میں آتا ہو۔ اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ مرض کچھ ہی کیوں نہ ہو علاج کسی دوسرے مرض کا شروع کر دینا چاہیے۔ اس طور پر کوئی تیسرا مرض یقیناً پیدا ہو جائے گا اور پھر اس کو قابو میں لانے کی کوشش کر لی جایا کرے گی۔ قابو میں آ گیا تو خیر ورنہ جہاں تک مریض کا تعلق ہے، پوسٹ مارٹم کے نتائج تو آسانی سے متیقن ہو جائیں گے۔

ہاں تو میں تذکرہ کر رہا تھا اگلے زمانے کے حاکموں اور قانون دانوں کا۔ چنانچہ جن بزرگ یعنی حاکم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ آپ کی دعا سے ضابطہ یا قانون سے کچھ زیادہ واقف نہ

تھے اور وکیلوں اور مختاروں سے اتنے ہی خائف یا مشتبہ رہتے تھے، جتنا ملزم حاکم عدالت اور وکیل مختار دونوں سے۔ حاکم نے سوچتے سوچتے یہ ترکیب نکالی کہ وکیل مختار سے گلوخلاصی حاصل کر لی جائے، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ قانون کی گہری گہری ٹھوس باتوں سے دماغ یکسو نہیں رہنے پاتا، اس لیے نفس معاملہ پر صحیح رائے قائم کرنے میں دقت واقع ہوتی ہے۔ یہ بات صحیح ہے یعنی کچھ غلط بھی نہیں ہے یعنی اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ یہ بات ذرا گہری ہے اور ممکن ہے میں اسے واضح نہ کر سکا ہوں، لیکن اس سے یہ تو نتیجہ نکالا جا سکتا کہ آپ بھی کچھ نہ سمجھ سکتے ہوں یا حاکم کی نیت بخیر نہ ہو۔

چنانچہ حاکم نے وکیل مختاروں سے کہا۔ ''حضرات! آپ لوگ قانون کی ایسی بال کی کھال نکالتے ہیں کہ نفس معاملہ گاؤ خورد ہو جاتا ہے اور انصاف کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس لیے آپ لوگ خاموش رہا کیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ فریقین خود ایک دوسرے سے بحث کریں۔ یہ خود بحث کریں گے تو حق کا فرشتہ یا ناحق کا شیطان فریقین متعلقہ کے سر اور چہرہ کے اردگرد حمد، گاتا یا رقص کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اس طور پر عدالت کو صحیح فیصلہ صادر کرنے میں سہولت ہوگی۔'' وکلا نے کچھ کہنا چاہا تو گرگ باران دیدہ پیشکار نے جلتی شیشہ کی میلی عینک ناک کے پھننگ پر رکھ کر کہا، صاحبو! اس معاملہ میں آپ لوگ خاموش ہی نہیں بلکہ عدالت کے کٹہرہ سے ذرا دور ہٹ جایا کریں تو زیادہ بہتر ہوگا، ورنہ جس وقت عدالت میں انصاف کے فرشتہ یا ظلم کے شیطان کا نزول ہوگا، اس وقت ان نو واردوں کو اس کے سمجھنے میں سخت دشواری ہوگی کہ ظالم یا مظلوم کون ہے۔ عدالت، فریقین، یا وکلا؟ یہ تو کہیے حاکم کے سر پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے ورنہ آپ جانتے ہیں کہ غیبی مہمانوں کا عدالت کے کمرہ میں نازل ہونا کوئی معمولی بات ہے؟

غرض حاکم کا حکم بحال رہا۔ فریقین خود اپنے حقوق ایک دوسرے پر جتاتے اور عدالت بجائے خود کسی نتیجہ پر پہنچتی اور اسی کے مطابق فیصلہ صادر کرتی۔ کچھ دنوں یہی لیل ونہار رہے۔ حق کے فرشتے اور ناحق کے شیطان آتے رہے۔ حاکم کے سر پر خدا کا سایہ بھی قائم رہا۔ البتہ پیشکار پر وکیل مختاروں کا سایہ ذرا ضرورت سے زائد گہرا پڑنے لگا۔

ایک دن عدالت نوشیروانی کا اجلاس ہورہا تھا۔ فریقین پیش ہوئے لب ولہجہ میں حرارت پیدا ہوئی۔ حرارت سے چنگاری برآمد ہوئی۔ چنگاری نے شعلہ کا رنگ پکڑا یہاں تک کہ ایک دھما کا ہوا اور ناحق کے شیطان نے حق کے فرشتہ کو دبوچا، سر سے بلند کیا اور زمین پر دے مارا۔

فلک گفت احسن ملک گفت زہ

عدالت نے فوراً فیصلہ صادر کیا یعنی شیطان حق پر تھا اور فرشتہ ناحق پر۔

حاکم نے آرام کمرے کا راستہ لیا۔ پیشکار اور وکلا طلب ہوئے فیصلہ کی داد چاہی گئی۔ حاضرین نے تخلیہ میں نہایت ادب سے دریافت کیا کہ یہ ازغیبی فیصلہ کیوں کر صادر کیا جاتا تھا اور اس رمز سے دنیا آگاہ ہو جائے تو حق و ناحق کے جھگڑے بڑی آسانی سے طے ہو جایا کریں۔ حاکم صاحب پہلے تو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ڈھیلے پڑے اور ہر چہ بادا باد کا سا انداز اختیار کر کے مسکرا پڑے اور پھر بولے۔ ''تم کو اتنی سی بات نہیں معلوم کہ حق کی آواز کوئی دبا نہیں سکتا۔ میں فریقین کی بحث کو اتنے غور سے نہیں سنتا، جتنا ان کے لب ولہجہ اور تیور اور بحث کے انجام پر نظر رکھتا ہوں۔ چنانچہ جس کو یہ دیکھتا کہ چیخ وپکار، گالی گلوج، مار دھاڑ کے اعتبار سے حریف پر بھاری پڑ رہا ہے اسی کے موافق فیصلہ دے دیتا تھا۔ اس لیے کہ حق کی آواز کبھی دبائی نہیں جا سکتی۔''

اس راز کا انکشاف ہونا تھا کہ حاضرین پہلے تو دم بخود ہوئے پھر کسی نے حاکم کی طرف دیکھ کر سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے لگائے اور کسی نے پیشکار سے مخاطب ہو کر دھن ہے مہاراج کی، جے کار لگائی۔ حاکم کے ہاتھ چومے، پیشکار کے پاؤں چھوئے اور کانوں پر ہاتھ اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

انصاف کرنے کا یہ طریقہ ایک راز تھا جو صرف حاکم صاحب پر منکشف ہوا تھا۔ تھوڑا بہت پیشکار پر بھی۔ چنانچہ جس حادثہ یا فیصلہ کا تذکرہ ابھی ابھی کیا گیا ہے، یہ پیشکار ہی کی مخبری کا نتیجہ تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات، انصاف کا یہ طریقہ کچھ پیٹنٹ تو کرایا نہیں گیا تھا، پھر موجودہ دور کے ذرائع و وسائل آمد و رفت جیسے بے پناہ ہیں۔ وہ بھی ظاہر ہے انجام یہ ہوا کہ یہ چیز آج ساری دنیا میں پھیل گئی ہے اور اسی اصول پر دنیا میں انصاف کا کاروبار ہو رہا ہے، جس میں خدا رکھے الیکشن بھی شامل ہے۔

یہی حالت ہماری زندگی کے تمام نشیب وفراز میں پائی جاتی ہے۔اسی کو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کہتے ہیں۔اسی کا نام مسابقت رکھا گیا ہے۔اسی کو تہذیب کا علم یا تمدن کی فتح کہتے ہیں اور خدا جانے اور کیا کیا کہتے ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع تو تھا مگر بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے خود یاد نہیں آتے۔ورنہ یقین مانیے کہ کسی نہ کسی طور پر ضرور سنا دیتا۔

ہاں تو بات میں بات نکل آتی ہے، یعنی آج کی صحبت میں ریڈیو والے اس امر کے درپے ہیں کہ الیکشن کے بارے میں میرے آپ کی گلخپ ہو جائے۔آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں برسات کے موسم میں بالعموم لوگ کشتی لڑتے ہیں، جھولا جھولتے ہیں اور پھلوڑی کھاتے ہیں۔ سیلاب آیا تو درخت پر چڑھ گئے۔ ہیضہ ہوا تو اسی درخت کے بھوت یا دینت بن گئے، لیکن یہ بات تو عوام یا جہلا سے متعلق ہے۔مہذب لوگ ایسا نہیں کرتے وہ کشتی کے بجائے الیکشن لڑتے ہیں۔کونسلوں میں پینگیں بڑھاتے ہیں اور کمیٹیوں میں پکوان اُڑاتے ہیں۔سیلاب آئے یا سوکھا پڑے، یا اپنے حلقۂ انتخاب میں ماتمیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ ''مرغ شاخ درخت لا ہوتیم''

مرغ اور شاخ پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ واقعہ اکثر بے موقع ہی یاد آتا ہے، اور یہاں مجھے غیر متعلق سا بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن آپ معاف فرمائیے۔اگر میں اسے یہاں بیان کردوں تو آپ کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور میرا خلجان دور ہو جائے گا، یعنی یہ واقعہ یاد آنا بھول جائے گا۔وہ واقعہ میں سنائے دیتا ہوں۔موقع آپ تلاش کر لیجیے گا کیوں کہ ہم آپ پڑھتے آئے ہیں، گو برتنے کا کبھی موقع نہ ملا کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔

ایک دن یہی الیکشن کی فصل تھی۔ووٹ لینے کے لیے لوگ موٹر ڈنڈے، اور لڈو لیے ہوئے میری تلاش میں نکلے تھے۔صرف تین اُمیدوار تھے اور میں نے تینوں سے ووٹ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ایک سے تو اس بنا پر کہ مجھ پر اس کے روپیہ واجب تھے، دوسرے سے یوں کہ میں اس کا کاشتکار تھا اور تیسرے سے اس لیے کہ یہ شخص بات کرتے کرتے یا تو کبھی خود رو پڑتا تھا یا مجھے مار ڈالنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

ظاہر ہے ایسی حالت میں میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کہیں بھاگ جاؤں، لیکن آپ نے سنا ہوگا کہ گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔میں اتفاق سے ایک

ایسے مقام پر جا نکلا، جہاں ہر طرف عجیب و غریب قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ کہیں گراموفون بج رہا تھا، کہیں کھانے پکانے اور کھلانے کا انتظام تھا۔ ایک طرف سپیرا سانپ کے اور دوسری طرف مداری بندر، بھالو اور بکری کے کرتب دکھا رہا تھا۔ ایک طرف سبیل لگی ہوئی تھی، دوسری طرف ناچ رنگ کا سامان تھا۔ ایک جگہ کچھ لوگ لکچر دے رہے تھے۔ لکچر اور حاضرین کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید کوئی منچلا کسی سنیاسی یا فقیر کی بنائی ہوئی جڑی بوٹیوں کے خواص بتا رہا ہے۔ ابھی میں اسی حیص بیص میں تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے کہ ایک صاحب نے نہایت دوستانہ انداز میں پیچھے سے آ کر میری گردن پکڑی اور آگے پیچھے کھینچ ڈھکیل کر، جیسے رائفل میں کارتوس بھرے جاتے ہیں، بولے کیوں آپ کا نام بندو خاں ہے۔ چلیے ووٹ دیجیے اور یہ بیڑی پیجیے۔ بڑا انتظار دکھایا۔ میں نے دوستی کا اعتراف ابھی اسی حد تک کیا تھا کہ بیڑی لینے پر آمادہ ہوا تھا کہ ایک دوسرے صاحب نے مجھے اپنی طرف گھسیٹا اور بولے، خبردار! بدھو خلیفہ میرے ووٹر ہیں۔ لڑکپن میں ہم دونوں کپاس چرایا اور مار کھایا کرتے تھے، کیوں خلیفہ بھولے تو نہیں۔ ابھی میں نے پورے طور پر حافظہ کا امتحان نہیں لیا تھا نہ دیا تھا کہ ایک تیسرے بزرگ آگے بڑھے اور میرا گریبان کھینچ کر بولے، واہ میر بنّے! تم نے کنوئیں جھنکوا دیے۔ ایسا بھی کیا غائب ہونا، چلو کچھ کھا پی لو اس کے بعد مجرا سنیں گے۔ لیکن اس سارے قضیہ کا انجام یہ ہوا کہ مجھے اس کمرے میں لے گئے جہاں ووٹروں کی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ اصلی شخص جس کا ووٹ پڑنے والا تھا، بندہ حسن تھا۔ کلرک نے پوچھا، بندہ حسن کون ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے آگے بڑھا کر کہا، صاحب! ان کا اصلی نام بندہ حسن ہے لیکن یہ نام ماں باپ نے رکھا تھا، ورنہ عام طور پر ان کو بندو خاں کہتے ہیں۔ دوسرے نے کہا، ارے بھائی اللہ سے ڈرو۔ بدھو خلیفہ ہمیشہ سے بدھو خلیفہ ہیں۔ اسی نام سے ووٹ دیں گے۔ تیسرے نے لپک کر للکارا، ارے لوگو خدا سے ڈرو یا نہ ڈرو حوالات سے تو ڈرو۔ میرے بنّے کو بدھو خلیفہ کہتے شرم نہیں آتی۔ کلرک نے گھبرا کر مجھ سے پوچھا۔ آخر تم کیسے چپ ہو، تم ہی بتاؤ تمھارا کیا نام ہے۔

میں نے کہا، حضور اپنا اصلی نام تو مجھے بھی ٹھیک نہیں معلوم، لیکن کشتی لڑتا تھا تو اکھاڑے میں بندو خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ غازی میاں کا علم اُٹھانے لگا تو بدھو خلیفہ کہلایا۔

اب نفیری بجاتا اور فیرینی بیچتا ہوں تو لوگ میر ہنسے کہنے لگے۔'' کلرک بھی زندہ دل تھا۔ بولا،
''تم نے آنے میں جلدی کی، ورنہ یہی لوگ تم کو اس ممبر کی حیثیت سے پیش کر دیتے جس کے تم
ووٹر سمجھے جاتے ہو، لیکن اب یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ ورنہ تمھاری خیر نہیں!

میں بھاگا اور سارا مجمع میرے پیچھے ہولیا۔ ایک ہلڑ مچ گیا اور مشہور یہ ہوا کہ میں بچوں کو
چرا لے جایا کرتا ہوں۔ قریب تھا کہ مجمع کے ہاتھوں صبر وشکر قسم کی کوئی چیز بن جاتا کہ میں ایک گلی
میں ہولیا اور شور مچایا کہ پولنگ اسٹیشن پر بلوہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجمع پولنگ اسٹیشن کی طرف روانہ
ہو گیا اور میں بھاگتا گرتا پڑتا سامنے ایک عالی شان عمارت تھی، اس میں داخل ہوا اور بے ہوش
ہو گیا۔ یہ جانوروں کا عجائب خانہ تھا۔ دوسرے دن آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ قریب
ہی ایک اخبار رکھا تھا جس میں نہایت جلی حرفوں سے یہ خبر درج تھی ـــــ'' کونسل ہال میں ایک
انارکسٹ کا حملہ اور دربان کی عدیم المثال بہادری'' یہ باتیں تو بقول چہار درویش یا فسانہ عجائب
''اے حاضرین باتمکین و صاحبان صدر نشین'' اپنی جگہ پر رہیں اور آپ انھیں اپنی جگہ پر رہنے نہ
دیں گے تو کیا مجھے جیل خانہ بھجوا دیں گے۔ بات اصل یہ ہے کہ الیکشن بہت اچھی چیز ہے۔ خدا کی
دین ہے یعنی اللہ دے اور بندہ لے۔ اس محاورہ کے استعمال میں ممکن ہے مجھ سے غلطی ہوئی ہو،
لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ الیکشن نہایت اچھی
چیز ہے یہ اور بات ہے کہ ابھی ہندوستان کی فضا اس کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یہاں الیکشن میں
بالعموم اسی کی فتح ہوتی ہے جس کے پاس روپیہ ہے یا جس سے لوگ ڈرتے ہیں۔ ووٹروں کو فکر د
عمل کی آزادی نہیں ہے۔ مستثنیٰ حالتوں کے علاوہ یہاں کامیاب ممبر کے بارہ میں یہ کہنا ذرا مشکل
ہے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب کا صحیح نمائندہ ہے۔ اس کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے
ہیں کہ وہ الیکشن کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس بے روزگاری کے دور میں الیکشن نفع بخش چیز ہے۔
مثلاً آپ کسی کے مقابلہ میں کھڑے ہو کر خوب ہنگامہ مچائیے، دولت مند امیدوار آپ کو روپے
دے دلا کر بیٹھ رہنے پر راضی کر لے گا۔ اس کے بعد آپ اس کے کارکن بن جائیں گے تو اور
روپے مل جائیں گے۔ آپ ذرا ایمان دار قسم کے آدمی ہوں تو کوئی قومی ادارہ کھول دیجیے، مثلاً

مدرسہ، یتیم خانہ، پنجرہ پول وغیرہ، اور کہیے کہ آپ کے ادارہ کو ہزار پانسو روپے دلائے جائیں تو آپ بیٹھ رہیں گے۔ روپے مل جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس سلسلہ میں اپنی زیر باریوں کی تلافی کے لیے زرعطیہ سے کچھ نہ کچھ وصول ہی کر لیں گے اور اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے کہ آپ اتنے خوش قسمت نہیں ہوں گے کہ اتنی ذرا سی رقم سے آپ کی تمام زیر باریاں دور ہو جائیں۔

اب رہا یہ امر کہ الیکشن نہ ہو تو کیا ہو، اس پہ مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ کسی گاؤں میں ایک لال بجھکو رہتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی سخت معاملہ پیش آ گیا، جس کو سلجھانے کے لیے لوگ لال بجھکو کے یہاں ایک وفد لے گئے۔ لال بجھکو سے کون نہیں واقف ہے۔ بہت ممکن ہے اس وقت آپ اس کے آس پاس بیٹھے ہوں اور اپنا نام سن کر کان کھڑے کریں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ جس کے کان نمایاں دیکھیں ان کو لال بجھکو قرار دے دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کانوں سے لال بجھکو کا کان، ناک، آنکھ، زبان کسی سے کوئی واسطہ نہیں، وہ صرف عقل سے کام لیتے ہیں۔ لال بجھکو عقل سے جس قسم کا کام لیتے ہیں اس قسم کا کام عقل سے دوسرے نہیں لیتے، لیکن یہاں کچھ خلطِ مبحث ہو رہا ہے۔

واقعہ صرف یہ ہے۔ گاؤں والے ایک مشکل میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ ایک وفد لے کر لال بجھکو کے ہاں گئے۔ لال بجھکو نے سارا واقعہ سن کر ایک چنگھاڑ ماری اور زار و قطار رونے لگے۔ ابھی لوگوں کا تعجب ختم نہیں ہوا تھا کہ موصوف رُکے، اور ایک لخت قہقہہ مار کر ہنسے اور ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں نے جذبات کے اس نشیب و فراز کی حقیقت دریافت کی تو لال بجھکو یوں گویا ہوئے، ''بھائی! رویا تو یہ سوچ کر کہ اب اس گاؤں کے ایسے بُرے دن آن لگے ہیں کہ لوگ ذرا سی بات پر مجھ سے رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر میں مر جاؤں تو کیا ہو اور ہنسا یوں کہ وہ بات میری بھی سمجھ میں نہ آئی۔''

(علی گڑھ میگزین۔ تعطیلات نمبر، 1936)

●●●

عدالت

تو صاحبو!

گرم بازار فوج داری ہے!

حکومتوں میں فوج داری، ریاستوں میں فوج داری، تعلیم گاہوں میں فوج داری، کارخانوں میں فوج داری، تیوہاروں میں فوج داری، مسجد و مندر میں فوج داری، اردو ہندی میں فوج داری — یہاں فوج داری، وہاں فوج داری — اور کہیں کہیں خدائی فوج داری!

لات مکّے چل رہے ہیں، لاٹھیاں چل رہی ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، تلواریں چل رہی ہیں، قلم چل رہا ہے، زبان چل رہی ہے، دماغ چل رہا ہے، جوتے چل رہے ہیں — کہیں کہیں سے پیٹ چلنے کی بھی خبر آجاتی ہے!

ان سب سے نپٹنے کے لیے عدالتیں، لنگر خانے، شفاخانے اور چندے کی فہرستیں کھلی ہوئی ہیں!

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوج داری ہے

لیکن جن فوج داریوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے، وہاں شاعری کا دخل نہیں ہے۔ تعزیرات ہند و ضابطہ دیوانی کی کارفرمائی ہے۔ عدالت ناز کے بجائے فوج داری اور دیوانی کی

عدالتیں ہیں۔ فوج داری اور دیوانی ہی کی نہیں فوجی عدالتیں بھی — قومی عدالتیں، مذہبی عدالتیں، تجارتی عدالتیں، اخباری عدالتیں — جابجا اندھا دھند عدالتیں بھی — ان میں کہیں فریقین مقدمہ ہیں حاکم نہیں ہے، وکلا ہیں فریقین مقدمہ نہیں، حاکم ہیں توانین نہیں، بعض ایسی بھی ہیں جہاں سزائیں ہیں اور کچھ نہیں!

ایک بات ضرور قابلِ اطمینان تو نہیں، قابلِ لحاظ ضرور ہے وہ یہ کہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کا عدالت کچھ بگاڑ نہیں سکتی، لیکن وہ چاہیں تو سب کچھ بگاڑ دیں، یعنی ظلِ اللہ۔ ان میں مَیں یقیناً نہیں ہوں۔ ممکن ہے آپ ہوں، بادشاہ خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ ہم آپ خدا کے سایہ میں ہیں۔ اس لیے ہم آپ کا خدا ہی حافظ ہے! دوسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ عدالت کی زد میں عاقل و بالغ ہی آتے ہیں۔ اب آپ دیکھ لیجیے اگر یہ صفات آپ میں نہیں ہیں تو آپ بھی عدالت سے پناہ میں ہیں اور بقیہ ہم سب آپ سے پناہ خواہ ہیں۔ پاگل اور نابالغ کو عدالت کے سپرد نہیں کرتے۔ اسے پاگل خانہ یا تعلیم گاہ میں بھیج دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ پاگل خانہ پہنچ کر حواس میں آجانے کا بھی امکان ہے، تعلیم گاہوں میں امتحانات اور اسٹرائک کی زد میں رہے سہے حواس بھی زائل ہو جاتے ہیں۔

عدالت کے سلسلہ میں پاگلوں کے رُتبہ سے تو آپ واقف ہوں گے۔ اب میں ایک اور بزرگ کا آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں، یعنی سرکاری گواہ۔ یہ جتنے زیادہ قابلِ گردن زدنی ہوں گے، اتنے ہی زیادہ عدالت کے مراعاتِ خصوصی کے سزاوار۔ انھیں کے باب میں کہا گیا ہے:

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ریڈیو سرکاری چیز ہے اور میں ریڈیو کا آوردہ ہوں۔ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے۔ زبان اور محاورہ کا پیچ نہ ہوتا تو میں یہ کہنے کے بجائے کہ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے، یہ کہتا کہ آپ کس شمار و قطار میں۔ بہرحال اگر آج کی عدالت گفتاری میں، شیطان کے کان بہرے، کوئی نوع دیگر ہوا تو آپ یقین مانیے میں فی الفور سرکاری گواہ بننے کی درخواست کروں گا۔ شیطان کے کان بہرے کہنے کو میں کہہ گیا لیکن اگر کوئی صاحب یہ خیال کرتے ہوں کہ میں نے شیطان

کے ساتھ زیادتی کی تو میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ عدالت میں میرا سابقہ شیطان یا اس کے کسی دوست سے ہو! عدالتوں میں فرشتوں کی یوں ہی کیا کمی ہوتی ہے کہ میں ان بزرگ کو دعوت عدالت آزمائی دوں!

''سرکاری گواہ'' بننے کے جو حقوق مجھے حاصل تھے، ان کا میں نے تذکرہ کر دیا ہے، لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ ریڈیو والوں کو سرکاری گواہ بننے کا زیادہ حق پہنچتا ہے۔ کیوں کہ وہ مجھ سے آپ سے کہیں زیادہ سرکاری واقع ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اوروں کے مقابلہ میں ان کو سرکاری گواہ بننے کا حق شفع حاصل ہے۔ بہر حال موقع آنے پر دیکھا جائے گا۔ کیا معلوم اونٹ یا عدالت کس کل بیٹھے!

ہاں تو قوانین اَن گنت ہیں۔ مذہب کا قانون، اخلاق کا قانون، فطرت کا قانون، حکومت کا قانون، تجارت کا قانون، معاشرت کا قانون، جماعت کا قانون، اداروں کا قانون۔ اسی طرح خاندان، دولت، افلاس کا قانون، نوجوانوں کا قانون، بوڑھوں کا قانون، غرض زندگی کی مکڑی جتنے تانے بانے بنتی تانتی رہتی ہے، ان سب کے قوانین علاحدہ ہیں اور علاحدہ علاحدہ عدالتیں بھی۔ اس بھول بھلیاں سے جو شخص سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ باہر نکل آئے، اسی کو ہم سب سے بڑا آدمی کہتے ہیں!

''قانون کی تاریخ'' بڑی دلچسپ ہے۔ غور تو کیجیے جب دنیا پہلے پہل آباد ہوئی ہوگی اس وقت کے قانون کیا ہوں گے، اور اب جبکہ دنیا کی آبادی کی کوئی حد نہیں، اس کے قوانین کیا ہیں۔ کچھ اور نہیں تو اسی پر غور فرمائیے کہ پہلے آبادی بڑھانے کے اصول برتے جاتے تھے اور اب آبادی گھٹانے کے لیے کیسے کیسے فوجی اسلحات کام میں لائے جاتے ہیں، یا اخباری آلات وی پی ہوتے ہیں۔ پہلے انسان فطرت کا غلام تھا اب فطرت کو اپنا غلام بنانے کی فکر میں ہے۔ پہلے پیٹ بھرنے کے لیے شکار کرتا تھا، اب اقتدار بڑھانے کے لیے جنگ کرتا ہے۔ پہلے طاقت کا نام قانون تھا، اب قانون کا نام طاقت بتاتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن بات جہاں کی تہاں ہے۔ (طاقت کی کارفرمائی پہلے بھی تھی اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو کام پیتر ے سے لیتے تھے، اب وہی کام آداب تسلیمات

سے لیتے ہیں) پہلے جس واقعہ کا اظہار ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' ایسے بھدے جملے یا محاورہ سے ہوتا تھا وہی اب شاد کے شعر سے ہوتا ہے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی [1]
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے!

لیکن جس طرح قانون اور عدالت کی زد میں محض مقدمات کا دوران بڑھتا رہتا ہے (اور فیصلہ کی نوبت اس وقت آتی ہے جب فریقین مقدمہ کا بجائے خود فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے) اسی طرح آج کی تقریر میں محض قانونی عدالت کا دوران بڑھتا رہا اور ''خلاصہ فریاد کی'' نوبت نہیں آئی۔ اس لیے میں تمہید کو چھوڑ اصل مقدمہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

میرا عدالتوں سے تعلق رہا ہے۔ ''ہسپتال'' میں بھی مدتوں رہا۔ اس لیے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہیے کہ میں یونیورسٹی میں کیوں ہوں، لیکن اس سے آپ یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکال سکتے کہ میرا عدالت سے متعلق ہونا ہسپتال جانے کا باعث ہوا۔ جو عدالت کی زد میں آ جاتا ہے، اسے ہسپتال اور یونیورسٹی دونوں سے بہتر مقام پر بھیجتے ہیں۔

میں نے پنچ مجسٹریٹوں کے وہ زمانے بھی دیکھے ہیں جب نہ مجسٹریٹ قانون جانتے تھے اور نہ عورتیں لپ اسٹک، مختار وکیلوں کے پاس پشتینی بستے اور تانگے کی عینکیں ہوتی تھیں۔ جب بائیسکلیں صرف کپتان قسم کے لوگوں کے پاس ہوتی تھیں اور وہ کہیں معائنہ کو آتے تھے تو تھانہ دار صاحب ان کی بائیسکل اس طور پر پکڑ کھڑے ہوتے تھے جیسے کوئی نیاز مند دیہاتی کسی شریر اور منہ زور گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے جھکا سمٹا اس طور پر کھڑا ہوتا تھا کہ گھوڑا اذ را چکا اور یہ باگ چھوڑ کر بھاگا۔

اسی زمانہ کے ایک بڑے سن رسیدہ پنچ مجسٹریٹ صاحب کا تذکرہ ہے جو ایک آنکھ بعض حواس اور دونوں پاؤں سے معذور تھے۔ معدہ کے مریض اور بنیے کے مقروض تھے۔ ڈاک بنگلہ میں اجلاس ہوتا جہاں ایک قبہ دار پالکی پر لاد پھاند کر پہنچائے جاتے۔ پالکی ایسی تھی جس کی چار گھنٹے پہلے سے مرمت شروع ہوتی تو دو گھنٹے کے لیے کام دے جاتی۔ مدعی مدعا علیہ

[1] شاد عظیم آبادی

اوران کے حوالی موالی کہار کا کام دیتے۔ مختار، وکیل صاحبان جلو میں چلتے۔ مجسٹریٹ صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے اور بیکھوں میں سماتے تھے۔ کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہا تھا، اس لیے وزن میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ بیٹھتے تو پالکی کے بیچ ہی میں تھے، لیکن جدھر مدعالیہ ہوتا اسی طرف تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے۔ اس طور پر دور سے دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے کہ فریقین میں مدعی کون ہے اور مدعالیہ کون۔ کچھ حاکم کا وزن کچھ زمین کی کشش کچھ پالکی کی بوسیدہ سیٹ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجسٹریٹ صاحب کا کولھوں سے اوپر تک کا بہت کچھ حصہ ایک گٹھری کی صورت میں پالکی کی پٹی سے نیچے نظر آتا۔ یہاں تک کہ آپ آسانی سے دیکھ سکتے تھے کہ پالکی کی سیٹ کی مستحکم بنانے کے لیے کن کن چیزوں سے مدد لی گئی تھی، مثلاً انگوچھا، نواڑ، دوائن کی رسّی، برگد کے گدّے دور سے پالکی ایسی نظر آتی تھی، جیسے کسی قبہ دار مزار کا عکس پانی میں پڑ رہا ہے۔

پیچوان کا ایک سرا حاکم کے منہ میں ہوتا اور بقیہ متعلقان مقدمہ کے پاس۔ ڈاک بنگلہ دور تھا حقہ پیتے، خواب دیکھتے، وکلا کی بحث سنتے چلے جاتے اور کچہری پہنچتے پہنچتے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیتے۔ واپسی میں اس کی اپیل بھی سن لیتے اور حسب مصلحت کبھی فیصلہ بحال رکھتے اور کبھی مسترد کر دیتے!

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے واقعے آپ کو سنانا شروع کر دوں تو ممکن ہے آپ کی دلچسپی بڑھ جائے، مگر میرا خطرہ میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے۔ امکان کو یقین پر ترجیح دینا بڑی ''غیر عدالتی'' بات ہے، اس لیے میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ آج کل کی عدالتوں کی مثال آج ہی کل کے ڈاکٹروں یا مزاروں سے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح آپ کسی مزار پر جائیں تو قدم قدم پر مجاور اور دربان آپ سے کچھ نہ کچھ ''چراغی'' وصول کرتے جائیں گے اور وقتاً فوقتاً دعائیں اور گالیاں بھی دیتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ آپ کی جیب خالی اور حواس مختل ہو جائیں گے یا جس طرح ڈاکٹروں سے سابقہ ہو تو تمام اعضائے رئیسہ ورذیلہ کا امتحان یا ان میں سے بعضوں کی قطع برید یا قلع قمع کراتے کراتے آپ دیوالیہ ہو جائیں گے یا از کار رفتہ۔ اسی طرح عدالتوں میں بھی چپراسی، کلرک اور وکلا کی دار و گیر سے فریقین مقدمہ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

مقدمات کی مثال بعض ایسے امراض سے دی جا سکتی ہے جن کا علاج بڑا قیمتی اور انجام ہمیشہ افسوس ناک ہوتا ہے۔ وکلا اور حکام دونوں واقعات سے اتنا سروکار نہیں رکھتے جتنا کہ دفعات سے۔ بڑی سے بڑی اور آخری سے آخری عدالت تک صرف قانونی موشگافی ہوتی ہے۔ اس طور پر فریقین مقدمہ کی دادرسی ہوتی ہو یا نہیں قانون کو تعبیر و تاویل کی چرخ دے دے کر تصوف یقیناً بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ اب فی نفسہ عدالت کا کام واقعہ کی تول پرکھ نہیں بلکہ دفعات قانون کی تول پرکھ رہ گیا ہے۔ ہم فریقین مقدمہ کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ دفعات قانون کے ساتھ تصوف آزمائی کرتے ہیں اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے مریض کی جان بچانے یا تکلیف دور کرنے کے بجائے طبیب تحقیق مرض پر پوری کوشش صَرف کر دے۔

جس طرح ریاضیات (Mathematics) ایسا نپا تلا علم بھی ترقی کی آخری منزلوں تک پہنچ کر صرف تصوف بن کر رہ جاتا ہے، اسی طرح عدالتوں کا کام دادرسی کے بجائے قانون آزمائی رہ گیا ہے۔

چپراسی، محرر، وکیل، حاکم، فریقین مقدمہ، بیانات، جرح، بحث، سمن وارنٹ دوران مقدمہ، ان سب کی ترکیب استعمال یا ترتیب انجام مستقل عنوانات ہیں، جن پر اس مختصر عرصہ میں اظہار خیال ناممکن ہے۔

آخر آخر میں آپ اتنا البتہ سمجھ رکھیے کہ سزا اور قانون کے دو بنیادی اصول یہ ہیں۔ یعنی جو بات کہی جائے اسے کوئی نہ مانے یا جو بات منع کی جائے اسے کوئی کر گزرے۔ انہی اصولوں کے ماتحت شیطان راندہ درگاہ ہوا اور حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔ عدالت کا کام یہ ہے کہ وہ قانون کی اسی دو پہیا گاڑی کو لڑھکاتی رہے۔ اسی گاڑی پر دنیا کے سارے کھیل کھلونے لادے ہوئے ہیں اور گاڑی نامعلوم منزل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ گاڑی بان کا فرض راستہ کے نیچے اونچے کو دیکھتے ہوئے گاڑی کو ہانکتے رہنا ہے۔ گاڑی کہاں جائے گی، گاڑی کے پہیے کیسے ہیں، گاڑی کی ساخت کیا ہے، راستہ کی دشواریوں سے گاڑی کو کیوں کر گزارا جائے گا، ان تمام باتوں کی ذمہ داری قانون بنانے والے اور منزل کے متعین کرنے پر ہے۔ گاڑی بان کو ان باتوں سے سروکار نہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاڑی کے پہیے اور اس کے متعلقات کاٹ کباڑ کی ہوتی ہیں، لیکن اس میں طاقت اسٹیم یا بجلی یا منہ زور جانور کی پہنچادی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں گاڑی پہلے ہی دھچکے میں پاش پاش ہو جائے گی۔ کبھی انجن کو اسٹیم یا بجلی کے بجائے بیل، گدھوں سے کھنچوانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بیل گدھے تھک کر تباہ ہو جاتے ہیں اور انجن جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہوائی جہاز اور اسٹیم انجن کے چلانے والے کو چھکڑا اور بہلی ہانکنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں کس کا کیا انجام ہوگا۔

(نگار۔ جولائی1939)

●●●

بیمہ کا ایجنٹ

میں نے بیمہ کے مسئلہ پر کچھ بہت زیادہ غور نہیں کیا ہے، خودکشی پر کیا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی ہیں۔ بیمہ اور خودکشی میں دور کی نسبت ضرور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کی وضاحت نہ کرسکیں یا ایسا کرنا خلاف مصلحت ہو، بیمہ کا تعلق بیمہ سے کم اور ایجنٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خودکشی کا جان سے کم اور پولیس سے زیادہ۔ اس لیے بہتری ہے کہ ایسے مواقع سے دور ہی رہا جائے جہاں بیمہ ایجنٹ اور پولیس سے سابقہ پڑنے کا اندیشہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ان دونوں کا موجود ہونا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا کہ ان سے سابقہ پڑنا دردناک بھی ہے اور خطرناک بھی!

میرا خیال ہے کہ آپ میں سے بیش تر اصحاب بیمہ کے مفہوم سے آشنا ہوں گے۔ یہ زمانہ بے روزگاری اور روشن خیالی کا ہے۔ ہمارے سننے والوں میں سے اکثر اصحاب بے روزگار ہوں گے، بعض روشن خیال بھی۔ بہت ممکن ہے بعض بے روزگار بھی ہوں اور روشن خیال بھی۔ ان کی بارگاہ میں میرا سر نیاز خم ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں جب بھوک میں روشن خیالی کا اضافہ ہوجاتا ہے اُس وقت صلح پسند لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر ریڈیو پر تقریر کرنے دہلی کا سفر نہیں اختیار کرتے۔ میں نے سنا ہے کوئی بیمہ ایجنٹ بھی ایسا نہیں کرتا۔

بہر حال یہ تو ریڈیو ہے جو ہر قسم کے لوگوں کے مذاق کا لحاظ رکھتا ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا مذاق ہے۔ اس لیے مجھے کچھ نہ کچھ اور جلد سے جلد بیمہ کے بارہ میں ہاں ناں کرہی دینا چاہیے۔ میرے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ جیتے رہیے تو تاوان دیجیے اور مر جائیے تو تاوان دیجیے۔ کمپنی آپ کے جینے کی دعا گو رہتی ہے اور ورثا آپ کے مرنے کے منتظر۔ چوں کہ مرنا جینے سے زیادہ یقینی ہوتا ہے، اس لیے لوگ اپنی زندگی ہی میں اپنی جانوں کا بیمہ کرا لیتے ہیں۔ اس سے حق بخشوانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بیمہ، بیوی بچوں کو بچانے کے لیے کراتے ہیں اور خودکشی بیوی بچوں سے بچنے کے لیے۔ آپ کے لیے دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ بیمہ ہم اس لیے کراتے ہیں کہ موت کا کوئی وقت معین نہیں ہے اور بیوی بچوں سے مفر نہیں، خودکشی اس لیے کرتے ہیں کہ بے وقت کی موت کے الزام سے بچیں، خودکشی ہمیشہ ناپسند کی گئی ہے۔ بیمہ کمپنیاں بھی اس حرکت کو ناپسندیدہ سمجھتی ہیں۔ لیکن بیمہ کرانا ہمیشہ بہتر سمجھا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ خودکشی میں بھی معین ہوتا ہے اور شادی میں بھی۔ آپ تو جانتے ہیں آج کل اچھی شادی اسی وقت ہو سکتی ہے جب آپ کی جان بڑی قیمتوں پر بیمہ ہو چکی ہو۔ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند لوگ اور اس میں شوہر اور بیویاں خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔ ہمیشہ اس امر کا خیال رکھتے ہیں کہ فریق ثانی کی جان کو بیمہ کمپنیاں کس حد تک قابل التفات سمجھتی ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی قیمتی پالیسی ہے تو پھر آپ کو اپنے اس نسب نامے کی طرف سے متردد نہ ہونا چاہیے، جسے آپ کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں یا جس کی تصنیف میں آپ کو بعض دقتیں ناقابلِ عبور معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ مریض بھی ہوں تو نورٌ علیٰ نور۔ پھر آپ کو خواہ مخواہ خودکشی بھی نہ کرنی پڑے گی۔ گو میرا خیال ہے کہ بعض اس قسم کے لوگ بھی دیکھے گئے ہیں جو تندرست رہ کر اتنے دن زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ جتنا وہ بیمار رہ کر زندہ رہے! اس گفتگو کے بعد آپ غالباً اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے کہ بیمہ ورثا کے لیے مفید ہے، اور خودکشی کرانا کاتبین کے لیے خوش آئند!

آج کل معقول باتوں کا نام لے لے کر بعض نامعقول لوگ جس بے دردی و بے حیائی سے شرافت، سنجیدگی، عقل، خلوص، ایمان و اخلاق کے گلے پر چھری پھیرتے ہیں، اس کا اندازہ

آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ فی الحال تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس شخص کو آپ زک پہنچانا چاہتے ہوں یا جس کی جان عذاب میں ڈالنا چاہیں، اس پر کسی بیمہ ایجنٹ کو مسلط کر دیجیے۔ پھر اگر وہ شخص اپنے حواس میں رہ جائے، یا اس پر نان نفقہ کا دعویٰ نہ ہو تو میں سمجھوں گا کہ وہ شخص یا تو وزیر اعظم ہے یا اردو کا کوئی بڑا ہی شورہ پشت شاعر!

آپ بیمہ ایجنٹ سے واقف نہ ہوں گے تو چھلاوا کا نام تو کم سے کم ضرور ہی سنا ہوگا۔ رات کا وقت بالخصوص جب کہ ملک میں ہر چہار طرف بیداری کے آثار پیدا ہوں اور ریڈیو نے چھلاوے کا امکان بہت بڑھا دیا ہو۔ ان بزرگ کا نام لینا خطرہ سے خالی نہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ اپنی مخصوص شکل کے علاوہ جس شخص کا حلیہ چاہیں اختیار کر لیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک صاحب شب میں کہیں سے گزر رہے تھے، ان کی ملاقات ایک دوسرے معقول صورت بزرگ سے ہوئی۔ معمولی علیک سلیک پر اکتفا نہ کر کے دونوں نے معانقہ کی ٹھانی۔ اب جا کر معلوم ہوا کہ ایک صاحب تو جوں کے توں ہیں دوسرے بزرگ کا ہاتھ اور چہرہ بوڑھی بکری جیسا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ چیخ کر بھاگے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ان کے ایک ساتھی مل گئے ان سے سارا حال کہہ سنایا۔ انھوں نے ان سے بڑی ہمدردی کی اور ان کے اصرار پر ان کے ہمراہ بھی ہوئے۔ اثنائے گفتگو میں دوست نے پوچھا کیوں بھئی اس کی شکل تمھیں ٹھیک یاد ہے کیسی تھی۔ یہ غریب بتانے پر آمادہ ہوئے ہی تھے کہ انھوں نے خود وہی منظر پیش کر دیا، یہ بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں آپے میں آئے اور کچھ دور بڑھے تھے کہ ان کے پڑوس کا ایک آدمی ملا، اور ان کی منت سماجت سے متاثر ہو کر انھیں گھر پہنچا دینے پر آمادہ ہو گیا۔ جب یہ بالکل اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے تو اس نے کہا، دیکھو تم کس واہمہ میں مبتلا تھے، اب اس کا پتہ نہیں ہے۔ یہ کہہ کر مصافحہ کرنے اور شب بخیر کہنے کی نوبت آئی تو دیکھتے کیا ہیں کہ ہتھیلی اور اُنگلی کے بجائے بکری کی کُھر ہاتھ میں ہے اور اسی کا چہرہ سامنے۔ غریب چیخ مار کر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ اندر سے اعزا بھاگے ہوئے آئے۔ لاد پھاند کر مریض کو گھر میں لائے۔ بڑی دیر میں ہوش آیا، واقعات سنے گئے۔ بیوی نے بہت کچھ تسکین دی، جب یہ کچھ ہوش حواس میں آئے تو بیوی ہی کو چھلاوا کا مثنیٰ پایا۔ یہ وار سب سے کاری ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ غریب۔

کے قائل ہو کر آنجہانی ہو گئے۔ یہ روایت تھوڑی سی مختلف ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اصلی چھلاوہ پہلے ملتا ہے اس کے بعد کے بقیہ تمام سب اسی کی ذرّیات ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے یہ کہتے ہیں کہ پہلے نقلی ملتے ہیں، جان لیوا آخر میں ملتا ہے۔ بہر حال ہمارے دوست کا جو حشر ہوا وہ ان روایات کے سبب سے مشتبہ ضرور ہے — اور ہاں مجھے اُمید ہے آپ میں سے کوئی صاحب دام چھلاوہ کی ترکیب سے چھلاوہ نہ بن جائیں گے۔ بحث یہاں مضاف، مضاف الیہ کی نہیں ہے بلکہ محض بیمہ ایجنٹ کی اور آپ کو کیا معلوم جو شخص کسی بیمہ ایجنٹ کی زد میں ہو، اس کے لیے مضاف و مضاف الیہ قسم کے آداب تسلیمات سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔

میں نے ایک دفعہ اپنی زندگی بیمہ کرائی تھی۔ روپے ادا کرنے کا وقت آیا تو بیمار پڑ گیا۔ چنانچہ جو کچھ بیمہ کمپنی کے نذر ہونے والا تھا، ڈاکٹروں کے پاس پہنچ گیا۔ انجام یہ ہوا کہ میں بچ گیا اور بیمہ سوخت ہو گیا۔ بچنے کو تو میں بچ گیا لیکن معلوم نہیں مرے حلیہ میں کیسا تغیر ہو گیا کہ بیمہ ایجنٹوں کے زغہ میں آ گیا، اور ایسے ایسے لوگ میری جان کے درپے ہوئے جن کو میں نہایت شریف اور معقول سمجھتا تھا، لیکن وہ نکلتے تھے ایجنٹ۔ آپ یقین مانیں ایک عرصہ تک مری وہی حالت رہی جو کسی ایسے شخص کی ہوتی ہے جس کا سابقہ چھلاوہ سے ہو چکا ہو۔ آخر آخر میں تو میں نے ایسے ماہرین فن کی خدمات حاصل کر لی تھیں جو مجھے پہلے سے یہ بتا دیتے تھے کہ ان میں کون بیمہ کمپنی کا ایجنٹ تھا اور کون — محض ملنے والا۔

اس واقعہ کا اثر اب بھی مجھ پر کچھ نہ کچھ باقی ہے۔ میرا سابقہ اکثر ایسے لوگوں سے بھی رہتا ہے جنھیں عرف عام میں بڑے آدمی کہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا نام اخبار میں پڑھتا ہوں کسی کے نام کا نعرہ سنتا ہوں اور کسی کے کرتوت بھگتتا ہوں۔ لیکن جلد یا بہ دیر ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ اصل میں یہ نام نہاد بڑے لوگ صرف چھلاوہ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسے نجیب الطرفین چھلاوہ جو بیمہ ایجنٹ ہونے کے بھی قابل نہیں۔ آپ میری باتوں یا ان ریڈیو والوں کی ستم ظریفی پر نہ جائیں، بلکہ خود اس کا تجربہ کر لیں۔ جس شخص کو یہ دیکھیے کہ یہ بعض خاص خاص قسم کے نام یا فقرے دُہراتا ہے، کبھی روتا ہے، کبھی چیختا ہے، کبھی گڑگڑاتا ہے، کبھی ہم کو ہماری حالت زار بھاتا

ہے۔ یا اپنی حالت زار سناتا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے کے لیے اپنے باپ کو اپنی کمزوری، اپنے بزرگوں کو احمق، اپنے روایات کو خرافات، اپنی نیک بخت کو حالی کا مسدس اور دوسروں کی جواں بخت کو حافظ کی غزل قرار دیتا ہو، بس سمجھ لیجیے،

فهو الجهلاوه

آپ معاف فرمائیں، میں یقیناً موضوع گفتگو سے دور جا پڑا ہوں۔ اصل بحث غالباً یہ تھی کہ بیمہ ایجنٹ کی اوقات کیا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، آج کل بیمہ ایجنٹ بھی عجیب مصیبت میں مبتلا ہیں۔ سب سے بڑی دقت ان کے لیے یہ ہے کہ لوگ مرتے کم ہیں، اور قربانی زیادہ کرتے ہیں۔ قربانی سے یہاں مراد وہ قربانی نہیں ہے جو آخرت کی نیت سے کی جاتی ہے۔ بلکہ یہاں اس قربانی سے مراد ہے جو اسی دنیا میں کی جاتی ہے اور یہیں اس کا حساب بے باق ہو جاتا ہے۔ یہ قربانی قوم اور ملک کو سدھارنے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ قربانی کا وقت آ گیا ہے۔ برخاست ہو جاؤ یا تنخواہوں میں تخفیف کرو، اسلحات جنگ میں زیادتی کرو، معدہ خالی رکھو، دل کو بہلاؤ، اپنے کو غاصب دوسروں کو غازی سمجھو اور خبردار! اپنی موت اور دوسروں کی زندگی برحق سمجھو۔

ایسی حالت میں ایجنٹ بے چارہ کیا کرے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ میں انسان ہوں، بیمہ کے ایجنٹ سے ہمدردی رکھتا ہوں اور یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ ہمارے سننے والوں میں سے کوئی صاحب ضرور ایسے ہوں گے جو بیمہ کے نہیں تو کسی اور قسم کے ایجنٹ ہوں گے۔ ان کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اب انھیں محض زندگی کا بیمہ کرنے میں جان نہ کھپانی چاہیے، بلکہ زندگی اور سرشت انسانی کے بعض ناقابلِ بیان کرشموں کا بیمہ کرنا چاہیے، اور اس بارہ میں ان کو پولیس سے بھی امداد لینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔

مثلاً بڑے بڑے افسروں کے کانوں کا بیمہ کرانا چاہیے تاکہ وہ نامعقول مطلبی لوگوں کی باتوں کو ذہن نشین نہ کر لیا کریں۔ پھر بعض مناصب ایسے ہوتے ہیں جن پر فائز ہونے کے بعد حماقت کرنے کی بے پناہ خواہش ہوتی ہے۔ اس کی روک تھام اس طور پر کرنی چاہیے کہ جو لوگ اس کے ماتحت ہوں وہ اپنی اپنی عافیت کا بیمہ کرائیں۔

ہندوستان میں اس کی بڑی ضرورت ہے کہ یہاں کے لوگ اپنے بعض لیڈروں کی بے تکی باتوں سے محفوظ رکھے جائیں۔ ایک بیمہ کمپنی ایسی ہونی چاہیے جو لیڈروں سے ان کے پیروؤں کو بچا سکے۔ یہاں کے لوگ مذہب کا نام لے کر اکثر عجیب وغریب قسم کے ہنگامے کھڑے کر دیتے ہیں۔ پیروان مذہب کا یہ حق ہے کہ وہ حکومت سے اس کا مطالبہ کریں کہ مذہب کے نام پر پیروان مذہب کے جذبات سے غلط فائدہ اُٹھانے والوں کے خلاف بیمہ کرانے کی سہولت پیدا کی جائے۔ اس کے لیے ایک زبردست اسکیم مرتب کرنی پڑے گی۔ مثلاً ہر بیمہ کمپنی کو اختیار ہو کہ وہ عدالت کے ذریعہ ایسے لوگوں سے نیک چلنی کی ضمانت لے سکے جن کے دل میں بعض خاص قسم کی خاص اوقات میں ہوک اُٹھتی ہو، یہی نہیں بلکہ عدالتوں کو بعض خاص اقسام کے لوگوں کا ڈاکٹری معائنہ بھی کرانا چاہیے۔

یہ اسکیم مثال سے واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجیے کسی شخص پر قوم کے سردار بننے کا نہایت شدت کے ساتھ دورہ پڑا۔ سب سے پہلے اس شخص کا ڈاکٹری معائنہ کرانا چاہیے اور ڈاکٹروں سے تاکید کر دینا چاہیے کہ اس معائنہ میں کسی خاص بات کے جانچنے میں کوئی چوک ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ البتہ ہر چیز کے معائنہ کی فیس چارج کرنے میں غفلت نہ ہونے پائے۔ اگر غفلت ثابت ہو جائے تو ڈاکٹر پر غبن کا مقدمہ دائر ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹروں کی چراغی ادا کرتے کرتے اُمیدوار کی ہوک قطعاً غائب ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہر عضو کا ہر قسم کا فوٹو اور ناک، تھوک، خون، بول و بزار کے امتحان کا پرچہ اُمیدوار کے گلے میں آویزاں کر دینا چاہیے، اور اس کو "تقیل سمن بآویزانی" کی حیثیت دینی چاہیے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے بیوی بچے کس حال میں ہیں۔ اگر بیوی بچے اس کے شاکی ہیں تو ایسے شخص کو دوسروں کے بیوی بچوں کو عذاب میں مبتلا کرنے کا کوئی حق نہیں۔

ہماری سوسائٹی میں ہر مشتبہ یا خطرناک چیز کی روک تھام کے لیے خاص خاص پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً نشہ لانے والی یا خطرناک اشیا کے لیے لائسنس رکھنا ضروری ہے۔ بیویوں کے لیے عدالت اور شوہروں کے لیے جیل خانہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے جاتے ہیں۔ کتے اور مویشیوں کے لیے اور کہیں کہیں زہریلی گیس سے بچنے کے لیے خاص قسم کی

تھوتھنیوں کا انتظام رکھا جاتا ہے۔ نوکری کے لیے اسلحات جنگ، اخلاق کے لیے سنیما اور تفریح گاہیں مقرر ہیں۔ نفخ و ریاح کے لیے بھوجن بھشم چورن ایجاد کیا جاچکا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ لیڈر کے لیے بھی خاص قسم کی تھوتھنیاں یا جاروب معدہ قسم کی ادویات نہ مقرر ہوں۔

مرا خیال ہے کہ ملک کی عافیت اور ترقی اس وقت تک متیقن نہیں ہوگی جب تک ان امور کا انصرام بیمہ کمپنیوں اور ان کے ایجنٹوں کے سپرد نہ کیا جائے گا۔

●●●

سوداگر و سوداگری

کسی بڑے آدمی نے سچ کہا ہے کہ دنیا ایک بازار ہے جہاں رُکے نہیں اور قیمت گری نہیں! یعنی زندگی کی ساری بڑائی آگے بڑھتے رہنے پر ہے، رُکنے پر نہیں۔ سوچیے تو یہ بڑے پتے کی بات ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ سوچنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ زیادہ سوچنا ایک مرض کی بھی علامت ہے۔ جس کا نام میں یوں نہیں لینا چاہتا کہ اس سے بعض سوچنے والوں کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے اور ظاہر ہے تقریر کی ابتدا ٹھیس لگانے سے نہیں کرنی چاہیے۔ یوں کسے معلوم ہماری آپ کی تقدیر میں کیا لکھا ہے!

اچھا تو کبھی آپ نے یہ بھی خیال فرمایا کہ ہم آئے دن جو کچھ کرتے دھرتے رہتے ہیں، اس میں نفع نقصان کی لم برابر لگی رہتی ہے۔ بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی (اور اس میں ریڈیو سننے نہ سننے والوں کی کوئی تخصیص نہیں) کوئی کام اپنی دانست میں ایسا نہیں کرتا جس کے بارہ میں اسے یہ اندیشہ ہو کہ اس سے اسے نقصان پہنچ جائے گا۔ ہر شخص اصلاً سوداگر ہوتا ہے۔ ہم ہمیشہ نفع کی فکر میں رہتے ہیں (بعض دفعہ دنیا کا کم عقبیٰ کا زیادہ) خواہ وہ نفع مال دولت کی شکل میں ہو، خواہ اطمینان یا خوشی کی صورت میں۔ ہم کوئی کام ایسا نہیں کرتے جس کے صلہ پانے کی توقع نہ رکھتے ہوں۔ کبھی یہ توقع برآتی ہے اور محنت سپھل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محنت کا پھل نہیں ملتا۔ ایسی حالت میں ہم یہ محسوس کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ مقابلہ

تو دل ناتواں نے خوب کیا! اور ہاں اس سلسلہ میں لومڑی کے اس نفع کو بھی نہ بھولیے جس نے انگور کو کھٹے قرار دے کر اپنا اطمینان کر لیا تھا!

نفع کی بہت سی شکلیں ہیں۔ کچھ لوگ مال دولت کو نفع سمجھتے ہیں اور کچھ اس روحانی مسرت یا ذہنی طمانیت کو نفع سمجھتے ہیں جو کسی کام کے کرنے اور اکثر نہ کرنے سے اُن کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ بعضوں نے بڑی سے بڑی قربانی کرنے والوں کو بھی نفع کمانے والوں کے زمرہ میں رکھ دیا ہے۔

یہ باتیں تو اصولی ہوئیں جن پر عمل کیے بغیر یوں چارہ نہیں کہ لوگ کسی کے عاقل و بالغ ہونے کے اس وقت تک قائل نہیں ہوتے، جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو نہ خود اس کی سمجھ میں آئے اور نہ وہ دوسروں سے سمجھنے کی توقع رکھتا ہو۔ کسی بات کو جلد سے جلد صاف صاف کہہ دینے سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کہنے والا کچھ یوں ہی سا ہے۔ اسے بات کرنے نہیں آتی۔ لیکن اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ صاف صاف اور جلد سے جلد بات نہ کہہ دی جائے تو لوگ سمجھنے میں تامل کرتے ہیں۔ اس لیے ہم پڑھے لکھے لوگ اکثر ہر بات کے پہلے یا بعد کچھ ایسی بات کہہ دیتے ہیں (مثلاً اُصولی) جس سے ہمارے خلوص کا کم اور قابل ہونے کا گمان بڑھ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی سوداگری ہے، لیکن اس کی بحث آگے آئے گی۔ آپ ابھی سے کیوں پریشان یا بدگمان ہوں۔

آج کل سوداگری کے بھیس میں شاہی کی جاتی ہے اور شاہی کے بھیس میں سوداگری۔ تہذیب و تمدن پھیلانے کا مقصد تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سب سے متمدن قوم وہ ہے جو زبردست قوم کی مصنوعات اپنے ہاں کھپائے۔ پہلے خریدنے والا مختار تھا، اب مجبور ہے۔ پہلے مال کی قیمت لی جاتی تھی، اب کمزوری کا تاوان لیا جاتا ہے۔ پہلے فاتح لوٹتا تھا، اب بیچتے ہیں اور رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتے ہیں۔ پہلے سوداگر آتا تھا کارواں سرا میں ٹھہرتا تھا۔ کوئی چور ڈاکو مال لوٹ لیتا تو حاکم وقت اس کی تلافی کرتا۔ اب تاجر کو لوٹنا محال ہے۔ اب تاجر مال بیچنے نہیں آتا، جھگڑا مول لینے آتا ہے۔ آج کل کے تاجر مال نہیں بیچتے، عہدنامے کرتے ہیں۔ وہ مال کے دام نہیں لینا چاہتے۔ تاوان عائد کرتے ہیں!

پہلے کارواں کے گرد گاہکوں کا ہجوم ہوتا تھا ''پس از مدت گزار افتاد برما کاروانے را''
لوگ جوق جوق آتے تھے۔ نئے نئے ملکوں کی عجیب عجیب چیزیں خریدتے تھے۔اب تاجر آتا
ہے تو لوگ سراسیمہ ہوتے ہیں اور پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔قصّے کہانیوں میں سنتے آئے ہیں کہ ایک
بڑا سوداگر کسی اجنبی ملک سے آیا۔ بادشاہ کو نوادر دکھا رہا تھا، دکھاتے دکھاتے روم، خراسان،
ایران، توران کہیں کی شہزادی کی تصویر کی جھلک بھی دکھا دی۔ بادشاہ فریفتہ ہوئے اور اٹوائی
کھٹوائی لے کر پڑ گئے۔ وزیر کو مژدہ سنایا گیا کہ بادشاہ کی منظورِ نظر کو حاضر کرو، ورنہ بیوی بچے کولھو
میں پیل ڈالے جائیں گے۔ وزیر نے بڑے فاقوں اور پیتروں کے بعد شہزادی کو حاضر کیا۔
بادشاہ کی شادی ہوئی اور ہم سب خرشے سے نجات پا گئے!

اسی طرح کی باتیں اب بھی ہوتی ہیں۔صرف نیتوں میں کھوٹ آ گیا ہے۔تشبیہیں بدل
گئی ہیں، مضمون واحد ہے۔اس زمانہ میں تاجر کے پاس اسلحات جنگ کے نوادر ہوتے ہیں۔کسی
شہزادی کی تصویر کے بجائے معاہدہ کی شرائط کا عکس ہوتا ہے۔وہ اسلحات جنگ دکھاتا ہی نہیں کام میں
بھی لاتا ہے۔معاہدہ کی شرائط میں گاہک اپنی بدفالی کے نقوش دیکھتا ہے اور جان بحق ہو جاتا ہے۔

بعض تاجر زیادہ چالاک ہوتے ہیں۔وہ سامان تجارت میں تہذیب و ترقی کی ایسی
جیتی جاگتی مورتیں رکھتے ہیں جن کو دیکھ کر گاہک سب کچھ بھول جاتا ہے۔وہ مال پیدا کرنے کی
بجائے مال خریدنا زیادہ پسند کرنے لگتا ہے۔تاجر کی نظر اخلاف کی کمائی پر اتنی نہیں ہوتی جتنی
اسلاف کے کارناموں پر۔وہ گاہک کے تصورات ذہنی بدل دیتا ہے اور روایات فراموش کرا دیتا
ہے۔آج کل کا تاجر مال کی بہترین قیمت نہیں وصول کرتا۔گاہک کی بہترین متاع اینٹھتا ہے!

لیکن ریڈیو پر رونے سے کچھ حاصل نہیں۔رونے کے اس سے بہتر مواقع مل سکتے
ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ میرا یہ بیان نہ بھولے ہوں گے کہ دنیا ایک بازار ہے جہاں ہر شخص
ہر آن خرید فروخت میں مبتلا رہتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ کہیں سلطنتوں کا بیوپار ہوتا ہے اور کہیں
پان بیڑی کا بیوپار۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کسی قسم کا شغل نہ رکھتا ہو۔ہم آپ سب کسی نہ کسی
دھندے میں گرفتار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی سب کچھ ترقی و تہذیب، اخلاق و مذہب، علم و
حکمت، قوم اور ملک کے لیے کرتا ہے اور کوئی محض پیٹ پالنے اور جی لینے کے لیے کرتا ہے!

دنیا میں جتنے انسان ہیں اتنے ہی دھندے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جتنے انسان ہیں ان سے زیادہ دھندے ہیں۔ اس لیے کہ دھندے نیتوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور نیتیں اتنی متنوع اور گریز پا ہوتی ہیں کہ بعض وقت خود ہم کو محسوس نہیں ہوتا کہ ہماری نیتیں کیا یا کتنی ہیں۔ ہر شخص کی انفرادی ذہنی دنیا میں یہ نیتیں آباد ہوتی ہیں۔ انفرادی دنیا کا یہ گھروندا ہماری اس بڑی دنیا کے کھیل میں شامل ہوتا ہے۔ ہم اپنی دنیا علاحدہ نہ آباد رکھ سکیں تو اس دنیا میں جینا دشوار ہو جائے۔ آدمی بجائے خود محشر خیال نہ ہوتا تو غالب کا وہ شعر کیوں مشہور ہوتا!

اسی محشر خیال یا شخصی دنیا کے توسل سے ہم اس بڑی دنیا سے رشتہ قائم کرتے ہیں۔ اسی کو زندگی کا بیوہار کہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو زندگی غیر شخصی بن کر ہمارے لیے جی کا جنجال بن جائے۔ لیکن بعض لوگ اپنی بنائی ہوئی ذہنی دنیا میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ وہ اس بڑی دنیا سے اجنبی ہو جاتے ہیں، اور اس کے مطالبات پورے نہیں کرتے۔ یہ خوبی یا خرابی افراد سے گزر کر جماعت تک پہنچتی ہے تو بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہم مشرقی اسی محرومی کے شکار ہیں!

ہاں خوب یاد آیا، میں نے کچھ غیر متعلق باتیں کی ہیں۔ یہ میری بڑی محبوب کمزوری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے غیر متعلق باتیں بیان کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ بے سوچے سمجھے ذہن میں آتی ہیں اور چوں کہ مفت ہاتھ لگتی ہیں، اس لیے ان کے بے تکان خرچ کرنے میں ایک خاص طرح کی خوشی محسوس ہوتی ہے اور یہ میرے خلوص نیت کی دلیل ہے کہ میں آپ کے بارہ میں بھی یہی عقیدہ رکھتا ہوں کہ جو چیز آپ کو گھاٹے یا کمیشن میں ملے گی، اسے آپ نہایت فراخ دلی کے ساتھ قبول کریں گے۔ آخر آپ ہی میں سے تو کسی صاحب نے فرمایا ہوگا، مفت را چہ گفت! اچھے سوداگروں کی مانند میں اپنے پرانے اور مستند گاہکوں کو اکثر کارآمد چیزیں مفت نذر کیا کرتا ہوں!

اب میں براہ راست آج کے موضوع گفتگو پر آتا ہوں، جس کا اعلان اناؤنسر صاحب نے پہلے کیا تھا اور جس کا اقرار میں اب کر رہا ہوں۔ یعنی سوداگر!

تو حضرت، تکلف برطرف میں اُس بڈھے مریض گمس راں کو بھی سوداگر سمجھتا ہوں جو کوئی موسم یا حاکم ہو۔ درخت کے نیچے سڑک کے کنارے مُرمُرے، ریوڑیاں اور شیرے کی

سڑی بسی جلیبیاں بیچتا ہے، جس پر کھیاں بھنبھناتی اور Sinking or stinking fund کی مد میں بعض مقویات کا اضافہ کرتی رہتی ہیں اور ان مرتب و مسلح تجارتی سفیروں کو بھی سوداگر سمجھتا ہوں جو ملک کے سب سے بلند و صحت بخش مقام پر ملک کے سب سے بڑے حاکم یا حکومت کے ساتھ بھاؤ چکاتے، رقص کرتے، بھاؤ بتاتے، ڈنر کھاتے اور غراتے ہیں۔ انہی کے درمیان وہ سب تجارتی بازی گر آ جاتے ہیں جن سے ہم سب کو آئے دن سابقہ رہتا ہے۔

میں تجارت کے ایسے اصولوں سے واقف نہیں ہوں کہ مجھے چاندنی چوک کی کسی دُکان کا انچارج بنا دیا جائے یا پان بیڑی کا خوانچہ سپرد کر دیا جائے یا کسی یوروپین دُکان میں وہ کام حوالہ کیا جائے، جس سے میں پیدائشی طور پر محروم ہیں۔ لیکن میرا موجودہ پیشہ ایسا ہے جس کے رو سے مجھے ہر فن پر اظہار خیال کی آزادی ہے اور ظاہر ہے جب آزادی نصیب ہوتی ہے تو ذمہ داری کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

آپ کو شاید نہ معلوم ہو اور اس معاملہ میں ریڈیو والوں پر بھی آپ رشک نہیں کر سکتے کہ کسی زمانہ میں مجھے اپنے گاؤں کے پرچونیے سے بڑا اُنس تھا۔ جو دن رات میلا سُرمئی رنگ کا روئی دار شلوکا، روئی دار پاجامہ اور روئی دار ہی کنٹوپ پہنے رہتا تھا۔ پاجامہ کے نیچے دھوتی بھی ہوتی۔ اس ہندی ایرانی اتحاد کو ہندستانی کلچر (تمدن) میں منتقل کرنے کے لیے ایک مونج کی رسّی تھی جو کمر بند کا کام دیتی تھی۔ اس وردی کی عمر اور خدمت گزاری کا اندازہ آپ اُن حصوں سے کر سکتے تھے جو گھٹنے اور کہنیوں پر خندہ دنداں نما کر رہے تھے۔ دن بھر ہانڈیوں، ٹوکریوں، کابکوں اور گاہکوں کے درمیان بیٹھا ہلدی، دھنیا گرم مسالا، تیل، نون، لکڑی بیچا کرتا تھا۔ اس درمیان میں کسی کی خوشامد کرتا، کسی کو ڈانٹ دیتا، کسی کی ڈانٹ سہ لیتا۔ کسی کو قانونی مشورہ دیتا، کسی کو گھر بیچنے اور کسی کو بسانے کے اُپائے بتاتا، کسی کو نسخہ تجویز کرتا اور پہلے سے بندھی ہوئی پڑیاں حوالہ کرتا، دو ایک چوپائی گنگناتا اور دو ایک فارسی کی مثلیں سنا دیتا اور سب کے بعد دو ایک ریوڑی گٹو کی منہ میں ڈال کر ایک لوٹا پانی منہ میں اُنڈیل لیتا۔ بڑی سی توند، بے معنی سا چہرہ، پاٹ دار آواز، مرنجاں مرنج سی عمر، غرض کہ وہ ساری باتیں تھیں جو یاد تو رہ جاتی ہیں، بیان کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

میں سودا لینے جاتا تو نام بہ نام گھر والوں کی خیریت پوچھتا۔ کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا، اسکول میں کیا پڑھتے ہو۔ پھر کہتا ساری زندگی ختم کردو گے، پلے کچھ نہ پڑے گا۔ اس کے بعد ایک سادھو کی طرف مخاطب ہو کر جو پرساد دینے اور نون مرچ لینے آئے تھے۔ کہتا، کیوں مہراج!

پڑھتم تو مرتم نہ پڑھتم تو مرتم
سانست جنجھا کیوں کرتم

یعنی پڑھو گے تو مرو گے، نہ پڑھو گے تو مرو گے۔ آخر زبان کو کیوں عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے!

پھر کہتا للا یہیں آجایا کرو۔ سال بھر میں پارس پتھر بنا دوں گا۔ میری بات گرہ باندھو۔

''جو دُکان پر بیٹھ گیا اسے برہما بھی ہلا نہیں سکتے۔''

اس کے بعد سودا حوالہ کرتا اور دو ایک سوکھے چھوہارے یا ایک آدھ چٹکی چورن کی دے کر رُخصت کر دیتا۔

تھوڑی ہی دنوں بعد لکھنؤ جانا پڑا۔ ایک چائے والے کی دکان پر پہنچا۔ اس مردِ خدا نے خواہ مخواہ میرے بارہ میں وہ رائے قائم کر لی جو آپ یقین مانیں نہ اُس وقت اپنے بارہ میں میری وہ رائے تھی اور نہ اب ہے۔ اس نے نہایت تکلف سے چائے کی پیالی دی اور اس طور پر گفتگو شروع کی جیسے وہ میرا بے تکلف دوست ہی نہ تھا، بلکہ لکھنؤ میں میرا سرپرست اور محافظ بھی تھا۔ شکر کم تھی، میں نے مطالبہ کیا تو اس نے کہا۔ میں نے شکر قصداً کم دی ہے۔ واجد علی شاہ شکر کے بجائے افیون چائے میں ڈالتے تھے، میاں یہ لکھنؤ ہے۔

''لکھنؤ ہم پر فدا ہے ہم فدائے لکھنؤ'' —— جی اور کیا!

میں چائے سے منہ موڑ کر لکھنؤ، واجد علی شاہ اور افیون کو ایک دوسرے سے متوازن یا متمائز کرنے کی اُدھیڑ بن میں مصروف ہی تھا کہ چائے والے نے موقع بھانپ لیا اور یک لخت بولا۔ میاں صاحب زادے آصف الدولہ کا امام باڑہ بھی دیکھا، یہ لو ابھی ابھی یہ خستہ کرارے بسکٹ چائے کی پیالی میں چورا کر کے ڈال دیا اور نصف میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ کا بسکٹ تو میں نے خیر سے کھا لیا، لیکن پیالی کا ملغوبہ دیکھ کر گھبرایا۔ چائے والے نے میرا تذبذب دیکھ کر

للکارا میاں، بس اللہ کا نام لے کر فرد کر ڈالو۔ صبح ہوتے ہوتے مونچھ نکل آئے گی! مونچھ کی بشارت کوئی معمولی بشارت نہ تھی کہ میں آدھی پیالی اس ملغوبے کی ختم نہ کر سکتا۔ روپیہ دیا صرف ر/4، اُس نے واپس کیے۔ مجھے تامل میں پا کر بولا۔ جناب ر/4 تو چائے کے ہوئے، ر/4 آصف الدولہ کے بسکٹ کے اور 4 روا جد علی شاہ کے فاتحہ کے۔ رات کو سوئیے گا تو واجد علی شاہ کی روح آئے گی۔ آپ جو مانگیں گے مل جائے گا۔ میں گھر واپس آ گیا، جہاں اس چائے نوشی کے سلسلہ میں کچھ ایسے ناملائم واقعات پیش آئے کہ واجد علی شاہ کی روح نے آنا کچھ مناسب نہیں خیال کیا!

دہلی میں خرید فروخت کرنے سے گھبراتا ہوں۔ لکھنؤ میں تو واجد علی شاہ اور آصف الدولہ سے سابقہ تھا۔ اس خاک پاک میں تو پوری تاریخ ہند دفن ہے۔ اوّل تو یہاں کے دوکانداروں کے تیور ایسے ہوتے ہیں جیسے غازی میاں کے میلہ میں پولیس کا حولدار۔ ان کی سج دھج اور نوک پلک دیکھ کر مجھے وہ کوتل گھوڑے یاد آ جاتے ہیں جو زمین دار کی بارات یا کسی جلوس میں حمائل و پازیب قسم کی چیزوں سے مرصع ہوتے ہیں۔ جی کڑا کر کے یا دم لینے کے لیے دوکان کے قریب کھڑے ہو جائے تو بات کرنے کے بجائے اشارے کریں گے۔ جیسے ادھر اُدھر دہن کے دونوں گوشوں پر دو مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں اور یہ شخص باچھوں کو پھڑکا کر دونوں مکھیوں کو باری باری اُڑا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے موقع پر بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ آگے بڑھیے تو پٹ جانے کا یقین پیچھے ہٹیے تو ٹریموے سے کچل جانا مسلّم مجھے اپنے دوست کا ایک فقرہ یاد ہے جو دہلی سے واپس آئے۔ میرے پوچھنے پر کہ چاندنی چوک کی سیر کیسی رہی۔ بہت خفا ہوئے بولے، لعنت بھیجو میاں، ہر دوکان پر نادر شاہ تلوار لیے بیٹھے ہیں!

انگریزی دوکانوں میں داخل ہونے کی بڑی مشکل سے ہمت پڑتی ہے۔ اوّل تو ان دوکانوں کا ٹھاٹھ ایسا ہوتا ہے کہ کوتوالی اور آپریشن تھیٹر دونوں کا نقشہ بہ یک وقت آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ دوسرے ان کے اندر بیچنے والیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے میں بہت گھبراتا ہوں اور میں کیا ہر وہ شخص گھبرائے گا جس کو نہ اپنے پر اعتماد ہوگا، نہ دوسرے پر۔ پھر یہ تو دیکھیے اُن تمام چیزوں کی انگریزی کس بھلے مانس کو معلوم جسے اس موقع پر جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ گھر سے اس قسم کی انگریزی یاد کر کے جائے تو اس بقیہ آئندہ انگریزی سے کون نپٹے جو

والی وقت ضرورت کام میں لائے گی یا لاسکتی ہے۔ پھر چیز پسند نہ آئے تو ناپسندیدگی کا اظہار کیوں کر کیجیے۔ اندیشہ یہ رہتا ہے کہ کہیں بیچنے والی یہ نہ سمجھ لے کہ چیز ناپسند نہیں ہے۔ انگریزی میں نیاز مند ہے۔ ان سب سے قطع نظر، میں ٹھہرا ایک خاص قسم کا ہندستانی، جب تک قیمت کے رزولیشن پر سینکڑوں ترمیمیں نہ پیش کرلوں، نعرے نہ بلند کروں یا لاٹھی چارج کی زد میں نہ آجاؤں، اطمینان نہیں ہوتا کہ معاملہ ٹھیک ہوا۔ انگریزی دکانوں میں یہ بڑی بدتمیزی سمجھی جاتی ہے کہ دام طے کرنے میں ردوکد کی جائے۔ چنانچہ میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ جہاں خریدار کے بنیادی حقوق کا لحاظ نہ ہو وہاں قدم نہ رکھا جائے۔

لیکن بندہ پرور قدم ہی تو ہے۔ ایک دفعہ اُکھڑ گیا اور میں ایک انگریزی دکان میں سامان بیچنے والی خاتون کے سامنے مؤدب جا کھڑا ہوا۔ اس دکان کا عجیب خاصا تھا۔ ہر چیز دور سے بڑی اچھی معلوم ہوتی تھی، ہاتھ آنے پر ہی چیز بے وقعت معلوم ہونے لگتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے ایک جوڑے موزے پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ یہی موزہ فلاں جگہ چوتھائی دام پر ملتا ہے۔ معزز خاتون نے مجھ پر ترس کھاکر (حالاں کہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی) اور ایک خاص پندار کے ساتھ (جس کا میں نے بُرا نہ مانا) کہا۔ تم یہ تو دیکھو اس ایک جوڑے موزے کو تم تک پہنچانے میں دکان نے کتنا خرچ کیا ہے، کتنی بڑی دکان ہے، کتنا عملہ ہے، کیا رکھ رکھاؤ ہے۔ ان سب پر کچھ نہ کچھ لاگت آتی ہی ہوگی۔ میں نے دست بستہ عرض کیا۔ معزز خاتون مجھے کیا معلوم کہ مجھ ننگ خلائق تک پہنچنے میں اس موزہ کو کتنی زحمت اُٹھانی پڑی، ورنہ میں خود حاضر ہو جاتا اور ان کو سرآنکھوں پر جگہ دیتا۔ انھوں نے بات کاٹ کر کہا۔ لیکن یہ چیز تو پاؤں میں پہنی جاتی ہے سرآنکھوں سے کیا سروکار۔ میں نے عرض کیا، آپ کا فرمانا بالکل صحیح، لیکن اس کا آپ کچھ خیال نہ فرمائیں۔ ہم ہندستانی کچھ ایسے ہی واقع ہوئے ہیں کہ ہر چیز سے سلوک تو ویسا ہی کرتے ہیں جیسا کہ کرنا چاہیے۔ لیکن گفتگو میں اس سلوک کا اظہار نہیں کرتے، صرف شعر پڑھ دیتے ہیں۔ خاتون نے کسی قدر مطمئن ہوکر لیکن قطعیت کے لہجہ میں فرمایا۔ میں سمجھ گئی، لیکن اس دکان میں شعر میں گفتگو نہیں کی جاتی۔ موزے کے دام وہی ہوں گے جو میں نے بتائے ہیں۔ ہمارے اخراجات تمہارے اشعار سے نہیں پورے ہوتے۔ بس ایک بات! میں نے گڑگڑا کر عرض کیا:

یہ بالکل درست ہے کہ اس موزہ کی پشت پناہی پر دکان کے کثیر اخراجات واس کا اقتدار ہے لیکن یہ بھی تو خیال کیجیے کہ اسے استعمال تو کروں گا۔ میں اپنے ہی غریب خانہ پر جہاں مجھے وہ راحتیں نصیب نہیں ہیں جو اس دکان اور آپ کے طفیل سے اس موزہ کو یہاں حاصل ہیں۔

بہر حال نہ میں قائل ہوا اور نہ معزز خاتون۔ موزہ البتہ میرے ساتھ آیا!

بعض لوگ تجارت کے بڑے شائق ہوتے ہیں، لیکن ان کا نفع کمانے کا اصول وہی ہوتا ہے جو بعض دعوت کھانے والوں کا ہوتا ہے۔ یعنی زندگی اور تجارت دونوں فنا ہونے والی چیزیں ہیں۔ نہ معلوم کس کا کب قصہ پاک ہو جائے۔ اس لیے دعوت کھانے اور نفع کمانے کے ہر موقع کو آخری موقع سمجھو۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو تجارت اور نفع کے درمیان اتفاقات یا حادثات کے قائل نہیں ہوتے۔ وہ تجارت کو شطرنج کی ایسی بازی سمجھتے ہیں جس میں ایک ہی کھیلنے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ حریف کی طرف سے بھی خود ہی چال چلتے ہیں اور اسے مات کر دیتے ہیں۔ وہ بہت چھوٹے پیمانے پر تجارت شروع کرتے ہیں اور اپنے ذہن میں ترقی کی ساری منزلیں طے کر دیتے ہیں۔ پان بیڑی سے شروع کرتے ہیں اور بغیر کسی تامل یا تکان کے افریقہ کے سونے کی کان پر دم لیتے ہیں۔ لیکن آنکھ کھلنے پر معلوم ہوتا ہے کہ پان بیڑی کا ذاتی مصرف کے لیے میسر آنا بھی ناممکن ہو چکا ہے۔ یہ ہر قسم کی تجارت کریں گے اور محض اس خیال سے کہ ہر قسم کی تجارت شروع کرنے اور کروڑ پتی بننے کے درمیان (شارٹ سرکٹ) یا چراغ گل پگڑی غائب کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔

میں نے بہتوں کو تجارت شروع کرنے اور جان بحق ہوتے دیکھا ہے۔ اس قسم کی وفات حسرت آیات کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ دکان کا بڑا شاندار نام رکھا جائے۔ لفافے کاغذ چھاپے جائیں۔ ہر قسم کے رجسٹر مہیا کیے جائیں۔ آفس قائم ہو، ٹھپہ دار چپراسی مقرر کیا جائے اور آئندہ نفع کی اُمید پر شیروانیاں سلائی جائیں اور کرایہ کی موٹر پر آمد و رفت شروع کی جائے۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ دیکھیں گے کہ دکان کے سامنے چھڑکاؤ اور اندر ستھراؤ ہے! آپ شیروانی پہنیں، چپراسی ٹھپہ لگائے ہو، دکان پر چلمن پڑی ہو تو بچارے گاہک کا کون پرسان حال ہوگا۔ گاہک آپ کا کفیل ہو یا اپنے بیوی بچوں کا؟

اب جب کہ تو تو میں میں نے یہاں تک طوالت کھینچی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اپنے تجارتی کارنامے سے آپ کو مطلع کردوں۔ بات یہ ہے کہ میں خاندان کے سارے بچوں کا آنریری خزانچی ہوں۔ ان کو جو کچھ اخلاقاً یا بطور تاوان وقتاً فوقتاً ملتا رہتا ہے، وہ میرے ہی پاس جمع رہتا ہے۔ اس میں وعدے کی بھی خاصی رقمیں شامل رہتی ہیں جو نہ کبھی میرے پاس موجود تھیں اور نہ بچوں کے ہاتھ میں گئیں۔ یہ مبارک عادت میں نے بڑے بڑے ماہرین فن سے سیکھی ہے۔ یوں تو کام چلتا رہتا ہے، لیکن بعض مواقع ایسے آجاتے ہیں جب ہر طرف سے ایک ساتھ مطالبہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت جیسی کچھ گزر جاتی ہے، اس کا اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں ایک ایسا موقع پیش آ گیا اور میں نے محسوس کیا کہ کوئی فوری تدبیر نہ کی گئی تو بینک کا خاتمہ ہے۔ میں فوراً بازار گیا اور گھر کے لیے جتنی چادر، تولیے، رومال، قمیص، پاجامہ کے کپڑے، جوتے، موزے، گڑ، گاجر، چار چھ ماہ کے لیے درکار ہوتے، انھیں خرید لایا اور گھر پہنچتے ہی سب کو 80-70 فی صدی دام کم کر کے نیلام کر دیا۔ سب نے انتہائی شوق کے ساتھ اپنی اپنی پسند کی چیزیں خرید لیں۔ میں نے خود نقدی کا کسی سے مطالبہ نہیں کیا، بلکہ اُن ہی نے اپنی اپنی رقمیں قیمت میں وضع کرادیں۔ چنانچہ بینک کی ساکھ بھی قائم رہی، گھر کا کام بھی چل گیا اور منیجر بھی سنگ سار ہونے سے بچ گیا۔ گڑ اور گاجروں میں البتہ خسارہ رہا۔ بقیہ چیزیں اب تک بقید حیات ہیں۔ لیکن بچے بڑے ہو رہے ہیں، منیجر بوڑھا ہو رہا ہے۔ ریڈیو گھر کا بھیدی بنا ہوا ہے۔ دیکھئے بینک پر کیا گزرتی ہے!

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ![1]

(علی گڑھ میگزین۔ مارچ 1939)

●●●

---

1. مکمل شعر:

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک — غالب

عاشق

میر کا مشہور شعر ہے:

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

خدا جانے وہ کون ''کافر'' تھا اور کافری کی وہ کون سی ساعت جب عشق و عاشقی کے مرض مبارک کی طرح ڈالی گئی، جن کی شامت شعرا قرار پائے اور جن کا جواب وہ یہ فدوی قرار دیا گیا۔ ہمارا اردو شعر و ادب اسی کفر و کافری کا ''عجائب خانہ'' ہے جس میں زندہ مردہ ہر طرح کے عجوبے اس کثرت سے ملتے ہیں کہ عقل دنگ اور جادۂ ہستی تنگ نظر آنے لگتا ہے۔

امراض کے بارہ میں جدید تحقیقات کا فیصلہ یہ ہے اور میرا خیال ہے کہ امراض و جدید تحقیقات میں دونوں سے نہیں تو ایک سے آپ کا سابقہ ضرور رہا ہوگا کہ ہر مرض کے مخصوص ''جراثیم'' ہوتے ہیں اور اسی سبب سے ہر مرض کی علامتیں یکساں ہوتی ہیں۔ لیکن جس مرض کا نام ''عشق'' ہے اس کی علامتیں اور اس کے مریض طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر دنیا کے سمجھدار لوگ ایک عجیب پھیر میں پڑ گئے ہیں۔ یعنی عشق فن ہے یا سائنس۔ عاشقوں کے کرتب دیکھ کر تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ فن ہے لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی بات سن کر اس کے سائنس ہونے میں شبہ نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔ یعنی بعض ایسے لوگ جو ہماری آپ کی طرح لکھے پڑھے کم اور دال روٹی کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہیں۔ وہ عشق و عاشقی کو خلل دماغ سے بھی تعبیر کرتے ہیں!

اردو شعر و شاعری میں عاشق کے کارٹون بہ کثرت ملتے ہیں۔ مثلاً لاغر ہوتے ہوتے شکنِ بستر ہو جانا یا سوکھ کر چلمن کی تیلی بن جانا، جس کی وجہ سے پردہ کے مقاصد نہ پورے ہوتے ہوں۔ ناتوانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دمِ عیسیٰ بھی پیامِ مرگ ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ عاشق کے سارے اعضا اسکریو پر ہوتے ہیں، جس کے جی میں آتا ہے اُڑا لے جاتا ہے اور یہ زندہ رہتے ہیں۔ شراب پینے میں ان کا ثانی نہیں، مرکے جی اُٹھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ جو منہ میں آئے کہہ جائیں اور جہاں جی چاہے مار کھا جائیں۔ ہر قسم کے مرض میں مبتلا ملیں گے اور ہر جگہ موجود رہنے پر اصرار کریں گے۔

غور تو فرمایئے خط بڑھا ہوا، ہر قسم کے متعدی مرض میں مبتلا، دامن کے چاک میں اور گریبان کے چاک میں کوئی فاصلہ باقی نہیں۔ منہ سے وہ بھبکے نکلتے ہوں کہ نکیرین بھاگ جائیں۔ تن بدن لہولہان، بغل میں لپٹا ہوا بستر، خاک بسر، آنکھوں میں کیچڑ، پیچھے پیچھے رقیب، ناصح محتسب اور رپ وان ونکل کی ذرّیات کا ہجوم۔ آخر اس قسم کی متحرک میونسپلٹی کو کوئی شریف آدمی اپنے قریب کیوں آنے دے!

عاشق کی ایک نامکمل سی مثال بڑے آدمیوں سے دی جاسکتی ہے۔ جس طرح عاشق پر سے ہر قسم کا محاسبہ اُٹھا لیا جاتا ہے، اسی طرح بڑے آدمیوں سے بھی کسی قسم کا محاسبہ نہیں کیا جاتا۔ عاشق جس پر چاہے عاشق ہو جائے، اُس کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ بڑا آدمی جو چاہے بگاڑ دے، آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بڑا آدمی جو چاہتا ہے کہہ ڈالتا ہے۔ عاشق بھی جب جی میں آتا ہے شعر پڑھ دیتا ہے۔ البتہ وہ موقع بڑا نازک ہوتا ہے جب بڑا آدمی شعر پڑھنے لگتا ہے۔ بڑا آدمی لڑتا کبھی نہیں سرنگ ہمیشہ لگاتا ہے۔ عاشق جوئے شیر لاتا ہے اور خودکشی کر لیتا ہے۔ بڑا آدمی کامیاب ہوتا ہے تو ولایت چلا جاتا ہے یا تھرما میٹر استعمال کرنے لگتا ہے۔ عاشق کو بُرے دن دیکھنے پڑتے ہیں تو وہ جنگل کی طرف بھاگتا ہے اور پنجۂ مژگانِ آہو کو پشت خار کے طور پر استعمال کرتا ہے!

آپ کو ایسے عاشق بھی کثرت سے ملیں گے، جن کو محبوب سے دور کا بھی سروکار نہیں۔ محبوب ہو یا نہ ہو، وہ عاشق ہیں۔ رقیب ہو یا نہ ہو، وہ بدگمان ہوں گے۔ تعزیراتِ ہند ہو یا نہ ہو،

وہ جیل خانہ بھیجے جا سکتے ہیں اور ضرورت ہو یا نہ ہو، وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے شعرا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پڑھنا لکھنا آتا ہو یا نہیں شاعر کہلائیں گے۔ مشاعرہ میں شریک ہوں یا نہ ہوں سفر خرچ وصول کر لیں گے۔ شاعری پر لعنت بھیجیں گے، لیکن مشاعرہ میں گائیں گے ضرور۔

''عشاق'' یا شعرا کا ذکر ہو تو بہک جانا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ موضوع تقریر کی (ویولنگتھ) اور میٹر سے تجاوز نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں بے موقع نہ ہوگا اگر میں عشاق کے دو ایک مخصوص ٹائپ کا ذکر کر دوں۔ اردو شعر و شاعری میں میر کا کون منکر ہو سکتا ہے۔ یہ حزن والم کے سب سے بڑے مفسر قرار دیے گئے ہیں، لیکن آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ حزن والم نے میر کی شخصیت تعمیر کی تھی۔ میر کی شخصیت نے حزن والم کو نہیں اپنایا تھا۔ یہی سبب ہے کہ میر کا حزن وملال شخصی نہیں کائناتی تھا۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر محبت سے اتنا سروکار نہیں رکھنا چاہتے تھے جتنا ناکامیوں کو اپنے سلیقہ سے نباہنا، سنوارنا چاہتے تھے۔ میر محبت سے کامراں ہونا ہی نہیں چاہتے تھے۔ محبت کا یہ تصور کچھ بہت زیادہ جیتا جاگتا تصور نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں محبت کی حیثیت ثانوی اور درد والم کی اساسی بن جاتی ہے۔ برخلاف ان کے محبت کا تصور غالب کے ہاں بالکل مختلف ہے۔ غالب کا عاشق، شخص پہلے ہے اور عاشق بعد میں۔ وہ اپنی انفرادیت کو محبت میں ضم نہیں کرتے۔ میر کا عاشق محبت کے سمندر میں موج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بحر سے علاحدہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ علاحدہ رہ نہیں سکتا۔ غالب کا عاشق دریائے محبت کی موج نہیں ساحل ہے۔ وہ دریائے کو چیلنج دیتا ہے کہ تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں۔ ساحل کا ساحل دریا سے ہم کنار ہے، لیکن اپنی تشنگی کو سیرابی سے رُسوا نہیں کرتا۔

دریا اور ساحل کا ذکر کرتے کرتے فانی کا ایک شعر یاد آ گیا۔

دریائے محبت بے ساحل، اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل، یوں نام کا ساحل کوئی نہیں!

آپ ہی بتایئے اب کیا کیا جائے۔ سوااس کے کہ خوش اسلوبی سے آپ کو دھوکا دیا جائے اور گفتگو کا رُخ کسی اور طرف پھیر دیا جائے۔

آپ کو یہ ساری باتیں فلسفیوں جیسی معلوم ہوتی ہوں گی، جن سے دیر تک سابقہ رہے تو کوئی نہ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے قابل رہے اور نہ اس کے وصیت نامہ کو قانونی اہمیت دی جائے۔ آیئے میں آپ کو اردو شاعری میں عاشق کے ڈرامے کے چند سین دکھاؤں۔ فی الحال ازل سے شروع کیجیے۔ بیان کیا گیا ہے کہ:

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا[1]

واقعہ یہ ہے کہ ازل سے کچھ مال ''اونرس رسک'' [2] تحت اس ویرانہ، آباد نما میں بھیجا جانے والا تھا، جس کو اُٹھانے ڈھونے والا کوئی نہ ملتا تھا۔ ہمارا ہیرو یعنی عاشق پہاڑی مزدوروں کی طرح بے زبان وشت استخواں اپنی تاب وسکت سے کہیں زیادہ وزنی مال لادنے لے چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسے کچھ نہیں معلوم کہ بکس و بستر کے اندر کیا تھا۔ منزل مقصود پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ مالک کا دور دور پتہ نہیں، اور محنت مزدوری دینے والا بھی کوئی نظر نہ آیا۔ غریب مزدور نے مجبوراً بکس کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے الف لیلیٰ والا جنات برآمد ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے آپ کو وہ قصہ یاد ہوگا۔ جب سمندر سے ایک صندوق برآمد ہوا تھا جس کے ڈھکن کھولنے پر دھواں نکلا اور دھوئیں سے ایک جنات صادر ہوا، اور پھر خدا جانے کیا کیا ہوا۔ مجھے قصہ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ لیکن قصہ کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ٹھیک طور پر یاد نہ ہو اور آسانی سے بھلایا نہ جا سکے!

بہرحال صندوق کے اندر سے ایسے ایسے دھواں دار جناتی مصرعہ طرح نکلے کہ آج تک ان پر طبع آزمائی ہو رہی ہے یا یوں سمجھ لیجیے جناتی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ کہیں مشاعرہ ہے، کہیں یونیورسٹیاں، کہیں خانقاہیں ہیں، کہیں عجائب گھر، کہیں راز و نیاز ہے، کہیں جوتم پیزار، کہیں رزولیشن پاس ہو رہے ہیں اور کہیں بم برسائے جاتے ہیں۔ اردو شعر و شاعری کا عاشق

1۔ میر تقی میر۔

2۔ Owner Resk مالک کی ذمہ داری کے تحت۔

کبھی زندہ باد کے نعرے لگاتا ہے، کبھی رو رو کر اپنے حقوق طلب کرتا ہے اور کبھی کبھی اناللہ پڑھ کر چائے پینے اور جھوٹ بولنے لگتا ہے۔

چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا اس دنیا کے پردہ سیمیں پر ہمارا فلم اسٹار کس کس طرح شعر پڑھتا سوانگ بھرتا، قلابازیاں کھاتا، انتقال فرماتا اور حشر اُٹھاتا رہتا ہے۔ انھیں ہنگامہ آرائیوں سے ہمارا شعر و ادب بھرا پڑا ہے۔

ہم کو بتایا گیا ہے کہ ''شاعری'' زندگی کا آئینہ ہے اور اصلی ادب وہی ہے جس میں زندگی کے اصلی خد و خال نظر آئیں۔ تنقید کے اس نظریہ سے جب ہم اردو شعر و ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک سے ایک عجیب مناظر آتے ہیں۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ نئے ادب کو پرانے اصول سے پرکھیے تو اس میں اور ہسپتال، پولیس یا پریس رپورٹ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اسی طرح پرانے ادب کو نئی عینک سے دیکھیے تو بھی یہی رپورٹیں سامنے آئیں گی۔ جب صورت حال یہ ہو تو کیا ہرج اگر ہم آپ پولیس، ہسپتال یا پریس کی رپورٹوں سے اردو شعر و ادب کا جائزہ لیں اور عاشق کے کاموں کی کھتونی شروع کر دیں۔

ان رپورٹوں میں عاشق کا حلیہ، اس کے کارنامے یا کارستانیاں جس طور پر پیش کی گئی ہیں، انھیں میں مختصر الفاظ میں پیش کروں گا اور مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لیے ''تعزیرات ہند'' کی دفعات نہیں بلکہ دواوین سے اشعار کے خلاصے پیش کروں گا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص جس کی معاش اور حلیہ دونوں مشتبہ تھے، کسی دربان سے اُلجھ پڑا۔ ظاہر ہے جہاں الجھاؤ ہوتا ہے، وہاں پولیس ضرور موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اس شخص کو حراست میں لے لیا گیا۔ دریافت حال کرنے پر اس نے کوئی معقول جواب دینے کے بجائے بات بات پر شعر پڑھنا شروع کر دیا۔ پولیس کو شعر خوانی سے کوئی ہمدردی نہیں ہوئی اور نہ اس قسم کی باتیں اس کے سمجھ میں آتی ہیں۔ چنانچہ اس نے شبہ کا فائدہ خود اُٹھا کر ان کا چالان کر دیا۔ عدالت میں بھی ملزم نے شعر خوانی نہ چھوڑی۔ عدالت میں شعر خوانی کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن ملزم جس بحر میں شعر خوانی کر رہا تھا اس کی تقطیع عدالت کی قابلیت سے ذرا زیادہ فاصلہ پر تھی۔ چنانچہ اس نے ان کا مقدمہ دوسری عدالت میں منتقل کر دیا، جہاں عقل سے کم اور غیر جانب داری سے

زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ ایسی غیر جانب داری جو قانون تک کو برتے جانے سے محفوظ رکھتی ہے۔ جہاں تک کارروائی ہو چکی ہے اس کا خلاصہ آپ کو سنایا جاتا ہے۔

سب سے پہلے جب ملزم پولیس کانسٹبل یا دربان کے قریب آیا تو سپاہی نے حسب معمول Halt! who comes there (ہالٹ ہو کمس دیر) کہا جس کے بارہ میں ملزم کو اعتراف ہے!

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا![1]

لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ سمجھ کر کہ دربان پرانا آشنا ہے وہ جس قدر رذلت دے گا، یہ ہنسی میں ٹالیں گے ملزم آگے بڑھا۔ دربان یہ خیال کر کے کہ یہ کوئی گدا ہے چپ رہا۔ لیکن ملزم نے جس کی نیت یقیناً وہ نہ تھی جس کا اظہار اس کی شکل سے ہوتا تھا۔

اُٹھا اور اُٹھ کے قدم پاسباں کے لیے[2]

چنانچہ ان کو حراست میں لے لیا گیا۔ تفتیش مقدمہ کے سلسلہ میں ان کی ہسٹری شیٹ کا مطالعہ کیا تو ایک سے ایک مرصع غزلیں ملیں جن کے مختصر خلاصے آپ کو سنائے جاتے ہیں۔

یہ اکثر سینما کے مشہور کھیل نقش فریادی کا اشتہار زیب تن کیے اور دن کے وقت مشعل جلائے بازاروں میں گھومتے پائے گئے۔ مکتب میں رفت بود پڑھتے ہیں، لیکن درس بے خودی اس وقت سے دیتے ہیں جب مجنوں دیوار دبستاں پر لام الف کی مشق کرتا تھا۔ ساقی سے کچھ کہتے ہوئے انھیں شرم آتی ہے، اس لیے ان کے لیے دردِ تہ جام بہت ہے۔ اکثر بیٹھے بٹھائے جو ہر اندیشہ کی ایسی آتشیں لہریں پھینکتے ہیں کہ صحرا جل اُٹھتا ہے۔ قید کر دیجیے تو خیال بیاباں نورد رہتا ہے، اور خود ایسی سواری پسند کرتے ہیں جس میں باگ در کار نہ ہوں۔ سو پشت سے پیشہ آبا سپہ گری رہا ہے۔ اس لیے دھول دھپا کرنے میں نہ پولیس کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی سراپا ناز کا۔ اگر ان کو اپنا سر یاد نہ آجائے تو یہ مجنوں کو سنگ سار کرنے سے باز نہ رہیں۔ باوجود اس کے

مکمل شعر:

1 دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا — میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

2 گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے — غالب

کہ اُنگلیاں فگار اور خامہ خونچکاں ہوتا ہے۔ یہ ہر صبح لوگوں کو خط لکھنے کے لیے کان پر قلم دھر کر نکلتے ہیں اور نامہ بر کو سلام لکھ بھیجتے ہیں۔

یہ جو کچھ کھاتے ہیں وہ کیموس بنے[1] بغیر خون بن جاتا ہے۔ اسی سبب سے اُڑنے سے پیش تر بھی ان کا رنگ زرد ہوتا ہے اور یہی وہ موقع ہے جب گلہائے ناز کھلتے ہیں اور موت کا کھٹکا پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی تعمیر میں ہیولیٰ مضمر ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب یہ خوبرویوں کو دیکھتے ہیں تو لوگ ان کی صورت دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب کوئی سوتے میں تبسّم ہوتا ہے تو وہ یقیناً غیر کی بغل میں سوتا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں پاؤں کا بوسہ نہ لینا چاہیے۔ ورنہ پولیس بدگمان ہو جائے گی۔ یہ اپنا لپٹا ہوا بستر کبھی نہیں کھولتے، کیوں کہ محبوب کے در پر جلی حرفوں سے یہ لکھا ہوا ہے کہ "بستر مت کھولو اور دربان کے قدم نہ لو، ورنہ شامت آجائے گی۔ اگر کوئی مشق ناز کرے تو یہ خون دو عالم اپنی گردن پر لے لینے کے لیے آمادہ رہتے ہیں، لیکن اگر کف قاتل میں خنجر دیکھتے ہیں تو مارے جانے پر آمادگی کا اظہار نہیں کرتے اور عذر کرتے ہوئے کفن و تلوار سمیت مکان واپس آجاتے ہیں۔ جب تک آنکھوں میں دم ہوتا ہے ساغر و مینا کو علاحدہ کیے جانے پر راضی نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ جب ہاتھ میں جام آجاتا ہے تو سب لکیریں ہاتھ کی رگ جان بن جاتی ہیں اور ضمناً ہندوستان کا تاج و تخت بھی مل جاتا ہے۔ دیار غیر میں وطن سے دور مارے گئے، اس سے خدا نے ان کی بے کسی کی شرم رکھ لی، لیکن پولیس کی وقتیں بڑھا دیے۔ پری زادوں نے خلد میں جانے سے یوں انکار کر دیا ہے کہ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ قدرت حق سے پری زاد حوروں میں منتقل ہو گئے تو خلد میں ان سے انتقام لیا جائے گا۔ اسی سلسلہ میں یہ ایک بار جنت پہنچ چکے تھے۔ لیکن وہاں قدیم و جدید آرٹ پر ان کی لڑائی رضوان سے ہو گئی۔ پھر معلوم نہیں ان کے جی میں کیا آیا کہ بنات النعش گردوں کو عریاں دیکھتے ہوئے اس دنیا میں واپس آ گئے۔

ہسٹری شیٹ بہت طویل ہے اور ریڈیو پر مہلت بہت کم ملتی ہے۔ اس لیے میں اردو شاعری میں عاشق کے درجہ پر تھوڑی سی گفتگو اور کر کے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

---

1. کیموس، یعنی Hamoglobine۔

اردو میں ہمارے شعرانے عاشق کی آڑ میں وہ سب باتیں بیان کردی ہیں جو کائنات میں انسان کی پوزیشن کو واضح اور متعین کرتی ہیں اور جنھیں صنائع بدائع اور مخصوص اسالیب بیان سے علاحدہ کر کے دیکھیے تو ایک نہایت ہی ذہین، بالغ نظر اور متمدن قوم کے بڑے دل نشین اور قیمتی نقوش ملیں گے۔ انسان حقیقتاً کائنات کا سب سے بڑا باغی ہے۔ وہ معمولی سی معمولی چیز کو اپنی اُپج اور استعداد سے بلند سے بلند درجہ پر فائز کر دیتا ہے اور کائنات کے بڑے سے بڑے مظاہرہ کو اپنی استعداد کار کردگی سے بے بود و بے سپر قرار دے دیتا ہے۔ اس موقع پر بہت سی اور باتیں بھی میرے ذہن میں آتی ہیں، لیکن میں ان سب کو نظر انداز کر کے اصغر مرحوم کے صرف دو اشعار موضوع گفتگو یعنی عاشق کی جواب دہی میں پیش کر کے آپ سے رُخصت ہو جاؤں گا۔

ایک یہ ہے:

ز لا تسخیر کردم ایں جہانِ مہر و انجم را
ز جوش بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا [1]

دوسرا:

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

گراں نہ گزرے تو ایک شعر اور سُن لیجیے۔

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہید تبسم ہوئی بہار ہوئی

یہ سب تو ہوا، اور میں تقریر ختم کرنا ہی چاہتا تھا کہ ابھی ابھی ریڈیو کی ایک لہر براہِ راست موج گوش بن کر نکل گئی جس کی (لہر کی لمبائی) اور میٹر آپ متعین کیجیے شعر میں سنائے دیتا ہوں۔

آ اودھر آ ارے او چاک گریباں والے
یوں بلاتے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے

---

1 ترجمہ میں نے "لا" سے اس جہانِ مہر و انجم کو مسخر کر رکھا ہے اور بندگی کے اپنے جوش رندانہ سے سرمدو منصوری کی طرح اپنے معبود کو پالیا ہے۔ ●●●

محبوب

پہلی بات تو یہ ہے کہ تقریر یا تحریر کے آغاز میں طرح طرح کے اشعار یا وسوسوں کا دل میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ دل میں چور ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ''محبوب'' کا تذکرہ ہو تو دل میں چور ہونا بڑی ناروا بات ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ محبوب کا تذکرہ کرتے وقت دل میں چور نہ ہو تو پھر آپ ہی بتایئے، دل میں چور ہونے کا اور کون سا موقع آئے گا۔

ان باتوں کو آپ مذاق نہ سمجھیں، اس لیے کہ دل کی چوری ایک امر واقعہ ہے۔ بہت ممکن ہے مذاق ہی مذاق میں آپ خود دل چرانے پر آمادہ ہو جائیں یا آپ کا دل چوری ہو جائے یا ایسا ہو چکا ہو اور آپ کسی سے نادم اور کسی سے خائف ہوں۔

لیکن معاف کیجیے اس چوری کے سلسلہ میں ہم آپ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ مجھے ایک بات اور کہنی تھی جسے چوری کے سلسلہ میں بھول گیا تھا، مگر کوئی ہرج نہیں۔ جس طرح ''ریڈیو'' میں کہیں بھول چوک ہو جاتی ہے تو ''گراموفون'' بجنے لگتا ہے، اسی طرح مقرر بھی ''غیر حاضر'' ہوتا ہے تو شعر پڑھنا شروع کر دیتا ہے — ہاں تو وہ بات اور غالباً آخری بات یہ ہے کہ پہلا شعر جو میں پڑھنا چاہتا تھا، وہ کچھ نامکمل سا یاد آ گیا ہے۔ ممکن ہے آپ کو بالکل یاد نہ ہو۔ یعنی فلک کو ستم گاری کا سلیقہ نہیں ہے — اور یہ لیجیے دوسرا مصرعہ پورا یاد آ گیا، یعنی

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں![1]

معشوق کے بارہ میں کچھ زیادہ کہنا یوں نہیں ہے کہ خود مصرعہ میں معشوق موجود ہے۔ پردۂ زنگاری کی البتہ دقت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن بزرگوں کا مقولہ ہے کہ شعر میں کوئی دقت پیش آئے تو فوراً کوئی دوسرا شعر پڑھ دینا چاہیے۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ایسی حالت میں برابر شعر پڑھتے رہنا چاہیے۔ میں ایسا تو نہیں کروں گا، لیکن شعر ضرور پڑھوں گا۔ مثلاً:

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا[2]

ہم مشرقیوں نے دنیا کے آلام و مصائب کو جتنا برتا ہے اس سے زیادہ ان آلام و مصائب کو انگیز کرنے اور برگزیدہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے وجوہ ہیں اور دنیا کی کون سی بات وجوہ سے خالی ہے۔ وجہ دریافت کرنے کی لَم انسانوں میں نہ لگی ہو تو ہم میں اور دوسرے جانداروں یا جانوروں میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ میرا تو خیال ہے کہ انسانوں کی بہترین تعریف یا ڈفینیشن ''وجہ دریافت کرنے والا جانور'' ہوسکتا ہے۔ سبب یا علت کا فلسفہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ لیکن آپ اطمینان رکھیے فلسفہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو (اور فلسفہ کی دلچسپی کا تمام تر مدار اس پر ہے کہ وہ فوراً فلسفی میں تبدیل ہوجاتا ہے) میں آپ کو بہرحال اس سے محفوظ رکھوں گا۔

مشرق اور مغرب کے ذہنی عمل میں ایک بنیادی تفاوت یہ ہے کہ مشرق ہر واقعہ یا ہر چیز کو مجموعہ میں دیکھتا ہے۔ مغرب جز کو اہمیت دیتا ہے۔ مشرق ہر بات کو منجانب اللہ سمجھ کر اس کی جواز کی فکر میں پڑ جاتا ہے اور بالآخر اُن پر ایمان لاتا ہے، اور ظاہر ہے جب ہر چیز منجانب اللہ مان لی جاتی ہے تو جواز ڈھونڈھنے میں نہ تو کوئی دقت پیش آتی ہے نہ اس کی ضرورت باقی

---

1 چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

2 جگر۔

راہی ہے۔مغرب جزئیات کا امام ہے۔وہ کل سے اتنا سروکار نہیں رکھتا جتنا جز کے تحلیل و تجزیہ کو اہم سمجھتا ہے۔کائنات اور کردگار کا گورکھ دھندا اسی ذہنی تفاوت کا نتیجہ ہے۔

چنانچہ ہمارا شاعر ہر غم کو غمِ جاناں بنا کر آلام حیات کو آسان بنالیتا ہے۔مغرب کا حکیم آلام حیات کو آسان بنانے کی اتنی فکر نہیں کرتا جتنا ان کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔بات یکساں ہے، یعنی آلام حیات سے عہدہ برآ ہونا۔کوئی تاویل کر کے انھیں گوارا بنالیتا ہے اور کوئی ان کی تحلیل کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔پھر یہ بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مشرق غمِ جاناں کو سب کچھ سمجھتا ہے۔مغرب جاناں ہی کا نہیں قائل تو غم کا احترام کیوں کرے۔

مثلاً مشرق شمع کی زبان سے زندگی پر حکم لگاتا ہے، وہ شمع سے کہتا ہے کہ عمرِ طبیعی تو جہاں کی تہاں رہے گی، جسے ہنس کر گزار دے چاہے رو کر گزار دے۔مغرب کہتا ہے ہنسنے رونے کا تمام تر مدار عمرِ طبیعی پر ہے، اس لیے ہنسا رونا اتنا اہم نہیں ہے جتنا عمرِ طبیعی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔مشرق فلک کو ستم گار نہیں سمجھتا، وہ پسِ پردہ قوت پر نظر رکھتا ہے۔وہ ستم گار کا شاکی نہیں ہوتا، سلیقۂ ستم پر سر دُھنتا ہے۔

آج کی صحبت میں اسی سلیقۂ ستم یا غم جاناں سے سابقہ ہے۔لیکن غم کا ریڈیو پر کہاں گزر۔یہ چیز تو ایک دفعہ صرف اکبر مرحوم کو پیش آئی تھی جب ان کی آہ کو فونوگراف میں قید کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ممکن ہے غالب کے زمانہ میں بھی اسی قسم کا کوئی سانحہ پیش آیا ہو، جس کا اظہار انھوں نے یوں کیا تھا۔

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

بزمِ محبوب میں معلوم نہیں کس قسم کا ریڈیو سیٹ ہے جہاں نالہ نغمہ بن کر پہنچتا ہے، ورنہ اب تک ہمارا آپ کا تجربہ اپنے اپنے ریڈیو سیٹ کا تو یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ریڈیو سیٹ ایک مشین ہے۔تاہم کثرت استعمال بامدت تک ہاتھ لگتے رہنے سے اس میں ایک طرح کی ''شخصیت'' پیدا ہو جاتی ہے، اور شخصیت جیسا کہ ہم آپ جانتے ہیں اُس حالت کو کہتے ہیں جب کوئی کچھ کرے آپ اپنی سی کریں! چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا، جس ریڈیو میں شخصیت پیدا

ہو جاتی ہے اس کا حال اس طنبورہ جیسا ہو جاتا ہے جس کے بارہ میں کہا گیا ہے، من چہ سرایم و طنبورہ من چہ سراید! کچھ اسی قسم کی حالت بعض بزرگوں کی بھی ہوتی ہے جو گاتے ہیں تو رونے کا احتمال ہوتا ہے اور بات کرتے ہیں تو جھگڑنے، ورنہ جھوٹ بولنے کا گمان ہوتا ہے۔

غالب کے اسی اعتبار نغمہ کو مدنظر رکھ کر بعض ریسرچ کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جب ریڈیو سیٹ میں اس قسم کی اصلاح کی جاسکے گی کہ براڈکاسٹ کسی زبان میں کیا جائے۔ سننے والا جس زبان میں چاہے خبر، تقریر یا گانا سن سکے گا۔ مثلاً بہت ممکن ہے ہندو مسلم اتحاد مکمل ہو جانے پر ریڈیو اسٹیشن سے تقریر ہندستانی میں براڈکاسٹ کی جائے، لیکن سننے والے چاہیں تو اردو میں سن لیں اور چاہیں تو ہندی میں، اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ مختلف زبانوں کے بنیادی الفاظ و معنی کی چھوٹی چھوٹی ڈبیاں ریڈیو سیٹ میں بند ہوں گی جو متعلقہ الفاظ و معنی کو مطلوبہ الفاظ و معنی میں منتقل کر دیں گی اور ہم آپ جو چاہیں گے سُن لیا کریں گے۔

دیار محبوب کے مخبر نے تو یہاں تک اطلاع دی ہے کہ عشاق اور شعرا محبوب کے خلاف جس طور پر تہمت تراشتے رہتے ہیں یا جس طرح مبالغہ کو مباہلہ کی حد تک پہنچا دیتے ہیں، اس سے تنگ آکر محبوب سنگھٹن نے ایک کمیشن ایسے لوگوں کا مقرر کر دیا ہے جو ایجاد کرنے کے ماہر ہیں۔ ان ماہرین کو اس امر کا کمیشن دیا گیا ہے کہ چوں کہ افلاس و بے روزگاری نے قوم اور ملک کی ذہنیت یکسر بدل دی ہے اور عشاق و شعرا کی تعداد اندیشہ ناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ محبوبوں کی عزت و جان و مال کے تحفظ کے لیے مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

سنگھٹن نے نہایت محنت اور قابلیت کے ساتھ تحقیقات کرنے کے بعد اپنی رپورٹ دے دی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح فطرت جانوروں کو اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے مختلف قابلیتیں مہیا کر دیتی ہے، اسی طرح محبوب کو بھی اپنی حفاظت کے لیے مناسب و معقول ساز و سامان سے لیس ہونا چاہیے۔ نظر براں محبوب کی بعض فطری کمزوریوں کو مادّی قوتوں سے مزید تقویت پہنچانا از بس ضروری ہے۔

مثلاً آپ نے دیکھا ہوگا جانوروں میں سے بعض کو زمین یا درخت یا ان کے مخصوص ماحول کا رنگ دے دیا گیا ہے تاکہ دشمن انھیں آسانی سے دیکھ نہ سکے۔ بعضوں کے دانت اور پنجے تیز ہوتے ہیں۔ بعض اتنے تیز رفتار سبک جست، تیز پرواز یا خورد بینی ہوتے ہیں کہ دشمن کے لیے ان کا پیچھا کرنا یا پتہ لگانا دشوار ہوتا ہے۔ بعض ایسے خاردار، متعفن، زہریلے، چکنے چپڑے یا گنجے ہوتے ہیں کہ ان کو ہاتھ لگانے میں تامّل ہوتا ہے۔ فطرت نے جانوروں میں یہ باتیں اس لیے رکھ دی ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں سے محفوظ رہیں۔ گو ہم یہاں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ بعض انسانوں نے بھی جو بھلے مانسوں سے کچھ سیکھنے کے بجائے سب کچھ جانوروں سے سیکھنے اور بھلے مانسوں پر آزمانے کے شائق ہوتے ہیں۔ یہی اصول اختیار کر لیے ہیں، لیکن یہاں انسانوں سے بحث نہیں ہے، محبوبوں سے ہے۔ اس لیے میں اس بحث کو یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور محبوب سنگھٹن کی بعض اہم سفارشات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔

محبوب سنگھٹن اس بات پر زور دیتا ہے کہ محبوبوں کو کشتی لڑنا چاہیے۔ تیر، بندوق، نیزہ، گرز، خنجر اور کمند سے حملہ کرنے کی مشق بہم پہنچانا چاہیے۔ رضا کاروں کا دستہ بنانا چاہیے۔ پیرا کی، قواعد، پریڈ اور لاٹھی چارج قسم کی باتیں سیکھنی چاہئیں —— اس خلاصہ کا شائع ہونا تھا کہ ''بزم مجانین'' عرف ''حزب الشعرا'' کی طرف سے ایک احتجاجی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں اس امر کا اعلان کیا گیا کہ یہ تحریک نہایت درجہ خطرناک ہے اور اس کی تمام تر بنیاد ایذا رسانی اور اشتعال انگیزی پر ہے۔ یہ ملک کے تمدنی روایات ہی نہیں بلکہ شعر و آرٹ کے آداب کے بھی خلاف ہے۔ محبوب کو بزم آرائی و مشق ناز سے سروکار رکھنا چاہیے نہ کہ دنگل آرائی اور مردانگی سے۔ محبوب کو حفاظت خود اختیاری اور جارحانہ اقدام دونوں کے لیے فطرت نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ انھی سے غریبوں، مسافروں اور نیازمندوں کو پناہ نہیں ملتی۔ چہ جائیکہ انھیں مزید اسلحہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے یا سہولتیں فراہم کی جائیں۔

سامان حرب وضرب کی فراوانی وفراہمی سے امن وعافیت کا تحفظ ضرور ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سامان حرب وضرب کا ایک خاصہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ بچانے کے بجائے مارنے کی طرف ذرا زیادہ مائل رہتے ہیں!

اس کے علاوہ یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عشاق اور شعرا بالطبع صلح پسند اور "حق بخشوائے" ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف صف آرائی پر آمادہ ہونا انصاف و شرافت دونوں سے بعید ہے۔ پھر یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ ہم تو دن بہ دن امن و صلح کی تبلیغ، نیاز مندی کا اعلان اور درماندگی و افتادگی کا ثبوت بہم پہنچائیں اور فریق مخالف کو اہتمام جنگ، تباہ کاری اور خونریزی کی مزید سہولتیں پہنچائی جائیں!

آپ کو محبوب کے اسلحہ خانہ میں مژگاں کے تیر، ابرو کی کمان، نگاہ کی شرر باری، تبسم کی برق پاشی، خرام کی حشر انگیزی اور معلوم نہیں کس کس کی اور کیا کیا چیزیں ملیں گی! توشہ خانہ کی سیر کیجیے تو دانتوں کے موتی، لبوں کے عقیق، خط کا زمرد، گردن کی صراحی، عارض کا مصحف، تل کے سپند، آنکھوں کے میخانے، پروانوں کی خاکستر، پیشانی کی بیاض، بغل کے فتنے، دہن کا عنقا، افشاں کے ستارے، مانگ کی کہکشاں، چاہ زنخداں ید بیضا موکر، مہرۂ افعی، دود آہ، اعجاز مسیح، متاع کنعاں، خواب زلیخا، نامہ خونچکاں ملے گا — پائیں باغ میں گزر ہو تو زلفوں کے سنبل، زبان کی سوسن، قد کا سرو، شمشاد کی سولی، نرگس کی آنکھ، لالہ کا جگر، شبنم کا گریہ، قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ، پھولا ہوا ڈھاک اور جلا ہوا ساکھو ملے گا۔ حریم محبوب کے گرد جو حصار ہے، اس میں ساحل سمندر، کام نہنگ، سراب، بگولے خار مغیلاں "ذرہ صحرا دستگاہ قطرہ دریا آشنا" سنگ آستیں، آئینہ حیرت، طور سینا، میدان حشر کی پوری مجنو لائن کا نقشہ نظر آ جائے گا۔ جس کے اندر باہر، اوپر نیچے، دربان، کتے، رقیب، ناصح، واعظ، محتسب، شحنہ اور بوالہوس اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ملیں گے۔

یہ تو ہوا لیکن مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ عشاق بھی کچھ کم حقنی نہیں ہوتے۔ دیکھنے میں خاصے مریل، خفیف و کثیف نظر آئیں گے۔ لیکن پروپیگنڈا کرنے میں ان کا ثانی کوئی نہیں۔ ان کی مثال ان لوگوں سے دی جا سکتی ہے جو جتنے حقیر فقیر و مسکین نظر آتے ہیں، اتنے ہی زیادہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کی خاطر خواہ مرمت کی جائے۔ آپ کو بعض ایسے لوگوں سے یقیناً سابقہ رہا ہوگا جو خاکساری اور مسکینیت کا مظاہرہ ہی اس لیے کرتے ہیں کہ دوسرے ضبط و تحمل سے گزر جائیں۔

لیکن آپ کو معلوم ہے جہاں محبوب سے سابقہ ہو، وہاں صرف پیترے اور پروپیگنڈے سے کام نہیں چلتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کے بارہ میں بتایا گیا ہے۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے [1]

یہ وہ لوگ ہیں جو

ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے [2]

یہ وہ آتش ہے

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے [3]

لیکن بنے یا نہ بنے گفتگو کا سلسلہ بہر حال جاری رکھنا ہے۔ اس لیے آیئے میں آپ کو دیارِ محبوب کی سیر کراؤں۔ آپ آگے بڑھیے اور جی میں جو آئے کیجیے۔ میں آل انڈیا ریڈیو کی طرح رواں دواں قسم کی خبر سرائی یا حاشیہ آرائی کرتا ہوں۔ جیسا کہ میچ میلے یا مشاعروں سے ریڈیو والے Running Commentary کے طور پر کیا کرتے ہیں۔

لیکن یہ بات اچھی طرح یاد رکھیے کہ اردو شعر و شاعری کے ہیرو ہیروئن دونوں زمان و مکان خشکی و تری، خلوت و جلوت، عقل و جنون، شرافت و شہدپن غرض ان تمام علائق سے آزاد ہوتے ہیں۔ جس میں ہم آپ گھرے ہوئے ہیں۔ اس لیے بیان میں اگر کبھی کبھی آسمان سے زمین تک کا تفاوت بھی ملے تو اپنی یا میری طرف سے آپ کسی قسم کا وسوسہ دل میں نہ لائیں!

وہ دیکھیے محبوب کی محفل گرم ہے۔ ایک طرف شعرا شعر پڑھ رہے ہیں، عشاق رو رہے ہیں، بوالہوس پنکھا جھل رہے ہیں، کچھ مریض دل پکڑے سر تھامے کراہ رہے ہیں۔ کسی کا سر ہتھیلی پر کسی کے ہاتھ میں دل ہے۔ ایک صاحب گوشت کی دوکان کا افتتاح محبوب سے کرانا چاہتے ہیں۔ وہ دیکھیے گا اوّل تو انھوں نے محبوب کے سامنے خنجر رکھ دیا۔

مکمل شعر:

1. نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے — غالب
2. اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے — غالب
3. عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے — غالب

پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا[1]

محبوب بولا، تو بعض حاضرین اُچھل پڑے کہ دہن موجود ہے حالاں کہ بتایا یہ گیا تھا کہ

دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

وہ دیکھیے شراب کا دور چلا۔ جام ہمارے ہیرو کے سامنے پیش کیا گیا تو یہ سمجھ کر کہ

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں[2]

انھوں نے طلب کی نوعیت ہی بدل دی اور فرماتے ہیں:

وہ بھی تھوڑی سی جوان آنکھوں کے پیانہ میں ہے

فرمائش پوری کی گئی تو انھوں نے

صحبت شراب سے آگے سفر کیا!

اور ہاں خبروں کا بھی انتظام ہے جو مختلف لہروں پر آ جا رہی ہیں۔ مخبر اپنی رپورٹ اور نامہ بر اپنے خطوط پیش کر رہے ہیں۔ ایک طرف نامہ بر کبوتر بھی بام پر چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے، جس کو دیکھ کر ایک صاحب فرماتے ہیں:

یہ تو کہتا نہیں کھو آیا مرے نامہ کا جواب

کیسا بیٹھا ہے کبوتر مرا اُلو ہو کر

محبوب نے ایک خط پڑھ کر قاصد کی گردن مارنے کا ارادہ کیا ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے:

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے

اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

اور قبل اس کے کہ محبوب ان پر ہاتھ صاف کرے، انھوں نے بڑھ کر آئینہ دکھا دیا۔ جس پر محبوب اپنا سا منہ لے کر رہ گیا ہے اور یہ مصرعہ طرح عرض کرتے ہیں:

مکمل شعر:

1 میں نے ان کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا | پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا | غالب

2 مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام | ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں | غالب

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا! [1]

اور ہاں ذرا یہ بھی دیکھیے گا، محبوب کے اس کہنے پر کہ ذرا میرے پاؤں داب تو دے۔ ایک صاحب کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے ہیں۔ اس کے بعد ہی محبوب نے انگڑائی لینے کا ارادہ کیا، لیکن ان کے سوجے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھے تو

چھوڑ دیے ''گڑ بڑا'' کے ہاتھ [2]

وہ دیکھیے کیا ہو رہا ہے

مجمع سے عاشقوں کے وہ گھبرائے اس طرح
قرآن اُٹھا رہے ہیں کہ بندہ حسین نہیں!

اب محبوب نے قالب بدلنے شروع کر دیے ہیں۔ کبھی پھول بن جاتا ہے تو آواز آتی ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں [3]

لیکن کیا کیا جائے۔ وقت ختم ہو رہا ہے، اور محبوب کے کرشمے فکر و نظر کے قابو میں نہیں آ رہے ہیں۔ کبھی ہر رنگ میں نظر آنے لگتا ہے اور کبھی ہر رسائی سے باہر ہو جاتا ہے۔

دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

ایک طرف سے آواز آئی:

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

●●●

مکمل شعر:

1. آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا غالب
2. اصل شعر یہ ہے۔ رشید صاحب نے مصرعے میں تحریف کر کے لطف پیدا کیا ہے:
   انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ دیکھا مجھے تو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ
3. غالب کا مشہور شعر ہے:
   سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

دربان

غالب اردو فارسی کے بڑے زبردست شاعر گزرے ہیں۔ ایک جگہ انھوں نے فرمایا ہے:

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا

یعنی عشق و محبت جس کے دم سے زندگی کی کشتی زمانے کے دھارے پر بہتی اُچھلتی چلی جاتی ہے۔ دربان کی جھڑکی گھڑکی سے سہم ہی گیا۔ اور عاشق نامراد جس آرزو اور ارمان کے ساتھ محبوب کی بارگاہ تک پہنچا تھا وہ سارے کا سارا کافور ہو گیا۔ غالب کا میں دل سے قدردان ہوں، اور کوئی غالب کو برا کہے تو مجھ سے برا بھی کوئی نہیں۔ بشرطیکہ برا کہنے والا خود دربان نہ ہو۔ لیکن باوجود اس اعتقاد اور ارادت کے میں برابر اس پھیر میں رہا کہ غالب یا ان کے ہیرو پر یہ واقعہ گزرا ہی کیوں۔ اتفاقاً ایک اور شعر میری نظر سے گزرا، جس کے مفہوم پر غور کرنے کے بعد میں دربانوں کی زبان درازی یا دست درازی کو ایک حد تک حق بجانب بھی سمجھنے لگا۔ وہ شعر یہ ہے ؂

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں لپٹا ہوا بستر کھلا
غالب

اس شعر کو آپ جس طور پر چاہیں معنی کا جامہ پہنالیں۔ لیکن میرا ذہن اس وقت کسی اور طرف منتقل ہو رہا ہے۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے اور رفتار کے اعتبار سے طول وعرض کا تصوّر بدل جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے بعض ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو اپنے اشعار کچھ اس ڈھن سے پڑھتے ہیں کہ آپ ان کے صحیح رقبہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے ایک شاعر کو غزل اس طور پر پڑھتے دیکھا ہے گویا غزل کے معنی عورتوں سے بات کرنے کے نہیں ہیں بلکہ XB انجنوں پر دانت پیسنے کے ہیں۔

اچھا آیئے ذرا سنجیدگی سے اس مضمون کی ''تقطیع'' کر ڈالیں۔ یہ کوئی اندیشہ ناک بات نہیں ہے بشرطیکہ سنجیدگی اپنی ہو اور تقطیع دوسروں کی۔ دنیا میں ہر شخص کھلونے کھیلتا ہے۔ کھلونوں اور کھلاڑیوں کا شمار نہیں ''شاعر'' الفاظ سے کھیلتا ہے۔ مصوّر رنگ اور خط سے، مجسمہ تراش پتھر سے، رقاص حرکت سے، سیاست دان اقوام سے، لیڈر جہلا سے، یونیورسٹیاں تعلیم یافتوں سے، تعلیم یافتہ بیکاری سے، بیکاری انقلاب سے، انقلاب زندہ باد سے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ خود الفاظ کی دنیا بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اور اس میں ہمارے شاعر کو بہت کچھ دخل ہے۔ الفاظ کی اہمیت اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ ''تعزیراتِ ہند'' اور نقش سلیمانی دونوں کا مدار اسی پر ہے۔ قانون اور تعویذ سے کون آزاد رہ سکتا ہے۔ تعزیراتِ ہند کی رو سے سزا ملتی ہے، نقش سلیمانی سے محبوب۔ بہرحال الفاظ کو معنی سے کیا نسبت ہے۔ اس پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ خود الفاظ کو کیسی جامعیت نصیب ہو چکی ہے اور ہم آپ اس سے نت نئے نئے شگوفے کھلایا کرتے ہیں۔

شاعر کا سارا کھیل الفاظ سے ہے۔ اس کھیل کو ہمارے شعرا نے اتنا کھیلا ہے کہ اب الفاظ میں وہ باتیں پیدا ہو گئی ہیں، جو کبھی معنی میں نہیں تھیں۔ پہلے معنی کے لیے الفاظ کی تلاش تھی۔ اب الفاظ تلاش کر لیجیے۔ معنی خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ کبھی معنی کے لیے سرگرداں رہتے تھے، بڑی ریاضت بڑی مشقت کے بعد معنی تک رسائی ہوتی تھی۔ اب الفاظ ہی سب کچھ ہیں، ان کو ادھر اُدھر کرتے رہیے، ہر قسم کے معنی نکلتے رہیں گے اور جو بچ رہیں گے ان کو سامعین پورا کر دیں گے۔

آج کل کے بیش تر شاعروں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ انھیں صرف ''الفاظ'' یاد ہیں، جن کو وہ جس طرح چاہتے ہیں ترتیب دیتے ہیں۔ بعض حالتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جب بحروں اور ترکیبوں کی چرخ پر خود بخود الفاظ آجاتے ہیں۔ جن کے لانے میں شاعر کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ معنی تو سامعین کی شعریت خود ہی پیدا کر لیتی ہے۔ شاعر کا فرض صرف الفاظ کی ترتیب اور بندش ہی نہیں ہے اور نہ صرف وہ خیالات ہیں جن کی وہ الفاظ ترجمانی کرتے ہیں۔ سننے والوں میں بھی شاعر موجود ہوتا ہے۔

یہاں ''شاعر'' سے مراد کوئی خاص شخص نہیں ہے۔ جس کا ایک تخلص ہو یا جس کا ایک خاص طرح کا حلیہ یا مشتبہ قسم کی صحت ہوتی ہے، بلکہ وہ شعریت ہے جو سننے والے میں موجود ہوتی ہے۔ حقیقی شاعر اپنے سامعین کے دل و دماغ کے تاثرات کو بھی جذبات یا تخیل کا جزو بنالیتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو پھر کسی دواساز شاعر میں فرق کیا رہ جائے، جو ہمیشہ چند ادویات ملا کر عرق سفوف یا معجون تیار کر سکتا ہے۔

حالاں کہ آپ نے ایسے شاعر بھی دیکھے ہوں گے جو شاعر بالکل نہیں صرف دواساز ہوتے ہیں۔ یہ آپ کے دیکھتے دیکھتے غزل ہی نہیں بلکہ ایک نشست میں پورا دیوان مرتب کر دیں گے۔ ان کے اشعار ملکۂ شعر سازی کے اتفاقی یا میکانیکی نتائج ہوتے ہیں۔

اچھا اب تصوّر کیجیے، ایسے شاعر کا جسے اطلاع ملی ہے کہ فلاں مقام پر مشاعرہ ہونے والا ہے اور مصرعۂ طرح یہ ہے۔ فرض کر لیجیے وہ ایسے خوش قسمتوں میں نہیں ہے، جس کو تیسرے درجہ کا بھی سفر خرچ مل سکتا ہے۔ وہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر ''مصرعۂ طرح'' پر زور لگانا شروع کر دے گا۔ اس درمیان میں اس کو مطلق یہ فکر نہ ہوگی کہ بیوی بچوں کو پیٹ بھرنے کی روزی اور تن ڈھکنے کو کپڑا بھی میسّر ہے یا نہیں۔ نہ دن کو دن سمجھے گا نہ رات کو رات، بھوک پیاس سے کوئی علاقہ نہیں۔ دوست دشمن سب سے بے نیاز، تخیل کے زور سے آسمان پر چڑھ جائے گا۔

شفق سے عبیر اور سپیدۂ سحر سے کافور اُڑاتا، چاند، سورج سے رُخسار، محبوب کی سیر کرتا، ثریا کی مانگ سے افشاں چراتا، زہرہ کی تان اُڑاتا، مریخ سے گھبراتا، قاضی فلک سے گلخپ کرتا، اوروں پر مسکراتا، فرشتوں سے آنکھ ملاتا، حوروں کو ورغلاتا، رضوان سے لڑتا، مالک سے

کترا تا، قلم سے لکھتا، لوح کو پڑھتا، طوبیٰ وسدرہ پر جھولتا، کوثر وتسنیم میں ڈبکیاں لگاتا، جبرئیل کو صید زبوں بناتا، اسرافیل سے سرگوشیاں کرتا، میکائیل سے دانہ بدلتا، عزرائیل سے بچتا، پرتو خور سے شبنم کو فنا کی تعلیم دیتا یک لخت پاتال پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کبھی خاک سے پوچھتا ہے کہ اے لئیم تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے۔ لالہ وگل میں نمایاں ہونے سے جو صورتیں بچ رہی تھیں ان سے آداب وتسلیمات کرتا، قارون نے راستہ میں جو خزانہ لٹایا تھا، اسے ٹھکراتا کسی سوختہ سامان کو فلس ماہی سے شمع روشن کرنے کی ہدایت دیتا۔ ہر موج میں جو صد حلقہ کام نہنگ ہیں ان میں قطرہ کو گہر بنتے یا بگڑتے دیکھتا۔ عین دریا میں حباب آسا گھوں پیانہ کرتا، ساحل کو سفینہ اور سفینہ کو ساحل سے اور دونوں کو سبک سامان ساحل سے ٹکراتا اس دنیا میں آجاتا ہے، جہاں اس کی غزل تیار ہو رہی ہے اور بیوی بچے فاقہ کر رہے ہیں۔

یہاں کی دقت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ شعر ہے کہ کسی طرح اپنے ہاتھ پاؤں پر کھڑا ہی نہیں ہو پاتا۔ کبھی لیلیٰ ملتی ہے تو مجنوں بھاگے جاتے ہیں۔ فرہاد قابو میں آتے ہیں تو جوئے شیر غائب۔ حضرت موسیٰ سے نیاز حاصل ہوتا ہے تو تجلی طور کا پتہ نہیں، رود نیل تک رسائی ہوتی ہے تو فرعون ہاتھ نہیں لگتا۔ محمود ملتے ہیں تو ایاز غیر حاضر، محبوب بے حجاب نظر آتا ہے تو رقیب مسلح ملتا ہے۔ بہار آئی تو زنجیر نہیں ملتی، ہجر میں مرغ سحر نہیں ملتا تو وصل میں موذن حائل ہو جاتا ہے۔ مے خانہ تک رسائی ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ساقی مہوش کے بجائے لٹھ بند (والنٹیر) موجود ہیں۔ عالم وحشت میں صحرا کی خاک چھاننے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کو ترقی دینے کے لیے مرغیوں اور مویشیوں کو بسا دیا گیا ہے۔ داور محشر سے نپٹنا چاہتا ہے تو جمعیت اقوام معترض ہوتی ہے۔

ان سب سے کسی نہ کسی طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں تو ایک اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کوئی حرف تقطیع سے گر رہا ہے، کہیں الف بڑھ گیا ہے تو کہیں ی دب گئی ہے۔ ایک طرف روزمرہ کا منہ سوجا ہوا ہے تو دوسری طرف محاورہ بپھر گیا ہے۔ زحافات میں تذبذب ہے تو مصرعوں میں شتر گربگی۔ کہیں فصاحت سسک رہی ہے تو کہیں بلاغت غرا رہی ہے۔ بندش کو سنبھالتے ہیں تو ترکیب کی چولیں ڈھیلی ہوئی جاتی ہیں۔

ان دشواریوں سے کسی نہ کسی طرح نجات ملتی ہے تو غزل لے کر دربار مشاعرہ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ بیلی میں سوار، نزلہ زکام میں مبتلا، فاقہ کرتے سردی سے اکڑتے، مشاعرہ پہنچے۔ جلسہ شروع ہوا ایک نے مصرعہ اُٹھایا سینکڑوں نے نعرہ لگایا اور ہزاروں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ مجمع کی یہ حالت ہوئی جیسے برسات میں کسی کے بگڑے ہوئے منہ زور و بے لگام ریڈیو سیٹ پر ماسکو سے روسی قوالی سننے کی کوشش کی جارہی ہے۔ خدا خدا کر کے ایک صاحب کی باری آئی جن کا لہجہ نکیر پن کا اور جن کی شاعری عذاب قبر سے مشابہ تھی۔ پہلے تو پڑھنے سے اس لجاجت سے معذوری ظاہر کی، جیسے پھانسی کے تختہ پر جانے سے گریز کر رہے ہیں۔ لیکن جب اصرار خاطر خواہ اور بے پناہ ہوا تو معلوم نہیں کدھر سے ایک رجسٹر نکالا، جس پر معلوم ہوتا تھا کہ غدر کے بعد سے اب تک میونسپلٹی کے تمام اندراجات فوتی و پیدائش موجود ہیں۔ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ مجمع سے ہنگامہ بلند ہوا۔ اتنے میں کسی منچلے نے بجلی کا سلسلہ بند کر دیا، دوسرے نے شامیانہ کی طنابیں کاٹ دیں۔ جناب صدر سکریٹری مشاعرہ شعرا مصرعہ طرح سب کے سب شامیانے کے نیچے کل حکمت ہو گئے!

یہ تو ہوا شاعر ہونا۔ اس سے زیادہ عبرت انگیز شاعر کا میزبان ہوتا ہے۔ شاعر ہمیشہ مشاعرہ کو بُرا بھلا کہتا آتا ہے، لیکن مشاعرہ پر جان دیتا ہے۔ میزبان کو سب سے زیادہ احتیاط اس امر کی رکھنی پڑتی ہے کہ مہمان کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ برف پڑ رہی ہو تو اسے نمونیا کا اندیشہ نہیں۔ آگ برس رہی ہو تو اُسے لو لگنے کا خوف نہیں، لیکن اس کی توہین ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ میزبان کو شاعر کے عجیب و غریب معمولات ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی، بلکہ اس کے اناپ شناپ اشعار بھی سننے پڑتے ہیں۔ اس کو داد اس طور پر دینی چاہیے کہ ایسے اشعار نہ اب تک سنے گئے نہ آئندہ اس کی توفیق ہوگی۔ شعر سننے اور داد دینے کے خاص خاص آداب مقرر ہیں۔ اوّل تو فرمائش اس طور پر کیجیے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کی فرزندی میں دینے جارہا ہے اور شرم، خوف اور تذبذب کی وجہ سے اٹک اٹک کر گفتگو کرتا ہے یا پھر قرض کے بہانے خیرات مانگ رہا ہے۔

اس کے بعد موصوف ''مصرعہ اوّل'' پڑھیں گے۔ اسے آپ اُٹھائیں، یعنی دُہرا دیں۔ آپ کے بعد ممدوح اس مصرعہ کی تکرار کریں گے اور معاً دوسرا مصرعہ پڑھیں گے۔

''مصرعہ ثانی'' کا ایک تہائی ختم ہوتے ہی آپ کو اپنی آنکھ کھول کر منہ پھاڑ لینا چاہیے۔ دو تہائی پر کلماتِ تحسین ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو جایئے اور بقیہ تہائی کے ختم ہونے سے ذرا پہلے آہ یا واہ کر کے لوٹ جایئے اور ہوش میں آنے سے پہلے ہی مکرر پڑھنے کی فرمائش کیجیے۔ اس طور پر کوئی دو دو رجن شعر سنیے اور بغیر ستائے یا دم لیے چلم بھرنے یا پان لینے گھر میں چلے جایئے۔ مجھے اس قسم کی سعادتیں اکثر نصیب ہوئی ہیں۔

مگر بدنصیبی سے مجھ میں ایک کمزوری یہ ہے کہ میں لکھا ہوا مصرعہ بھی آنکھ سے دیکھ کر اکثر پہلے ہلّے میں غلط پڑھ جاتا ہوں۔ چہ جائیکہ مصرعہ اُٹھانے کے سلسلہ میں اسے سنتے ہی دُہرا دوں۔ میری اس کمزوری سے اکثر شعرا واقف ہیں اور کچھ یہ بھی ہے کہ انھیں اپنا مصرعہ بھی خاصا عزیز ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے معذور سمجھ کر مصرعہ اُٹھانے سے معاف کر دیا گیا ہے۔

بدنصیبی سے ایک بار اپنے ایک دوست سے ملنے گیا۔ ان کے ہاں ایک اور ''بزرگ'' بیٹھے ملے۔ دوست نے پذیرائی کچھ غیر معمولی مسرّت سے کی۔ میرے بیٹھتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے زنان خانہ میں چل دیے کہ یہ فلاں شاعر ہیں۔ آپ ان کا کلام سُن کر بے حد مسرور ہوں گے۔ میں کچھ کہنے سننے بھی نہ پایا تھا کہ شاعر نے آداب و تسلیمات و خلوص و احترام کے ایسے پینترے شروع کر دیے کہ میں کچھ نہ کر سکا اور انھوں نے اپنی بیاض کی مشین گن مری طرف کر دی۔ پہلے تو ڈر کے مارے چپ رہا، لیکن ان کی آنکھوں میں طیش و لجاجت کے باری باری کچھ ایسے آثار ملے کہ داد دینے کے لیے سربکف ہو گیا۔ وہ مصرعہ کے دو چار ہی الفاظ پڑھ پاتے کہ میں جلدی سے انھیں کو دُہرانے لگتا۔ انھوں نے پھر سے مصرعہ شروع کیا اور میں نے پھر سے انھیں الفاظ کو دُہرانا شروع کر دیا۔

کئی دفعہ ان کا اسٹارٹ (ابتدا) بگڑا تو ایک دفعہ الف ہی ہو گئے۔ جھلا کر بولے: ''حضرت مصرعہ کو تو ختم ہونے دیجیے۔'' میں نے بھی مری ہوئی آواز میں کہا: ''قبلہ پورا کر لیجیے۔'' انھوں نے مصرعہ پڑھ کر میری طرف دیکھا تو میں نے جہاں پہلا فقرہ ختم کیا تھا، اُس کے آگے کا فقرہ نادانستہ طور پر تھوڑی ترمیم کے بعد پڑھ دیا۔ انھوں نے چین بجبیں ہو کر صحت کر دی۔ میں نے بھی عرق عرق ہو کر صحت کر لی۔ ان کو اطمینان نہیں ہوا، اس لیے انھوں نے پورا

مصرعہ پڑھ دیا۔ میں نے بھی پڑھ دیا، لیکن ذرا رُک رُک کر۔ جس کی وجہ سے نظم نثر میں تبدیل ہوگئی۔ میرے اس اضطراری قصور پر انھوں نے ایسا نعرہ لگایا کہ میں وہاں سے بھاگا اور میزبان باہر نکل آئے۔

یہ سب تو ہوا، لیکن اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر یہ بات کیا ہے کہ شاعر اور مشاعرہ ہماری زندگی اور ادب میں اتنا رچ گیا ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے یہ اسی کا فیضان ہو کہ ہم دوسری اہم تحریکوں کو بھی ''مشاعرہ'' ہی سمجھنے لگے ہیں۔ وہی اناپ شناپ خیالات، جن کو کبھی رقص کر کے، کبھی رو کر اور کبھی چیخ کر پیش کرتے ہیں۔ کسی کو گالی دے دی، کبھی اپنا قصیدہ پڑھ دیا۔ خود جی میں خوش ہوئے، دشمنوں کو ہوشیار یا بدگمان کیا۔ اپنوں نے داد دی، دوسروں نے ڈنڈا سنبھالا۔ مشاعرہ سے اُٹھے تو یہ سمجھا کہ سارے جہاں کو زیر وزبر کر دیا ہے۔

●●●

ناصح

پُرانے زمانہ کا ایک شعر سنیے، اور مجھے بخش دیجیے۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پندِ پیر دانا را

مجھے یقین ہے کہ میں اپنے آپ کو پیر دانا قرار دے دوں تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس لیے کہ پیری کے ساتھ دانائی کا اضافہ کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے سنا ہوگا پیری وصد عیب!

لیکن مجھے یہ تامّل ہو رہا ہے کہ آپ بھی جوانانِ سعادت مند کے زمرہ میں آتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے کہ جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ کم سعادت مند جوان دیکھے گئے ہیں، اور کوئی جوان سعادت مند ہونا گوارا نہیں کرتا!

بہر حال ریڈیو کا اصول یہ ہے کہ جوانانِ سعادت مند کے لیے پیر دانا ہی کا انتخاب کیا جائے۔ اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ ریڈیو کے بس میں کچھ اسی قسم کا انتخاب ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ریڈیو والوں کو محبت ضرور نو جوانوں سے ہوتی ہے۔ لیکن اعتماد انھیں بوڑھوں ہی پر ہوتا ہے۔

چنانچہ مجھے اُمید ہے کہ آپ سعادت مندی سے کام نہ لیں گے تو خواہ مخواہ جوانی کا مظاہرہ بھی نہ فرمائیں گے۔

ہاں تو مجھے کہنا یہ تھا کہ اردو شاعری میں ''ناصح'' واعظ یا انھیں کے بھائی بند زاہد اور شیخ سے بڑی بدگمانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ انہی میں ملے جلے کہیں بھیس بدلے ہوئے اور کہیں لاٹھی لیے ہوئے محتسب بھی نظر آ جاتا ہے۔ کچھ دن ہوئے اسی قسم کے لٹھ بند آپ کو ریڈیو سیٹ اور لائسنس کے سلسلہ میں بھی ملے ہوں گے۔ ان دنوں ان سے امن ہے، لیکن فضا اچھی نہیں ہے۔ یہاں فضا سے ہندو مسلم فضا سے نہیں ہے۔ بلکہ اس فضائی خلفشار سے ہے، جس سے غالباً اس وقت بھی آپ دوچار ہوں گے!

محتسب اور فضائی خلفشار سے پہلے میں نے کہیں بدگمانی کا اظہار کیا تھا۔ ہاں خوب یاد آیا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ناصح، واعظ، زاہد، شیخ اور محتسب سے اردو شاعری میں بڑی بدگمانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ عشاق شعرائے خوار یا رند، جس بات کو سب سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اسی کو ناصح یا واعظ سب سے بڑا سمجھتے ہیں۔ محتسب تو مار تک بیٹھتے ہیں۔ عاشق سے خوار یا رند کو ناصح ہر طرح کا نیچ اونچ سمجھاتا ہے۔ کہتا ہے کہ تمھاری حرکتیں، اخلاق، مذہب، بھلمنساہٹ، عافیت جوئی یا مصلحت اندیشی کے خلاف ہیں۔ ان سے باز آؤ، توبہ کرو، کان پکڑ کر اُٹھو بیٹھو، ورنہ آخرت میں پل صراط کے اور دنیا میں انجن کے نیچے کٹ جاؤ گے۔

عاشق کہتا ہے کبھی ہنس کر کبھی رو کر بیش تر چیک کر کہ یہی باتیں ''حاصل حیات'' ہیں۔ یہ نہ ہوں تو دنیا مافیہا سب ہیچ۔ یہی نہیں بلکہ عاشق سمجھتا ہے کہ مے محبوب، محبت قلندری، بے نیازی اور بے باکی کی رمز، لطائف یا مصالح سے واعظ بے خبر ہے۔ اس لیے اس کی باتیں نا قابلِ اعتنا اور اس کی بد عقلی قابلِ درگزر ہے۔

وہ زاہد یا واعظ کو بدمذاق بھی سمجھتا ہے اور ناواقف احوال بھی۔

وہ کبھی کہتا ہے کہ:

رعنائی خیال کو ٹھیرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

تو دوسری جگہ کس حزیں انداز سے یہ بھی کہہ گزرتا ہے۔

یہ کیا تو نے کہا ناصح نہ جانا کوئے جاناں میں
ہمیں تو رہ رووں کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا

واعظ اور رند کی یہ چشمک وکشاکش بڑے زمانہ سے چلی آتی ہے۔ واعظ، مذہب، اخلاق یا سماج کی حمایت کرتا ہے۔ اُس مذہب اخلاق وسماج کی نہیں، جسے ہم آپ جب چاہیں زیروزبر کردیں۔ بلکہ اس مذہب اخلاق یا سماج کی جو آئین وسنیں اور فکر وفشار کے جنتر سے نکلا اور جسے نسلوں نے نکھارا اور نتھارا۔ وہ شریعت یا سوسائٹی کو مجموعی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ فکروعمل کے اجتہاد یا شخصی آزادروی کے خلاف ہوتا ہے۔

رند کہتا ہے اور اپنی جگہ پر ٹھیک کہتا ہے کہ شخصی فکروعمل کی آزادی نہ ہوتو دنیا سے بڑھ کر مہمل جگہ کوئی نہیں۔ شریعت و اخلاق سے شیرازہ بندی ہوتی ہے، زندگی کے نئے ابواب کا افتتاح نہیں ہوتا۔ زندگی کا وظیفہ کائنات کی ورق گردانی ہوتو ہو، حیات انسانی کا مقصد مضمون آفرینی اور گرہ کشائی ہے۔ جس کے بغیر انسان کی عظمتیں بے معنی، کائنات کی گتھیاں، لاینحل اور وعیدالٰہی بے اصل!

لیکن اس قسم کی بحث سے آپ کو کیا فائدہ۔ یہ باتیں تو پڑھے لکھوں کی شاشتیں ہیں، جن میں قاضی قاتل اور قاتل قاضی ہوتے ہیں۔ تاہم قتل و قضا سے علاحدہ ہوکر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ میری نیت بخیر ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ شعروشاعری سے پہلے ہی پہلے کچھ وعظ ونصیحت ہو جانی چاہیے۔ اس لیے کہ شعروشاعری میں وعظ ونصیحت شامل ہو جاتی ہے تو لوگ بہت برہم ہوتے ہیں اور برہمی دور کرنے کے لیے اکثر نصیحت سے کام لینا پڑتا ہے۔ نصیحت کارگر نہ ہوتو البتہ کچھ اور کیا جاتا ہے جس کی ضرورت ہوتو ہو، موقع نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ دور ہیں اور میں محصور!

نصیحت کے اقسام ہیں۔ مقام بھی۔ بعض لوگ نصیحت تو کرتے ہیں، لیکن اس کے لیے موقع اور مقام ایسا انتخاب کرتے ہیں کہ سننے والا بدحواس ہو جاتا ہے اور بدحواسی میں کچھ ایسی باتیں کرگزرتا ہے کہ ہم کو آپ سے اور آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لیے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔

نصیحت کرنا میرے نزدیک بڑی قابلیت کا کام ہے۔اس لیے کہ نصیحت کرنے سے زیادہ معمولی اور آسان مشغلہ اور کوئی نہیں ہے، اور ظاہر ہے معمولی اور آسان بات کو ایسا بنا دینا کہ وہ موثر اور دل نشین بھی ہو جائے، بہت مشکل کام ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نصیحت سنی چاہیے۔ نصیحت کرنے والے کو نہیں دیکھنا چاہیے۔ میں اس کا قائل نہیں، میں تو نصیحت کرنے والے سے متاثر ہوتا ہوں۔ نصیحت یا اصول نصیحت قسم کی چیزوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ آدمی آدمی سے متاثر ہوتا ہے، نصیحت سے نہیں۔

نصیحت کے باب میں ایک بزرگ نے بڑی اچھی بات بتائی ہے۔ یعنی نصیحت کرنا بڑی بے وقوفی کی بات ہے اور اس سے بڑی بے وقوفی یہ ہے کہ نصیحت پر عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں۔ نصیحت نہ سہی، ناصح میں بڑے فریب چھپے ہوتے ہیں۔ نصیحت کر دینے کے بعد ناصح بعض دوسرے اہم فرائض سے اپنے آپ کو بالکل آزاد کر لیتا ہے۔

چنانچہ صبر وشکر کی تلقین بھی اسی نصیحت کی ایک شکل ہے۔ جس طرح صبر وشکر کی تلقین کر کے لوگ اپنی تمام ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر اور مظلوم یا ستم رسیدہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح نصیحت کر دینے کے بعد نصیحت کرنے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس پر کسی اور قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کوئی شخص فاقہ کرتے کرتے روٹی کا ایک ٹکڑا چرا لے تو ناصح یہ نہ کرے گا کہ عدالت میں مقدمہ کی پیروی کرے یا بھوکے کو برسر روزگار لگانے کی فکر کرے۔ وہ صرف یہ بتا کر فارغ ہو جائے گا کہ چوری کرنا بہت بُری بات ہے۔ شرفا ایسا نہیں کرتے، اس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہوتا ہے وغیرہ۔ وہ کبھی اس پر غور نہ کرے گا کہ چوری کرنا ضرور بُری بات ہے، لیکن فاقہ سے ہلاک ہو جانا اس سے بھی بُرا ہے۔ شرفا چوری کریں یا نہ کریں فاقہ کش کو ایسا ضرور کرنا چاہیے۔ دوسروں کی حق تلفی اتنی سنگین بات نہیں ہے جتنا اپنے حقوق سے محروم ہونا، عبرت ناک اور درد انگیز ہے۔ عبادت کی مانند نصیحت کو پیشہ بنا لینا بڑی نامعقول بات ہے۔

یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے ناصح کو ہمیشہ بُرا بھلا کہا گیا ہے۔ چنانچہ اردو شعر و شاعری میں واعظ یا زاہد کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان سے کسی کی

ہمت افزائی نہیں ہوسکتی۔ واعظ و ناصح کے زمرہ میں زاہد، چارہ گر اور والدین قسم کے تمام لوگ آجاتے ہیں۔ والدین قسم سے مراد ایسے لوگوں سے ہے جو اپنے لڑکوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں اور اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، گویا آخرت نوجوانوں کے لیے اور دنیائے دوں ان بزرگوں کے قیام وطعام کے لیے مخصوص ہے!

اردو شعر و شاعری میں واعظ یا ناصح کے بارہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جس طرح سے کہا گیا ہے، اُن سے ہم خوب واقف ہیں اور ان پر ہنسے بھی خوب ہیں۔ اکثر واعظ و ناصح پر بیش تر خود اردو شاعری پر اُردو شاعری پر ہنسنا بڑی نادانی کی بات ہے، اس پر رونا اور بھی بُرا ہے۔ ہماری شاعری میں ناصح، واعظ، زاہد، رند، عاشق، محبوب، بوالہوس، محبت، رشک، نفرت، جاں بازی اور اس قسم کی جن اور باتوں کا ذکر آیا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض طبائع ایسے بیان یا اسلوب اظہار کو پسند نہیں کرتیں جو ہماری شاعری کا اوڑھنا بچھونا ہی نہیں، بلکہ جادو کی وہ چھڑی ہے جس کے ہلانے گھمانے سے کائنات اپنے اسرار بے نقاب کرنے لگتی ہے۔

لیکن ذرا ٹھہریے۔ آج کی صحبت میں میرا فرض یہ ہے کہ میں آپ کو اردو شعر و شاعری کے انہی اوراق سے آشنا کراؤں۔ جن میں صرف واعظ و ناصح کے خدوخال نمایاں کیے گئے ہوں۔ اس لیے میں آپ کے سامنے جستہ جستہ ایسے نمونے پیش کرتا ہوں جن میں آپ کو ناصح کا حلیہ یا کردار نہایت واضح اور دلچسپ نظر آئے گا۔ واعظ یا ناصح کی تدریجی نقاب کشائی مدّنظر رکھتے ہوئے سنیے۔

اُٹھواؤ میز سے مے وساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پُرانے خیال کے

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

داڑھی کے ساتھ ہے سر اقدس گھٹا ہوا
اب ہے کمی ریاض تو اک پشت خار کی

یا　　　　واہ رے دستار واعظ بے ریا

بڑھ گیا طرۂ دمِ روباہ سے

مکمل سراپا اب ملاحظہ ہو:

ہم نے دیکھا طرف مے کدہ جاتے تھے ریاض

اک عصا تھامے، عبا پہنے، عمامہ باندھے

ایک عصا تھامے، عبا پہنے، عمامہ باندھے، ان کا مکمل نقشہ آپ کے ذہن میں نہیں آتا تو کسی تقریب کا انتظار کیجیے۔ جہاں اس قسم کی چیز اکثر دیکھنے میں آجاتی ہے یا پھر ٹیلی ویژن کے عام ہو جانے پر آپ ان کا مشاہدہ گھر بیٹھے کر سکیں گے۔ اس لیے کہ مجھے یقین ہے، اس وقت تک میں خود زندہ رہوں گا اور ریڈیو والوں کو بھی معاوضہ دو چند کر دینے میں کوئی تامّل نہ ہوگا۔

واعظ یا ناصح کے کردار یا کرتوت کا اندازہ کرنا ہو تو یہ شعر سنیے:

ملے تو حشر میں لے لوں زبان واعظ کی

عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لیے [1]

عاشق کو ان بزرگ کے نیک فال ہونے کا یہاں تک خوف ہے کہ وہ کہتا ہے:

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں

کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے [2]

عاشق خوب جانتا ہے کہ ناصح کی گفتار بے اثر ہوتی ہے۔ اتنی بے اثر کہ وہ ڈرتا ہے کہیں گفتگو کرنے سے غریب کی آہ و فغاں بھی بے اثر نہ ہو جائے۔

عاشق ناصح کی گفتگو کو محض ایک طوفان تکلم سمجھتا ہے۔ طوفان تکلم ہی نہیں بلکہ خود اسی کے طوفان تکلم ہونے کا اسے خدشہ ہے۔ عاشق ترک محبت کو محالات سے سمجھتا ہے۔ ناصح کی تلقین کو ایک فرضی کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ شب فراق میں جب اسے نیند نہیں آتی اور کوئی افسانہ خواں نہیں ملتا تو کہتا ہے:

1　داغ دہلوی

2　مومن خاں مومن

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق
ناصح ہی کو لے آؤ، اگر افسانہ خواں نہیں [1]

عاشق کو یقین ہے کہ ناصح عقل سے عاری ہے۔ ہمدردی سے اسے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ تنگ نظر ہے، اور اس قابل نہیں کہ اس سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے جائیں۔ پھر بھی کبھی کبھی وہ اپنے جذبہ، نفرت وحقارت کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے اور محض اس بنا پر کہ ناصح کی گفتگو کو محبوب سے ایک طرح کی نسبت حاصل ہے۔ اس کی باتوں کو انگیز کر لیتا ہے، اور خود ناصح کو ایسی بات سمجھاتا ہے جو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ عاشق کا یہ درجہ اتنا بلند اور اتنا درد انگیز ہوتا ہے کہ ہم ناصح کی نا قابلِ رشک پوزیشن کو یک قلم فراموش کر دیتے ہیں۔

مثلاً ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کو ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

یا نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا بھی تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

یا چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

غالب نے اپنے خاص انداز میں ایک جگہ ناصح کی حیثیت بیان کی ہے جس کے دو مختلف لطیف پہلو خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ یعنی:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

نصیحت سے دنیا کے کارخانے کا کوئی گوشہ یا ہماری زندگی کا کوئی پہلو خالی نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ماضی کا ورثہ حال کے توسل سے مستقبل کو پہنچاتی ہے۔ اسی آنکھ سے ہم مستقبل کی تاریکیوں میں راستے پیدا کرتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے، آج ہم جو کچھ دیکھتے پاتے ہیں، اس میں اس رہبری کا کتنا دخل ہے۔ جو ہمارے پیش رووں کی نصیحت سے ہم کو پہنچی ہے۔

---

1 مومن خاں مومن

دنیا کی تاریخ نصیحتوں ہی کا آئینہ ہے۔ لیکن دنیا کی بہت بڑی محرومی یہ ہے کہ لوگ دوسروں کو نصیحت نہیں کرتے، بلکہ نصیحت کے پردے میں اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں یا دوسروں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ غور تو کیجیے یورپ میں کون کسے نصیحت کرتا ہے، کیوں کرتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ لیڈر اپنی جماعت کو نصیحت سے کیسے کیسے سبز باغ دکھاتے ہیں، وہ کیا کہتے ہیں، کیا چاہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو نصیحت نہیں کرتے، فضیحت کرتے ہیں۔ نصیحت کی آڑ میں اپنے کینہ کو تسکین دیتے ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو اخلاق و مذہب کی تلقین ہی اس لیے کرتے ہیں کہ معقول لوگوں کو عذابِ الٰہی ہی کی بشارت دے کر اپنے جذبۂ حسد و غضب کو تسکین پہنچائیں۔

بعض لوگ نصیحت کرتے ہیں، لیکن ان کی نصیحت پر عمل نہ کیجیے تو کسی وقت گولی سے ہلاک کر دیے جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ورنہ تاحیات فریقین کی دشمنی مسلّم۔ یہ اللہ واسطے نصیحت کرتے ہیں اور نہ مانیے تو بندہ واسطے پیٹ پھاڑ ڈالنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

ایسوں کی نصیحت سننی کوئی قابلِ رشک پوزیشن نہیں ہے۔ اتنی بات البتہ یاد رکھیے کہ جب موقع نازک اور ہر طرف مایوسی اور تاریکی نظر آئے تو اپنے مخلص ترین دوستوں سے مشورہ کیجیے، اور ان کے مشورہ یا نصیحت پر عمل کیجیے۔

مخلص دوست کی نصیحت یا مشورہ الہام ہوتا ہے جس سے زیادہ سچی اور کاری بات آج تک دریافت نہیں کی جا سکی ہے۔

●●●

رقیب

سائنس میں آیا ہے کہ دنیا کا سارا کاروبار قوت کی غیر مساوی تقسیم پر ہے۔ ہر چیز کے باہمی تعلقات جائز ہوں، خواہ ناجائز اسی غیر مساوی تقسیم پر منحصر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بشارت دی گئی ہے کہ روز بروز یہ فرق کم ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ اس کا امکان ہے کہ یہ عدم مساوات کم ہوتے ہوتے کسی وقت ایسے نقطہ یا سطح پر پہنچ جائے کہ دنیا کی ساری موجودات قوت یا حرکت کے اعتبار سے ساکن محض ہو جائیں اور ہماری دنیا جہاں کی تہاں رہ جائے، اور ہم آپ جوں کے توں۔ ممکن ہے قیامت کی سائنٹفک تعبیر یہی ہو۔

رقیب کے سلسلہ میں سائنٹفک قیامت کا تذکرہ آجانا بظاہر بڑی نامعقول سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عاشق کے لیے خود رقیب کسی قیامت سے کم نہیں اور قیامت پھر قیامت ہے۔ خواہ وہ سائنٹفک ہو، خواہ شاعرانہ، خواہ کسی اور قسم کی جس کی تشریح خود قیامت سے کم نہیں۔

اردو شاعری میں عشق و محبت کی دنیا بھی اُسی قانون کی محور پر گردش کرتی ہے جس کا شاعرانہ نام رقیب ہے۔ رقیب کو درمیان سے اُٹھا لیا جائے تو دنیا کے ڈرامے میں ہیرو ہیروئن، میاں بیوی بن کر رہ جائیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میاں بیوی بننا کوئی نامعقول بات ہے اور ہیرو ہیروئن ہونا کوئی بڑے فخر کی بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رقیب کا عنصر حذف کر دینے کے

بعد عشق و محبت کی حیثیت وہی رہ جاتی ہے جو سورج نکلنے سے پہلے تاڑی کی بتائی جاتی ہے۔ آپ اس مثال سے منغض نہ ہوں۔ اس میں تاڑی کا لفظ ذرا غیر شاعرانہ سا آ گیا ہے، لیکن مثال تلاش کرنے میں دیر لگتی۔ بہت ممکن ہے اس وقت تک تاڑی میں وہ بات پیدا ہو جاتی جو ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اس لیے میں نے خیال کیا کہ جلد سے جلد تاڑی ہی پیش کر دی جائے۔ اس کے بعد بقیہ دال دلیا کا انتظام ہوتا رہے گا۔

اور ہاں دال دلیا کے سلسلہ میں ریاض کا ایک شعر یاد آ گیا۔

دعوت تھی رقیب کی مرے گھر
جوتی میں دال کیا بٹی ہے

مجھے اس قسم کی دعوت پر سخت اعتراض ہے۔ پہلا اعتراض تو دعوت میں دال کی موجودگی ہے، پھر جوتے کی۔ اس کے بعد یہ کہ میں تو کروں آپ کی دعوت اور آپ لائیں اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو جن سے میرے تعلقات کشیدہ اور آپ کے ناگفتہ بہ ہوں۔

جوتی میں دال بٹنے سے لڑائی مراد ہے۔ آپ ہی بتایئے دعوت میں دال بٹے گی تو تعلقات کب تک خوش گوار رہیں گے۔ پھر یہاں اس امر کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ ریاض خمریات کے امام ہیں۔ ان کے ہاں مہمانوں کو جائز طور پر یہ توقع رہی ہوگی کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اسے کر بھی دکھائیں گے۔ برخلاف اس کے مہمانوں نے دال بٹتے دیکھی تو یقیناً چراغ پا ہوئے ہوں گے اور دھول دھپا شروع ہو گیا ہوگا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں، لیکن غالباً اس واقعہ کے بعد ہی شراب نوشی کے انسداد کی تحریک بروئے کار آئی۔ لیکن یہ مسئلہ بجائے خود کافی پیچیدہ تھا اور اس پر آسانی کے ساتھ عمل درآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس وقت یہ حکم نافذ کر دیا گیا کہ دعوتوں میں دال نہ ہوا کرے۔ مزید احتیاط کے طور پر اس امر کا بھی انتظام کیا گیا کہ ایسے مواقع پر بالعموم مہمان و میزبان چپل استعمال کیا کریں، تاکہ بانٹنے کا کوئی موقع آ بھی جائے تو جوتے کو برتن کی حیثیت نہ حاصل ہو سکے۔

رقیب کا لفظ بعض اقوام کی مانند بدیشی ہے، لیکن اس کا مفہوم سودیشی ہے۔ پردیس میں اس کے معنی اُن محافظوں کے تھے جو عورتوں یا لڑکیوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ اردو شعر

وشاعری میں اس کا اطلاق ایک ہی محبوب کے متعدد چاہنے والوں پر ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ رقیب کا لفظ دشمن، حریف، غیر سبھی معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

شعرا یا عاشق رقیب کو بہت بُرا سمجھتے ہیں اور رقیب بھی شعرا یا عشاق کو کچھ اچھا نہیں سمجھتا۔ ہم آپ ان میں سے کسی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ بالخصوص رقیب کو اس لیے کہ عموماً اس کو رقیب روسیہ کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جس شخص کا منہ کالا ہو، وہ رقیب ہے۔ البتہ آپ کی سہولت کی خاطر میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ اگر آپ کسی ایسے شخص کو دیکھ پائیں جس کا صرف منہ کالا ہو تو اس کے بارہ میں آپ یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ رقیب ہے۔ لیکن کالے ہونے کے اعتبار سے آپ کسی کو سرتاپا نورٌ علیٰ نور پائیں تو خواہ مخواہ اسے رقیب قرار نہ دیں۔ ممکن ہے وہ کالا چور ہو، یا ہمارا آپ کا دوست۔ گو یہ بات میں بتائے دیتا ہوں اکثر دوست ہی رقیب بھی بن جاتے ہیں جس کی غالب نے جابجا شکایت کی ہے۔ یعنی:

بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

رقیبوں کی بہت سی اقسام ہیں۔ یہ زندگی کے ہر شعبہ میں ملیں گے۔ لیکن یہاں ہمارا سروکار اُن رقیبوں سے ہے جو اردو شعر شاعری میں ملتے ہیں۔ رقیبوں کی صرف اس قسم کو متعین کر لینے سے رقیبوں کی کھتونی کا کام ہلکا ہو سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلّم ہے کہ اردو شعر و شاعری میں رقیبوں کے ایسے ایسے کرتوت ملیں گے جن کے ہوتے ان کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ رقیب اور زاہد کی اردو شاعری میں جس جس طور پر مرمت کی گئی ہے، اس سے آپ کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہوں گے۔ خود رقیب بے چارے کی جواب دہی آج تک کسی نے نہ کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی جماعت بہت غیر منظم ہے اور ان کے خلاف ایک مدت سے بڑا سخت پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور وہ دن دور نہیں کہ رقیبوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے۔

ایک بار رقیبوں کے خلاف عشاق اور شعرا نے بڑا سخت مظاہرہ کیا۔ کالے جھنڈے نکالے، بڑا بھاری پنڈال بنایا، خوب خوب روئے، کوسنے دیے، طعن تشنیع گالی گلوج کی، بے سروپا افواہیں پھیلائیں، گمنام خطوط بھیجے، غرض وہ تمام طریقے اختیار کیے جو ناکارے و بے حیا اور اوباش کیا کرتے ہیں۔ بالآخر ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے بہت کچھ تحقیقات کرنے کے

بعد یہ سفارش کی کہ رقیبوں کا انسٹی ٹیوشن نہایت مفید ہے۔ اس لیے کہ جس طرح فطرت میں بہت سے کیڑے کوڑے یا چرند پرند بظاہر نجس و نامعقول معلوم ہوتے ہیں، لیکن نجس اور نامعقول چیزوں کو کھا پی کر ان کے زہریلے اثرات سے انسانوں کو محفوظ رکھتے ہیں، اسی طرح محبوب کو عشاق اور شعرا کی وبا سے محفوظ رکھنے کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ رقیبوں کا ادارہ بکلیہ قائم رکھا جائے، اور اس ادارہ کو قائم رکھنے کے لیے محبوبوں پر تدریجی ٹیکس عائد کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ کسی محبوب کو میونسپلٹی اس وقت تک محبوب بننے کی اجازت نہ دے جب تک کہ اس کا محکمہ صفائی اس بات کا اطمینان نہ کر لے کہ ہر محبوب میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ دو چار رقیبوں کی کفالت کر سکتا ہے۔

شعرا نے عجیب عجیب اقسام کے رقیب دریافت کیے ہیں۔ خود رقیب، ناصح رقیب، نامہ بر رقیب، چارہ ساز رقیب، ہوا رقیب، ذرّہ رقیب، تکیہ رقیب، بستر رقیب، خواب رقیب، تلوار رقیب، زیور رقیب، آئینہ رقیب، بدگمانی و بدگوئی رقیب، غرض ملک الموت کے علاوہ رقیب ہی رقیب!

عاشق کی فطرت ہے کہ وہ محبوب سے بدگمان رہے اور محبوب کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ عاشق سے چوکنا رہے — اور ہماری آپ کی شامت ہے کہ ہم ان دونوں کے معاملہ میں کھنچے کھنچے پھر رہے ہیں۔ ممکن ہے آپ کبھی عاشق نہ ہوئے ہوں اور نہ رقیب بننے کی آپ میں صلاحیت ہو، لیکن ریڈیو کا کام ہی یہ ہے کہ آپ جس چیز سے ناواقف ہوں، ان سے یہ آشنا کرائے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ آپ کو بعض ایسے نسخے بھی بتا دے گا جو صرف ہمالیہ کے سنیاسوں یا مشہور خاندان کے اطبا کو معلوم ہوتے ہیں یا بعض ایسے راز منکشف کر دے کہ آپ چاہیں تو یورپ میں جنگ چھڑ جائے یا ہم ہندوستانیوں کو فرسٹ سکنڈ کلاس میں سفر کرنے کی تمیز آ جائے۔

ریڈیو کا کام یہ ہے کہ وہ آپ کو دلچسپ اور مفید معلومات بہم پہنچا کر آپ کو بھلے مانس بننے اور رہنے کی ترغیب دے۔ ہاں تو بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ممکن ہے ہم کو آپ کو نہ عاشق بننے کی توفیق ہوئی ہو اور نہ ہم میں آپ میں ایک دوسرے کے رقیب ہونے کی صلاحیت ہو۔ نہ شد، نہ شد، لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کا سابقہ کسی نہ کسی بڑے آدمی سے ضرور رہا

ہوگا۔ معشوق اور بڑے آدمی ایک ہی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کو مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ یہ پیدا ہی اس لیے کیے گئے ہیں کہ لوگ ان کا دم بھرتے رہیں۔ ان کا مغالطہ ایک حد تک حق بجانب بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں ایسے لوگوں سے گھرے ہوتے ہیں جن کا نامۂ اعمال بالکل سیاہ نہیں تو گنجلک ضرور ہوتا ہے، اور آپ تو جانتے ہیں نامۂ اعمال سیاہ ہونے سے پہلے گنجلک ہی ہوتا ہے۔

محبوب کے ارد گرد بوالہوس اور بڑے آدمی کے گرد و پیش خوشامدی اور خود غرض ہوتے ہیں۔ بڑا آدمی اپنے مصاحبوں کو آزماتا نہیں، بھلے مانسوں کو رُسوا کرتا ہے۔ بڑے آدمی کی اصلی پہچان یہ ہے کہ اسے نہ اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے اور نہ بھلے مانسوں پر۔ وہ اپنے اختیارات اور بے ایمانوں کی ذہانت یا دنائت پر اعتماد کرتا ہے۔ محبوب کو بقول غالب:

اپنے پہ اعتماد ہوتا ہے وہ غیر کو آزماتا نہیں [1]

یہی سبب ہے کہ محبوب تو ہر حال میں محبوب رہتا ہے، لیکن بڑا آدمی وہ کہلایا جانے لگتا ہے، جس کو فرشتے نہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھنے کے مجاز ہیں اور نہ جسے ریڈیو پر نشر کیا جا سکتا ہے!

محبت کا رشک سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن یہ بات میں پُرانے زمانہ کی بتا رہا ہوں۔ آج کل کا حال تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ میں اس عہد کا تذکرہ کر رہا ہوں جب رقیب زیادہ اور سنیما بالکل نہ تھے۔ اب رشک کی جگہ روشن خیالی نے لے لی ہے۔ پہلے زمانہ میں جو رقیب ہوتے وہ اب رفیق قرار دیے جاتے ہیں یا پہلے کبھی جو شریف کہے جاتے تھے، انھیں اب مقابلہ کے امتحان میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ان باتوں کو چھوڑیے۔ رقیبوں کی خبر لیجیے اور اکبر کا بیان سنیے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

رقیبوں کا ذکر آئے تو تلخ کلامی نظر انداز کر دینی چاہیے۔ غالب اور رقیب دونوں نے اس پر عمل کیا ہے۔ آپ کو وہ شعر تو یاد ہی ہوگا۔

---

1. درست اور مکمل شعر یہ ہے:

حُسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں غالب

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا!

اس شعر میں غالب نے محبوب کی شیریں سخنی کی داد دی ہے، لیکن اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ غالب کے زمانہ میں رقیب کتنے عالی ظرف اور محبوب کس درجہ خوش لگام ہوتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ایک کی زبان اور دوسرے کا ذائقہ آپس میں کیا نسبت رکھتے تھے۔ غالب نے اس واقعہ پر تحسین یا تعجب کا ضرور اظہار کیا ہے، لیکن بہت ممکن ہے محبوب اور رقیب میں کوئی رشتہ ایسا بھی ہو، جس میں لطف دشنام ہی سب کچھ ہو۔

بعضوں کا خیال ہے کہ حقیقتاً کوئی رقیب نہیں ہوتا، بلکہ شاعر یا عاشق خود رقیب گھڑ لیا کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب تک رقیب کا تصور درمیان نہ ہو عشق و محبت میں طاقت یا حرکت کی وہ عدم مساوات نہیں پیدا ہوتی، جو محبت کی گاڑی کو زمانہ اور زندگی کے نشیب و فراز پر کھینچتی رہتی ہے۔ محبوب کی بے وفائی یا محبت کی رُسوائی کا اندیشہ نہ ہو تو عشق کے جذبات افسردہ ہو جائیں اور مقابلہ یا مسابقت کی استعداد باقی نہ رہے۔ عاشق اور محبوب دونوں بوالہوس کو بوالہوس ہی سمجھتے ہیں اور دونوں رقیب کو صرف رقیب۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے۔

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

غالب کی غیر معمولی شخصیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کا جذبہ رشک نہایت درجہ متنوع اور اتنا ہی قوی تھا۔ وہ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لانا چاہتے تھے۔ ان کو اپنی شخصیت طرح طرح سے خطرہ میں نظر آتی تھی۔ اسی لیے وہ اس خطرہ کا طرح طرح سے مقابلہ اور ازالہ کرتے تھے۔ ہر رشک ایک نئے رقیب کی خبر دیتا ہے۔ وہ محبوب کی ہر بات انگیز کرنے پر آمادہ رہتے تھے، لیکن رقیب کا تخیل گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ میں اکثر خیال کرنے لگتا ہوں کہ غالب اکثر اپنے آپ کو محبوب سمجھنے لگتے تھے اور اپنے آپ ہی کو رقیب بھی۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

وہ دیکھا جائے، کیا یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ذرا اس بیان پر بھی نظر رکھیے۔

قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!

لیکن باوجود اس غلو کے غالب پھر غالب تھے۔ وہ اپنے سے بھی کھیلتے تھے اور ہم سے بھی کھیلنے پر آمادہ رہتے تھے۔ کبھی اُن بلندیوں پر پہنچ جاتے تھے جو خود اُن کی رسائی سے بھی پرے معلوم ہوتی تھی اور کبھی اس سطح پر آ جاتے تھے جہاں ہر شخص پہلے سے موجود ہوتا۔ جن میں وہ اس طور پر گھل مل جاتے اور کھیل کھیلتے تھے کہ ہم ان کو اپنا سمجھنے لگتے تھے۔ یہ بات پیغمبروں کے بعد شاعروں ہی میں ملتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتہ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

یا

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

یا

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف بر طرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

لیکن ایک جگہ غالب نے کچھ ایسی بات کہہ دی ہے کہ کبھی اس کے مفہوم سمجھنے میں تامل ہوتا ہے اور کبھی جو کچھ سمجھ میں آتا ہے، اس کے اظہار کرنے میں پس وپیش ہونے لگتا ہے۔ شعر میں پڑھ دیتا ہوں۔ آپ کو ممکن ہے اس کی تشریح کے بہتر مواقع مل جائیں۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ وتاب میں

غالب نے پری زادوں سے خلد میں انتقام لینے کا وعدہ کیا تھا، بشرطیکہ قدرت حق سے وہاں یہ حوریں بن جاتیں۔ ریاض نے رقیب کے خلاف ایک اسکیم بنائی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

پاسباں تو رقیب بن جاتا
ہم ترے پاسبان ہو جاتے

اس سلسلہ میں آپ اُستاد خنداں کو نہ بھولے ہوں گے۔ جن کے طبی اور شاعرانہ کارنامے میں نے عرصہ ہوا، آپ کو سنائے تھے۔ غیر اور رقیب کے بارہ میں ان کے خیالات بھی سن لیجیے۔ فرماتے ہیں:

اُس نے ذرا جو قتل کی خنداں کو دھونس دی
لے آئے غیر دوڑ کے خنجر کہے بغیر

ایک جگہ کچھ عجیب طرح سے بانگ دی ہے:

بانگ سے اس کے نہ ہم دھوکے میں آئے شب وصل
غیر ناپے میں رہا آپ ہی مرغا ہو کر

اُکتا نہ گئے ہوں تو رقیب کے مصرف یا کرتوت پر استاد کے دو ایک شعر اور سن لیجیے:

غیر عاجز ہو گئے خنداں سے جب وصل دلبر کی صلائے عام دی

ایک اور شعر یاد تھا جسے ابھی ابھی بھول گیا، اور یہ اچھا ہوا۔ ورنہ اس سے اندیشہ تھا کہ ڈاکٹر خنداں کا ڈاکٹری کا ڈپلو ما ضبط ہو جاتا اور میرا بھی انجام کچھ اچھا نہ ہوتا۔ خنداں رقیب کے ساتھ کچھ ایسا سلوک کرنا چاہتے تھے جس سے وہ دہلی کے گلی کوچوں میں علاج و امراض کے اشتہار پڑھتا پھرتا۔ اس لیے ناگفتہ بہ!

موقع ہوتا تو میں ایک اور رقیب کا حال سناتا جو ازل میں رُسوا ہوا اور دنیا میں بدنام ہے۔ اس نے رقابت کے ایسے کرشمے دکھائے ہیں کہ کتنے انگشت بدنداں ہیں، کتنوں کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں اور کتنے گمراہ ہیں!

یہ سب کچھ ہوا لیکن ابھی اس کا ہمارا اور آپ کا انجام باقی ہے اور کیا معلوم کس کی عاقبت کیا ہو گی۔ سعدی کی بھی ایک بات اور آخری بات یاد رکھیے۔

زہدت بچہ کار آید گر راندۂ درگاہی
کفرت چہ زیاں دارد گر نیک سرانجامی [1]

●●●

---

1 تمھارا زہد کس کام کا، اگر تم راندۂ درگاہ ہو، تمھارا کفر کیوں کر نقصان دہ ہے اگر اس سے تم نیکی سرانجام دے رہے ہو۔

حاجی صاحب

حاجی صاحب شعر کہتے ہیں اور بسکٹ بیچتے ہیں۔ شعر اور بسکٹ دونوں خستہ۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی المتخلص بہ دارالمصنفین کا بیان ہے کہ حاجی صاحب جس خلوص کے ساتھ شعر کہتے ہیں، اس سے زیادہ مہنگے بسکٹ بیچتے ہیں۔ مولوی صاحب کے اس بیان نے دنیائے شاعری اور بسکٹ میں تہلکہ مچادیا۔ موصوف اس قسم کے غیر محتاط فقرے اکثر سنجیدگی سے زبان پر لاتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بارہ بنکی کے کسانوں سے تنگ آکر حاجی صاحب پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ اس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کی خصوصیات یہ رکھی گئیں کہ صرف ایک ممبر ہو جس نے تمام عمر شعر نہ کہے ہوں اور بسکٹ کھائے ہوں۔ مولانا سہیل اقبال احمد خاں صاحب وکیل علیگ کے یہاں مقیم ہو اور موکلوں سے نہ ڈرے۔

آخری شرط ایسی تھی کہ اس سے عہدہ برآ ہونے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ حکومت نے سپر ڈال دی۔ کانگریس نے ذاکر صاحب کو منتخب کیا اور ذاکر صاحب نے مجھ کو۔ چنانچہ میں اعظم گڑھ پہنچا۔ چھوٹی لائن نے ایک ایسے مقام پر پہنچادیا جہاں صرف یکہ بان اور بندر تھے۔ یکہ بانوں سے اُلجھتا، بندروں سے بچتا۔ مولانا سہیل[1] کے مکان پر پہنچا۔ عرصہ تک یہ طے نہ

---

1. اقبال احمد خاں سہیل (1955-1884) رشید صاحب کے کالج کے دور کے ساتھی۔ اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔

کر پایا کہ ملازم کون ہے اور آقا کون۔ کتنے مقدمات لڑتے ہیں، کتنے بسکٹ بیچتے ہیں۔ کتنے وکیل اور کتنے موکل، اور کب اپنے مشاغل ایک دوسرے سے بدل لیتے ہیں۔

مولانا سہیل سے ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ امتدادِ زمانہ سے حکومتِ ہند اور مولانا شوکت علی بھی بدل گئے تھے۔ لیکن مولانا سہیل میں قطعی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ایک مشتِ استخوان اور اردو شاعری میں تبدیلی بھی کیا ہوسکتی تھی۔ مولانا سہیل اور بکی بارک سے آج سے سولہ برس قبل میں علی گڑھ میں سب سے پہلے دوچار ہوا تھا، اور انہی دونوں کا طفیل تھا کہ ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا ہی کی ایما اصرار اور ہمت افزائی سے میں نے موجودہ رنگ میں مضمون لکھنا شروع کیا۔ یادش بخیر بکی بارک میں (گل منزل) اس رنگ میں میرا سب سے پہلا مضمون تھا۔ گل منزل ختم ہوچکی ہے، اب ہماری باری ہے۔

مولانا کھانا بہت اچھا کھلاتے ہیں اور شعر بہت اچھے کہتے ہیں اور سناتے ہیں۔ ان دونوں کی خوبی اس وقت دوبالا ہوتی ہے جب مولانا کا بالائے بام برآمدہ ہو، اور موکل موجود نہ ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ مولانا موجود نہ ہوں، کھانا موجود نہ ہو، مکان نہ ہو، مکین نہ ہوں، لیکن موکل کا موجود ہونا یا پیدا ہوجانا یا نمودار ہونا لازمی ہے۔ موت کا وقت معیّن ہے، موکل کا نہیں۔ آپ کھانا کھارہے ہوں، سو رہے ہوں، خلوت میں ہوں، بیمار ہوں، غسل خانہ میں ہوں، اس کا اطمینان نہیں۔ ہوسکتا کہ موکل نظر نہیں آئے گا اور موکل بھی کیسا، ہر شکل کا، ہر عمر کا، مرنے والا، مارنے والا، ڈرنے والا، ڈرانے والا۔ ڈرنے ڈرانے والے کی صورت بنانے والا، نہتا، لٹھ بند، آذوقہ طلب، آذوقہ بردوش بیٹھا ہوا۔ دیکھیے تو کانگریس کا پنڈال، سوتا پائیے تو راج گھاٹ کا اسٹیشن، غور کیجیے تو مار سڈن، ہسٹری کے اوراق میں نظر آنے والے ٹھگ!

شام کو مولانا نے کہا، چلو کلب چلیں۔ وہاں سے دارالمصنفین (شبلی منزل)۔ عرض کیا حاجی صاحب کہاں ملیں گے۔ فرمایا، کلب میں اشعار پڑھ رہے ہوں گے یا دارالمصنفین میں بسکٹ کا پرچہ ترکیب استعمال تقسیم کرتے ہوں گے۔ ایک عرصہ کے بعد دارالمصنفین کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ہر طرف نئی تعمیرات نظر آئیں۔ ایک ستھری اور خوب صورت مسجد تھی۔ کتب خانہ اور دارالمطالعہ کی عمارت نئی بنی تھی۔ بساط بدل گئی تھی، مہرے پرانے تھے۔

میں نے کہا۔ ''حاجی صاحب فرض اور آزادی کا آپ جیسا تلفظ فرماتے ہیں، اسے اگر دارالمصنفین تسلیم کر لے تو میں اس کی معنویت مہاسبھا سے منوانے کا ذمہ دار ہوتا ہوں۔''

'شہید' اور 'غازی' کا مسئلہ تو آپ نے 'زندہ' کے تلفظ سے حل کر دیا ہے۔ اس قسم کے شہید اور غازی 'جندہ' رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مونجے اگر آپ کا تلفظ سن لیتے تو راؤنڈ ٹیبل میں شریک ہونے کے بجائے دارالمصنفین چلے آتے۔ سر اقبال نے بڑی ہمت کی تو کہہ سکے:

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری!

لیکن آپ نے تو نغمہ اور لے دونوں کو نجیب الطرفین سوراجی بنا دیا۔ اس کی مبارک باد آپ کو دوں یا دارالمصنفین کو۔ ارشاد ہوا:

اب ہوا دارالمصنفین کا اروج　　اپسوس سبلی نومانی نہ رہے!

عروج　　افسوس　شبلی　نعمانی

عرض کیا، ''حاجی صاحب دیکھیے ملنے سے کتنی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ دشمنوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ آپ میں اور دارالمصنفین میں چشمک ہے۔ لوگوں کو شکایت بھی یہی ہے کہ دارالمصنفین میں اروج کو عروج کہتے ہیں اور نومانی کو نعمانی۔ دارالمصنفین سے یہ عصبیت دور ہو جائے تو ہندستانی اکیڈمی کو بھی شکایت کا موقع نہ رہے گا۔ اپسوس اور افسوس میں ظاہر ہے ف کا بدل پ ہے۔ مثلاً فارسی سے پارسی، فیل سے پیل۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نہ سہی مولوی مسعود علی صاحب ضرور ان سوراجی تصرفات پر آپ کے شکرگزار ہوں گے۔'' حاجی صاحب نے بے اختیار فرمایا۔

کس شان سے ٹھہرا ہے مسعود علی ہمارا

یہ رہنما ہمارا یہ دل ربا ہمارا!

عرض کیا، ''حاجی صاحب شاعر اور غیر شاعر میں فرق بھی اتنا ہی ہے کہ شاعر کے دل میں جو کچھ آتا ہے کہہ ڈالتا ہے۔ ہم لوگ صرف سوچ کر رہ جاتے ہیں، اور کہنا چاہیں بھی تو اکثر نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ کی جو رائے مولوی مسعود علی صاحب کے بارے میں ہے، ممکن ہے مولانا سہیل کی بھی وہی ہو۔ لیکن ان کے پاس صرف الفاظ ہیں۔

شبلی منزل میں چند باتیں خاص طور پر نظر آئیں۔ مثلاً ہر جگہ صفائی، ہر بات میں سلیقہ، رفقا کا رہن سہن، آپس کا میل جول اور تصنیفی کاموں میں ان کا غیر معمولی انہماک۔ اس ادارے سے عرصہ سے واقف ہوں۔ اس کی تاریخ کے بعض ایسے قابلِ تحسین وتقلید واقعات بھی معلوم ہیں جواب تک نہ منظرِ عام پر آئے نہ لائے گئے۔ ان واقعات اور روایات کا خفی یا جلی فیضان ہر طرف نظر آتا ہے۔

شبلی منزل میں حقہ اور پان بہت مقبول ہے، لیکن پان کی پیک اور حقے کی راکھ اور کوئلہ کہیں نظر نہ آیا۔ یہ اس لیے کہنا پڑا کہ بعض ایسے مقامات بھی دیکھنے میں آئے جہاں حقہ اور پان کا عمل دخل نہ تھا۔ لیکن ان کے مقویات ہر جگہ بکھرے نظر آئے۔

جس طرح دو فوق البشر ہمیشہ ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے بدگمانی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح حاجی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ معلوم تھا کہ حاجی صاحب شاعر ہیں۔ موصوف کو البتہ نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں۔ تعارف کے الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے کہ حاجی صاحب نے فرمایا:

"یہ مانا کہ آپ پروفیسر (پروفیسر) ہیں، حلیکت (حقیقت) یہ ہے کہ
علی گڑھ کے اسیر ہیں۔"

نورٌ علیٰ نور۔ اپنی اس قدر جامع و مانع تعریف سُن کر سناٹے میں آ گیا۔ ایسا تمامی تلفظ یہ ہندستانی "فضا" یہ سودیسی بشارت!

حلیکت (حقیقت) یہ ہے کہ علی گڑھ کے اسیر ہیں۔

عرض کیا، "حاجی صاحب آپ اولیا بھی ہیں شاعر بھی۔ آپ کے کمال کی داستانیں سنی تھیں۔ مختلف روایتیں تھیں، لیکن آج شرفِ نیاز حاصل کر کے وہ بصیرت حاصل ہوئی کہ "سچ" اور "نگار" کے مذاکراتِ علیہ بھول گیا۔ آپ کا شعر دارالمصنفین اور آپ خود یونیورسٹی ہیں۔"

مولوی مسعود صاحب نے فرمایا۔ "شعر سن کر تو آپ کا یہ عالم ہوا، بسکٹ کھا کر کیا ہوگا۔" عرض کیا، "دیکھا جائے گا، آخر سوراج، پورن راج اور مکمل آزادی وغیرہ بھی تو ہے۔"

آزادی کا لفظ سننا تھا کہ حاجی صاحب نے جھرجھری لی اور فرمایا:

مسلم کا پھرج آجادی ہے　　　مرے تو سہید جندہ رہے تو گاجی ہے

فرض آزادی　　　شہید زندہ　　غازی

آپ کے یہاں صرف اظہار۔ تو آج یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ ہم آپ مولوی مسعود علی صاحب کے سامنے بے وقوف کیوں معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

ان باتوں سے حاجی صاحب پر رقّت بہ شکل ترنّم طاری ہوگئی۔ اور اشعار سنانے لگے۔

جی کہتا ہے یہاں کہیں یار مرا

جبان رکتی نہیں دل ہے بیکرار مرا

زبان　　　بےقرار

یہ سان وسوکت تیری یہ سہرا مبارک ہوا ے گیاس

شان وشوکت　　　غیاث

مگلوب دسمن اور گالب ہو اکتیار تیرا!

مغلوب دشمن　　غالب　　اختیار

پہلے شعر میں مصرعۂ اوّل کی کمی دوسرے مصرعہ کی سادگی اعتراف نے پوری کردی اور دونوں اشعار کا ستھراؤ حاجی صاحب کی موسیقی نے کر دیا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا یہ سوز و گداز تو آپ کے تنور اور بسکٹوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ آپ مرثیہ کہنے لگیں تو زندوں کا تو ذکر کیا مُردے پر بھی کیا کچھ نہ گزر جائے گی۔ حاجی صاحب گویا اسی کے منتظر تھے۔ فرمایا، سہیل صاحب نے مولانا محمد علی مرحوم کا مرثیہ لکھا تھا۔ محمد علی "جندہ" ہوتے تو عمر بھر سمجھ نہ پاتے۔ میں نے بھی لکھا ہے۔ سنیے: (تحت اللفظ)

کرم مولا کا ہوا دریائے رحمت جوس میں

جوش

چل دیے جھگڑے سے چھوٹے جنت الپھر دوس میں

جنت الفردوس

مکدس جمین کہتی ہے تو آمرے آگوس میں!

مقدس زمین آغوش

جاں نثاری کرتے تھے جب تک تھے اپنے ہوس میں

ہوش

ایک صاحب بھرے بیٹھے تھے کہنے لگے، حاجی صاحب بعض قافیے بڑے گریز پا ہیں۔ موصوف نے فی البدیہہ فرمایا۔

یہ احساس ہر مسلم میں ہے لیکن نہیں کھر گوس میں

خرگوش

انھیں کہاں پائے گا ڈھونڈیے پاپوس میں

پاپوش

حریف کھاموس ہو گیا لیکن اظہار تخلص پر حاضرین سے وہ دارو گیر بلند ہوئی کہ تھوڑی دیر کے لیے حاجی صاحب بھی سراسیمہ ہو گئے۔ ایک صاحب نے مولوی مسعود علی صاحب سے دریافت فرمایا۔ ''مولوی صاحب کھر گوس حرام ہے یا حلال؟'' مولوی صاحب نے فرمایا۔ ''جب خرگوش حلال ہے تو کھر گوس کو تو کیا کھا لینے میں کوئی قباحت نہیں۔''

حاجی صاحب کو مچھلی کے شکار کا بھی شوق ہے۔ تالاب پر شکار کھیلنے کے لیے گئے لوگوں نے فرمائش کی، حاجی صاحب اس موقع پر کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا:

ٹہلتی ہوئی مچھلیاں آئیں حمیں ست کانٹے میں

پھنسیں

لگیں اجل کی ٹھمکیاں آئیں اک طمانچے میں

ایک ٹھاکر صاحب بھی اسی شغل میں مبتلا تھے۔ حاجی صاحب سے چشمک تھی، شکار نہ ملنے کی خفت، کچھ حاجی صاحب کو چھیڑنے کا تاؤ۔ فرمایا، حاجی صاحب کانٹے میں بسکٹ لگاوت ہو کا؟

حاجی صاحب نے فرمایا۔

دعویٰ یہ تھا ماریں گے رد ہو پھسا کر
کھسیا کے رہ گئے پھنسے بھی نا ٹنگنا ٹھا کر

قریب تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ہو جاتا، لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ حاجی صاحب فطرتاً صلح پسند واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے اس موقع پر صرف اظہارِ تغزل فرما کر خاموش ہو گئے، ارشاد ہوا۔

وہ دل جل جائے جس میں چاہ نہیں
وہ چھاتی ہے ناکارہ جس میں آہ نہیں

حاجی صاحب کے بسکٹ اور اشعار ان کے حلیہ کے ترجمان ہیں۔ اس پر صرف ایک داڑھی کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ جس کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ٹھوڑی، ٹھوڑی نہ ہوتی تو داڑھی بھی نہ ہوتی۔ حاجی صاحب کی شاعری ''دندان تو جملہ در دہانند'' کے مطابق ہے یعنی ان کے دندان کے مطابق۔

حاجی صاحب کی شکل اور رنگ دونوں عاشقانہ ہیں۔ آواز اور چال دونوں میں لچک ہے۔ گفتگو کرنے میں لیڈری اور تصوّف کا رنگ نمایاں رہتا ہے۔ ایک دفعہ احباب کے اصرار پر حاجی صاحب فٹ بال کھیلنے پر آمادہ ہو گئے۔ کھیل میں حاجی صاحب اپنے بسکٹوں کی ڈلیا بھول گئے اور ان کے حریف فٹ بال کھیلنا۔ چنانچہ ڈلیا کو تماشائیوں نے اور خود حاجی صاحب کو کھلاڑیوں نے فٹ بال بنا دیا۔ مولوی مسعود صاحب ریفری تھے، کھیل ختم ہونے کے بعد فیصلہ یہ دیا کہ تمام لوگ حاجی صاحب سے معافی مانگیں اور حاجی صاحب سب کو چائے اور بسکٹ پر مدعو کریں۔

مولانا سہیل کا بیان ہے کہ حاجی صاحب اعظم گڑھ کے صاحب خدمت ہیں۔ ہند اور حجاز دونوں میں ان کے کرامات کی دھوم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ بدوؤں نے ان کو کنوئیں میں پھینک دیا۔ چالیس دن اور اتنی ہی راتوں کے بعد وہی بدو پھر آئے اور حاجی صاحب کو کنوئیں سے نکالا۔ حاجی صاحب ویسے ہی تر و تازہ نمودار ہوئے، جیسے تنور سے خستہ بسکٹ! بیان یہ کیا جاتا ہے بدوؤں کی مویشیوں اور بیویوں نے مفارقت شروع کر دی، آخر بدوؤں کو دوسری غلطی کا مرتکب ہونا پڑا اور حاجی صاحب کو کنوئیں میں سے نکال لیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حاجی صاحب ایک گلی سے گزر رہے تھے، سامنے سے ایک بڑو کا بہکا ہوا غصیلا بھینسا چلا آ رہا تھا۔ حاجی صاحب کو دیکھ کر پھنکارتا ہوا لپکا۔ موصوف پر مطلق ہراس طاری نہیں ہوا، قریب تھا کہ بھینسے کے سینگ اور حاجی صاحب کے دانت کا تصادم ہو، حاجی صاحب نے اپنی ایک اُنگلی بھینسے کے مستک پر رکھ دی۔ بھینسا بھیڑ بن گیا۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ یہ واقعہ صرف بھیڑ کی حد تک صحیح ہے اور جہاز والے معاملے کی حقیقت کا صرف تنور اور خستہ بسکٹ تک پتہ چلتا ہے۔

لیکن مولانا سہیل اور مولانا مسعود علی کے بیانات کو تسلیم کرنے سے پہلے اس امر کو ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ حاجی صاحب شاعر بھی ہیں، اس لیے اوّل الذکر دونوں بزرگوں کا موصوف کی شاعری یا بسکٹ کو داغ دار کرنے کی کوشش کرنا تعجب کی بات نہیں۔ مولانا سہیل فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب صاحبِ کشف و کرامات ہیں، لیکن جب حاجی صاحب کے شاعر ہونے کا مسئلہ پیش کیا جاتا ہے تو جواب سے کتراتے ہیں۔ مگر شاید مولانا کو یہ نہیں معلوم کہ ایک شاعر صاحبِ کشف و کرامات بھی ہوتا ہے اور نہیں ہوتا تو صرف ایک وکیل رہ جاتا ہے۔

رہی دارالمصنفین اور حاجی صاحب کی چشمک تو اس کو بھی انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ اگر الٰہ آباد کے امرود اور اکبر مشہور ہیں تو اعظم گڑھ کا دارالمصنفین اور حاجی صاحب کے بسکٹ کیوں نہ مشہور ہوں۔ حاجی صاحب کا ہر شعر دارالمصنفین پر بھاری ہے، دوسری طرف دارالمصنفین کو دیکھیے کتنے دنوں سے قائم ہے، لیکن نہ کوئی حاجی صاحب پیدا کر سکا نہ ان کا بسکٹ!

ایک صاحب نے بیان کیا کہ شبلی منزل کے بعض ورثا کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ شبلی منزل ان کو واپس کر دی جائے۔ مولوی صاحب کو تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ اس کے محرک حاجی صاحب ہیں اور اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے بے دریغ بسکٹ خرچ کر رہے ہیں۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ شبلی منزل میں ایک بسکٹ ٹرسٹ قائم کر دیا جائے۔ حاجی صاحب ایک سیدھے سادے مسلمان ہیں، مسعود علی صاحب نے ان سے سمجھوتہ کر لیا کہ تنور میں بنوائے دیتا ہوں بسکٹ کا انتظام آپ کر لیجیے۔ چنانچہ بڑے بڑے تنور یا بھٹے لگا دیے گئے۔ حاجی صاحب کا خلوص

دیکھیے، انھوں نے نان پاؤ کی طرح ڈالی اور مسعود علی صاحب کی کرامت ملاحظہ ہو۔ اس میں سے اینٹیں برآمد ہو رہی ہیں۔ ایک مسجد اور متعدد مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ مسجد میں حاجی صاحب حق اللہ ادا کرتے ہیں اور مکانات میں ارکان دارالمصنفین حق العباد۔

حاجی صاحب سے لوگوں نے معافی مانگ لی۔ اس کے بعد موصوف سے پارٹی کا مطالبہ کیا، حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں پارٹی صرف رشید صاحب کو دوں گا اور اس میں صرف وہی لوگ مدعو کیے جائیں گے جن کو رشید صاحب بلائیں۔ حاجی صاحب کی اس شرط کو اس ترمیم یا اضافہ کے ساتھ منظور کر لیا گیا کہ مولوی مسعود علی صاحب اس کے مہتمم ہوں گے اور شبلی منزل جائے وقوع۔ چنانچہ ایک روز شام کو بارش اور پارٹی شروع ہوئی۔ حاجی صاحب گھر سے چیزیں لاکر رکھ جاتے، اور دوسری قسط لانے کے لیے واپس جاتے تو حاضرین بصدارت مولوی صاحب، حاجی صاحب کے لائے ہوئے اشعار کو مشاعرے کے لیے منتخب یا موزوں کرنا شروع کر دیتے۔ بعض سرے سے حذف کر دیے گئے، بعض کے مصرعے یا الفاظ ادھر اُدھر کر دیے۔ بعض کو قطعہ بند کر دیا گیا۔ چند ایسے بھی تھے جن کو نثر کا جامہ پہنایا گیا۔ حاجی صاحب اختلاف پر آمادہ ہوتے تو ان کو بتا دیا جاتا کہ اشعار سب موجود ہیں، صرف ان کے محل وموقع بدل دیے گئے ہیں! حاجی صاحب سے مزید فرمائش کر دی جاتی، بے چارے پھر تلاشِ مقصود میں روانہ ہو جاتے۔ اسی دوران میں مولوی صاحب نے مجھے بلا کر فرمایا، حضرت آپ نے آنے کے ساتھ ہی بسکٹوں کی فرمائش کر دی تھی۔ حاجی صاحب سے خریدنے لگتے تو واپسی کے ٹکٹ کے دام بھی نہ بچتے۔ حاجی صاحب نے گیہوں کی ارزانی کو بسکٹوں کی گرانی سے متوازن کرنا چاہا ہے۔ جس قیمت پر یہ بسکٹ بیچتے ہیں اس قیمت پر عبدالسلام صاحب اپنے مستقبل سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ دیکھیے گھاگ نے تازے اور باسی بسکٹ ایک کر دیے ہیں۔ پیسٹری اور حلوے دست وگریباں ہیں جیسے شب برات کی خیرات مانگ لائے ہیں۔ آم بھی ملے جلے ہیں۔ انڈے اُبلے ہوئے ہیں۔ ان سب کو میں علاحدہ ٹوکری میں بندھوائے دیتا ہوں۔ علی گڑھ لیتے جایئے گا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں مولوی صاحب نے ایک بڑی ٹوکری ان نعمتوں سے بھر بھرا کر علاحدہ کر دی۔ حاجی صاحب لدے پھندے آ گئے۔ بارش تھم گئی اور پارٹی شروع ہو گئی۔ حاجی صاحب شعر خوانی

کرنے لگے۔ دوسروں نے وہ کرنا شروع کیا جس کے حاجی صاحب سزاوار یا حاجی صاحب کا سامان مستحق تھا۔

مولانا سہیل کا مکان نہایت اچھی قطع کا ہے، بالخصوص چھت کا برآمدہ۔ برسات میں بیٹھے تو شعر اور شباب یاد آنے لگتا ہے۔ طے ہوا تھا کہ میں رہوں یہاں اور تمام دوسرے اشغال شبلی منزل میں سرانجام پائیں۔ دوگھر کا مہمان اکثر فاقے کرتا ہے، لیکن اعظم گڑھ میں تخمہ کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ شام کو مولوی مسعود علی صاحب تشریف لایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا حکم تھا کہ جب تک وہ موجود رہیں کوئی موکل نظر نہ آئے۔ ورنہ وکیل اور موکل دونوں کی خیر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب کے حکم کی تعمیل نہایت تندہی سے کی جاتی ہے، لیکن اس معاملے میں مولوی صاحب کی طبیعت کچھ اس درجہ شکی واقع ہوئی ہے کہ وہ کبھی کبھی ساکنانِ خانہ کو بھی موکل سمجھ لیتے ہیں اور اپنی ایسی کرگزرتے ہیں یا کرگزرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

اس میں مولوی صاحب کا قصور بھی نہیں ہے۔ عام طور پر سب کا قیام دوسری منزل پر رہتا ہے، لیکن اوپر آنے کے لیے چھت کو جابجا کھول دیا گیا ہے، جس سے بہ یک وقت صرف ایک شخص جس کا جثہ نارمل سے کم ہو، برآمد ہوسکتا ہے۔ چھت پر بیٹھ کر دیکھیے تو آدمی اس طرح نمودار ہوتا نظر آتا ہے جیسے الف لیلیٰ کا جن صندوق سے۔ اس کے علاوہ جابجا چھت میں سوراخ بھی رکھ دیے گئے ہیں جو برسات سے زیادہ باشندوں کے کام میں آتے ہیں۔

موکلوں کے نمودار ہونے کا چوں کہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور سونے کا معین ہے، اس لیے ارادہ کرلیا تھا کہ اس آسیب سے محفوظ رکھنا میزبان کا اختیار نہیں تو اس سے محفوظ رہنے کا حق مہمان کو حاصل ہے۔ چنانچہ ایک دن لوگ سوگئے تو میں نے سارے سوراخ اور رخنے بند کردیے۔ ایک پر چارپائی بچھا کر سورہا۔

12/ بجے رات کا عمل ہوگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ متعدد چھوٹے بڑے فٹ بال چارپائی کی سطح زیریں سے چارپائی سمیت اُبھرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔ کبھی کبھی چارپائی کا ایک آدھ پایہ بھی اُٹھ جاتا، کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے متعدد اشخاص محنتِ شاقہ میں مبتلا ہیں اور تھک کر ہانپنے لگتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں شروع کردیتے ہیں۔

کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ ماجرا کیا ہے۔ کھانا زیادہ کھا لیا ہے یا سوراج مل گیا ہے۔ جب یہ یقین ہوا کہ اس میں سے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے تو لیٹے ہی لیٹے اور ڈرتے ڈرتے دریافت کیا، یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ پوچھنا تھا کہ سارے فٹ بال غائب سے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں کوئی چیز پہلو میں محسوس ہوئی، احتراماً دوسری طرف ہو گیا۔ وہاں بھی یہی پیش آیا۔ اس رُخ کو بدلا تو گردن کے پاس وہی واقعہ پیش آنے کے قریب ہوا۔ خالی دیا تو شانہ نے محسوس کیا۔ غرض بستر پر مسلسل کھسکتا لڑھکتا رہا۔ پوچھا اور اب کے کافی دلیری سے کہا۔ یہ کیا شرارت ہے، تھوڑی دیر کے لیے سکوت ہو گیا۔ اب گھٹنے اونچے نیچے ہونے لگے۔ ان کو ہٹا لیا۔ اتنے میں ایڑی کے نیچے ایک گرانڈیل فٹ بال اُبھرتا معلوم ہوا۔ چنانچہ جی کڑا کر کے ایک ایسی بھرپور ایڑی رسید کی کہ چارپائی کا جتنا آہنی حصہ اُبھرا تھا اتنا ہی پچک گیا۔

ایک آواز، "معاف کیجیے اگر آپ کے آرام میں مخل نہ ہوتا ہوں تو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں، "جی ہاں" آپ میرے آرام کے درپے ہیں اور میں آپ کی جان کے۔ آواز، "معاف کیجیے یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ نے اوقات تقسیم کر رکھے ہیں۔ ہم جس عالم سے تعلق رکھتے ہیں وہاں اس قسم کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔" میں، "آپ کا خیال صحیح ہے، جہاں سے آپ تشریف لا رہے ہیں ممکن ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہو، لیکن اس دنیا میں بعض لوگ اس طرح کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔" آواز، "لیکن مجھ کو کیا معلوم کہ آپ بغیر سوچے سمجھے ایسی جگہ فروکش ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ کو میرے مخلِ عافیت ہونے پر شکایت کرنے میں تامل کرنا چاہیے۔" میں، "بجا فرمایا، آپ نے بھی اسی قسم کی غلطی کی۔ اسی لیے آپ پر جو کچھ گزر گئی، اس کا آپ کو بھی شاکی نہیں ہونا چاہیے۔" آواز، "آنچہ گزشت، گزشت اب اجازت دیجیے کہ ہم اوپر آ جائیں۔ ممکن ہے دوبدو ہو کر ایک دوسرے کو بہتر سلوک کا مستحق پائیں۔" میں، "لیکن یہ تو بتایئے آپ کا کیا نام ہے اور آپ کے ساتھی کتنے اور کس قسم کے ہیں۔" آواز، "جناب میرا نام اقیقائیکل ہے، میرے دوسرے ساتھیوں کا نام بھی اسی طرح کا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" آواز، "قطع کلام ہوتا ہے یہ الفاظ جو آپ بے اختیار استعمال کر گئے ہیں، معیارِ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔" میں، "چھیڑ آپ کی طرف سے ہوئی۔" آواز، "اب اجازت دیجیے تو حاضر ہو جائیں۔"

میں، ''لیکن آپ کے ساتھ وہ بزرگ تو نہیں ہیں جو ہم کو کراماً کاتبین اور منکر نکیر دونوں سے شرمندہ رکھتے ہیں۔'' آواز، ''ہرگز نہیں۔ ان سے معاہدہ ہوا ہے کہ جہاں ہم جائیں وہاں وہ تکلیف نہ کریں گے۔'' کچھ دیر تک تو اطمینان کے بڑے بڑے سانس لیتا رہا۔ بیوی بچوں کا بھی دل سے خیال جاتا رہا۔ اس کے بعد گلا صاف کر کے بولا میں، ''آپ کو اوپر بلانے میں پس و پیش نہیں ہے، لیکن یہ اور بتا دیجیے آپ کے ساتھ بیوی بچے تو نہیں ہیں۔'' آواز، ''ہمارے صرف بیویاں ہوتی ہیں، بچے نہیں۔ میں، ''جزاک اللہ۔ عرض یہ ہے کہ آپ کی تشریف آوری بھی کسی سبب سے ہوگی، آپ کے گھریلو معاملات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن ہمدردی کی بنا پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

آواز، ''شکریہ! بات دراصل یہ ہے کہ بعض خانگی معاملات ایسے پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ اب ان کو پبلک میں لانا ضروری ہوگیا ہے۔''

میں، ''لیکن ایسے معاملات کو یوں شہرت دینا کب روا ہے۔''

آواز، ''جی نہیں اس قسم کی باتیں اگر افراد تک محدود رہیں تو بدتہذیبی ہے، لیکن سوسائٹی اور عدالت میں پہنچ جائیں تو شہرت اور تہذیب کے حدود میں داخل ہو کر مستحسن بن جاتی ہیں۔''

میں، ''کیا آپ کے حلقے میں ہم ایسوں کا بھی گزر ہو سکتا ہے۔''

آواز، ''کیوں نہیں، لیکن بعض مسائل ایسے ہیں جن کی عملی تعبیر میں آپ کو ذرا وسیع الخیال اور بلطی الحس ہونا بھی پڑے گا۔''

میں، ''وہ کیا۔'' آواز، ''خدا اور بیوی۔'' میں، ''یعنی۔'' آواز، ''آپ خدا اور بیوی سے متعلق جن معتقدات کے پیرو ہیں وہ باعتبار مفہوم مشتبہ اور باعتبار تعبیر اور تطبیق غلط ہیں۔ ہم بیوی کو اور آپ خدا کو خطا سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ ہم لوگوں کے نزدیک بیوی ایک عمومی صداقت ہے اور آپ کے یہاں خدا ایک طور پر انفرادی یا شخصی صداقت ہے۔ مذہب اور عقل کے پیرووں میں بھی چیز مابہ الامتیاز ہے۔ مذہب شخصی اور سائنس یا عقل عمومی صداقت ہے۔ آپ عمومی صداقت کے منکر اور ہم شخصی صداقت سے بے زار۔'' میں، ''سوال یہ ہے کہ صداقتوں کے یہ

جرثقیل آپ کے انکشافات ہیں یا آپ کی بیوی کے۔" آواز: "آپ خالص علمی مباحث میں بھی عصبیت اور نفسانیت سے احتراز نہیں کرتے۔ یہ طریقہ آئین تہذیب کے خلاف ہے۔"

میں: "اور کیوں صاحب آپ نے جس طور پر یہاں نزول اجلال فرمانے کا ارادہ کیا تھا وہ کہاں تک تہذیب کے قرین تھا۔ آپ نے مہذب یا غیر مہذب ہونے کی سعادت اس طور پر کیوں تقسیم کر رکھی تھی کہ آپ کی عورتیں ہمیشہ مہذب اور ہمارا خدا غیر مہذب، کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارا خدا بھی کبھی کبھی مہذب ہو جایا کرے اور آپ کی بیویاں غیر مہذب۔" آخری فقرہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ شور اُٹھا۔ "مار ڈالو، جلا دو غیر مہذب، تہذیب کا، مغرب کا، خواتین کا منکر۔"

چار پائی بھونچال بن گئی، چیخ اُٹھا۔ "السلام علیکم" آنکھ کھلی تو دیکھا، مولوی صاحب کھڑے ہیں اور چنے چنے پر..... موکل!

●●●

دھوبی

علی گڑھ میں نوکر کو آقا ہی نہیں 'آقائے نامدار' بھی کہتے ہیں اور وہ لوگ کہتے ہیں، جو آج کل خود آقا کہلاتے ہیں۔ یعنی طلبا! اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نوکر کا کیا درجہ ہے۔ پھر ایسے آقا کا کیا کہنا، جو سپید پوش واقع ہو۔ سپید پوش کا ایک لطیفہ بھی سُن لیجیے۔ اب سے دور اور میری، آپ کی جان سے بھی دور، ایک زمانے میں پولیس کا بڑا دور دورہ تھا۔ اسی زمانے میں پولیس نے ایک شخص کا بدمعاشی میں چالان کر دیا۔ کلکٹر صاحب کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ ملزم حاضر ہوا تو کلکٹر صاحب دنگ رہ گئے۔ نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے صورت شکل سے مرد معقول، بات چیت نہایت نستعلیق۔ کلکٹر صاحب نے تعجب سے پیش کار سے دریافت کیا کہ اس شخص کا بدمعاشی میں کیسے چالان کیا گیا، دیکھنے میں تو یہ بالکل بدمعاش نہیں معلوم ہوتا! پیش کار نے جواب دیا۔ ''حضور! تامل نہ فرمائیں یہ سپید پوش بدمعاش ہے۔''

لیکن میں نے یہاں سپید پوش کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ میں نے آج تک کسی دھوبی کو میلے کپڑے پہنے نہیں دیکھا اور نہ اس کو خود اپنے کپڑے پہنے دیکھا۔ البتہ اپنا کپڑا پہنے ہوئے اکثر دیکھا ہے۔ بعضوں کو اس پر غصہ آیا ہوگا کہ ان کا کپڑا دھوبی پہنے ہو، کچھ اس پر بھی جزبز ہوئے ہوں گے کہ خود ان کو دھوبی کے کپڑے پہننے کا موقع نہ ملا۔ میں اپنے کپڑے دھوبی کو پہنے دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہوں کہ دیکھیے زمانہ ایسا آگیا کہ یہ غریب میرے کپڑے پہننے پر اُتر

آیا۔ گو اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اپنی قمیص دھوبی کو پہنے دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں انکار بھی محسوس کیا ہے۔ اپنی طرف سے نہیں، یہ قمیص کی طرف سے۔ اس لیے کہ میرے دل میں یہ وسوسہ ہے کہ اس قمیص کو پہنے دیکھ کر مجھے در پردہ کسی نے اچھی نظر سے نہ دیکھا ہوگا۔ ممکن ہے خود قمیص نے بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا ہو۔

دھوبیوں سے حافظ اور اقبال بھی کچھ بہت زیادہ مطمئن نہ تھے۔ مجھے اشعار یاد نہیں رہتے اور جو یاد آتے ہیں وہ شعر نہیں رہ جاتے، سہل ممتنع بن جاتے ہیں۔ کبھی سہل زیادہ اور ممتنع کم اور اکثر ممتنع زیادہ اور سہل بالکل نہیں۔ اقبال نے میرے خیال میں (جس میں اس وقت دھوبی بسا ہوا ہے) شاید کبھی کہا تھا۔

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ دھوبی ہے سوار![1]

یا حافظ نے کہا ہو۔

فغاں کیں گاذرانِ شوخ و قابل دار و شہر آشوب!

ان دونوں کا سابقہ دھوبیوں سے یقیناً رہا تھا، لیکن میں دھوبیوں کے ساتھ ناانصافی نہ کروں گا۔ حافظ اور اقبال کو تو میں نے تصوف اور قومیات کی وجہ سے کچھ نہیں کہا لیکن میں نے بہت سے ایسے شعرا دیکھے ہیں جن کے کپڑے کبھی اس قابل نہیں ہوتے کہ دنیا کا کوئی دھوبی سوا ہندوستان کے دھوبی کے دھونے کے لیے قبول کرلے۔ اگر ان کپڑوں کو کوئی جگہ مل سکتی ہے تو صرف ان شعرا کے جسم پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ لڑائی کے بعد جب ہر چیز کی درو بست نئے سرے سے کی جائے گی، اس وقت عام لوگوں کا یہ حق بین الاقوامی پولیس مانے اور منوائے گی کہ جس شاعر کے کپڑے کوئی دھوبی دھوتا ہو، بشرطیکہ دھوبی خود شاعر نہ ہو۔ اس سے کپڑے دُھلانے والوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دُھلائی کا نرخ کم کرالیں۔ یہ شعرا اور ان کے بعض قدر دان بھی دھوبی کے سپرد اپنے کپڑے اس وقت کر دیتے ہیں جب ان میں اور کپڑے میں کوڑا اور کوڑا گاڑی کا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔

---

[1] مکمل شعر اس طرح ہے: ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نگار

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار — اقبال

دھوبی کپڑے چراتے ہیں، بیچتے ہیں، کرائے پر چلاتے ہیں، گم کرتے ہیں، کپڑے کی شکل مسخ کر دیتے ہیں، پھاڑ ڈالتے ہیں، یہ سب میں مانتا ہوں اور آپ بھی مانتے ہوں گے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمارے آپ کے کپڑے اکثر ایسی حالت میں اُترتے ہیں کہ دھوبی کیا کوئی دیوتا بھی دھوئے تو ان کو کپڑے کی ہیئت وحیثیت میں واپس نہیں کرسکتا۔ مثلاً غریب دھوبی نے ہمارے آپ کے ان کپڑوں کو پانی میں ڈالا ہو، میل پانی میں مل گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا، جیسے خاک کا پتلا خاک میں مل جاتا ہے۔ خاک خاک میں، آگ آگ میں، پانی پانی میں اور ہوا ہوا میں۔ البتہ ان کپڑے پہننے والوں کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے کپڑے کو تو اپنی شخصیت میں جذب کرلیا اور شخصیت کو کثافت میں منتقل کر دیا۔ مثلاً لطافت بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کرسکتی! اور یہی کثافت ہم دنیاداروں کو قیص، پگڑی اور شلوار میں نظر آتی ہو۔ یہ بات میں نے کچھ یوں ہی نہیں کہہ دی ہے۔ اونچے قسم کے فلسفے میں آیا ہے کہ عرض بغیر جوہر کے قائم رہ سکتا ہے اور نہ بھی آیا ہو تو فلسفیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات کبھی نہ کبھی ماننی پڑے گی۔

دھوبی کے ساتھ ذہن میں اور بہت سی باتیں آتی ہیں۔ مثلاً گدھا، رسّی، ڈنڈا، دھوبی کا کتا، دھوبن (میری مراد پرند سے ہے) استری (اس سے بھی میری مراد وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں) میلے ثابت پھٹے پرانے کپڑے وغیرہ۔ ممکن ہے آپ کی جیب میں بھولے سے کوئی ایسا خط رہ گیا ہو جس کو آپ سینے سے لگائے رکھتے ہوں لیکن کسی شریف آدمی کو نہ دکھا سکتے ہوں اور دھوبی نے اسے دھو پچھاڑ کر آپ کا آنسو خشک کرنے کے لیے بلاٹنگ پیپر بنا دیا ہو یا کوئی یونانی نسخہ آپ جیب میں رکھ کر بھول گئے ہوں اور دھوبی اسے بالکل 'صاف وسودہ' کر کے لایا ہو۔

لڑائی کے زمانے میں جہاں اور بہت سی دشواریاں ہیں، وہاں یہ آفت بھی کم نہیں کہ بچے کپڑے پھاڑتے ہیں، عورتیں کپڑے سمیٹتی ہیں، دھوبی کپڑے چراتے ہیں، دُکان دار قیمتیں بڑھاتے ہیں اور ہم سب کے دام بھگتتے ہیں۔ لڑائی کے بعد زندگی کی ازسرِ نو تنظیم ہو یا نہ ہو کوئی تدبیر ایسی نکالنی پڑے گی کہ کپڑے اور دھوبی کی مصیبتوں سے نوعِ انسانی کو کلیتاً نجات نہ بھی ملے تو بہت کچھ سہولت میسّر آجائے۔

کپڑے کا مصرف پھاڑنے کے علاوہ حفاظت، نمائش اور ستر پوشی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ باتیں اتنی حقیقی نہیں ہیں جتنی ذہنی یا رسمی۔ سردی سے بچنے کی ترکیب تو یونانی اطبا اور ہندستانی سادھو جانتے ہیں۔ ایک کشتہ کھاتا ہے، دوسرا جسم پر مل لیتا ہے۔ نمائش میں ستر پوشی اور ستر نمائی دونوں شامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ستر کے رقبہ پر کنٹرول عائد کر دیا جائے تو کپڑا یقیناً کم خرچ ہوگا اور دیکھ بھال میں بھی سہولت ہوگی۔ جنگ کے دوران میں یہ مراحل طے ہو جاتے تو صلح کا زمانہ عافیت سے گزرتا۔

لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر دنیا کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ تمام سائنس دانوں اور کاری گروں کو جمع کر کے قوم کی اس مصیبت کو ان کے سامنے پیش کریں کہ آئندہ سے لباس کے بجائے 'انٹی دھوبی ٹینک' کیوں کر بنائے اور اوڑھے پہنے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ ناممکن ہے اور دھوبیوں کے پھاڑنے، پھاڑنے اور چرانے کے پیدائشی حقوق مجروح ہونے کا اندیشہ ہو جس کو خداترس حکومتیں گوارا نہیں کر سکتیں یا بعض بین الاقوامی پیچیدگیوں کے پیش آنے کا اندیشہ ہو تو پھر رائے عامہ کو ایسی تربیت دی جائے کہ لباس پہننا ہی یک قلم موقوف کر دیا جائے اور تمام دھوبیوں کو کپڑا دھونے کے بجائے بین الاقوامی معاہدوں اور ہندوستان کی تاریخوں کو دھونے پچھاڑنے اور پھاڑنے پر مامور کر دیا جائے۔

بفرضِ محال ستر پوشی پر کنٹرول ناممکن ہو یا ترکِ لباس کی اسکیم پر بزرگانِ قوم جامے سے باہر ہو جائیں اور دھوبی ایجی ٹیشن کی نوبت آئے تو پھر ملک کے طول و عرض میں ''بھارت بھبھوت بھنڈار'' کھول دیے جائیں۔ اس وقت ہم سب سر جوڑ کر اور ایک دوسرے کے کان پکڑ کر ایسے بھبھوت ایجاد کرنے کی کوشش کریں گے جن میں چائے کے خواص ہوں گے یعنی گرمی میں ٹھنڈک اور سردی میں گرمی پیدا کریں گے۔ ستر پوشی سے جسم پوشی کرنا پڑے گی۔ اگر ہم اتنی ترقی نہیں کر سکے ہیں اور قوم و ملک کی نازک اور ناگفتہ بہ حالت دیکھتے ہوئے بھی ستر کو قربان نہیں کر سکتے تو بھارت بھبھوت بھنڈار کے ذریعہ ایسے انجینئر اور آرٹسٹ پیدا کیے جائیں گے جو ستر کو کچھ کا کچھ کر دکھائیں۔ جیسے آج کل لڑنے والی حکومتیں دشمن کو دھوکا دینے کے لیے دھوکے کی ٹٹی قائم کر دیا کرتی ہیں جس کو انگریزی میں

(Smoke Screen) کہتے ہیں اور جس کے تصرف سے دیوار در، در و دیوار نظر آنے لگتے ہیں۔

میں تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس بھبھوتیائی آرٹ کے ذریعے ہم کسی حصۂ جسم کو یا ان میں سے ہر ایک کو اس طرح مسخ یا مزین کر سکیں گے کہ وہ کچھ کا کچھ نظر آئے۔ بقول ایک شاعر کے جو اس آرٹ کے رمز سے غالباً واقف تھے یعنی:

وحشت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

شعرا نے ہمارے آپ کے اعضا و جوارح کے بارے میں تشبیہ استعارہ یا جنون میں جو کچھ کہا ہے، بھارت بھبھوت کے آرٹسٹ اسی قسم کی چیز ہمارے آپ کے جسم پر بنا کر غزل کو نظم معرا کر دکھائیں گے۔ اس وقت آرٹ برائے آرٹ اور آرٹ برائے زندگی کا تنازعہ بھی ختم ہو جائے گا۔ بہت ممکن ہے بھبھوت بھنڈار میں ایسے سُرمے بھی تیار کیے جا سکیں جن کی ایک سلائی پھیرنے سے چھوٹی چیزیں بڑی اور بڑی چھوٹی نظر آنے لگیں یا دور کی چیز قریب اور قریب کی دور نظر آئے۔ اس طور پر شعرا آرٹ اور تصوف کو ایک دوسرے سے مربوط کر سکیں گے۔ دوسری طرف ستر دوستوں یا ستر دشمنوں کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی۔ اس وقت دھوبیوں کو معلوم ہوگا کہ ڈکٹیٹر کا انجام کیا ہوتا ہے۔

علی گڑھ میں میرے زمانۂ طالب علمی کے ایک دھوبی کا حال سنیے جو اَب بہت معمّر ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گاؤں میں بہت معزّز مانا جاتا ہے۔ دو منزلہ وسیع پختہ مکان میں رہتا ہے۔ کاشت کاری کا کاروبار بھی اچھے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں میں کالج کے قصّے اس طور پر بیان کرتا ہے جیسے پُرانے زمانے میں سورماؤں کی بہادری و فیاضی اور حسن و عشق کے افسانے بھاٹ سنایا کرتے تھے۔ کہنے لگا میاں وہ بھی کیا دن تھے اور کیسے کیسے اشراف کالج میں آیا کرتے تھے۔ قیمتی خوب صورت نرم و نازک کپڑے پہنتے تھے، جلد اُتارتے تھے، دیر میں منگاتے تھے، ہر مہینہ دو چار کپڑے ادھر اُدھر کر دیے، وہاں خبر بھی نہ ہوئی، یہاں مالا مال ہو گئے۔

اُن کے اُتارے کپڑوں میں بھی میرے بچے اور رشتے دار ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے علی گڑھ کی نمائش۔ آج کل جیسے کپڑے نہیں ہوتے تھے گویا بوری اور جھول داری لٹکائے پھر رہے ہیں۔ ایک کپڑا دھونا پچاس ہاتھ مگدر ہلانے کی طاقت لیتا ہے۔ کیسا ہی دھوؤ بناؤ آب نہیں چڑھتا۔ اس پر یہ کہ آج لے جاؤ کل دے جاؤ۔ کوئی کپڑا بھول چوک میں آ جائے تو عمر بھر کی آبرو خاک میں ملا دیں۔

میاں اُن رئیسوں کے کپڑے دھونے میں بھی مزہ آتا تھا جیسے دودھ ملائی کا کاروبار۔ دھونے میں مزا، استری کرنے میں مزا، دیکھنے میں مزا، دکھانے میں مزا، کوئیں کے پاس کپڑے دھوتے تھے کہ کوتوالی کرتے تھے۔ پاس پڑوس دور سے کھڑے تماشا دیکھتے۔ پولیس کا سپاہی بھی سلام ہی کر کے جاتا۔ مجال تھی جو کوئی پاس آجائے۔ برادری میں رشتہ ناتا اونچا لگتا کہ سید صاحب کے کالج کا دھوبی ہے۔ پنچایت چکانے دور دور سے بلاوا آتا۔ ایسے ایسے کپڑے پہن کر جاتا کہ گاؤں کے مکھیا اور پٹواری دیکھنے آتے جو بات کہتا سب ہاتھ جوڑ کر مانتے، کوئی چیں چپڑ کرتا تو کہہ دیتا، بچا ہیکڑی دکھائی تو سید صاحب کے ہاں لے چل کر وہ گت بنوائی ہوگی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ پھر کوئی نہ نکلتا!

شہر میں کہیں شادی بیاہ ہوتا تو مجھے سب سے پہلے بلایا جاتا۔ لڑکی لڑکے کا بزرگ کہتا بھیا انکو لڑکی کی شادی ہے عزت کا معاملہ ہے، برادری کا سامنا ہے، مدد کا وقت ہے۔ میں کہتا نچنت رہو، تمہاری نہیں میری بیٹی ہے۔ کالج پھلے پھولے، فکر مت کرو پرماتما کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ میاں یقین مانو کالج آتا لڑکوں سے کہتا، حضور لڑکی کی شادی ہے، اب کے جمعہ کو کپڑے نہ آئیں گے۔ سب کہتے انکو، کچھ پروا نہیں، ہم کو بھی بلانا، جو چیز چاہو لے جاؤ، دب کے کام نہ کرنا۔ میاں پھر کیا تھا گز بھر کی چھاتی ہو جاتی!

ایک باری کے کپڑے، دری، فرش، چاندنی، تولیے، دسترخوان سب دے دیتا، محفل جھاجھم ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کالج کا کوئی جلسہ ہے۔ براتی دنگ رہ جاتے۔ میاں اس ہیرا پھیری اور ہڑبونگ میں ایک آدھ گم ہو جاتا، کوئی کچھ رکھ لیتا یا ادھر اُدھر دے ڈالتا۔ دوسرے تیسرے جمعہ کو کالج آتا، ہر لڑکا بجائے اس کے کہ کپڑے پر ٹوٹ پڑتا، دوری

سے پکارتا کیوں انکو، اکیلے اکیلے لڑکی کی شادی کر ڈالی ہم کو نہیں بلایا۔ سب کو سلام کرتا، کہتا میاں تمھارا لکھنے پڑھنے کا ہرج ہوتا، کہاں جاتے، تمھارے اقبال سے سب کام ٹھیک ہو گیا۔

میاں لوگ نواب تھے۔ کہتے انکو ہم کو فرصت نہیں میلے کپڑے لے لینا۔ دُھلے کپڑے بکس میں رکھ دینا، چابی تکیے کے نیچے ہوگی۔ بکس بند کر کے مجھے دے جانا۔ ان کو کیا خبر کون سے کپڑے لے گیا تھا کیا واپس کر گیا۔ کبھی کچھ یاد آ گیا تو پوچھ بیٹھے انکو فلاں کپڑا نظر نہیں آیا۔ میں کہہ دیتا، سرکار وہ لڑکی کی شادی نہ تھی۔ کہتے ہاں ہاں ٹھیک کہا، یاد نہیں رہا اور کیوں تم نے ہم کو نہیں بلایا۔ میرا یہ بہانہ اور ان کا یہ کہنا چلتا رہتا اور پھر ختم ہو جاتا۔

کالج میں کرکٹ کی بڑی دھوم تھی۔ ایک دفعہ کپتان صاحب نے گھاٹ پر سے بلوا بھیجا۔ کہنے لگے، انکو دلّی سے کچھ کھیلنے والے آ گئے ہیں، ہم لوگوں کو کھیلنے کی فرصت نہیں لیکن ان کو بغیر میچ کھلائے واپس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ میچ کالج کے بیرر کھیلیں گے۔ تم ممتاز کے یہاں چلے جاؤ وہ بتلائے گا کہ کتنے کوٹ پتلون اور قمیص مفلر وغیرہ درکار ہوں گے۔ بیروں کی پوری ٹیم کو کرکٹ کا یونی فارم مہیا کر دو۔ کل گیارہ بجے دن کو میں سب چیزیں ٹھیک دیکھوں۔ میاں کپتان صاحب کا یہ جنڈیلی آرڈر پورا کیا گیا۔ ٹیم کھیلی اور جیت گئی۔ کپتان صاحب نے سب کو دعوت دی اور بھرے مجمع میں کہا: ''انکو کا شکریہ!''

اکثر سوچتا ہوں کہ دھوبی اور لیڈر میں اتنی مماثلت کیوں ہے۔ دھوبی لیڈر کی ترقی یافتہ صورت ہے یا لیڈر دھوبی کی! دونوں دھوتے پچھاڑتے ہیں۔ دھوبی گندے چیکٹ کپڑے علاحدہ لے جا کر دھوتا ہے اور صاف اور کلف کر کے دوبارہ پہننے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیڈر بر سرِ عام گندے کپڑے دھوتا ہے اور گندگی اُچھالتا ہے۔ Washing dirty linen in public کا یہی تو مفہوم ہے۔ لیڈر کا مقصد نجاست کو دور کرنے کا اتنا نہیں ہوتا جتنا نجاست پھیلانے کا۔ دھوبیوں کے لیے کپڑے دھونے کے گھاٹ مقرر ہیں، لیڈر کے لیے پلیٹ فارم حاضر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دھوبی کپڑے پھاڑتا ہے، غائب کر دیتا ہے اور ان کا آب و رنگ بگاڑ دیتا ہے۔ لیکن لیڈر کی طرح وہ گندگی کو پائدار یا رنگین نہیں بناتا نہ متعدی کرتا ہے۔

ہمارے معلّم بھی دھوبی سے کم نہیں وہ شاگرد کو اسی طرح دھوتے، پچھاڑتے، مروڑتے اور اس پر استری کرتے ہیں جیسے دھوبی کرتا ہے۔ آپ نے بعض دھوبیوں کو دیکھا ہوگا جو دُھلائی کی زحمت سے بچنے اور مالک کو دھوکا دینے کے لیے سفید کپڑے پر نیل کا ہلکا سا رنگ دے دیتے ہیں۔ دھوبی کو اس کی مطلق پروا نہیں کہ سر پر سے گھما گھما کر کپڑے کو پتھر پر پٹکنا، اینٹھنا اور نچوڑنا اور اس کا لحاظ نہ کرنا کہ کپڑے کے تار و پود کے رنگ کا کیا حشر ہوگا، بٹن کہاں جائیں گے، لباس کی وضع قطع کیا سے کیا ہو جائے گی۔ استری ٹھیک گرم ہے یا نہیں، ٹھنڈی استری کرنا چاہیے یا گرم۔ بالکل اسی طرح معلّم کو اس کی پروا نہیں کہ طالب علم کس قماش کا ہے اس پر کیا رنگ چڑھا ہوا ہے اور اس کے دل و دماغ کا کیا عالم ہے، وہ اسے دے دے مارتا ہے اور بُھرکس نکال دیتا ہے۔ وہ طالب علم کی استعداد، اس کے میلانات اور اس کی اُلجھنوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ صرف اپنا رنگ چڑھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ گاذری کے سارے مراحل طے کرنے کے بعد جب طالب علم دنیا کے بازار یا گاہک کے ہاتھ میں آتا ہے تو اس کا جسم، ذہن و دماغ سب جواب دے چکے ہوتے ہیں۔ اس پر رنگ بھی ناپائدار ہوتا ہے۔ کلف دے کر اس پر جو بے تکی اور بے ٹکان استری کی ہوتی ہے وہ حوادثِ روزگار کے ایک ہی چھینٹے یا جھونکے سے بدرنگ اور کاواک ہو جاتی ہے۔ دھوبی کی یہ روایات معلّمی میں پورے طور پر سرایت کر چکی ہیں۔

ہندستانی دھوبی کے بارے میں آپ نے ایک مشہور ستم ظریف کا فقرہ سنا ہوگا، جس نے اس کو کپڑے پچھاڑتے دیکھ کر کہا تھا کہ دنیا میں عقیدہ بھی کیا چیز ہے۔ اس شخص کو دیکھیے کپڑے سے پتھر توڑ ڈالنے کے درپے ہے۔ اگر ستم ظریف نے ہندستانی شعرا یا عشاق کا مطالعہ کیا ہوتا جو تنگِ سجدہ سے محبوب کا سنگِ آستاں گھس کر غائب کر دیتے ہیں تو اس پر معلوم نہیں کیا گزر جاتی۔ یہ تو پرانے شعرا کا وطیرہ تھا، حال کے شعرا کا رنگ کچھ اور ہے۔ انھوں نے سوسائٹی کے میلے گندے کپڑے شارعِ عام پر دھونے، پچھاڑنے کا نیا فن ایجاد کیا ہے۔ اس قبیل کے شعرا سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنے کے اتنے قائل اور شاید قابل بھی نہیں رہے ہیں جتنا ان خرابیوں کا شکار ہو چکے ہیں یا اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ان خرابیوں کی نمائش

کرنے اور اس کو ایک فن کا درجہ دینے کے درپے ہیں۔ کمزوریوں کو تسلیم کرنا اور ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا مستحسن آثار ہیں، لیکن ان کو آرٹ یا الہام کا درجہ دینا کمزوری اور بدتوفیقی ہے۔ شاعری میں دھوبی کا کاروبار بُرا نہیں، لیکن دھوبی اور دھوبی کے گدھے میں تو فرق کرنا ہی پڑے گا!

میرا ایک سے سابقہ رہا ہے جسے بہانے تراشنے میں وہ مہارت حاصل ہے جو اردو اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر کو بھی نصیب نہیں۔ پرچے کے توقف سے شائع ہونے پر یا بالکل نہ شائع ہونے پر یہ ایڈیٹر جس جس طرح کے عذر پیش کرتے ہیں اور عاشقانہ شعر پڑھتے ہیں اور فلمی گانے سناتے ہیں وہ ایک مستقل داستان ہے اور فن بھی۔ لیکن میرا دھوبی اور اس کی بیوی جس قسم کے حیلے تراشتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ مثلاً موسم خراب ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ دھوپ نہیں ہوئی کہ کپڑے سوکھتے یا گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ دُھلے بن دُھلے ہوگئے یا دھوپ اتنی سخت تھی کہ دھونے کے لیے کپڑے کا تر کرنا محال ہوگیا! صحت خراب ہے یعنی دھوبی یا دھوبن یا اس کے لڑکے بالے یا اس کے دور و نزدیک کے رشتے دار ہر طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ قسمت خراب ہے یعنی ان میں سے ایک ورنہ ہر ایک مرگیا۔ زمانہ خراب ہے، یعنی چوری ہوگئی، فوجداری ہوگئی یا گدھا کانجی ہاؤس بھیج دیا گیا۔ کپڑا خراب ہے یعنی پھٹ گیا، بدرنگ ہوگیا یا گم ہوگیا۔

عاقبت خراب ہے یعنی ریڈیو پر طرح طرح کی خبریں آتی ہیں اور مٹی خراب ہے، یعنی وہ میرے کپڑے دھوتا ہے۔ میرے خلاف اور غالباً ناظرین میں سے بھی بعض حضرات کے خلاف دھوبیوں کو یہ شکایت ہے کہ میں کپڑے اُتارنے اور دھوبی کے سپرد کرنے میں زیادہ دیر لگاتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ دھوبی کے حوالہ کرنے سے پہلے وہ لوگ جو دھوبی نہیں ہیں یا دھوبی سے بھی گئے گزرے ہیں میرے اُترے ہوئے کپڑوں کا میل دور کرنے کی اپنے اپنے طور پر کوشش اور تجربے کرتے ہیں۔ کوئی چونا رگڑ کر کوئی کتھا، پیالی پلیٹ اور دیگچی پونچھ کر کوئی جھاڑو کا کام لے کر، کوئی آلو ٹماٹر اور کوئی لنگوٹ باندھ کر اور جب یہ تمام تجربے یا مراحل طے ہو لیتے ہیں تو وہ کپڑے دھوبی کے حوالے کیے جاتے ہیں۔

دنیا کو رنگ برنگ کے خطروں سے سابقہ رہا ہے۔ مثلاً لال خطرہ، پیلا خطرہ، کالا خطرہ، ان سے کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی حد تک گلو خلاصی ہوتی رہتی ہے، لیکن یہ دھوبی خطرہ زندگی میں اس طرح خارش بن کر سما گیا ہے کہ نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مصیبت و مایوسی میں انسان تو ہم پرست ہو جاتا ہے اور ٹونے ٹوٹکے اور فال و تعویذ پر اُتر آتا ہے۔ میں نے دھوبی کو ذہن میں تول کر غالب سے رجوع کیا تو فال میں یہ مصرعہ نکلا:

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو [1]

گھبرا گیا لیکن چوں کہ غالبؔ یہ بھی کہہ چکے تھے کہ اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا۔ اس لیے میرؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں سے یہ جواب ملا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اسی دھوبی کے سب اسیر ہوئے! [2]

بایں ہمہ دھوبی جس دن دُھلے کپڑے لاتا ہے اور میلے کپڑے لے جاتا ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھر میں برکتیں آئیں اور بلائیں دور ہوئیں۔ چاندنی، چادریں، غلاف، پردے، دسترخوان، میز پوش سب بدل گئے۔ نہا دھو کر چھوٹے بڑوں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ طبیعت شگفتہ ہو گئی اور کچھ نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس ہونے لگا کہ زندگی بہرحال اتنی پُر محن نہیں ہے جتنی کہ بتائی جاتی ہے۔

(مطبوعہ محمد حسن انٹر کالج میگزین، جونپور، 51-1950)

●●●

---

1 پورا شعر یہ ہے:

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو — غالب

2 اصل شعر:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

وکیل صاحب

متعدد ناکام حملوں کے بعد ایک روز جون کے مہینے میں معلوم ہوا کہ ہمارا ہیرو یونیورسٹی سے 'حق بخشوانے' میں کامیاب ہوا اور ایک نیا سوٹ، پرانی ٹائی اور اس سے پرانی ٹوپی جو ایامِ دماغ سوزی کی 'تفسیر روغن' ہو کر رہ گئی تھی زیبِ سر کر کے کلکٹر صاحب کے بنگلے سے لے کر نینی تال کی بلندیوں تک ڈپٹی کلکٹر کا گز بن گیا تھا۔ گرمی کا موسم جنون و مراق کے لیے مضر ہوتا ہے۔ اسی لیے نینی تال، مسوری، شملہ، کسولی وغیرہ میں جب دو ایک گرمیاں سر سے گزر جاتی ہیں تو بقول شخصے 'مغز کی گرمی' چھٹ جاتی ہے۔ مکان واپس آتے ہیں۔ والدین جو بی۔اے پاس ہو جانے کے بعد قانون پڑھانا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا حکما منضج کے بعد مسہل دینا اور لیڈرانِ قوم اسپیچ کے بعد چندہ لینا؟ ان کو قانون کا امتحان پاس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مدت کی سرگرانی کے بعد 'نے محقق بود نہ دانش مند' ہو کر واپس آئے۔ اب جو دیکھیے تو ایک ٹوٹے ہوئے سائبان میں ایک خانہ ساز کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے ان کے خیالات کی طرح ڈانواں ڈول ایک میز ہے جس کا ایک پاؤں کسی حادثے کی نذر ہو گیا تھا، اس کے نیچے تین اینٹیں تلے اوپر رکھی ہوئی ہیں۔ اوپر تین چار کتابیں، جن کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ اتنے میں ایک گاؤں سے کوئی دہقان اونچی دھوتی، کندھے پر لاٹھی اور لاٹھی کے سرے پر اس کا ایک جوڑا جوتا، جس پر تیل اور گرد کی تہیں جم چکی تھیں، پشت پر پیتل کا ایک لوٹا اور ایک میلی مختصر

پوٹلی باہم دست وگریباں، کچھ بوکھلایا ہوا کچھ چونکتا رُک کر آتے ہوئے دیکھا۔ فوراً سب سے موٹی کتاب کو اس بدحواسی کے ساتھ کھینچ کر بیچ میں سے پڑھنا شروع کر دیا کہ دوسری کتابیں میز پر منتشر ہوگئیں۔ اس خلفشار میں میز کا پایہ اینٹ پر سے کھسک گیا لیکن ڈگمگاتی ہوئی میز کو ایک طرف سے اپنے پاؤں پر سنبھال کر فوراً دریائے فکر میں غوطے لگانے لگے، ساتھ ہی ساتھ، کنکھیوں سے دہقانی کو بھی دیکھتے جاتے تھے۔ بدقسمتی سے اس کا رُخ دوسری طرف مائل ہوگیا۔ انھوں نے مایوسی سے کتاب کو میز پر ٹیک دیا میز پہلے ہی سے ڈگمگا رہی تھی، ہل چل سے قلابازی کھا گئی۔ قہر درویش بر جانِ درویش، سر جھکائے ہوئے کیل کانٹے درست کر رہے تھے کہ ایک دوسرا موکل نظر آیا معاً اپنی حالتِ زار کا اندازہ کیا اور سر اُٹھا کر کرسی پر واپس آنا چاہتے تھے لیکن یہ بھول گئے کہ سر میز کے نیچے ہے، اُٹھے تو سر میز سے ٹکرا گیا۔ کسان قریب آیا، چوٹ کی وجہ سے ایک ہاتھ مقامِ ماؤف پر، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں، کچھ خفت کچھ غصہ لیکن یہ سب حالتیں اُس اُمید پر قابلِ برداشت تھیں جو نووارد کی ذات سے وابستہ تھی۔ آنکھوں کے اشارے سے مطلب دریافت کیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس نگاہ میں یاس واُمید کے کیسے مد وجزر اُٹھ رہے تھے۔ کتنے ایسے ہیں جو اس بدنصیب کی ان مبارک اور خوش آئند اُمیدوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس نے طالب علمی کے زمانے میں محنت اور کلفت کی گھڑیوں میں شب کی تاریکی، صبح کی سپیدی اور شام کے دھندلکے میں مستقبل کے لیے قائم کر رکھی تھیں۔ نووارد نے ایک دوسرے وکیل کا پتہ دریافت کیا۔ غریب نے ایک طرف کو اشارہ کر دیا۔ کسان روانہ ہوگیا۔ وکیل صاحب کی مایوس نگاہیں کچھ دور تک جانے والے کے ساتھ گئیں پھر تھک کر کہیں رہ گئیں۔

دن کے نو بجے ہیں۔ وکیل صاحب نے کچھ کھا پی کر بستہ سنبھالا۔ شہر کے چوراہے پر یکے کے انتظار میں جا کھڑے ہوئے۔ ایک ہاتھ میں بدرنگ شکستہ چھتری، دوسرے میں بستہ، بغل میں چوغہ کی پوٹلی یکہ والے دو۲ آنے سواری پر مُصر یہ ڈیڑھ آنے سے زیادہ دینے پر تیار نہیں۔ جتنے یکے والے سامنے سے گزرے سبھی سے ردّ وقدح ہوئی۔ کسی نے ان کا خیال نہیں کیا۔ کسی نے سخت وسُست بھی کہہ دیا۔ غلط راستے پر کھڑے تھے ایک گھوڑے سے ٹکراتے بچے۔ کانسٹبل نے ڈانٹا اور یہ بے چارے سٹ سمٹا کر ایک طرف ہو لیے۔ ایک نہایت حقیر اور

شکستہ یکہ پر دو سواریاں پہلے سے موجود تھیں، اس میں ایک زنانی سواری بھی تھی۔ یکہ بان پیرفرتوت، بقول سودا گھوڑا ایسا جسے آگے سے توبڑا دکھلایا جائے اور پیچھے سے لاٹھی ماری جائے تو چلنے پر آمادہ ہو ورنہ پاؤں کے نیچے پہیے لگانے کی ضرورت ہو۔ بہ ہزار وقت ڈیڑھ آنے پر معاملہ طے ہوا۔ یکہ بان کے ساتھ تیسری سواری ہو کر بیٹھے۔ بستہ بغل میں، سر پر چھتری، یکہ روانہ ہوا گھوڑے کی چال ان سواریوں کی حالتِ زار کے مطابق تھی۔ ہر ایک پر وجد طاری تھا اور ہچکولوں کی تال وسم پر سر دُھنتا تھا یا وکیل صاحب ضابطۂ فوج داری یا ضابطۂ دیوانی کی معلوم نہیں کس دفعہ میں غلطاں و پیچاں تھے کہ گھوڑے نے ٹھوکر لی، بستہ مع ٹوپی کے زمین پر آرہا، اور خود کہنیوں کے بل گھوڑے کی پیٹھ پر آرہے۔

کرایہ کے یکے اور گاڑیوں کو کچہری کے دروازے تک جانے کی اجازت نہ تھی۔ احاطہ کے باہر وکیل صاحب اُتر گئے اور نظر بچاتے ہوئے کچہری کی عمارت میں آئے۔ بستہ عرائض نویسوں اور محرّر کے بوریے پر رکھا، پوٹلی سے نکال کر گاؤن زیبِ تن کیا۔ ایک مدت گزری کبھی اس چوغہ کا رنگ سیاہ تھا امتدادِ زمانہ اور وکیل صاحب کے پیش رووں کی سرپرستی سے اس کی رنگت ان بالوں کی سی ہوگئی تھی جن پر عرصہ سے خضاب نہ لگایا گیا ہو۔ پچھلے دامن کی گوٹ علاحدہ ہو کر نیم بیضاوی شکل میں ان کی بے گناہی پر خندۂ دنداں نما تھی۔ اس دامن کی شہادت کے بارے میں بعض اشخاص شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سعادت ایک موکل کی دراز دستی سے حاصل ہوئی تھی۔

وکیلوں کے کمرے میں پہنچے۔ یہاں کس کا کون پُرسانِ حال ہوتا۔ ہمارا ہیرو مایوسی و درماندگی کی تصویر بنا ہوا ایک گوشہ میں بیٹھ کر سب سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر آخری سگریٹ پینے لگا۔ خیالات کا ہجوم، کمرے میں ہوا کا گزر نہیں، دھوئیں کے حلقے فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ سگریٹ کی راکھ میز کے کنارے سے لگا کر گراتا جاتا تھا۔ دوسرے وکلا ہنس بول رہے تھے، شور پکار سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سامنے ایک بوڑھے بنگالی وکیل کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک میلا بھدّے قسم کا کوٹ، اسی کپڑے کا پائجامہ، پاؤں میں کریپ سول کا ایک پرانا جوتا۔ کاغذ کے ایک خول پر چلم رکھ کر مسلسل کش لگا رہے تھے اور نظر مسل پر لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف موکل جھکے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان وکیل اردگرد بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ کبھی کبھی بنگلہ

زبان میں کچھ نہ کچھ سمجھاتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص ہانپتا کانپتا کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔ ''حضور پکار ہو رہی ہے''، بوڑھا بنگالی اجلاس پر پہنچا۔ چپراسی نے جھک کر سلام کیا اور اس نے پانچ کر دو ہی ایک جملے کہے، مقدمے کی سماعت ملتوی کر دی گئی، تاریخ بھی بدل دی گئی۔ روپیوں کے بوجھ سے بنگالی وکیل کی مضبوط جیب کسی قدر اور لٹک گئی۔ اسی دوران میں حلوائی کا چھوٹا لڑکا پیپل کے ایک ہی پتے کے ہرے دونے میں دو گلاب جامن لایا۔ پیتل کے منجھے ہوئے لوٹے میں پانی بھرا ہوا تھا، بنگالی وکیل نے کریپ سول کا جوتا علاحدہ کیا۔ دونوں گلاب جامنوں کو داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور انگوٹھے سے اُٹھا کر ٹھیک حلق کے اندر یکے بعد دیگرے ٹپکا دیا۔ پورے لوٹے کا پانی ایک سانس میں پی گیا۔ انگوٹھے کو منہ سے، منہ کو انگوٹھے سے پونچھا اور مسلوں کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ شخص کتنی دولت کا مالک تھا۔ رائے بہادری۔ آئی۔ ای پانچ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی اور بینک آف انگلینڈ میں دس لاکھ کا حصہ دار۔

''........حاضر ہے۔'' عدالت میں پکار ہوئی، چپراسی نے کرخت آواز میں مستغیثہ کو آواز دی۔ ایک غریب نوجوان شریف عورت میلے کچیلے لباس میں عدالت کے دروازے پر متوحش کھڑی تھی۔ اس بدنصیب سے چپراسی کو کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی۔ بڑے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تیرا وکیل کون ہے'' غریب عدالت سے ناواقف، طرح طرح کے لوگوں کا ہجوم، عدالت کا ایوان، ہر طرف دوڑ دھوپ اور ڈانٹ ڈپٹ، یہ غریب ایک دور افتادہ گاؤں کی رہنے والی جس نے سادہ دل کسان اور مویشیوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا تھا۔ اس ہنگامے سے اور زیادہ مبہوت ہو گئی۔ چپراسی نے جواب نہ پا کر دھتکار دیا۔ سامنے سے ایک وکیل کا گزر ہوا۔ سر چھوٹا پیٹ بڑا، نیت کھوٹی آواز بھاری۔ عورت نے آنکھوں سے اپنی کس مپری کی خاموش داستان سنا دی۔ وکیل اس عورت کی طرف سے اسی مقدمے کی پیروی کر چکا تھا۔ عورت کی بے بسی کو نظر انداز کر کے فیس کا طالب ہوا۔ غریب نے ہزاروں منتیں کیں، بیوگی اور بے مائیگی کا سانحۂ غم رو رو کر کہہ سنایا لیکن وکیل نے توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔ غریب نے ایک بار پھر عدالت تک پہنچنا چاہا لیکن چپراسی سختی سے مانع ہوا اور مقدمہ عدم پیروی میں خارج ہو گیا۔

ایک اور وکیل صاحب کلکتہ ہائی کورٹ میں مدت تک کام کر چکے تھے۔ زمانے کی گردش سے مفلوک الحال ہو گئے تھے۔ زندگی کا آفتاب لب بام تھا۔ کہولت اور کمزوری کے باعث نشست و برخاست میں بھی دقت ہوتی ہے لیکن قانون کے روگ میں اب تک مبتلا ہیں۔ عدالت میں ان کا وجود سب پر وبال ہے۔ وکلا یا حکام کی لائبریری میں ان کا گزر ہوتا ہے تو لوگ بے رُخی سے پیش آتے ہیں۔ تازہ نظائر کے مطالعہ کے شائق ہیں اور ان کا خلاصہ اپنی اس نوٹ بک میں درج کرتے جاتے ہیں جس کے اطراف کی جلد مدت ہوئی حق رفاقت ادا کر کے واصل بحق ہو چکی ہے اور ادھر اُدھر کے دس بیس اوراق بھی غائب ہو چکے ہیں۔ ہاتھ میں میلے اور ملگجے کاغذات کا ایک پلندہ رہتا تھا جس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان کے ابتدائی زمانہ کے وہ پُراسرار کاغذات تھے جن کی نسبت یقین کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ملکی مسائل اور سیاسی اصول پر اس سرگرمی اور جوش کے ساتھ گفتگو کرتے کہ لوگ متحیر رہ جاتے۔ قانونی نکات خوب سمجھتے تھے لیکن ان کا حلیہ ان کی حالت، ان کی کہولت کچھ ایسے اسباب تھے کہ ان کی طرف کوئی رُخ نہیں کرتا تھا۔

ان کی وضع داری کو دیکھیے، دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک نچلے نہ بیٹھتے اور کبھی ایک پیسہ نہ کمایا۔ شام کو گھر کی مراجعت کرتے تو آدھ گھنٹے سے کم وقت کرایہ چکانے میں صَرف نہیں کرتے تھے۔ یکہ والے ان کی صورت دیکھ کر پناہ مانگتے تھے۔ یہ الف لیلیٰ کے اس تسمہ پا بوڑھے کی مانند تھے جس کے پاؤں جس کسی کی گردن میں حمائل ہو جاتے تھے، اس کی جان لے کر چھوڑتے تھے۔

وکلا کے کمرے سے علاحدہ محرّروں اور عرائض نویسوں کی نشست گاہ سے متصل ایک صاحب قابلِ توجہ ہیں جو منصفی کے وکیل ہیں۔ سر پر پٹھے جو بیچ سے علاحدہ کر دیے گئے تھے، بال خضاب سے سیاہ، چہرے پر جھرّیاں، آنکھوں میں سرے کی تحریر، ململ کی بند دار اُچکن زیبِ تن، عمامہ برفرق، جیسے ابھی کہیں سے عقد پڑھا کر چھوہارے لیے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ بڑی مہری کا پاجامہ جس میں چار اُنگل چوڑی گوٹ لگی ہوئی، حاشیہ کے اندر سرخ ڈورے دے دیے گئے تھے۔ اردو کی قانونی کتابوں کا بستہ سامنے تھا جس میں عرضی دعوے وغیرہ لکھنے کے مجرّب نسخے

تہہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ کہا جاتا ہے ان کے شاگرد ہمارے وہ وکیل صاحب بھی رہ چکے تھے جن کا ذکر ابتدا میں آیا ہے۔ ایک شاگرد مسودہ لے کر اصلاح کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے دبیز شیشوں کی عینک ناک کے کنارے پر رکھ کر میلے کچیلے ڈورے سر کے پیچھے کھسکا کر باندھ دیے۔ کاغذ کو ہاتھ میں لے کر انتہائی فاصلے سے پڑھنا شروع کیا۔ پہلے ہی لفظ پر رُک کے، مسودہ زمین پر پٹک دیا۔ عینک لکڑی کے ایک خول میں جس کا ڈھکنا اسی وقت سے غائب تھا جب سے وکیل صاحب نے اس وادی میں قدم رکھا تھا، بند کر دی گئی۔ غریب شاگرد گھبرایا، کچھ دیر تک وکیل صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے۔ آخرکار شاگرد نے ڈرتے ڈرتے عتاب کی وجہ سے دریافت کی تو فرمایا۔ ''میاں تمھیں عرضی دعویٰ لکھنا کیا آئے گا خاک، مدتوں سے ساتھ ہو، اتنا مغز مارتا ہوں لیکن تمھارے دماغ میں کوئی بات نہیں گھستی۔ بس اب ہو چکا، بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔''

شاگرد، ''آخر کیا غلطی ہوئی۔ میں نے حتی الوسع نہایت کوشش سے مسودہ تیار کیا ہے۔'' وکیل صاحب، ''اچھا تو ایک موقع اور دیتا ہوں، غور سے پڑھ جاؤ سامنے ہی غلطی ہے ہاں، شاباش!'' شاگرد ایک ایک لفظ غور سے پڑھ گیا، سودے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا لیکن کوئی غلطی نہ پا کر کاغذ واپس کر دیا، اور عرض کیا: ''وکیل صاحب مجھے تو اب بھی کوئی غلطی نظر نہ آئی۔''

وکیل صاحب برافروختہ ہو کر بولے۔ ''کیوں خلاصہ فریاد ہے، کہاں لکھا ہے۔ بسم اللہ ہی غلط۔ شاگرد خاموش ہو گیا اور مایوس و ملول گھر واپس آیا۔ ایک بی بی دو بچے موجود تھے۔ بچے دوڑ کر لپٹ گئے، جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے۔ ''ابا میرے لیے کیا لائے ہیں؟ میں تو آج ناشپاتی ضرور لوں گی، اماں پیسے نہیں دیتیں، کہتی ہیں ابا کچہری سے ناشپاتی لائیں گے۔'' چھوٹی لڑکی ماں کے پاس سے دوڑ کر بدقسمت باپ کے گھٹنوں میں لپٹ گئی۔ ''ابا کچہری نہ جایا کرو۔ تم نہیں تھے، فاطمہ کی ماں (ہمسائی) آن کر اماں سے روپے مانگتی تھی اور جب اماں نے کہا کہ تم کچہری سے آن کر دے دو گے تو وہ بہت بگڑی اور شور مچانے لگی۔ اماں اب تک رو رہی تھیں، کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ کچہری سے آتے ہو تو بیمار معلوم ہوتے ہو۔ میرے ساتھ دن بھر رہا کرو

ہم تم ساتھ جھولا جھولیں گے۔ کیوں اماں، اب بابا بھی ساتھ رہیں گے تو گھر میں آکر کوئی شور نہیں مچائے گا۔''

بیوی جو اُن کے لیے چشمِ براہ تھی، ناہموار قدموں کی چاپ سن کر سمجھ گئی کہ آج بھی حالات میں کوئی اُمید افزا تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن متبسّم ہوکر خیر مقدم کیا۔ بیوی کے اس اندازِ پذیرائی سے شوہر کے جذبات متلاطم ہوگئے۔ اس نے بچوں کو گود میں لیا اور پُرنم آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''خدا کا شکر ہے میری قسمت قابلِ رشک نہیں۔''

(مطبوعہ'الناظر' لکھنؤ، جون جولائی 1921)

●●●

چارپائی

چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسہ، آفس، جیل خانے، کونسل یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں، دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں۔ کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِ قوم، اکثر فاقہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی۔ سی۔ ایس پر، شاعر کو قافیہ پر یا طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

چارپائی کی پیڑھی دور چل کر دیو جانس کلبی کے خم سے جا ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تمام دنیا سے منہ موڑ کر دیو جانس ایک خم میں جا بیٹھا تھا۔ ہندستانی تمام دنیا کو چارپائی کے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ ایک نے کثرت سے وحدت کی طرف رجوع کیا۔ دوسرے نے وحدت میں کثرت کو سمیٹا۔

ہندستانی ترقی کرتے کرتے تعلیم یافتہ جانور ہی کیوں نہ ہو جائے، اس سے اس کی چارپائیت نہیں جدا کی جا سکتی۔ اس وقت ہندوستان کو دو معرکے درپیش ہیں۔ ایک سوراج کا دوسرا روشن خیال بیوی کا۔ دراصل سوراج اور روشن خیال بیوی دونوں ایک ہی مرض کی دو علامتیں ہیں۔ دونوں چارپائیت میں مبتلا ہیں۔ سوراج تو وہ ایسا چاہتا ہے جس میں انگریز کو حکومت کرنے اور ہندستانی کو گالی دینے کی آزادی ہو، اور بیوی ایسی چاہتا ہے جو گریجویٹ ہو لیکن گالی نہ دے۔

اس طور پر ہندستانی شوہر اور تعلیم یافتہ بیوی کے درمیان جو کھینچ تان ملتی ہے اس کا سبب یہ بھی ہے کہ شوہر چارپائی پر سے حکومت کرنا چاہتا ہے اور بیوی ڈرائنگ روم سے گھنٹی بجاتی ہے۔ روشن خیال بیوی شہرت کی آرزومند ہوتی ہے۔ دوسری طرف شوہر یہ چاہتا ہے کہ بیوی تو صرف فردِ خاندان ہونے پر صبر کرے اور خود فخرِ خاندان نہیں بلکہ فخرِ کائنات قرار دیا جائے۔

موتی لال نہرو رپورٹ سے پہلے ہندوستانیوں پر دو مصیبتیں نازل تھیں۔ ایک ملیریا کی دوسری مس میو المعروف بہ مادرِ ہند کی۔ ملیریا کا انسداد کچھ تو کونین سے کیا گیا بقیہ کا کثرتِ اموات سے۔ مس میو کے تدارک میں ہندو مسلمان دونوں چارپائی پر سر بہ زانو اور چوراہوں پر دست و گریباں ہیں۔ نہرو رپورٹ اور مادرِ ہند دونوں میں ایک نسبت ہے۔ ایک نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کو اہمیت نہ دی، دوسری نے ہندوؤں کے معاشرتی رسوم و روایات کی توہین کی!

مادرِ ہند کے بارے میں چارپائی نشینوں کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے ان کو ہندوستانیوں سے زیادہ مس میو کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع ملا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر سارے ہندوستان سے شمار و اعداد اور مواد اکٹھا کرنے کے بجائے موصوفہ نے صرف ہم ہندوستانیوں کی چارپائی کا جائزہ لیا ہوتا تو ان کی تصنیف اس سے زیادہ دلچسپ ہوتی جتنی کہ اب ہے۔

چارپائی ہندوستانیوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ فتح ہو یا شکست وہ رُخ کرے گا ہمیشہ چارپائی کی طرف۔

پھر وہ چارپائی پر لیٹ جائے گا۔ گائے گا، گالی دے گا یا مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات پڑھنا شروع کر دے گا۔

فنِ جنگ یا فنِ صحافت کی رو سے آج کل اس طرح کے وظائف ضروری اور نفع بخش خیال کیے جاتے ہیں۔ جس طرح ہر مال دار شریف یا خوش نصیب نہیں ہوتا اسی طرح ہر چارپائی چارپائی نہیں ہوتی۔ کہنے کو تو پلنگ پلنگڑی، چپرکھٹ، مسہری، سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن سیاسی لیڈروں کے سیاسی اور مولویوں کے مذہبی تصوّر کے مانند چارپائی کا صحیح مفہوم اکثر متعین نہیں ہوتا۔

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہرکام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے اس لیے ہرکام پر لگادیا جاتا ہے۔ایک ریاست میں کوئی صاحب ولایت پاس ہوکر آئے۔ ریاست میں کوئی آسامی نہ تھی جو اُن کی دی جاسکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے۔ راجہ صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچادی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے طے کرآئے ہیں۔ راجہ صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہل چل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رُخصت پر گئے ہوئے تھے۔ یہ ان کی جگہ پر تعینات کردیے گئے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینئر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوگئے تھے اور اپنے ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوادینے کی فکر میں تھے۔

یہی حالت چارپائی کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ کارآمد ہوتی ہے! فرض کیجیے آپ بیمار ہیں، سفرِ آخرت کا سامان میسّر ہو یا نہ ہو، اگر چارپائی آپ کے پاس ہے تو آپ کو دنیا میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پڑیہ تکیے کے نیچے، جوشاندہ کی دیگچی سرہانے رکھی ہوئی، بڑی بیوی طبیب، چھوٹی بیوی خدمت گزار، چارپائی سے ملا ہوا بول و براز کا برتن، چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچوں کے کھلونے، جھاڑو، آش جو، روئی کے پھائے، کاغذ کے ٹکڑے، مچھر بھنگے گھریا محلّے کے دو ایک بچے جن میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا! اچھے ہوگئے تو بیوی نے چارپائی کھڑی کرکے غسل کرادیا ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لب گور لائے گئے۔

ہندستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ سب کی حیثیت کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل رہتی ہے۔ کوئی مہمان آیا، چارپائی نکالی گئی۔ اس پر ایک نئی دری بچھادی گئی جس کے تہہ کے نشان ایسے معلوم ہوں گے جیسے کسی چھوٹی سی آراضی کو مینڈوں اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مہمان صاحب معہ اُچکن، ٹوپی، بیگ بغچی کے بیٹھ گئے، اور تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہوگیا کہ مہمان بے وقوف ہے یا میزبان بدنصیب! چارپائی

ہی پر ان کا منہ ہاتھ دُھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چار پائی پر یہ سور ہیں گے۔ سو جانے کے بعد ان پر سے مچھر کبھی اسی طرح اُڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خونچہ پر سے جھاڑ و نما مور چھل سے کھیاں اُڑا رہا ہو۔

چار پائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جائے گا جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی دانے چگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی۔ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیانے پر چار پائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رُخصت جمع ہوئی رہتی ہے اس کو لے کر ملازمت سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح چار پائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال کوٹھری میں داخل کر دیتے ہیں اور اس پر سال بھر کا پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دیہات کے ایک میزبان نے پیاز ہٹا کر اس خاکسار کو ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چار پائی پر اسی کال کوٹھری میں بچھا دیا تھا اور پیاز کو چار پائی کے نیچے اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہو گئے تھے جتنے ساری پیازوں میں چھلکے تھے اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے۔

فراق اور وصال، بیماری و تندرستی، تصنیف و تالیف، سرقہ اور شاعری سب سے چار پائی ہی پر نپٹتے ہیں۔ بچے، بوڑھے اور مریض اس کو بطور پاخانہ غسل خانہ کام میں لاتے ہیں۔ کبھی ادوان کشادہ کر دی گئی، کبھی بنا ہوا حصہ کاٹ دیا گیا اور کام بن گیا۔ پختہ فرش پر گھسیٹیے تو معلوم ہو کوئی ملٹری ٹینک مہم پر جا رہا ہے یا بجلی کا تڑا قا ہو رہا ہے۔ کھٹملوں سے نجات پانے کے لیے جو ترکیبیں کی جاتی ہیں اور جس جس آسن میں چار پائی نظر آتی ہے یا جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے ان پر غور کر لیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندستانی یوگ کا تخیل ہندوستانیوں نے چار پائی ہی سے لیا ہے۔

دو چار پائیاں اس طور پر کھڑی کر دیں کہ ان کے پائے آمنے سامنے ہو گئے، ان پر ایک کمبل، دری یا چادر ڈال دی، کمرہ تیار ہو گیا۔ گھر میں بچوں کو اس طرح حجرہ بنانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہاں وہ ان تمام باتوں کی مشق کرتے ہیں جو ماں باپ کو کرتے دیکھتے ہیں۔ ایٹن اور ہیرو انگلستان کے دو مشہور پبلک اسکول ہیں۔ ان کے کھیل کے میدان کے بارے میں کہا جاتا

ہے کہ واٹرلو کی جنگ یہیں جیتی گئی تھی۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ہندوستان کی ساری مہم ہم ہندستانی چارپائی کے اسی گھروندے میں سر کر چکے ہوتے ہیں۔

برسات کی سڑی گرمی پڑ رہی ہو، کسی گھریلو تقریب میں آپ دیکھیں گے کہ محلّہ نہیں سارے قصبہ کی عورتیں خواہ وہ کسی سائز، عمر، مزاج یا مصرف کی ہوں، رونق افروز ہیں اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر عورت کی گود میں دوایک بچے اور زبان پر پانچ سات کلماتِ خیر ضرور ہوں گے۔ کتنی زیادہ عورتیں کتنی کم جگہ میں آ جاتی ہیں، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا جب تک کہ چارپائی کے بعد کسی یکہ اور تانگہ پر ان کو سفر کرتے نہ دیکھ چکا ہو۔ یہ اللہ کی مصلحت اور ایجاد کرنے والے کی پیش بینی ہے کہ ہانکنے والے اور گھوڑے دونوں کی پشت سواریوں کی طرف ہوتی ہے۔ اگر کہیں یہ سواریوں کو دیکھتے ہوتے تو یقیناً غش کھا کر گر پڑتے۔

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے۔ تکیہ کے نیچے ہر قسم کی گولیاں جن کے استعمال سے آپ کے سوا اور کوئی واقف نہیں ہوتا۔ ایک آدھ روپیہ، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، دستاویز کے کچھ مسودے، یہ سب چارپائی میں آباد ملیں گے۔ میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چارپائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو اُجالا ہو یا اندھیرا اس صحت کے ساتھ آنکھیں بند کر کے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔

حکومت بھی چارپائی ہی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دھرتا چارپائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور ہر گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا میں ہاتھ، پاؤں، زبان کے علاوہ ڈنڈا، جوتا، تاملوٹ بھی ہیں جنھیں اکثر پھینک کر مارتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ توقف کرنے میں غصہ کا تادّمدّھم نہ پڑ جائے اور ان آلات کو مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

چارپائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانہ سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانچ سات چھوٹے بڑے بچے، اتنی ہی مرغیاں، دوایک کتے، بلی اور بے شمار کھیاں آ پہنچیں۔

سب اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ صاحب خانہ صدر دستر خوان ہیں۔ ایک بچہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر تیسرا کم کھانے پر چوتھا زیادہ کھانے پر اور بقیہ اس پر کہ ان کو کھیاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکھی اُڑاتی جاتی ہے اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا، شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھو کر فکرِ سخن میں چار پائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے جیسے گھر میں آگ لگی اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے، بیوی بچے بدن دبانے اور بددعائیں سننے لگے۔

کوئی چیز خواہ کسی قسم کی ہو کہیں گم ہوئی ہو، ہندستانی اس کی تلاش کی ابتدا چار پائی سے کرتا ہے۔ اس میں ہاتھی، سوئی، بیوی، بچے، موزے، مرغی چور کسی کی تخصیص نہیں۔ رات میں کھٹکا ہوا اس نے چار پائی کے نیچے نظر ڈالی، خطرہ بڑھا تو چار پائی کے نیچے پناہ لی۔ زندگی کی شاید ہی کوئی ایسی سرگرمی ہو جو چار پائی یا اس کے آس پاس نہ انجام پاتی ہو۔

چار پائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی مانند ڈھیلی ڈھالی شکستہ حال و بے سروسامان لیکن ہندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمراں کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لیے آمادہ۔ کوچ اور صوفے کے دل دادہ اور ڈرائنگ روم کے اسیر اس راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چار پائی پر میسّر آتی ہے! شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں۔ مثلاً بچے دوست، شرافت، فراغت اور گوشۂ چمن، ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے عیش و فراغت کی فہرست اس سے مختصر ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چار پائی ان تمام لوازم کو پورا کر سکتی ہے۔

بانوں کی ٹوٹی ہوئی چار پائی ہے جسے مکا کے کھیت میں بطور مچان باندھ دیا گیا ہے۔ ہر طرف جھومتے لہلہاتے کھیت ہیں۔ بارش نے گرد و پیش کو شگفتہ و شاداب کر دیا ہے، دور دور جھیلیں جھمکتی، جھلکتی نظر آتی ہیں جن میں طرح طرح کے آبی جانور اپنی اپنی بولیوں سے برسات کی عمل داری اور مزے داری کا اعلان کرتے ہیں۔

مچان پر بیٹھا ہوا کسان کھیت کی رکھوالی کر رہا ہے، اس کے یہاں نہ آسائش ہے نہ آرائش، نہ عشق و عاشقی، نہ علم و فضل، نہ دولت و اقتدار، لیکن یہ سب چار پائی پر بیٹھے ہوئے اسی کسان کی محنت کا کرشمہ ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب اس کی پیداوار کو چور مہاجن یا زمین دار لوٹ لیں گے اور اسی چار پائی پر اس کو سانپ ڈس لے گا اور قصہ پاک ہو جائے گا۔

برسات ہی کا موسم ہے۔ گاؤں میں آموں کا باغ، کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔ کوئل کوکتی ہے، ہوا ٹھکتی ہے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں دھوم مچا رہی ہیں۔ کہیں کوئی پکا ہوا آم ڈال سے ٹوٹ کر گرتا ہے، سب کے سب جھپٹتے ہیں۔ جس کو مل گیا وہ ہیرو بن گیا جس کو نہ ملا اس پر سب نے ٹھٹھے لگائے۔ یہ لڑکے لڑکیاں جو اس وقت کسی طرح قابلِ التفات نظر نہیں آتیں کسے معلوم آگے چل کر زمانہ اور زندگی کی کن نیرنگیوں کو اُجاگر کریں گے، کتنے فاقے کریں گے، کتنے فاتح بنیں گے، کتنے نام ور اور نیک نام، کتنے گمنام و نافرجام اور یہ خاکسار ایک کھری چار پائی پر اس باغ میں آرام فرما رہا ہے۔ چار پائی باغبان کی ہے، باغ کسی اور کا ہے۔ لڑکے لڑکیاں گاؤں کی ہیں۔ میرے حصے کا صرف آم ہے۔ ایسے میں جو کچھ دماغ میں نہ آئے تھوڑا ہے۔ یا جو تھوڑا دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے تو کیسا تعجب!

پھر عالمِ تصوّر میں ایسی کائنات تعمیر کرنے لگتا ہوں جو صرف میرے لیے ہے جو میرے ہی اشارے پر بنتی بگڑتی ہے۔ مجھے خالق کا درجہ حاصل ہے، اپنے مخلوق ہونے کا وہم بھی نہیں گزرتا، نہ اس کا خیال کہ زمانہ کسے کہتے ہیں نہ اس کی پروا کہ زندگی کیا ہے، دوسروں کو ان کا امیر دیکھ کر چونک پڑتا ہوں۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ میں ان لوگوں سے اور خود زمانہ اور زندگی سے علاحدہ بھی ہوں۔ کچھ دیر کے لیے اونگھنے لگتا ہوں۔ ممکن ہے اونگھنے میں پہلے سے مبتلا ہوں۔

(1۔ الناظر، لکھنؤ۔ جون جولائی 1921، 2۔ نیرنگِ خیال، لاہور۔ سالنامہ 1929)

●●●

پاسبان

پنشن اور پاسبان نے غالب کی زندگی تلخ کردی تھی اور غالب کے پرستاروں نے ہماری۔ ایک صاحب فرماتے ہیں، غالب قوی شاعر تھے، دوسرے کہتے ہیں حیوانِ ظریف تھے۔ تیسرے کا قول ہے مُلہمِ غیب تھے۔ چوتھے کا فیصلہ ہے فلسفی تھے۔ پانچویں کا کہنا ہے سہل تھے! ممتحن پوچھتا ہے کیا تھے، طلبا جواب دیتے ہیں:

شامتِ اعمالِ ما صورتِ غالب گرفت [1]

خود غالب کی شامت پاسبان تھے جیسا کہ خود کہتے ہیں:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بایں ہمہ غالب شاعری کو نہیں سپہ گری کو ذریعۂ عزت سمجھتے تھے۔ شاعری کی تکمیل کے لیے ممکن ہے پانچویں پشت تک کی مدت کافی ہو، سپہ گری البتہ غالب سے آخری پشت میں نبھ نہ سکی۔ فرماتے ہیں: دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا!

بات یہ ہے کہ میں غالب نہ ہونے کے باوجود پاسبان کے سامنے اپنے آپ کو گدا سا محسوس کرنے لگتا ہوں لیکن اس کے قدم لینے کی غلطی کبھی نہیں کی۔ آپ کسی شے، شخص یا موقع کا

---

1 اصل: 'صورت اعمال ما در گرفت'

تصور نہیں کر سکتے جو پاسبان سے خالی ہو۔ اس بیان پر ایک منطقی نے گرفت کی۔ فرمایا دو چیزیں یک جا ایک وقت میں کیسے موجود ہو سکتی ہیں۔ عرض کیا کیوں نہیں، جیسے علم اور حماقت۔ فرمایا، کیسے۔ میں نے کہا جیسے بعض منطقی! اتنے میں ایک بزرگ بول اُٹھے انجام کچھ بھی ہو ہندوستان کو پولیس یا پاسبان سے نجات نہیں۔ منطقی نے کہا یہ بحث غیر متعلق ہے۔ ہندوستان کی نجات میں پولیس کا دخل کیسا! ایک خاں صاحب شطرنج کھیل رہے تھے، بولتے: ''برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔'' یہ کہتے ہوئے مہرے کو دبا کر آگے کھسکایا، پھر بولے، ''برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔''

منطقی نے احتجاج کیا۔ خاں صاحب میرا آپ کا رشتہ وطن کا ہے، خون کا نہیں۔ آپ اپنا یہ بیان واپس لیں۔ دوسری طرف حریف شاطر ایک لالہ جی تھے، انھوں نے اپنا مہرا بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا'' اب خاں صاحب کی باری تھی، انھوں نے چال چلتے ہوئے یہی فقرہ دُہرایا۔ لالہ جی نے دوسری چال اور اسی فقرے سے جواب دیا۔ جیسی چال ہوتی یا موقع پڑتا اسی انداز سے دبا کر اُٹھا کر بہ سرعت یا بہ احتیاط تمام مہروں کو نکال دیتے اور اسی لب و لہجہ، جرأت، مسکنت، طنز یا ظرافت کے ساتھ برخوردار والا فقرہ دُہرایا جاتا۔ ایک موقع ایسا آیا جب دونوں کے پیادے رُخ اور فرزیں بننے کے لیے جلد جلد بڑھنے لگے۔ اس تیزی سے پورا فقرہ دُہرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے صرف برخوردار پر اکتفا کر لیا گیا۔ لالہ جی کا فرزیں پہلے بنا۔ خاں صاحب نے فرمایا، برخوردار تم نے بے ایمانی کی۔ لالہ جی نے کہا، برخوردار اور بے ایمان پر تین حرف۔ دونوں نے مزید خانگی رشتے جوڑنے شروع کیے۔ چنانچہ خاں صاحب نے شطرنج کی بساط سے اور لالہ جی نے نارل سے برخوردار کو بدل لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بساط منطقی کے سر پر، چلم کی آگ ہر ایک پر اور پولیس کا سپاہی حاضرین کے وسط میں تھا!

تھوڑی دیر بعد لالہ نے چلم سپاہی کو پیش کی۔ خاں صاحب نے سرپرستانہ بیچ میں خوشامدانہ لہجے میں گفتگو شروع کر دی۔ سپاہی نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو بدبختی یا بدشگونی یا دونوں کے آثار منطقی ہی میں پائے۔ ٹکسالی پوربی زبان اور لہجے میں بولا۔ ''اے کون ہے۔'' (یہ کون ہے) خاں صاحب بولے۔ ''ہم شطرنج کھیل رہے تھے اس نے (منطقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بکواس شروع کر دی۔ بہتیرا سمجھایا بھائی پولیس قریب ہے۔'' جملہ کاٹتے ہوئے منطقی نے کہا۔

''حضرت آپ خانگی رشتے اور سماجی رشتے میں خلط بحث کر رہے ہیں۔'' اس سے قطع نظر نفسِ بحث سے پولیس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ سپاہی غرّا کر بولا۔ ''موکو توای گاندھی کا چیلا جنات ہے تبے نا سرکار اور پولیس کا گریاوت ہے اپوے جھتی ہے ملا دُسرن کا جھت جھت کہت ہے چل کتوالی۔'' اس اردوئے معلّٰی کی ''ہندوستانی'' یہ ہے۔ ''مجھے تو یہ گاندھی کا چیلا جان پڑتا ہے تبھی نہ سرکار اور پولیس کو گلیاتا ہے۔ آپ ہی جھتی ہے مگر دوسروں کو جھت جھت (حضرت) کہتا ہے چل کوتوالی۔'' منطقی ہکابکا کانسٹبل کے ساتھ ہولیا۔

خان صاحب نے کہا، منشی جی کہاں کے لفنگوں کو بلا لیتے ہو۔ بساط بچھاؤ کچھ دال دلیا اور ہو جائے۔ منشی جی بولے، بھئی علم قسم جو ہم نے بلا ہو! حقہ بھرا گیا، بساط بچھائی گئی، ابتدائی پانسات چالوں کے بعد خان صاحب نے پکارا، برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔ لالہ جی نے چال چلنے میں کچھ دیر لگائی معاً کوئی اچھی چال سوجھی، جھرجھری لے کر بولے۔ ''برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔ گھڑی پھر چلنے لگی ٹک ٹک، گھر رگھر ر! ایک دن ''حکام بالادست'' کو سلام کرنے جانا پڑا۔ مجھے یہ شغل بڑا گراں گزرتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے خفیہ اور ان کے پاسبانوں کے علانیہ سلوک سے ڈرتا ہوں۔ یہ ''حاکم لوگ'' غلط اردو میں اظہارِ شفقت یا بے تکلفی فرماتے ہیں اور ان کے نوکر چپراسی صحیح اردو میں بخشش اینٹھتے ہیں، لیکن کیا کرتا شب برات کی تقریب، کپڑے نئے ایسا موقع کب ملتا تھا۔ چنانچہ کوٹھی کے احاطے میں قدم رکھا تھا کہ ایک ڈبلو کالے کتے نے لپک کر ایسے لہجے میں خوش آمدید کہا کہ یہ بات بالکل ذہن سے اُتر گئی کہ نئے کپڑے اور نیا جوتا پہن کر بھاگنا، وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ شیروانی کا دامن شرعی پیجامے کی مہریوں سے مائل بہ اختلاط ہو، خطرے سے خالی نہیں۔ ایسے میں اکثر عمودی رفتار دفعتاً عجیب و غریب افقی حرکات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور فطرت نے ہندوستان کو جیسے عجیب الطرفین چرمی کھدر میں ملبوس کیا ہے وہ کہنی گھٹنے اور ٹھوڑی سے غائب ہو جاتا ہے۔ بقول غالب بہ نسخہ دیگر:

'کہنیاں' فگار اپنی 'گھٹنا' خوں چکاں اپنا!

قصہ مختصر، میں کتوں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا۔ مجبور ہوتا ہوں تو صلح کر لیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے کالے کتے سے بھی کیا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ اس نے دب کر صلح کرنے والے کا

یقین کرلیا۔ واپس آکر ایک عزیز دوست سے کہا، ایک صاحب تمھارا کتا خریدنا چاہتے ہیں۔
آدمی ساتھ کردو خریدار کو دکھلا لاؤں۔ انھوں نے اپنے پہلوان کتے اور مریض نوکر کو ساتھ کردیا۔
اطمینان سے جائے فرار پر واپس آیا۔ دوست نے مجھے دیکھا معلوم نہیں میرے مسکرانے پر وہ
غرائے یا ان کے غرانے پر میں مسکرایا۔ ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ اس وقت ان کا مقابلہ پسر نوح اور
اصحاب کہف دونوں سے تھا۔ انھوں نے جست کر کے معانقہ کرنا چاہا لیکن بجائے اس کے کہ میرا
گلا اور ان کے دندان مبارک ہوتے، خود ان کا ٹینٹوا میرے ساتھی کے منہ میں تھا جو میرے پیچھے
گلزار نسیم بنے کھڑے تھے۔

دانت اس کے تھے گورکن قضا کے
دو نیخنے رہِ عدم کے ناکے

نوکر پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔ میں نے دوستوں کو تخلیے میں ''بحث و تکرار'' اسٹیج کرتے
چھوڑا اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔

یہاں کا نقشہ ہی جدا تھا۔ بیرے خانساماں، بھنگن اور ان کی اولاد پٹاخے چھوڑ رہے
تھے اور ایسا شور مچ رہا تھا کہ کتوں کی آواز بھی ماند پڑ گئی تھی۔ دیکھا کہ کوئی مخاطب نہیں ہوتا تو
پٹاخے اور چھچھوندر کی زد سے بچتا ہوا ان کے قریب آیا۔ ان میں بعض ایسے فربہ تھے کہ گمان ہوتا
تھا کہ شاید ایک نہیں کئی ایک ہوں اور ان کے اطراف میں کئی ہاتھ اور کئی منہ ہوں۔ ایک صاحب
ٹہلتے ہوئے تشریف لائے اور بولے۔ صاحب آرام کر رہے ہیں، دیکھیے شور نہ ہونے پائے۔
دوسرا بولا، حلوا وغیرہ دن چھپے تقسیم ہوگا۔ میں نے کہا، صاحب کی نیند میں تو خلل نہ آئے گا، ممکن
ہے آپ کی آتش بازی کی سرگرمیوں میں مخل ہوا ہوں۔ حلوے والے مسئلے کو پیچ و تاب کھا کر گول
کر گیا۔ کرتا بھی کیا، اس ستم ظریف نے جیب سے پُڑیا نکالی تمبا کو پھانک لی۔ کان پر سے دو انچ
لبی گھسی ہوئی پنسل اُتاری اور میلے ملگجے کاغذ کو سامنے لا کر بولا، نام لکھ جایئے۔ میں نے اس ہدیہ
کو اس طور پر قبول کیا جیسے وائسرائے سپاس نامہ کا خریطہ قبول فرماتے ہیں اور لکھا:

''شب برات میں آتش بازی اس لیے منع کی گئی ہے کہ بزرگوں کی روح
اپنے عزیزوں سے ملنے اور حلوا کھانے آتی ہے تو بغیر حلوا کھائے اور

بشارت دیے واپس جاتی ہے، انشاءاللہ آئندہ سال۔" (بشارت ناتمام)

سنہ 1915 میں علی گڑھ کالج آیا۔ قدم قدم پر انور بے اور سلطان محمد خامس سے سابقہ، چپے چپے پر سلام علیکم سے دوچار۔ پکی بارک کا ایک کمرہ کالج کے پرنسپل ٹول صاحب کا آفس تھا جو تن تنہا داخلے کے سارے کام انجام دیتے تھے۔ باہر دروازے پر اُمیدواروں کا ماگھ میلا لگا ہوا تھا۔ برسات کی اُمس، آٹھ بجے سے دن کے دو بج گئے۔ بھوک پیاس سے بدحواس پسینے میں شرابور، باریابی ہوئی۔ شکل سے یوں ہی 'اردو ڈل' معلوم ہورہا تھا۔ ٹول صاحب کی گول گول آنکھیں اور نصف بریدہ اُنگلی دیکھ کر کلکٹر صاحب یاد آگئے۔ فرمایا، کہاں سے آرہے ہو۔ بولا، کچی بارک سے۔ ٹول صاحب کا مطلب تھا وطن کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا، پکی بارک میں رہنا چاہتا ہوں۔ ٹول صاحب مسکرائے، وہ مسکراہٹ جس کے بارے میں کسی کو کبھی کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ عتاب کا پیش خیمہ تھا یا التفات کا نتیجہ!

داخلے کا صرف ایک فارم تھا۔ اسی پر سارے اندراجات کردیے گئے۔ وہاں سے ٹول صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ بابو رفیع اللہ خاں (شاہ جہاں پوری) کے پاس پہنچا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی 'محدث دہلوی' یا پینشنر تحصیل دار کا سامنا ہو۔ آنکھ اور عینک کے درمیان تقریباً چار اُنگل کا فاصلہ، پیشانی پر جھرّیاں، چند ساعت میرے سراپا اور سج دھج کا جائزہ لیا، اس کے بعد پان کی پیک کو منہ میں تولتے ہوئے ڈپٹ کر بولے۔ لہجہ سے معلوم ہوتا تھا عراق عرب میں افواج برطانیہ کے ساتھ رہ چکے ہیں۔ تمھارے باپ کا کیا نام ہے، کہاں کے رہنے والے ہو، کیا کاروبار ہے، جونپور کی امرتیاں لائے ہو۔ اب یقین ہوگیا کہ گورنمنٹ کے ملازم رہ چکے ہیں۔ غرض گلوخلاصی ہوئی، پکی بارک آیا 'نورٌ علیٰ نور'!

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے — زمیں جس کی چہارم آسماں ہے [1]

پکی بارک (گل منزل) وہ مقام ہے جس کے بارے میں بہت کہا اور لکھا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کردینا مقصود ہے کہ اس عہد کی طالب علمانہ زندگی میں کھانے پینے، اُٹھنے

---

1. ایم۔اے۔او کالج کے دور کا ایک ہاسٹل جس پر کھپریل کی چھت تھی۔ (دیکھئے گل منزل، شمولہ آپ بیتی، کلیات رشید احمد صدیقی، جلد اوّل) آتش لکھنوی

بیٹھنے، پہننے اوڑھنے، نماز روزہ، کھیل کود، ہنسی مذاق سبھی پر پاسبان مسلط تھے۔ کہنے کو تو آج بھی نہ آستانوں کی کمی ہے نہ پاسبانوں کی، لیکن یہ فرق ضرور ہے کہ اس زمانے میں پاسبان خارج ہی نہ تھے ان کا احساس ہمارے دلوں میں بھی موجود تھا۔ ان پاسبانوں کی ایسی کڑی گرفت تھی کہ خودسری اور بے راہ روی کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے تھے۔

ایک بار دور دراز کا سفر کرنا پڑا۔ پیسے کم سفر طویل۔ اس فکر میں ہوا کہ سفر کس طرح مختصر کیا جائے یا اخراجات کے پے در پے کی کیا سبیل ہو۔ دونوں میں سے ایک بھی نہ کر پایا۔ عادت یہ ہے کہ کام شروع کر دینے کے بعد اس کا پروگرام بناتا ہوں، اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اکثر کام پورا ہو جاتا ہے اور پروگرام بنانے کی زحمت نہیں اُٹھانی پڑتی۔

سفر شروع ہوا۔ راستے میں ایک درگاہ پڑتی تھی، زیارت کے لیے اُتر پڑا۔ اسباب سرائے میں رکھ کر درگاہ پہنچا۔ جو توقعات بن دیکھے قائم کی تھیں ان میں مایوسی ہوئی اور وہاں کے پاسبانوں کو دیکھ کر جان و مال کا اتنا نہیں تو آبرو جانے کا اندیشہ ضرور ہوا۔ لمبی چوڑی عمارت گندگی، گداگر، تنومند ترش رو مجاور ہر طرف کہنگی اور زوال کے آثار۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ خیال آیا قوالی سے کام لوں، لیکن کالج کی تالی اور مزار کی تالی میں بڑا فرق تھا، اور اس فرق کو خادموں اور مجاوروں نے محسوس کر لیا تو یہاں کوئی ایسا تو ہے نہیں جو اس کا قائل ہو کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بج سکتی ہے۔ ممکن ہے یہاں تالی کا پر چہ ترکیب استعمال کچھ اور ہی ہو مثلاً ایک ہی ہاتھ سے بجائی جاتی ہو، لیکن قوالی کی ایک چیز آتی ہے یعنی 'اہے وائے!'

چنانچہ کچھ سوچتا کچھ گنگناتا بہت کچھ ڈرتا ہوا داخلِ عمارت ہوا۔ پاسبان نے ایسی پاٹ دار آواز میں للکارا کہ ساری عمارت گونج گئی اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''قدمِ درویشاں ردّ بلا'' پھر نہایت لجاجت سے فیس داخلہ طلب کی۔ بات سمجھ میں نہ آئی اس لیے کہ میرے قدم ردّ بلا تھے تو اس کی فیس کیسی اور کسی دوسرے کے تھے تو اس کا اعلان مجھے دیکھ کر کیوں! پھر سوچنے لگا کہ ممکن ہے شکل کے اعتبار سے میں درویش ہوں قدم کے اعتبار سے یہ لوگ یا کوئی اور بزرگ ردّ بلا ہو۔ عرض کیا جناب پیسے ہوتے تو وطن ہی کیوں چھوڑتا۔ اس اُمید پر حاضر ہوا ہوں کہ حضرت کے فیض سے کچھ پیسے مل جائیں گے۔

فرمایا، آپ بڑے آدمی ہیں، اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ عرض کیا یہ آپ کا حسن ظن ہے، لیکن رائے صحیح نہیں قائم فرمائی۔ میں مفلس عیال دار ہوں، اسی اعتبار سے مقروض اور مریض بھی۔ کہنے لگے بجا، لیکن جب تک کچھ خیر خیرات نہ کیجیے گا حضرت کی خوشنودی کیوں کر حاصل ہوگی۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ دبی زبان سے عرض کیا، جناب یہ مزار شریف ہے یا امپیریل بینک! پاسبان نے کچھ اس طرح گھور کر دیکھا کہ مارے خوف کے دل سینے میں اور چونی جیب میں لرزنے لگی۔ چونی دربان کی خدمت میں پیش کی اور اپے وائے کہتا ہوا چار سورماؤں کی حفاظت یا حراست میں آگے بڑھا۔ ایک مقام پر طائفہ کھڑا ہوگیا۔ حکم ہوا حضرت نے یہاں وضو کیا تھا۔ اکنی رکھ دو۔ اکنی کے ساتھ ایک بزرگ بھی تخفیف میں آگئے۔ دوسری منزل پر بتایا گیا کہ حضرت نے یہاں چلّہ کھینچا تھا۔ آٹھ آنے نذر کے پیش کرو۔ وہ بھی پیش کر دیے۔ ایک صاحب اور کم ہوئے۔ ایک مقام پر پہنچے ارشاد ہوا، بارہ آنے رکھ دو حضور نے یہاں دعا مانگی تھی۔ تم بھی دعا مانگ لو۔ پوچھا کیا آپ بتا سکتے ہیں حضور نے کیا دعا مانگی تھی۔ کہنے لگے، یہی مانگی ہوگی کہ خدا مسلمانوں کو جملہ آفات وبلیات سے محفوظ رکھے۔ میں نے کہا، اپے وا ہے۔ وہ دعا کب مقبول ہوئی کہ میں بھی مانگوں۔ اس پر دوست بہت برہم ہوئے اور کچھ تعجب نہ ہوتا اگر نقضِ امن کی نوبت آجاتی۔ میں نے مطلوبہ رقم ان کے ہاتھ پر رکھ دی جس کا کرشمہ یہ تھا کہ ان کا ولولہ، جہاد، مزاج شریف اور دعائے لطیف پر ختم ہوگیا۔

پوچھنے لگے، حضرت کا آنا کہاں سے ہوا۔ عرض کیا ٹمبکٹو سے۔ فرمایا وہاں مزارات ہیں؟ کہا، جہاں کہیں مسلمان ہوں گے، مزارات بھی ہوں گے۔ پوچھا، متولی اور سجادہ نشین کون ہیں۔ کہا، فی الحال تو یہ خاکسار ہی ہے اور اس وقت مزارات کے مسائل پر تحقیقات کرنے ہندوستان آیا ہے۔ پوچھا، اوقاف کی آمدنی کیسی ہے؟ جواب دیا، کافی سے زائد ہے۔ کہنے لگے اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔ یہاں کی حالت تو نہایت زار ہے متولی صاحب پر ایک عورت اور ایک انگریز کا بڑا اثر ہے۔ مزار شریف کی آمدنی انھیں پر صَرف ہوتی ہے۔ ہم خدام تو بس اسی روکھی پھیکی پر بسر کرتے ہیں، جو آپ لوگوں سے مل جاتی ہے۔ عرض کیا، کیا کیجیے گا انگریز اور عورت سے کسے اور کہاں مفر ہے۔

ایک دوسرے خادم کے ہمراہ آگے بڑھا اور ایک کھڑکی کے قریب پہنچا۔ ساتھی نے کہا، ایک روپیہ نذر کیجیے اور اس کھڑکی میں منہ ڈال کر دعا مانگیے قبول ہوگی۔ عرض کیا، یہ ایک روپیہ حاضر ہے۔ دعا مانگنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کہنے لگے، نہیں جناب یہ یہاں کا دستور ہے، آپ مزار شریف کی توہین کررہے ہیں۔ میں نے کہا، یہ بات نہیں ہے۔ حواس پر قابو نہیں، اُلٹی سیدھی دعا مانگ گیا تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے، دعا مانگنی پڑے گی۔ اس آستانے سے کوئی محروم نہیں گیا۔ مجبوراً کھڑا ہوگیا۔ رفیق نے للکارا دعا مانگو اور ہم سے کیا پردہ بآواز بلند مانگو۔ عرض کیا، اس سے ممکن ہے صاحب مزار کے آرام میں خلل پڑے۔ فرمایا، اس کا خیال نہ کرو، ہم سنبھال لیں گے۔ میں نے دعا مانگی۔

''اے برگزیدہ روح دعا فرمایئے کہ اس گنہ گار اور بد بخت کو آج سے پھر کسی مزار یا مجاور سے سابقہ نہ پڑے۔''

یاد نہیں آتا کہ کھڑکی کے اندر سے خود گردن باہر نکالی یا اس کے لیے اپنے رفیق کا احسان مند ہونا پڑا۔ اے ہے وائے کرتا مزار شریف سے تنہا باہر آیا۔ بعض فقرا اور مساکین نے ہمدردی کرنا چاہی لیکن آخری کرم فرمانے وہیں سے للکارا، ''خبردار وہابی ہے!'' سرائے پہنچا تو مسلمان غائب، اے ہے وائے!

تجسس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اس کی عادت۔ ان کا سدّراہ نہ پردہ ہے نہ پیالو۔ اسے یہ فکر نہیں کہ مرد روپیہ کیسے کماتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ خرچ کہاں یا کیوں کرتا ہے۔ اس کا خرچ کرنے کا تصوّر وہی ہے جو آئی۔ سی۔ ایس کا برطانوی اقتدار کا ہے۔ یعنی ہر وہ فعل جو آئی۔ سی۔ ایس کا ہو برطانوی اقتدار میں معین اور ہر وہ فعل جو کسی ہندستانی سے عمل میں آئے، برطانوی اقتدار کے منافی ہے! وہ مرد کے مخلص دوست کو اپنے نکمے رشتے دار سے فروتر سمجھتی ہے اور مسلسل جتاتی رہے گی کہ آپ سے شادی کرنے میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور بے سود قربانی کی ہے۔ ثبوت میں یہ کہے گی کہ فلاں بیوی کے ہاں بندر اور بھالو پلے ہوئے ہیں اس کو میتر نہیں۔ اس کی زندگی ایک مسلسل تفتیش تذبذب اور بدگمانی ہے۔ جس طرح حکومتیں اور تاجر دن رات اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کسی اور حکومت کا رسوخ یا کسی دوسرے کی مصنوعات کی

مانگ تو نہیں بڑھ رہی ہے، اسی طرح عورتیں فکر میں مبتلا رہتی ہیں کہ کسی دوسری عورت کو تو نہیں فروغ ہو رہا ہے۔ عورت نے آج تک نہ اپنی غلطی تسلیم کی نہ اپنی شکست! عورتوں کا دشمن عورتوں سے زیادہ کوئی نہیں۔ اس لیے کہ ہر عورت دوسری کو اپنا ازلی حریف سمجھتی ہے!

عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم، ہر ادب اور ہر زمانے میں مقبول رہا ہے۔ جیل خانہ، ہسپتال، پاگل خانے، شہادت، وصیت نامے، بے قید نظمیں سب میں اسی کی جلوہ گری ملتی ہے!

مئی کا مہینہ دن کے ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ دھوپ، گرمی، گرد اور لو کا زور ہے۔ یونیورسٹی کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تھا۔ یہاں بھی دو چار موٹی سوری قسم کے مسائل درپیش تھے۔ اتنے میں باہر ہنگامہ بلند ہوا۔ ملازم نے اطلاع دی کہ ایک صاحب تشریف لائے ہیں جن کی لمبی داڑھی ہے اور ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ روکے نہ جاتے تو گھر میں گھس آتے۔ پانی مانگ رہے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ اس اطلاع اور آمد سے جو کوفت ہوئی اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ ارادہ کر کے نکلا کہ کورٹ کے ممبر یا ان کے اقربا میں سے کوئی نہ ہوا تو ع

من و گرز و میدان و افراسیاب!

دیکھتا کیا ہوں صحن کے وسط میں دھواں دھار داڑھی اور جریب زیتونی (بہ شکل لاٹھی چارج) سمیت حاجی بلغ العلا[1] (محمد فاروق صاحب ایم۔ ایس سی علیگ) کھڑے سگریٹ سلگا رہے ہیں۔ فرمایا، 26 لاکھ گنے بیل ڈالے گئے، چار لاکھ کی شکر تیار ہوگئی۔ عرض کیا حاجی صاحب کھانا کھانے جا رہا تھا فرمایا۔ "کلوا و اشربوا و لا تقنطوا۔"

کہنے لگے، برخوردار کو جانتے ہو۔ ایک دن عورت اور محبت کا مسئلہ چھیڑ کر کہنے لگے! ابا آپ بوڑھے ہو گئے لیکن نئے سر سے دنیا جوان ہو رہی ہے، اسلام کا نظریۂ نکاح مشتبہ ہے۔ اتنا بیان دے کر حاجی صاحب نے داڑھی کو اس طرح تکان دی کہ ایک ایک بال باہمہ و بے ہمہ ہو گیا۔ پیشانی پر شکنیں پڑنی شروع ہوئیں تو کرۂ سر کے خطِ استوا پر جا کر ختم ہوئیں اور آنکھیں فردوسی کا شاہنامہ بن گئیں۔ میں نے کہا، صاحب زادے کے کہنے پر نہ جائیے۔ انھوں نے

1 مجنوں گورکھپوری کے والد کا نام۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے رشید صاحب کا مضمون 'فاروق دیوانہ'

خیالات و جذبات کی تشکیل و تہذیب میں کتابوں کے مطالعہ سے زیادہ کام لیا ہے، زندگی کے واقعات اور مشاہدات کو اہمیت نہیں دی ہے۔ ان سے سابقہ پڑے گا تو جان لیں گے کہ کتابی باتیں زندگی کے نت نئے تقاضوں کا ساتھ دور تک نہیں دے سکتیں۔

حاجی صاحب پر میرے اس خطبہ صدارت کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ اُکتا کر بولے، کھڑکی کھولو اور اقبال (میرا بڑا لڑکا) کو بلاؤ۔ لونڈا مجھ کو بلفول ابا کہتا ہے۔ عرض کیا حاجی صاحب کن مصیبتوں سے کمرے میں بند کر آیا ہوں، دھوپ میں کہاں بلاؤں، لو لگ گئی تو بڑی پریشانی ہوگی۔ بولے، تو میرے لڑکے پر کیوں اعتراض کرتا ہے۔ اسے بھی بچپن میں لو سے بچایا گیا اب ذرا سی گرمی میں تلے اوپر ہونے لگتا ہے۔ میں نے پوچھا، حاجی صاحب اعتراض کیا تھا۔ فرمایا دیکھو مسخرے کو، کہتا ہے اگر مرد کو چار عورتیں روا ہیں تو عورتوں کو چار مرد کیوں نہیں۔ محبت کا انجام شادی ہے، اس لیے ہندستانی طریقہ شادی ناقص ہے۔ کیوں کہ یہاں محبت شروع ہونے سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے!

میں نے کہا، حاجی صاحب بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔ ایک جگہ گاڑی اٹک گئی ہے، صاحب زادے کو کیا جواب دیا تھا بتا دیجیے تو میں اسے سرقہ کی زد یا الزام سے بچا کر اپنے مطلب کا بنالوں۔ فرمایا، یہ کیوں کر۔ عرض کیا آرٹ یا ریسرچ کے بہانے! یعنی کسی نے کہا کہ عریاں یا فحش ہے تو کہہ دوں گا آرٹ ہے اور مہمل یا سرقہ بتایا تو عرض کروں گا کہ ریسرچ میں ایسا ہی ہوتا ہے!

حاجی صاحب ڈنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر گنگنانے لگے۔ حاجی صاحب کا داد دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ فرمایا، اجی وہی حماقت کی بات تھی، یعنی چار نکاح، محبت کا آغاز و انجام، عورت کا انتقام وغیرہ۔ عرض کیا ذرا تفصیل سے سنا دیجیے تو کرم ہوگا۔ فرمایا، کہتا تھا عورت چار نکاح کیوں نہ کرے۔ میں نے جواب دیا اور تم بھی سن لو۔ تمھاری کتنی اولاد ہے میں نے کہا۔

زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت![1]

---

1 زمین چھ ہوگئی اور آسمان آٹھ ہوگیا۔

فرمایا یہ قطعۂ ولادت ہے یا مصرع طرح۔ میں نے کہا دونوں۔ فرمایا، بیویاں کتنی ہیں۔ میں نے کہا، حاجی صاحب ذرا زبان سنبھال کر۔ حاجی صاحب نے صرف داڑھی سنبھال کر کہا، اگر چار بیویاں ہوتیں تو چوبیس گھنٹے اولاد ہوتی یا نہیں، میں نے کہا۔ تو پھر کہنے لگے، عورت چار نہیں چوبیس نکاح کرلے اولاد تو ایک ہی ہوگی۔ اس لیے نسل کی بقا یا افزائش کے لیے تم ہی بتاؤ مسئلہ کے کس رُخ کو زیادہ اہمیت دینا چاہیے۔ میں نے کہا، حاجی صاحب بات تو نامعقول کہی ہے لیکن چوں کہ گھاگ ہو اس لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا، مگر شادی کا مقصد تو الدو تناسل ہی تو نہیں ہے، محبت بھی تو کوئی چیز ہے۔ فرمایا، مسخرے بھی ہولونڈے بھی، محبت کا انجام شادی نہیں ہے یہ محبت کا سطحی تصور ہے۔ محبت کی ابتدا شادی کے بعد ہوتی ہے اور یہ برگزیدگی کا تصور ہے۔

میں نے کہا، اور پاسبان۔ فرمایا، اب وقت ضائع مت کرو، ابھی مجھے ایک اور جگہ جانا ہے۔ شکر سازی کی ایک مشین ایجاد کی ہے کسی ماہر سے مل کر حساب لگانا ہے کہ شیرہ اور شکر کا تناسب کیا ہونا چاہیے اور کیا شیرہ کا عنصر حذف کیا جاسکتا ہے۔ تم جاکر آرام کرو۔ میں نے کہا، حاجی صاحب گرمی کی شدت، بچوں کی چیخ پکار، ادھر اُدھر کی مکروہات، آرام کب لینے دیں گے۔ کہنے لگے، بیوی پاسبان ہے تو امن وامان ہے۔ بھاگ جاؤ!

علی میگزین میں اس مضمون کی دو قسطیں جا چکی ہیں۔ چاہتا ہوں کہ یہ آخری ہو۔ یاد نہیں اس سے پہلے کیا لکھ چکا ہوں۔ اس سلسلے میں نیل کنٹھ مہادیو کا بھی ذکر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں معلوم کہ نیل کنٹھ مہادیو ہیں یا مہادیو، نیل کنٹھ۔

ان کا حلیہ کچھ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ پاسبانوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ سنتے ہیں کہ خالقِ موجودات کو نیل کنٹھ مہادیو کو پیدا کرنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ کام دیو نابالغ بھی تھے، نابینا بھی۔ چنانچہ ان پر نیل کنٹھ مہادیو کا پہرہ مقرر کردیا گیا۔ کچھ عرصہ تک مہادیو کا بڑا دور دورہ رہا جیسا کہ نابالغ رؤسا کے منیجر یا مزارات کے متولیوں کا رہتا ہے۔ لیکن نابالغ اور نابینا کی پاسبانی یا پاسداری ہر وقت نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ کام دیو اور نیل کنٹھ مہادیو میں اختلافات پیدا ہونے لگے۔ عشق اور عقل نے 'تیشۂ فرہاد' اور 'فتنۂ پرویز' کی صورت اختیار کی۔ عشق کو عقل کی

پاسبانی کا شکوہ اور عقل کو عشق کی بے راہ روی کا گلہ قریب تھا کہ فریقین ہندو مسلم قسم کی حرکت کرنے پر آمادہ ہوں کہ راؤنڈ ٹیبل کا مصرعہ ذہن میں آگیا۔ ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ایک شاعر، ایک فلسفی اور ایک مولوی کا انتخاب کیا گیا۔ اخراجاتِ سفر ہندوستان پر ڈالے گئے اور یہ اصحابِ ثلاثہ عالمِ بالا کے سفر پر روانہ ہوئے۔

حجابات طے ہونے لگے، شاعر بے فکر، فلسفی متحیر، مولوی خائف و خفیف! یہاں تک کہ وہ منزل آئی جہاں راہبر نے بتایا کہ قیام کیا جائے گا۔ معزز مہمان تھے جائے اقامت کا انتخاب بھی انھیں کو دیا گیا۔ مولوی نے جنت کا رُخ کیا۔ فلسفی نے کہا، جب تک ہر جائے قیام کا کچھ حال نہ معلوم ہو مقام کا انتخاب کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔ مولوی نے کہا، جنت سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ فلسفی نے کہا، یہ تو ظاہر ہے لیکن جہاں صرف تمھارے ہی جیسے لوگوں سے سابقہ ہو، اسے جنت کیوں کہیے، جامع مسجد یا درگاہ کیوں نہیں۔ دوزخ اس لیے نہیں جانا چاہتا کہ دنیا میں ہمیشہ اس کی دھمکی دیتے رہے، جنت میں حوروں سے کہوگے کہ دیکھو فلسفی کو جہنم رسید کر دیا! میں برزخ میں قیام کروں گا، اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں مولوی اور ملحد دونوں سے نجات ہو!

اب شاعر کی باری تھی۔ راہبر نے پوچھا، آپ کا کیا ارادہ ہے۔ شاعر بولا، جنت پر تو مولوی نے قبضہ کرلیا۔ برزخ فلسفی کے حصہ میں آیا، مجھے جہنم لے چلو۔ اس میں شک نہیں کہ مولوی اور فلسفی کے نکل جانے سے اب دنیا بھی رہنے کے قابل جگہ ہوگئی ہے، لیکن یہ بھی دیکھنا ہے کہ جہنم اور دنیا دونوں میں کون قابلِ ترجیح ہے۔ دوسرے یہ کہ جس کے مہمان آئے ہیں، اس نے جائے قیام کے انتخاب کا اختیار دے دیا ہے تو یقین ہے کہ جنت دوزخ اور برزخ سب یکساں ہوں گی۔

جائے قیام پر پہنچ کر شاعر نے محسوس کیا کہ جگہ تو خاصی ہے، بدمذاقوں نے بدنام کر رکھا ہے، نور تپش بھی کچھ ہے۔ چنانچہ ایک فضا اپنے لیے منتخب کرلی۔ مالک نے پوچھا، کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ شاعر نے جواب دیا، تمھاری تو بڑی تعریف سنتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ تمھارے عقل ہے نہ ایمان۔ مردِ خدا، ضرورت تو جنتیوں کو ہوتی ہے، حور و قصور، کوثر و سلسبیل کی۔

ہم کوکسی چیز کی ضرورت ہوتی تو یہاں کیوں آتے۔ضرورت حاجت مندوں اور سائلوں کو ہوتی ہے۔ ہماری ضرورت خود اُن کو ہے جنھوں نے بےضرورت کسی چیز کو نہیں پیدا کیا۔ مجھ کو میری حالت پر چھوڑ دیجیے۔ مالک نے کہا، تم عجیب آدمی ہو نہ دوزخ سے خائف نہ بہشت کے خواہش مند! شاعر نے کہا، تم عجیب تر فرشتہ ہو کہ چون و چرا بھی کرتے ہو، بارگاہِ کبریا سے اتنے قریب ہوکر اس کی مصلحتوں سے اتنے نا آشنا ہو! جنت اور دوزخ کی حاجت ہم کو ہے یا ان کو؟ سزا اور جزا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مظلوم نہ سمجھنے پائے۔ یہ باتیں تمھاری سمجھ میں نہ آئیں گی۔ ہو سکے تو کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ دنیا تک چلے چلو، وہاں یہ باتیں خود بخود تم پر منکشف ہو جائیں گی۔

مالک نے پوچھا، آخر آپ آئے کیوں ہیں۔شاعر نے کہا کہ تم نے پھر بے تکا سوال کیا۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے تم پر فضل کیا اور تلاش و تجسّس کا مادہ بھی ودیعت کر دیا۔ پوچھتے ہو کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انسان نے دنیا میں رہ کر آخرت کے وجود کا ثبوت دے دیا۔لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اس میں تمھاری دوزخ یا بہشت کو بھی دخل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوزخ اور بہشت کی موجودگی نے انسانیت کی تکمیل میں بڑی رُکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں۔

مالک نے کہا، کیا تمھارا جنت، دوزخ یا ملائکہ پر ایمان نہیں ہے۔شاعر نے جواب دیا کہ یہ سوال تم کو قبر میں مُردوں سے کرنا چاہیے۔ میں نہ مردہ ہوں، نہ قبر میں۔ جس طرح تم کو فرشتہ مان لینے کے بعد تمھارے سوالات پر درگزر کیا جا سکتا ہے، اسی طرح خدا کو خدا مان لینے کے بعد جنت دوزخ کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔خدا کا مقصد نہ جنت، دوزخ ہے نہ ہم نہ تم، وہ خود مقصد ہے۔ مالک نے کہا، تمھاری باتیں کچھ عجیب سی ہیں۔اچھا اب آرام کرو، اس سلسلے کو پھر کبھی چھیڑیں گے۔ شاعر نے کہا، تمھارے یہاں آرام کہاں، یہاں کی یکسانیت تو مجھے پاگل بنا دے گی۔

شاعر کے دل میں آیا کہ دیکھوں دونوں ساتھی کہاں اور کس حال میں ہیں۔ پہلے مولوی سے ملا۔ پوچھا، کیسی گزر رہی جنت میں! کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے؟ کہنے لگے، تکلیف تو کوئی نہیں، لیکن کبھی کبھی کسی چیز کا بہت اچھا اور بہت زیادہ ہونا بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

شاعر نے کہا، تم کو معلوم ہے ہم لوگ کیوں اور کس حیثیت سے آئے ہیں۔ گفت و شنید کے لیے تم کہاں تک تیار ہو۔ مولوی نے کہا، یوں تو تم جانتے ہو بحث مباحثہ ہمارا دلچسپ مشغلہ رہا ہے، لیکن یہاں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ جگہ بحث مباحثہ کے بجائے عیش و نشاط کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ شاعر مولوی سے رُخصت ہو کر فلسفی کے ہاں پہنچا۔ قبل اس کے کہ شاعر کوئی سوال کرتا، فلسفی نے کہا۔ دیکھو تم ذرا جلد باز ہو۔ یہاں بھی جلد بازی نہ کرنا، میں سوچتا ہوں کہ:

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے![1]

صرف الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ کبھی کبھی شاعر کی نارسائی فلسفہ کے دامن میں پناہ لیتی ہے۔ شاعر نے جواب دیا، لیکن ایک صورت وہ بھی تو ہوتی ہے جب فلسفہ شاعری کی آڑ پکڑنا چاہتا ہے اور فلسفہ اور شاعری دونوں صداقت کے علَم بردار ہونے کے متمنی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف فلسفہ اور شاعری دونوں سے صداقت بیزار ہوتی ہے۔ فلسفی نے کہا صداقت کوئی میراث نہیں ہے جو کسی ایک ہی شخص یا جماعت یا فن کے حصے میں آئی ہو۔ شاعر نے جواب دیا، یہ صحیح ہے لیکن اشخاص، جماعت یا فن اس کے محتاج ضرور ہیں۔ مگر ہم دونوں یہاں فلسفہ اور شاعری کا الیکشن لڑانے نہیں آئے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ تم دنیا میں بھی برزخ ہی میں رہے اور یہاں بھی تم نے اس کا انتخاب کیا، اس لیے مجھے اُمید کم ہے کہ اب تک کسی نتیجے پر پہنچ سکے ہو گے۔

فلسفی نے کہا، اگر عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے تو پھر قطعیت کیسی اور کہاں۔ شاعر نے جواب دیا، فلسفہ کی گمرہی کو آپ شاعری کی محرومی سمجھتے ہیں۔ فلسفی بولا، گمرہی اور محرومی پر آخرت میں بحث کرنا کوئی مفید مشغلہ نہیں ہے۔ شاعر نے جواب دیا، لیکن اس کے دلچسپ ہونے میں کیا کلام ہے۔ تم الفاظ کی گرفت کر کے حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہو۔ حقیقت صرف ایک ہے

1۔ غالب کا شعر ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

الفاظ اور فلسفیوں کی تعداد بے شمار بحث حقیقت سے کرنا پڑے گی۔ یہاں جس سے سابقہ ہے اس نے صرف حقیقت کی ذمہ داری لی ہے۔ الفاظ کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک حد تک ہماری نارسائیوں کے مظہر ہیں۔

فلسفی نے جواب دیا، دیکھو جلد بازی کا میں ہمیشہ مخالف رہا ہوں اور اس سے زیادہ قطعیت کا۔ اگر تم کو ان پر اصرار ہے تو مولوی سے رجوع کرو۔ شاعر نے کہا، مولوی تو جنت پہنچ گیا، اس نے حقیقت کو ہمیشہ جنت سے تعبیر کیا۔ اس لیے اس کی پرواز ختم ہو چکی ہے۔ اس کا عشق اور اس کی عقل دونوں اس سے اور وہ ان دونوں سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ تم قطعیت سے گریز کرتے ہو۔ چنانچہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں تم دونوں کو تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔

شاعر نے جہنم پہنچ کر مالک سے پوچھا، اگر مصالح کے خلاف نہ ہو تو میں شیطان سے مل لوں، دنیا میں وہ آخرت کے پیچھے بدنام رہا۔ اب دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخرت میں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ مالک نے کہا اپنی ذمہ داری پر مل سکتے ہو۔

ملاقات ہوئی۔ شیطان نے کہا، خوب آئے، اچھا کیا کہ فلسفی اور مولوی کو ساتھ نہ رکھا ورنہ جہنم کی ساری معنویت ختم ہو جاتی۔ تمہارا وفد دنیا کی ایک گتھی سلجھانے آیا ہے یعنی عقل اور عشق کی پاسبانی یا کارفرمائی۔ شاعر نے کہا، مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا لوگوں نے بنا رکھا ہے۔ شیطان نے کہا، ٹھیک ہے لیکن اتنا معمولی بھی نہیں ہے جتنا شعرا نے سمجھ رکھا ہے۔ شاعر بولا، عشق کو تسلیم کرنے کے بعد عقل پر غور کرنا فضول ہے۔ شیطان نے جواب دیا، اس قسم کے فقرے لوگ وضع یا استعمال کرتے ہیں جو حقائق کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتے۔ انسان اپنی نارسائی کو چھپانے کے لیے فقروں کی آڑ پکڑتا ہے، اسے خود فریبی بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں کسی ایسی چیز کا قائل نہیں جس کا فیصلہ مفاہمت سے ہو۔ تم عشق اور آخرت کے قائل ہو میں عقل اور دنیا کو اہم سمجھتا ہوں۔ تم کو یہ نہیں معلوم کہ تم ہم سے جتنے بیزار ہو، اس سے زیادہ خدا ہم کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہے۔ تم ہم کو دشمن سمجھتے ہو، اس لیے کہ خدا کے بیوقوف دوست ہو اور میں اس لیے اسے عزیز ہوں کہ اس کا عقل مند دشمن ہوں۔ تمھارے جذباتی ہونے پر تم سے ہمدردی کر سکتا ہوں، لیکن تمھارا قائل نہیں ہو سکتا۔ عشق عبودیت ہے اور عبودیت پر فخر کرنے والے کمزور ہوتے ہیں یا سادہ لوح عقل اصل

ہے۔ مشیت نے اس کی تقسیم میں احتیاط ملحوظ رکھی ہے اور یہ زیادہ مقدار میں تقسیم کی جاتی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ ذہن میں ہزاروں طرح کے خیال آتے ہیں لیکن ہر خیال کا تحمل ہر ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا بارگراں ہے جو بجائے خود اپنا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس بار اس نے جہاں تم پر گرانی کی تم نے آڑ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص آلام کو ''غرقِ مے ناب'' کرنے پر آمادہ ہو جائے، جس کا اعتراف غالب نے کیا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

غالب کی پہلی کمزوری تو یہ تھی کہ انھوں نے نشاط کو بُرا کہا۔ نشاط بُری چیز نہیں ہے بلکہ نشاط سے مغلوب یا اس کا محتاج ہونا بزدلی اور کم مائیگی ہے۔ دوسری غلطی کا اعتراف انھوں نے یوں کیا ہے کہ وہ شراب میں پناہ لینا نشاط کی ذمہ داری سے زیادہ سہل سمجھتے ہیں۔ شاعر نے کہا، لیکن شیطنت بھی اسی کو کہتے ہیں۔ شیطان بولا، کہنے کو جو چاہے کہہ لو آخر انسان ہو اور شاعر بھی۔ شاعری اگر تمھارے خیال سے حسن اور حقیقت کے اظہار کا نام ہے تو میرے خیال میں شیطنت تکمیلِ حسن ہے۔ گو میرا خیال ہے کہ بیش تر اردو شعرا حسن اور حقیقت کو ایک سمجھنے کی استعداد بھی نہیں رکھتے۔ شاعری کو مذہب کیوں بنا رکھا ہے، شیطنت شجرِ ممنوعہ اور ارضِ ممنوعہ کی قائل نہیں۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ عشق سے زیادہ حسین کوئی اور تصور نہیں ہوسکتا۔ تم نے انسان اور اس کرۂ ارض کو سب سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ یہ عشق اور عبودیت کی محرومی و کوتاہی ہے۔ تمھارا عشق ایک حالت یا ایک نظریہ ہے۔ میری عقل مزاج ہے اور اصول، لیکن تم غیر ذمہ دار ہو اور اپنی ہر غیر ذمہ داری کو اس طور پر سراہتے ہو گویا وہ تکمیلِ اصول کے مختلف مراتب یا زینے ہیں۔ تم کو نہیں معلوم کہ شیطان ہر چیز کا قائل ہے الا غیر ذمہ داری۔ اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ غیر ذمہ داری قول سے متعلق ہو یا فعل سے، کمزوروں اور بے وقوفوں کی آخری جائے پناہ ہے۔

شاعر نے کہا، تم واقعی شیطان نکلے۔ شیطان بولا، اگر تم نے حقیقت کا اظہار یا اقرار کیا ہے تو میں خوش ہوں، لیکن اگر اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا ہے کہ میری توہین ہو اور

تمھارے انسان ہونے کے پندار کو تقویت پہنچے تو میں تم سے ہمدردی کرتا ہوں۔ تمھاری سادہ لوحی یہ ہے کہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہو۔ اشرف المخلوقات ہونا کوئی فخر کی بات نہیں۔ مخلوق ہونا ہی کون سا شرف ہے جس پر آپ 'اشرف' کا اضافہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ایک چیز اشرف موجودات بھی ہے۔ شاعر بولا، مثلاً خدا۔ شیطان نے جھنجھلا کر جو جلد سے جلد غلط نتیجہ پر پہنچتا ہو، جو چیز سمجھ میں نہ آئی اسے خدا کہہ دیا جس سے خفا ہوئے اسے شیطان قرار دے دیا۔ ان ہی کے پھیر میں تم نے اپنی عقل اور دوسروں کی عافیت کھوئی، اپنی حماقت پر غور کرو کہ عقل و عشق کے مسائل سمجھنے یا طے کرنے کے لیے دنیا چھوڑ کر یہاں آئے۔ زمین کا قضیہ زمین ہی پر طے کیا جاتا ہے۔ عقل اور عشق سمجھنے کی چیزیں ہیں یا برتنے کی؟ شاعر بولا، تم نے بحث اشرف موجودات کی اُٹھائی تھی، اسے پہلے طے کرلو۔ شیطان نے کہا، اشرف موجودات کا تصور اس شخص کے ذہن سے بالاتر ہے جو شیطان کے تصور کا تحمل نہیں کر سکتا!

شاعر نے ہنس کر کہا، گویا اشرف کا مفہوم شیطان کی ذات سے بھی وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ شیطان بولا، تم کو ہنسنے کا حق نہیں کیوں کہ ہنستے ہنستے رونے بھی لگتے ہو۔ مجھے دیکھو آج تک ہنسا نہیں! میں سمجھتا ہوں کہ جب کائنات میں سب ہنس چکیں گے، اس کے بعد میں سوچوں گا کہ میرے ہنسنے کا وقت آیا یا نہیں!

شاعر کچھ عرصہ تک دم بخود رہا۔ پھر بولا، گتھی سلجھنے لگی ہے لیکن انجام واضح نظر نہیں آتا۔ شیطان نے کہا، تم تو جہاں سے چلے تھے پھر وہیں پہنچ گئے۔ کیسی گتھی کہاں کا انجام۔ تم انسان بھی عجیب شے ہو اور کیوں نہ ہو جس نے قرن ہا قرن اَن دیکھی ہستی پر ایمان رکھا ہو، وہ ایک لحظہ میں اس سارے طلسم کو کیوں کر سمجھ سکتا ہے۔ تم اس کے منتظر رہتے ہو کہ تائید ایزدی ہو جائے اور گھر بیٹھے سب کچھ مل جائے جو شخص مانگنے کا خوگر رہا وہ حقیقت کو کب پا سکا ہے۔ جسم و جان کی درماندگی کا نام تم نے عشق رکھ لیا ہے۔

شاعر بولا، اس دور میں جب ہر کس و ناکس کے قول و فعل پر سے محاسبہ اُٹھا لیا گیا ہے، کس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ انسان تائید ایزدی کا منتظر رہتا ہے۔ شیطان بولا، جو خدا اور مذہب کا

نہیں قائل وہ شیطان اور شیطنت کا کب قائل ہوگا! خدا اور مذہب کا انسان قائل نہ ہو، نہ سہی۔ شیطان اور شیطنت کا پرستار ہو، یہ بھی نہ سہی لیکن پرستش سے وہ باز نہیں آتا۔ وہ خداوند تراشتا رہتا ہے۔ جس چیز کو وہ آزادی مقال کہتا ہے وہ صرف ایک حیلہ ہے۔ پہلے لوگ خدا اور مذہب کے نام پر ظلم اور حماقت کے مرتکب ہوتے تھے اب آزادی اور آرٹ کا نام لے کر ظلم اور حماقت کرتے ہیں۔ پہلے گمراہ تھے اب راہ زن ہیں!

شاعر نے کہا، تم شاعر ہوتے تو میں تم پر ایمان لاتا۔

شیطان نے کہا، اور تم شیطان ہوتے تو میں تم پر فرشتہ ہوتا۔ شاعر نے کہا، اچھا شاعری اور شیطنت دونوں داخلِ دفتر۔ یہ تو بتاؤ، تمھارا ایمان کس پر ہے۔ شیطان اس سوال کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ خاموش و غمگین ہوگیا اور ایک طرف کو چل دیا! وفد جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس آیا۔

شاعر نے دنیا میں پہنچ کر ایک مصرع موزوں کیا:

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے![1]

(علی گڑھ میگزین۔ جولائی 1933)

●●●

---

1 پورا شعر اس طرح ہے:

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے
غالب

ارہر کا کھیت

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائیڈ پارک کو لندن میں ہے۔ دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور دوسرے حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائیڈ پارک کی خوش فعلیاں آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔ ارہر کے کھیت کی خوش فعلیاں اکثر واٹرلو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا، لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ سے پہلے یہ مہم سر کر چکی ہیں۔ یہ دیہاتوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانیوں کو اسمبلی یا کونسل میں، دونوں بولتے ہیں، ضد کرتے ہیں، جھگڑتے ہیں، روتے بسورتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جن سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ارکان حکومت وہ کرتے ہیں جس سے وہ خود فائدہ اُٹھاتے ہیں، دوسرے نقصان۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں پھیلنے لگتا ہے، کتے بھونکنے لگتے ہیں، کسان اور ان کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں۔ دونوں کے ذہن میں ایک ہی بات ہے۔ یعنی گھر پہنچ کر کھانا ملے گا، سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے۔ کسان کی بیوی اس کے بچے بچیاں

اور اس کا بوسیدہ جھونپڑا کسان کے لیے اتنے ہی عزیز اور کارآمد ہوتے ہیں، جتنے خود مویشی کے لیے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، اس لیے زندگی کی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو، روشن خیال میاں بیویوں سے زیادہ جری اور پُر اُمید رہتا ہے۔

گاؤں کے قریب کنویں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے۔ ایک طرف گڑھا ہے جس میں کھاد جمع ہے، دوسری طرف ببول کا پرانا کھوکھلا درخت ہے جیسے کوئی کہن سال تمغہ یافتہ فوجی۔ جس پر دو ایک شب بیدار بزرگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوتے ہیں جیسے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر یورپ کے سورما شاخِ زرّیں پر بیٹھے ہوئے گردوپیش اور نزدیک و دور قبضہ جمانے کی فکر میں ہوں۔ عورتوں کی کچھ تعداد جمع ہوئی، تھوڑی دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں کنویں کی جگت پر تھیں، پاؤں لٹکاتے ہوئے گنگناتی ہنستی بوڑھیوں کو برہمی و بیزاری کی دعوت دیتی ہوئی کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی کراہ رہی تھیں۔ کبھی گالیاں دیتیں، کبھی کھانسنے لگتیں۔ ایک ٹولی اور آ پہنچی اور سب ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگیں۔ جسم کو تولتے ہوئے نوجوان لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار، وہ کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا موسم، پاس کے لڑکا لڑکی یا خوش خرام نوجوان عورتوں کو گالیاں دینے لگتا۔ چلتے چلتے قافلہ ایک تاریک ناقابلِ عبور فصیل کے سامنے رُک گیا یہ دیہاتی بلجیم کے قلعے تھے۔

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے ہم چورن یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیراتِ ہند کا آغاز ہوتا ہے اور حفظانِ صحت کے طرح طرح کے جراثیم کا انکشاف ہوتا ہے۔ کچھ منچلے یا مظلوم پہلے سے پہنچ چکے ہیں اور کسی سے وعدۂ دید کے مزید کا قول و قرار ہے۔ وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے اور کسی کا گدھا کھو گیا ہے، وہ بھی بھٹکتا ہوا آ پہنچا ہے۔ یہ ارہر کے کھیت کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا

خود گدھا کسی محبوب کے پہلو میں، کبھی یورپ میں ماسکوریڈ (جشنِ نقاب پوشی) منایا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس کا سماں اکثر ارہر کے کھیت میں نظر آ جاتا ہے۔

جوانی کھونے کے ہندوستان میں دو بڑے جانے پہچانے مقام تھے۔ شہر کی گلیاں اور ارہر کے کھیت! اب ان میں یونیورسٹیوں اور کارخانوں کا بھی اضافہ کرلیا گیا ہے۔ یہاں کے نکھٹے یا راندہ و درماندہ یا تو شفا خانے پہنچتے ہیں یا جیل خانے! ہسپتال سے زندگی اور جیل خانے سے موت گھبراتی ہے۔ شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان۔ مانا کہ مرچ اور تمباکو صحت کے لیے مضر ہیں لیکن تندرستی کا مصرف تندرستی کو ہر قیمت پر قائم رکھنا ہی نہیں ہے۔ اس سے لطف اُٹھانا بھی ہے۔ شباب میں بڑھاپے کا لطف، اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں، اُٹھانا ممکن ہے لیکن بڑھاپے میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالاتِ منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود انتظار 'دشمن ایمان و آگہی' یا 'رہزن تمکین و ہوش' ہے اور ہمیشہ عقل سے شرمسار ہونے پر اصرار ہے۔ دوسری طرف پیری ہے جو عقل ہی نہیں ہر حواس سے شرمسار رہتی ہے!

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولے سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے۔ کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا۔

کسان سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں، اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت کی کارفرمائی ہے اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے، لیکن عورت، دیہات کا آدمی، عورت کو مایۂ عزّت سمجھتا ہے، شہری وسیلۂ تفریح، دیہاتی کے نزدیک عورت کا تصوّر یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جہاں وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور فشارِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تازہ دم ہوکر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک اجنبی تقاضہ ہے یا ایک وسیلۂ تفنن، جس کے لیے اس نے چوپائی اور اپالو تعمیر کرلیا ہے۔ کسان پناہ اور آرام چاہتا ہے، شہری عیاشی و ہوس ناکی

کے در پے رہتا ہے۔ گاؤں میں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری عورت کا طالب رہتا ہے لیکن محبت کے لیے نہیں لذت کے لیے!

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے۔ کونسل اور اسمبلی کا تصور یہیں سے لیا گیا ہے۔ گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ یہاں معرضِ بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہورہی ہے۔ داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکمنیا کے بچے کیوں نہیں پیدا ہوتے اور سنکھیا کے حمل کیسے ٹھیرا۔ ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہوگی۔ دوسری بولی پہلوٹھی کی بچھیا ہوچکی ہے اب کے بچھوا ہوگا۔ اس پر اختلاف آرا ہوا اور ہمارے لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ دراصل کس شغل میں مصروف تھیں اور اب کیا ہورہا تھا۔ ایک غوغا بلند ہوا، بھگدڑ مچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے مرد عورت، بچے، گیدڑ، کتے، لومڑی، بن بلاؤ نکلنے بھاگنے لگے۔ جیسے اسمبلی میں بم گرا ہو!

ایک روز مقررہ وقت سے نصف گھنٹہ پہلے کلاس پہنچ گیا۔ معلّم کی حیثیت سے کلاس میں تنہا پایا جانا، پانے والوں کے لیے بڑی دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ جیسے کسی غیر متوقع مقام پر کسی نادرالوجود جانور کا ڈھانچہ مل جانا۔ ایسی صورت میں ہر اُس گزر جانے والے کو مخاطب کرنا اور اس سے اظہارِ برتری کرنا ضروری ہوجاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئت کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتا سامنے سے گزرا اور ہم نے اس طرح اسے للکارا اور آمادۂ 'نقضِ امن' ہوئے گویا اردو پڑھانے کے علاوہ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے دفعیہ کے لیے تھانہ دار بنادیا تھا۔ پھر ایک بہشتی سامنے آگیا۔ ہم نے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا کیوں، اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو آنے جانے میں بڑی آسانی ہوگئی ہوگی؟ اس نے نہایت انکسار اور تشکرانہ انداز میں ہامی بھری۔ ابھی یہ تکلفات ختم نہیں ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا دکھائی دیا۔ بولا میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے۔ دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہوگیا۔ (خوانچہ کے اندر جو سر پر رکھا ہوا تھا کچھ ٹٹولتے ہوئے) خدا آپ کو سلامت رکھے یہ لیجیے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ یونیورسٹی نے معلمین کے لیے

کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا ضروری قرار دیا ہے۔ اتنے میں ایک طرف سے حاجی بلغ العلا اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ ؎

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے [1]

حاجی صاحب کا عربی نام "بلغ العلےٰ" اور فارسی "جریب زیتونی" ہے۔ کچھ لوگ "سابق دیوانہ ہمدرد" حال ابوالجنون" کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "خشت الجزایہ" پر زور لگاتے ہوئے ان دنوں "قانون مسعودی" کا ترجمہ کر رہے ہیں۔

ملتے ہی فرمانے لگے جلدی سناؤ جلدی۔ میں نے کہا کیا! فرمایا کوئی اچھا سا شعر۔ میں نے کہا مثلاً:

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی!

گردن ہلا کر "بہ جلوہ ریزیٔ کملی" و "بہ پرفشانی ریش سکوتِ سخن شناس" کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کوئی موضوع بتایئے تو مضمون لکھوں۔ فرمایا!

"ارہر کا کھیت"

دریافت کیا کروں کیوں جناب! اس شعر کا یہ معاوضہ، سخن فہمی کی داد دیتا ہوں، کملی کو حاجی صاحب نے جناب "کراماً" کے سر سے اُٹھا کر "کاتبین" پر ڈال دیا (میں نے سہولت کی خاطر ان "تسمہ پا" بزرگوں کے نام علاحدہ کر دیے ہیں) اگر کوئی صاحب ان کے نام ونشان، حسب ونسب وطن اور مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ اُمید ہے کہ نیاز صاحب باب الاستفسار کے 'جن' نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ فرمایا، نواب صاحب کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا، نواب مزمل اللہ خاں صاحب کو یہ شعر سنایئے گا۔ کہنے لگے نہیں جی وائس چانسلر صاحب، نواب مسعود یار جنگ صاحب بہادر۔ میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو پھر یہ سنایئے گا۔

---

1 ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے غالب

ترا کہ زور بہ بازوئے تیغ زن باقیست
بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقیست [1]

فرمایا یہ کیا، میں نے کہا اس لیے کہ

من آں علم و ہنر را با پر کا ہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را!

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ اُکتا کر، کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا ارے میاں یہ سب تو ہوا، کلاس میں بیٹھ کر تمھارا لکچر سنوں گا۔ میں نے کہا اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا۔ فرمایا، السلام علیکم!

مطبوعہ:

1۔ نگار لکھنؤ، دسمبر 1929

2۔ نقوش، لاہور (طنز و مزاح نمبر) شمارہ: 70، 1971 جنوری۔فروری 1972

●●●

---

1 اے میرے محبوب اگر اب بھی تیرے بازوئے تیغ زن میں حوصلہ باقی ہے تو تلوار اُٹھا کہ ابھی تیرے عاشق میں دار و رسن کی حسرت باقی ہے۔

گواہ

''گواہ قربِ قیامت کی دلیل ہے۔'' عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں وہ گواہ ہے۔ عدالت مختصر نمونۂ قیامت ہے اور قیامت وسیع پیانہ پر نمونۂ عدالت۔ فرق یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ فرشتے جو ہمارے اعمال لکھتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

عدالت کو قیامت اور قیامت کو عدالت کی جو حیثیت حاصل ہے، وہ گواہ کے دم سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے آرٹ کو عورت سے ہے، گواہ عینی ہو یا سماعی، روایتی ہو یا پیشہ ور ہر حال میں گواہ ہے۔ اس لیے ہر حال میں خطرناک، گواہ جھوٹا ہو یا سچا عدالت کے لیے اس کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا برطانوی اقتدار کے لیے ہندوستان کی دولت اور ہندستانیوں کی عبادت!

غالبؔ نے انسان کو محشرِ خیال قرار دیا ہے۔ ممکن ہے اس کے اسباب میں وہ گواہ بھی ہوں جن کے بیان پر غالبؔ کو اپنے عہدِ شاعری کا کچھ زمانہ جیل خانہ میں گزارنا پڑا تھا! گواہ کے تصوّر کے ساتھ ہمارے ذہن سے کتنے حالات وحوادث گزر جاتے ہیں۔ گاؤں، تھانہ، بے آبروئی، کچہری، جیل خانہ، جن کے مجموعے کا نام باغیوں نے ہندوستان اور وفاشعاروں نے حکومت رکھا ہے۔

اُصول یہ رکھا گیا ہے کہ ہر انسان پیدائشی جھوٹا اور ہر گواہ اصولاً سچا، واقعہ کچھ ہو جب تک کوئی گواہ نہ ہو، اس کا عدم یا وجود یکساں ہے۔ باعتبار واقعہ ممکن ہے کسی حادثہ کا گواہ نہ ہو لیکن

جس طرح فطرت خلا محض سے متنفر ہے اسی طور پر ضابطہ فوج داری سے متعلق جتنے واقعات ہو سکتے ہیں ان کو بھی تنہائی محض سے بیر ہے۔ جس طرح ہر خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوا یا اس کے بعض متعلقات دوڑ پڑتے ہیں اسی طرح ہر موقع واردات پر پولیس اور اس کے گواہوں کا پہنچ جانا لازمی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ واردات سے پہلے گواہ پہنچ گئے، جیسے کبھی کبھی پولیس واردات کے بعد جائے وقوع پر پہنچنا بہتر سمجھتی ہے۔ قومی تنزل کی مانند گواہ بھی ہر جگہ ملتا ہے۔ اگر قومی تنزل کے انکشاف کے لیے ایک لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے تو گواہ پیدا کرنے کے لیے کسی تھانے دار یا وکیل کا ہونا ضروری ہے۔

بعض مولوی وعظ کہنے سے پہلے "کلوا واشربوا" کی خوش آئند توقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اسی طرح ایک تھانے دار یا وکیل کسی واقعہ یا حادثے کی تفتیش شروع کرنے سے پہلے گواہ کے ملنے یا نہ ملنے کے امکان پر غور کرتا ہے اور ان کے لیے گواہ پیدا کر لینا اکثر اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنا بعضوں کے لیے اولاد پیدا کرنا۔ اولاد کی پرورش یا نگہ داشت کی مانند گواہ کا نباہ اور رکھ رکھاؤ بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ کھانا، پینا، لباس، تعلیم و تربیت دونوں کے لیے لازمی ہے۔ حادثے کی اہمیت تمام تر گواہ پر منحصر ہے۔ ایک گواہ قتلِ عمد کو حفاظتِ خود اختیاری میں اسی آسانی سے تبدیل کرا سکتا ہے جیسے کوئی تنقید نگار بے حیائی کو آرٹ میں۔ ضرورت اس کی ہے کہ مدعی ذی حیثیت ہو اور حاکمِ عدالت خطابات کا متمنی اور نوروز یا ملک معظم کی سال گرہ کا منتظر۔

پہلی عالمی جنگ میں دولِ متحارب کا مقولہ تھا کہ آدمی اور سامانِ جنگ فراہم کردو ہم دشمن کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ جیسے یہ کوئی بہت بڑا راز تھا جس کا انکشاف کیا گیا تھا۔ ان کے پیش رو ایک بزرگ ارشمیدس نامی گزرے ہیں ان کا کہنا یہ تھا کہ فلکرم مل جائے تو میں زمین کا تختہ اُلٹ دوں۔ لیکن ان دونوں کے مقسوم علیہ اعظم پولیس والوں کا دعویٰ ہے کہ گواہ فراہم کردو تو ہندوستان میں نہ ہم کو کین فروش رہنے دیں گے نہ تان کو آپریٹر۔ ہر بلندی پر یونین جیک ہوگا اور ہر پستی پر سلام علیک!

کسی بات کے حسن و قبح کا مدار زیادہ تر اسی عہد کے اربابِ اقتدار کی پسند یا ناپسند پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی مانند مقتدر شخص کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ شاید اس لیے کہ اس پر جرم

ثابت کرنے کے لیے گواہ نہیں مل سکتے! ایسا ممکن بھی ہوا تو پھر اس کو جرم کا مرتکب نہیں آرٹ اور کلچر کا مفسر یا محسن قرار دیں گے۔ پولیس کا کسی کو چالان کر دینا ہی ثبوت جرم کے لیے کافی ہے۔ ہندستانی عدالت پولیس اور اس کے گواہوں کو وہی اہمیت دیتی ہے جو ہندستانی عوام ملاؤں اور سیانوں کو دیتے ہیں۔ یعنی دونوں معصوم بھی ہیں، برگزیدہ بھی۔

ہر یورپین پیدائشی فاتح ہے اور ہر ہندستانی سرکاری گواہ یا اقراری ملزم۔ اس طرح کے گواہ اس مصنف کی مانند ہوتے ہیں جو نازیبا خیالات وجذبات کا اظہار کرتا ہے لیکن اس بنا پر قابلِ مواخذہ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ لائقِ تحسین سمجھا جاتا ہے کہ اس نے حقیقت کی ترجمانی کی یا ہندوستان اور ہندستانیوں کی توہین! سرکاری گواہ کے بارے میں تو آپ جانتے ہوں گے کہ اکثر وہ ایسا مجرم ہوتا ہے، جس کے بیان پر دوسرے سزا پاتے ہیں اور خود وہ رہائی پاتا ہے!

جس طرح ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے صرف ایک قوم بنائی گئی ہے اسی طرح گواہ بننے کی صلاحیت ایک طبقے میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ یعنی پٹواری جس کو گاؤں کا غیر متشدد آمر (ڈکٹیٹر) کہنا بجا ہوگا۔ انگریز کیک کھاتا ہے اور غراتا ہے۔ پٹواری گالی کھاتا ہے نذرانے لیتا ہے اور جو چاہتا ہے درج رجسٹر کرتا رہتا ہے۔ اس کو گاؤں میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو وکیلوں کو عدالت یا کلرکوں کو دفتر میں ہوتی ہے یعنی یہ سب جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ جو چاہیں وہ ان کو ملتا رہے!

گواہ کی حیثیت سے پٹواری کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ مثل صحیح ہے کہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ پٹواری کی توہین نہیں کی جاسکتی۔ پٹواری اس راز سے خوب واقف ہے۔ اس کے بعد قومی لیڈر ہی اب تک جان سکا ہے کہ جب تک حلوا مانڈہ ملتا رہے، توہین اور توقیر بے معنی الفاظ ہیں۔ جس طرح ہندستانی کے لیے شادی اور فاقہ کشی ناگزیر ہے، پٹواری کے لیے گواہ بننا مقدر ہے۔ اس لیے وہ اپنے میلے بستے کے بہی کھاتوں میں ایسے اندراجات کرتا رہتا ہے، ''جو بوقتِ ضرورت کام آویں'' صوفیانہ کلام یا سیاسی دستاویزات کی مانند اس کے اندراجات ایسے ہوتے ہیں کہ جو چاہے جس طرح تعبیر کرے مواخذے سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور مواخذے میں آ بھی سکتا ہے!

لالہ چرونجی لال گاؤں کے پٹواری اور گنگادین ایک غریب کسان تھا۔ ایک مقدمے میں گنگادین کو لالہ جی کی گواہی کی ضرورت پیش آئی۔ گنگادین کی ساری پونجی ایک گراپڑا جھونپڑا تھا جس کی پردہ پوشی کاشی پھل اور کدو کی ہری ہری بیل، ان کے زرد اور سفید پھول اور صبح شام کی سنہری کرنیں تھیں۔ ایک طرف اُپلوں کا منڈپ تھا، دوسری سمت کھاد اور کوڑے کرکٹ کا گڈھا۔ چھپّر کے پیچھے کھیت تھا اور سامنے ساگ پات کی کچھ کیاریاں۔ زمین دار کسانوں پر اتنا ہی جری تھا جتنا لالہ چرونجی لال سے خائف۔ گنگادین کے پاس کچھ مویشیاں بھی تھے جس میں گائے، بیل، بھیڑ، بکری کے ساتھ اس کی بیوی بچے بھی شامل تھے۔

ہندستانی کسانوں کو دیکھتے ہوئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے بال بچے مویشیاں ہیں یا مویشیاں اس کے بال بچے۔ جب سے مقدمہ شروع ہوا تھا ساری معاش وملکیت لالہ جی کے لیے وقف تھی۔ دودھ، دہی، ترکاری ان کی رسوئی میں جاتی گنگادین چلم بھرتا تھا اس کی بیوی للائن کی خدمت گار تھی۔ لڑکے لڑکیاں لالہ جی کے بچّوں کو کھلاتے بہلاتے۔ یوں تو ہر پٹواری عدالت کا کیڑا ہوتا ہے جب تک وہ عدالت کی زیارت نہ کرلے، اس کی زندگی بے کیف ومعنی رہتی ہے لیکن جب سے گنگوا کا مقدمہ شروع ہوا تھا لالہ جی نے عدالت کا ذکر وفکر کم کر دیا تھا۔ گنگوا جب کبھی اس معاملہ کو چھیڑتا تو کہتے بھائی دن بُرے ہیں۔ تھانہ عدالت سے دور ہی رہنا اچھا۔ پتا جی کا حال تو جانتے ہو سچی بات پر جیل خانہ کاٹنا پڑا، کوئی سسرا کام نہ آیا۔ گنگادین لالہ کے پاؤں پکڑ لیتا گڑگڑانا شروع کرتا اور جلد جلد ان کے پاؤں دبانے لگتا تو لالہ جی پاؤں ڈھیلے رکھتے لیکن زبان سے ہائیں ہائیں کہتے جس طور پر ڈاکٹر یا وکیل فیس کے لیے جیب ڈھیلی کرتا جاتا ہے لیکن زبان سے کہتا رہتا ہے ارے آپ یہ کیا کر رہے ہیں یا اس کی کیا ضرورت تھی۔ لالہ کی نگاہیں گنگوا کی زمین چھپّر اور مویشیوں پر تھیں اور گنگوا کی نظروں میں بیوی بچّوں کی تباہی کا نقشہ پھر رہا تھا۔ بالآخر لالہ کی فتح ہوئی اور گنگوا دستاویزی غلام بنا۔ مقدمہ کی تاریخ آئی اور دونوں کچہری کو روانہ ہوئے۔

کچہری کا راستہ شہر سے گزرتا تھا۔ چلتے چلتے یکا یک لالہ کے قدم سُست پڑنے لگے۔ سامنے جوتے والے کی دُکان تھی۔ لالہ جی کھڑے ہوگئے۔ فرمایا جوتا ٹوٹ گیا ہے، چلنا

پھرنا دوبھر ہے۔ مہنگے سے روز روز شہر آنا نہیں ہوسکتا۔ گنگوا سمجھ گیا۔ اس نے دام ادا کیے لالہ جی نے جوتے قبضے میں کیے۔ دونوں آگے بڑھے، کچھ دور چلے تھے کہ بزاز کی دُکان آ گئی۔ لالہ جی اس طرح رُک گئے جیسے جوتے میں کنکری آ گئی ہو جسے اطمینان سے نکالنا چاہتے ہوں۔ بولے بھائی گنگوا اس پھٹی پرانی پگڑی میں عدالت کے سامنے گئے تو حاکم جلاد ہے کھڑے کھڑے عدالت سے باہر نکلوا دے گا۔ تمھارا کام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ گنگوا گھبرایا کہنے لگا، لالہ دیر ہو رہی ہے عدالت میں پکار ہونے لگی ہوگی۔ ہرج کیا ہے واپسی میں لے لینا۔

لالہ نے تیوری بدل کر کہا اچھی کہی۔ تمھاری کوڑیوں کی خاطر اپنی لاکھ روپے کی آبرو پر پانی پھر جانے دوں۔ جاؤ نہیں جاتے۔ ڈاکٹر گوکل پرشاد سے سار ٹیفکیٹ لکھوا کر داخل کر دیں گے کہ مسمّی لالہ چرونجی لال کو ہیضہ ہو گیا اس لیے حاضر عدالت نہ ہوسکا! گنگوا ہیضے کے امکان پر ابھی اچھی طرح خوش نہیں ہو پایا تھا کہ لالہ جی بزاز کی دُکان کے سامنے تختے پر اس طرح لیٹ گئے جیسے ہیضے میں مبتلا ہو جانے کا اعلان یا انتظار کر رہے ہوں۔ بالآخر پگڑی کا کپڑا خرید لیا گیا!

کچھ اور آگے بڑھے تھے کہ حلوائی کی دُکان سامنے آئی۔ لالہ کچھ اس طرح رُکے جیسے کوئی ضروری بات دفعتاً یاد آ گئی ہو۔ فرمایا گنگادین دیکھو کیسی چوک ہوئی جا رہی تھی درگا جی کی پرشاد لینا بھول گئے! کسان توہم پرست ہوتا ہے جیسے ہم آپ مطلب پرست، ایک طرف اس کی آنکھوں میں پورے کنبہ کی تباہی کا نقشہ پھر گیا دوسری طرف مقدمے کے انجام کا منظر سامنے آیا۔ کچھ نہیں بولا۔ لالہ جی کو سیر بھر جلیبی دلوادی، یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ دونوں کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے۔ گنگوا اس فکر میں مبتلا کہ لالہ کی سخت گیری کا یہی حال رہا تو دوپہر کے چبینے کے لیے بھی پیسے نہ بچیں گے۔ لالہ اس پھیر میں کہ گنگوا کو اور کس طرح نچوڑا جائے۔

معلوم نہیں گنگوا اُمید یا نا اُمیدی کی کس منزل میں تھا۔ لالہ کے ذہن رسا نے جلد ہی کمان و کمیں دونوں متعین کر لیے۔ بولے اس بُرُ دیا نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ مہینے بھر سے گٹھیا کا زور ہے تمھارا پیچ نہ ہوتا تو پرمیشر جانے اس حال میں کبھی گھر دوار نہ چھوڑتا۔ یہ کہتے کہتے ایک سایہ دار درخت کے نیچے انگوچھا بچھا کر لیٹ رہے اور اس چلم کا انتظار کرنے لگے جو ایک خوانچہ

والا پیسے جا رہا تھا۔ خوانچہ والے نے معزز مہمان کی توجہ کو اپنے لڈّو اور مرمروں کی طرف مائل کرانا چاہا۔ بولا لالہ کچھ جل کھادا ہو جائے۔ ایسے نئے کدھر آ نکلے ذرا دم لے لو۔

گنگوا کا یہ حال کہ بس چلتا تو لالہ جی خوانچہ والا اور خوانچہ سب کو پاس کے کنوئیں میں ڈھکیل کر خود بھی کود پڑتا لیکن بے بسی وہ بلا ہے جو ہر طرح کے غم، غصّے اور غرور کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ گنگوا نے کہا لالہ جی ہم پر دَیا کرو سورج دیوتا کہاں آ ئے۔ عدالت کب تک پہنچیں گے لالہ نے کراہ کر بے رُخی سے جواب دیا۔ بھیا اپنے آپ کی سیوا نہ کریں تو کون بھڑ وا بال بچّوں کو دیکھے گا۔ تم عدالت جاؤ ہمار تو پران نکلا جات ہے۔ ارے باپ رے۔

خوانچہ والا بولا، لالہ دھیرج دھرو۔ یہ لو چلم پیو، کچھ کھا پی لو۔ عدالت میں بیان حلفی داخل کر دینا۔ اس دوران میں ایک خالی یکّہ گزرا۔ خوانچہ والا بولا ارے بھائی لالہ جی کا جی اچھا نہیں ہے یکّے میں کیوں نہ بٹھا لیتا۔ یکّہ والا رُک گیا۔ لالہ جی نے کروٹ بدلی۔ خوانچہ والے نے لالہ کو لڈّو اور مرمرے کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے کی دعوت دی، یہ کہتے ہوئے کہ عدالت کا معاملہ ہے معلوم نہیں کب کھانے پینے کی نوبت آئے۔ گنگوا نے چند آنے خوانچہ والے کو نذر کیے، لالہ جی یکّے والے کی دعوت پہلے سے قبول کر چکے تھے۔ ایک کراہتا، دوسرا کوستا دونوں یکّے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

عدالت میں پکار ہوئی۔ لالہ نے پگڑی اور بستہ سنبھالا۔ چپراسی لالہ جی کا آشنا نکلا۔ گردن میں ہاتھ دے کر ایک دشنام زیر لبی کے ساتھ جھونکا دیا تو لالہ جی گواہوں کے کٹہرے میں داخل تھے۔ شام تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ لالہ جی نے موافقت میں گواہی دی نہ مخالفت میں۔ اس دوران میں عدالت، وکلا، فریقین، چپراسی، حاضرین سب نے باری باری لالہ جی کو اپنی اپنی پسند کی گالیاں دیں۔ طرح طرح سے ڈراتے دھمکاتے رہے لیکن لالہ کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی۔

کچہری برخاست ہوئی۔ لالہ باہر نکلے۔ یکّہ والوں کا ہجوم تھا۔ کسی پر ایک سواری تھی وہ دوسری کی فکر میں تھا۔ کسی پر دو تھیں وہ ایک کا متلاشی تھا۔ اس دھر پکڑ میں لالہ وارد ہوئے۔ سر پر نئی پگڑی، پاؤں میں نیا جوتا، ہاتھ میں دن بھر کا سمیٹا ہوا مالِ غنیمت، بغل میں غیر فانی لیکن

ناشدنی بستہ، چاروں طرف سے چابک بدست لنگوٹی بند یکّہ والوں نے گھیر لیا۔ ایک نے بستہ چھین کر اپنے یکّہ پر رکھ لیا۔ دوسرے نے گٹھری اپنے قبضے میں کی۔ تیسرے نے خود لالہ کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا اور کچھ دور تک گھسیٹتا ہوا لے بھی گیا۔ اس رستا خیز میں پگڑی نے سر سے اور جوتے نے پاؤں سے مفارقت کی جن کو دوسرے یکّہ بانوں نے تبرکاً اپنے یکّوں پر رکھ لیا۔ یہ سب آنکھ جھپکاتے ہو گیا۔

اب جو دیکھتے ہیں تو میدان صاف تھا۔ سارے یکّے والے چل دیے تھے اور لالہ جی بیک بینی و دو گوش اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ دنیا کا آئندہ آشوب کون ہوگا۔ یکّہ بان یا پٹواری۔

مطبوعہ:

ساقی، دہلی

1۔ اپریل 1931

2۔ نیرنگ خیال، لاہور، مئی 1930

●●●

شیطان کی آنت

میں اکثر غور کرتا ہوں کہ آخر شعرا درد گردہ میں کیوں نہیں مبتلا ہوتے، اور مبتلا ہوئے تو انھوں نے اس کا ذکر اپنے کلام میں کیوں نہیں کیا! یہ احساس اس وقت خاص طور پر ہوا جب میں اس درد کے دورے یا ان کے کلام کے مطالعہ میں مبتلا ہوا۔ یہ شعرا اعضاءِ رئیسہ کی ہر قسم کی بیماری میں مبتلا پائے گئے جن میں دل و جگر خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اس قسم کے شاعرانہ امراض اور ان کے اثرات شعرائے لکھنؤ کے کلام میں زیادہ ملتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ بیمار پڑا تو اطبائے لکھنؤ سے رجوع کرنے کے لیے علی گڑھ سے روانہ ہو گیا۔

ہر مرض کی ایک حد ہونی چاہیے۔ ورنہ مریض کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ حد سے گزر جائے۔ جس طور پر ہمیشہ تندرست رہنا بدمذاقی ہے اسی طرح ہر وقت بیمار رہنا بدتوفیقی ہے۔ چوں کہ یہ دورِ ترقی کا زیادہ تہذیب کا کم ہے یعنی تم جو چاہو کر سکو یا نہیں تمھاری بیویاں کر سکتی ہیں، میں نے گردے کی مدتوں تالیفِ قلب کی لیکن جب دیکھا کہ میری چشم پوشی یا درگزر کو یہ روشن خیال بیوی کی مانند میری نیازمندی پر محمول کرنے لگے ہیں تو پھر اس اندیشہ سے کہ شوہر کے بجائے کہیں مہذب ہی نہ رہ جاؤں۔ ایک دن گردے کو نوٹس دے دیا کہ میرا سلوک اب تک تمھارے ساتھ شریفانہ رہا اور میں نے تمھاری زیادتیوں پر چشم پوشی کی اس لیے آخری بار تنبیہ کرتا ہوں کہ اپنی حرکات سے باز آ جاؤ ورنہ میں وہی کروں گا جو عاجز آ کر ایک جاہل شریف آدمی کیا کرتا ہے۔

اس نوٹس کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا بلکہ گردے نے اور ہاتھ پاؤں پھیلائے اور نہایت بے باکی کے ساتھ اپنا اقتدار جگر اور معدے کے حدود میں پھیلانے لگا لیکن اطبا نے یہ تشخیص کیا کہ یہ کرتوت جگر اور معدے کا ہے، گردہ صرف بدنام ہے بحیثیت ایک جدید الخیال حکمراں کے جو صرف ماہرین فن کے فتاویٰ پر حکومت کرتا ہے، میں ان وفا شعاروں سے بدظن ہو گیا۔ بادشاہ کی بدظنی کے معنی جنگ اور خوں ریزی کے ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف معجون، عرقیات جوشاندہ، سفوف وجوب کے حربے استعمال کیے گئے۔ ان غریبوں نے واویلا شروع کر دی کہ یہ سب گردے کی بالشوزم یا شہنشاہیت تھی وہ بجائے خود ازل سے وفادار و خیر اندیش برطانوی رعایائے ہند ہیں۔ چنانچہ ایک رات جب زلفِ شب گردہ تک پہنچ چکی تھی، علی گڑھ سے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گیا۔

کئی دن تک جھوائی ٹولہ میں محب مکرم حکیم عبداللطیف [1] صاحب کا مہمان رہا۔ اس دوران میں حکیم صاحب کی شہ پا کر کھانے پینے میں جی بھر کے بدپرہیزی کرتا اور ان کے تانگہ پر تمام دن میڈیکل کالج ہسپتال کا گزبنا رہتا۔ ایک بار خیال آیا کہ اطبا جھوائی ٹولہ کو بھی کیوں نہ دکھالوں ایسا کیا بھی لیکن کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ اور ایسی ایسی ثقیل زبان میں مرض کی تشخیص کرتے رہے کہ اس کی تفصیل پوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ خدانخواستہ کوئی اتنا ہی جرثقیل مرض نہ ہو۔

یہاں حکیم صاحب کے تانگے اور گھوڑے کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس تانگے میں سوار ہونے سے بہت سی پرانی تکالیف زائل اور اتنی ہی نئی پیدا ہو جائیں گی۔ گھوڑا حبشی خواجہ سرا ہے یعنی مشکی اور آختہ! آپ سوار ہونے کا ارادہ کریں گے، یہ چل دے گا۔ حکیم صاحب نے اس کی اطلاع پہلے سے دے دی تھی لیکن مجھے کوئی تردد نہیں ہوا اس لیے کہ اپنے دوسرے دوست سید محمد عبدالجلیل صاحب پر اکٹر مسلم یونیورسٹی کے تانگے پر بیٹھ چکا تھا جو سیلف اسٹارٹر اور کک اسٹارٹر دونوں تھا۔

حکیم صاحب کے تانگے پر بیٹھ کر کوئی شخص نہ اپنے آپ کو محفوظ خیال کر سکتا تھا نہ دوسروں کو جو سڑک پر چل رہے ہوں یا دوکان پر بیٹھے ہوں۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر، تیور جیسے

---

1. حکیم عبداللطیف مرحوم (ف 1970) اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ کے پرنسپل بھی رہے۔

کسی دیہاتی تھانے کا تھانے دار۔ کسی کو نہیں معلوم کس وقت یہ سڑک چھوڑ کر کسی دُکان میں داخل ہو جائے گا یا تانگے سمیت بالا خانے پر چڑھ جائے گا۔ گومتی سے متصل سڑک پر اس بے پناہ رفتار سے چلا رہا تھا جیسے رفتار کا ریکارڈ قائم کرنے کے لیے کوئی شخص سمندر کے کنارے ریت پر موٹر چلا رہا ہو۔ جادۂ مستقیم سے ذرا انحراف ہو جائے تو یہ تانگہ اپنی مشمولات کے ساتھ دریا میں جار ہے۔ لکھنؤ میونسپل بورڈ نے سڑک اور دریا کے درمیان کوئی آڑ نہیں قائم کی ہے اس فروگذاشت کا جو شخص ذمہ دار ہوا سے حکیم صاحب کے اس تانگے پر سوار کر کے ریور بینک روڈ کی طرف ہانک دینا چاہیے۔

برف حکیم صاحب کی ایسی کمزوری ہے جس پر وہ کبھی قابو نہ پا سکے۔ گرمی کے موسم میں برف نہ دستیاب ہو اور یہ معلوم ہو کہ صرف قطب شمالی پر مل سکتی ہے تو وہ اپنے تانگے پر قطب شمالی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ ایک دن ہم دونوں اس تانگے پر ہسپتال گئے۔ مختلف مقامات پر آتے جاتے اور زینوں پر چڑھتے اُترتے دوپہر ہو گئی۔ دھوپ کی شدت لُو کے تھپیڑے دفعتاً حکیم صاحب پر پیاس کا غلبہ ہوا مجھے ساتھ لے تانگے پر بیٹھ چوک کے لیے روانہ ہو گئے۔ تانگہ چوک میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی بھونچال آ گیا ہو۔ کسی دُکان کے پردے سے اُلجھا کسی کا سائن بورڈ سربہ سجود ہو گیا کتنے برف والوں کی دُکانیں راستے سے گزر گئیں کتنے اپنے اپنے اعضا کی خیر مناتے، ہم کو گھورتے یا گالی دیتے ہوئے، اِدھر اُدھر کترا گئے۔ میرا بیٹھنے اور چوکنا رہنے کا انداز ان جاکیوں کا تھا جو ریس میں گھوڑوں کی پشت پر نظر آتے ہیں۔ گھوڑے نے ایسے مقام پر جا کر دم لیا جس کے ایک طرف کارگاہِ شیشہ گراں دوسری سمت مٹی کے رنگین کھلونے بیچنے والوں کی دُکان اور بالا خانوں پر

''ڈھونڈے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس!''

ہم دونوں تانگے سے اُتر پڑے اور اسے بہ وقت تمام ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا گیا جس کے سامنے ایک طویل سائبان جیسی عمارت تھی۔ ہم شربت پینے کی مہم پر روانہ ہو گئے۔ ابھی گلاس ختم نہیں کر پائے تھے کہ اک ''شورِ مردم خیز'' اُٹھا، جا کر دیکھتے ہیں تو گھوڑا تانگے سمیت سائبان میں داخل ہے اور سامنے کی دیوار پر چڑھ جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ گھوڑا تانگہ، کوچوان، تماشائی

سب کے سب ''دست افشاں پائے کوباں نعرہ زناں'' لڑکے تالی بجا رہے تھے، عورتیں چیخ رہی تھیں، بوڑھے لعنت بھیج رہے تھے، کچھ نوجوان بے فکرے ہماری مدد کر رہے تھے اور کچھ گھوڑے تانگے کو شہ دے رہے تھے۔ غرض کسی نہ کسی طرح تانگہ نکالا گیا اور ہم وہاں سے واپس ہوئے۔

چاہا تھا کہ آپریشن کی خبر عام نہ ہو پائے، لیکن ہوا یہ کہ یہ سب کو معلوم ہو گیا۔ بزرگوں، عزیزوں، دوستوں کی آمد شروع ہو گئی۔ محبت اور شفقت کی کیسی کیسی باتیں سننے اور کیسے مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا کچھ اپنی طرف سے بہت کچھ خدا کی طرف سے کبھی ان کو، کبھی اپنے کو اطمینان دلاتا تھا۔ جو ہونے والا تھا ٹھیک تھا۔ اس لیے اور بھی کہ بیماری کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی!

بالآخر یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں پہنچ گیا۔

''وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا!'' کشادہ، ستھرا، روشن، خوب صورت کمرہ، آرام دہ نرم سفید بستر، شفاف غسل خانہ، مستعد خدمت گزار، خوب صورت نرسیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں سے مرصع یا مسلح چیر پھاڑ اور مرہم پٹی کا وہ سامان تھا جو ایک طرف میز پر ہماری پذیرائی کے لیے چشم براہ تھا، جن کو دیکھ کر آرزوؤں کے بہت سے غنچے کھلنے سے پہلے مرجھانے لگے۔ کھانے پینے کی اچھی سے اچھی چیزیں فراہم کی جانے لگیں۔ مقررہ اوقات میں احباب واعزا آتے اور اپنے خلوص ومحبت سے شادماں وشادکام کر جاتے۔

اس کے ساتھ ہسپتال کے جتنے متعلقہ ڈاکٹر یا طالب علم تھے، جب جی چاہتا اس عجوبۂ روزگار مریض کو کبھی تنہا کبھی گروپ میں آکر دیکھ جاتے۔ طرح طرح سے بیان لیتے اور جرح کرتے۔ دوسری طرف آپریشن کی تیاری کے سلسلے میں مریض کے ساتھ جتنے نرم گرم سلوک کیے جانے تھے وہ سب کیے جانے لگے۔ دو ہی ایک دن میں وہ سارے حوصلے پست ہو گئے، جو یہاں پہنچ کر پہلے دن ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ مرض کی داستاں سناتے سناتے اور آپریشن کے خیر مقدم میں بعض نامعقول آداب بجالاتے لاتے اُدھ موا ہو گیا۔ ایسا نہ کیا جائے تو شاید یورپین وارڈ کی عیش سامانی اور فضا مریض کو ہسپتال کی ڈسپلن میں طرح طرح سے مخل ہونے پر مختار بھی کر دے اور مجبور بھی!

آپریشن سے ایک دن پہلے سب نے دلاسا دیا۔ ڈاکٹروں نے اپنے طور پر، نرسوں نے اپنے انداز سے، عزیزوں اور دوستوں نے اور طریقوں سے۔ بالآخر وہ صبح آئی جب نوٹس ملا کہ پندرہ منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔ میں نے وضو کیا دو رکعت نفل ادا کی، اور دعا مانگی خدایا جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ بالکل درست ہے اب تک تو نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، تو علیم ہے مجھے اس کا کیسا اقرار ہے اور تیرا کتنا شکر گزار ہوں۔ ایک تمنا یہ ہے کہ اگر آخر وقت آ گیا ہے تو میری یاد کو مجھ سے محبت کرنے والوں کے لیے آسان کر دے۔ زندگی میں، میں نے تجھے اکثر بھلایا ہے، اس کے گواہ بہت ملیں گے لیکن اس وقت صرف تجھے یاد کر رہا ہوں۔ اس کا گواہ صرف تو ہے۔ اس کے بعد ایک ڈاکٹر نے مورفیا کا انجکشن دیا اور دو خدمت گاروں نے بیماروں کی کرسی پر بٹھا کر آپریشن تھیٹر پہنچا دیا۔

کرسی سے اُتر کر آپریشن تھیٹر میں داخل ہوا۔ جو میز بتائی گئی اس پر لیٹ گیا۔ سرہانے سے ایک ڈاکٹر نے کلوروفارم دینا شروع کیا۔ خیال آیا دیکھوں کلوروفارم کا اثر کس طور پر ہوتا ہے اس لیے ارادہ کر لیا کہ ہو سکے تو بے ہوش ہو جانے میں عجلت سے کام نہ لوں بلکہ کلوروفارم کے اثر کی مدافعت کروں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیر تک کلوروفارم دیتے رہے لیکن بے ہوشی طاری نہ ہوئی، البتہ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چیز حلق میں رہ رہ کر اٹکتی اور سوزش پیدا کرتی ہے۔ یہ تجربہ تکلیف دہ ثابت ہوا اس لیے مدافعت ترک کر دی۔ چند ہی سکنڈ میں ایسا معلوم ہوا جیسے دماغ دھنی ہوئی روئی کے مانند تھا جس کو آگ دے دی گئی ہو، پھر خبر نہیں کیا ہوا۔

آنکھ کھلی تو کمرے میں تکیوں کے سہارے لیٹا ہوا پایا۔ سر پر بھیگا ہوا تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ نہ آپریشن کی کوئی تکلیف تھی اور نہ کلوروفارم کا کوئی اثر۔ کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ پرائیوٹ نرسیں رکھ لی تھیں۔ پوچھا کیسا آپریشن رہا۔ جواب دیا، نہایت کامیاب لیکن خاموش رہو۔ مجھ پر بھی کچھ تکان سے غالب تھی۔ تھوڑی دیر میں نیند آ گئی۔ سہ پہر میں آنکھ کھلی تو چھوٹے بھائی کو جنھیں ہمہ وقت ساتھ رکھنے کی اجازت لے لی گئی تھی، قریب پایا۔ کچھ دیر تک آپریشن کا حال پوچھتا رہا۔ پیاس کا غلبہ تھا، سنترے کا تھوڑا سا عرق پیا پھر سو رہا۔ رات ہوئی اور تکالیف کا آغاز ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے گردہ کی مضافات کی رگیں آتشِ سیال بن گئی ہوں اور درد گردہ پوری شدت سے عود

کر آیا ہو۔ کیسی بھیانک تکلیف تھی، ڈاکٹر نے آکر مورفیا کا انجکشن دے دیا اور صبح تک کے لیے غافل ہو گیا۔ یہ حالت شب میں تین چار روز رہی اور مورفیا کا انجکشن دیا جاتا رہا۔ لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ نیند لانے کے لیے منوّم دواؤں کا محتاج ہونا اچھا نہیں، کوشش کرو کہ نیند خود آجایا کرے۔ چنانچہ انجکشن کا سلسلہ بند کر دیا گیا اور کچھ دنوں بعد نیند حسبِ معمول آنے لگی۔

مگر چند راتیں جس کرب سے گزریں وہ بھی نہ بھولیں گی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ سب اعصاب کا کرشمہ ہے۔ چوں کہ گردہ نکالا گیا ہے اس لیے متعلقہ جتنے اعصاب ہیں ان میں کرب پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کیفیت عارضی ہے خود بخود جاتی رہے گی۔ لیکن اس سمجھانے کے باوجود کچھ دنوں آہ و بکا و اظہار مایوسی درماندگی کا مظاہرہ اس طرح کرتا رہا کہ تیماردار پریشان ہو گئے اور نرسوں اور ڈاکٹروں نے درشت لہجے میں میری خبر بھی لی۔ چار پانچ دن بعد تکالیف میں تخفیف شروع ہوگئی۔ ساتویں دن ٹانکے کاٹ دیے گئے اور سہارے سے اُٹھنے بیٹھنے لگا۔

اب تاکید کی جانے لگی کہ "کھاؤ پیو اور ٹہلو۔" موسم گرما اور خربوزے دونوں شباب پر تھے۔ لکھنؤ میں قیام کر کے لکھنؤ کے خربوزے کبھی نہیں کھائے تھے، اس کا بھی لطف اُٹھایا۔ لکھنؤ ہی میں صبح و شام کے تازے اور باسی خربوزوں کی لطافت اور لذّت میں فرق آجاتا ہے۔ چہ جائیکہ نقل و حمل کے فشار سے گزار کر ان کو باہر لے جایا جائے اور پھر کھانے کی نوبت آئے۔ اہلِ لکھنؤ کا تو یہاں تک خیال ہے کہ فالیز پر جا کر کھانے اور گھر پر لا کر کھانے سے لذّت و خوشبو میں فرق آجاتا ہے۔

آج کل طرح طرح کے علاج دنیا میں رائج ہیں۔ غذا سے، پانی سے، دودھ سے، روشنی سے، نمک سے، جھاڑ پھونک سے۔ غالباً وہ دن بھی دور نہیں جب خربوزے سے بھی علاج کیا جانے لگے گا۔ مثلاً مایوس العلاج کا علاج لکھنؤ کے خربوزوں سے اور بقیہ کا دوسرے مقامات کے خربوزے سے البتہ ہر حال میں پرہیز علی گڑھ کے خربوزے سے بتایا جائے گا۔ لکھنؤ کے پھلوں میں جہاں ذائقے لطافت، خوشبو کے نازک سے نازک مدارج ملیں گے، علی گڑھ کے پھلوں میں صورتِ حال بالکل برعکس ہوگی۔ اس تن و توش کے بدمزہ اور بے مزہ خربوزے شاید ہی کہیں اور ملیں۔ ان میں سب سے غنیمت وہ ہوگا جو بے مزہ ہوگا۔ اگر مساوات کے تقاضوں کی

بنا پر ان کو بھی دوا کے مصرف میں لانا ضروری ہو تو پھر ان کو ضماد تکمید و تدہین کی شکل میں استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ وہ بھی کسی خربَذ (خربوزوں سے علاج کرنے کا ماہر) کی براہِ راست نگرانی میں!

آموں کی بھی فصل شروع ہو چکی تھی۔ آموں کی بعض اقسام لکھنؤ سے بہتر کہیں اور نہ ملیں گی۔ ان کے حسب و نسب پر اظہارِ خیال کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ دوستوں اور عزیزوں نے ان پھلوں کے علاوہ لکھنؤ کی مشہور مٹھائیوں، کھانوں اور دوسری اچھی چیزوں سے جس میں ان کی محبت سب پر غالب تھی، جس جس طرح مجھے نوازا وہ بھی بھول نہیں سکتا۔ تعجب ہے لکھنؤ کی ان نعمتوں اور نفاستوں کا اثر سب پر خاطر خواہ پڑا سوا وہاں کی شاعری کے بہرحال اپنے مرض اور لکھنؤ کا میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو تو مریض کو اپنا علاج خربوزہ اور آموں کی فصل میں لکھنؤ میڈیکل کالج کے ہسپتال میں یورپین وارڈ میں رہ کر کرانا چاہیے۔

ہسپتال کا ماحول طبیعت پر افسردگی طاری کر دیتا ہے ہر سمت قدم قدم پر مرض تکلیف اور بے بسی کا احساس ملتا ہے۔ جس کو تندرست ڈاکٹر اور تندرست نرسوں کی مستعدی، مصروفیت اور مسلسل آمد و رفت اور زیادہ وحشت انگیز بنا دیتی ہے۔ صفائی اور باقاعدگی بڑی اچھی چیزیں ہیں، لیکن ہسپتال اور جیل خانے کی صفائی اور باقاعدگی مجھ پر وہ خوش گوار اثر نہیں ڈالتی جتنی کہیں اور کی۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رُخ اتنا ہی روشن بھی ہے۔ عرفی کو آستانۂ محبوب سے،

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم![1]

کہتے ہوئے واپس آنا پڑا تھا لیکن اچھے ہسپتالوں میں مریض مایوس آتا ہے اور بالعموم شاد کام واپس آ جاتا ہے۔ اردو شعرا درد اور دوا دونوں کے لیے کوچۂ محبوب میں آمد و رفت رکھتے ہیں اس لیے شعر بھی اسی قسم کے کہتے ہیں۔ چوں کہ داخلِ ہسپتال بہت کم ہوتے ہیں اس لیے "ہمہ درد آمدہ بودم ہمہ نغمہ رفتم" کے انداز کے شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔

سائنس، ایجادات اور مشق و مہارت نے فنِ جراحت کو کس درجہ حیرت انگیز بنا دیا ہے، بہ مشکل تصوّر میں آ سکتا ہے۔ لکھنؤ میڈیکل کالج اور ہسپتال کے سرجن ڈاکٹر آر۔ این۔ بھاٹیہ نے

1۔ پورے ذوق شوق سے آیا تھا اور پوری محرومی کے ساتھ یہاں سے واپس گیا۔

میرا آپریشن کیا تھا۔ انھوں نے جتنی جلد اور جس وثوق سے مرض کی تشخیص کی وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ پھر جس دل نشیں انداز سے مرض کی نوعیت اور آپریشن کی ضرورت بتائی وہ بھی کم ڈاکٹروں کے حصے میں آیا ہوگا۔ میں نے کسی قدر فکرمند ہو کر دریافت کیا اور آپریشن کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کے بارے میں پوچھا تو فرمایا، جسم میں سوئی چبھنا بھی خطرے سے خالی نہیں لیکن تردد کی بات نہیں ہے کوئی دقت یا نزاکت پیش نہ آئے گی۔

آپریشن ہو گیا اور جتنی تکالیف تھیں وہ گردے کے ساتھ اب لکھنؤ میڈیکل کالج کے عجائب خانے میں منتقل ہو چکی تھیں۔ جسم کے ماؤف حصے کو اس طور پر کاٹ کر پھینک دینا یا اس کی اصلاح کر دینا کہ نظامِ جسمانی میں کوئی خلل نہ آئے اور وجہ آزار دور ہو جائے کتنا بڑا اور مشکل کام ہے، جسے انسان کے حوصلے، عقل، محنت اور محبت نے پورا کر دکھایا ہے۔ پھر اس خیال سے کتنی راحت اور تقویت محسوس ہوتی ہے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ انسان بیماری، مفلسی، جہالت اور خوف کے کیسے کیسے عذابوں سے نجات پا جائے گا اور آسودگی، صلح اور آرزومندی کی زندگی بسر کرنے لگے گا۔ آج سے پہلے جب بلا اور بیماری کو دور کرنے کی تدابیر انسان کے قابو میں نہیں آئی تھیں کیسی کیسی عزیز جانیں کس عذاب اور بے بسی سے تلف ہوئیں، ان کا خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحمید صدیقی ہاؤس سرجن تھے اور میری دیکھ بھال ان کے سپرد تھی۔ کتنے محنتی، مجبتی اور اپنے فن میں طاق ہیں۔ کسی وقت سرجری میں وہ اپنے استاد ڈاکٹر بھاٹیا کے ہمسر بن جائیں گے۔ اس میں اتنا عرصہ لگے گا جتنا 'فتنہ' کو 'قیامت' ہونے میں لگتا ہے۔ ایک دن بیمار ہو کر پاس کے کمرے میں آ گئے۔ ملیریا کی گرفت میں تھے لیکن جس طرح سے انھوں نے ملیریا کی توہین کی تھی، اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ مرض پھر کبھی ان سے اختلاط پر آمادہ نہ ہوگا۔ ڈاکٹر ظریف ہاؤس فزیشین تھے۔ اکثر آجایا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے گنہ گاروں میں ہیں۔ وہی خلوص یگانگت اور بے تکلفی، جو علی گڑھ والوں میں ملتی ہے۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو علی گڑھ میں طالب علمانہ زندگی نہیں بسر کر سکے ہیں۔ کسی علی گڑھ والے کے سامنے علی گڑھ کا نام لیجیے پھر دیکھیے وہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے مصائب اور مناصب سب بھول

جائے گا۔ اس کا تصور زمان و مکان سے آزاد کر کے اس کو کالج کے آغوش میں پہنچا دے گا۔ وہی کمرے، وہی ڈائننگ ہال، وہی مسجد، وہی یونین، وہی کچی بارک، وہی کرکٹ فیلڈ، وہی شرارتیں، صحبتیں اور سرگرمیاں جن سے وہ اب دور اور محروم ہے!

جب کبھی علی گڑھ سے باہر گیا اور کسی علی گڑھ کے طالب علم سے ملاقات ہوئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کالج ہی میں ہوں۔ اجنبی یا غریب الدیار محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کسی تکلف یا تصنع کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی اپنے اعزا سے بھی تکلف سے ملنا پڑتا ہے لیکن علی گڑھ اتنا بڑا خاندان ہوتے ہوئے ایسا خاندان ہے جس کے کسی فرد سے ملنے میں کسی طرح کی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے فریقین کے پاس ایک دوسرے سے چھپانے کی کوئی بات نہ ہو۔ اگر ایک وائسرائے ہے اور دوسرا صرف ایک کلرک لیکن دونوں پروردۂ علی گڑھ ہیں تو اس طور پر ملیں گے گویا دونوں ایک سطح پر ہیں۔ وہ سطح جو علی گڑھ نے قائم کی ہے اور جس پر خود علی گڑھ قائم ہوا۔

ایک بار کسولی (مضاف شملہ) کا سفر کر رہا تھا۔ انبالہ کے اسٹیشن پر آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ نقدی کا بٹوا تکیہ کے نیچے سے غائب ہے۔ علی گڑھ سے دور اجنبی مقام پر جب کہ سفر کا کافی حصہ باقی تھا اس حادثے کے پیش آجانے سے پریشانی ہوئی۔ کالکا پر اتنی دیر ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا کہ روپے کے لیے علی گڑھ تار دیتا۔ خیال آیا کہ دیکھوں کوئی علی گڑھ کا آدمی تو نہیں سفر کر رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک صاحب میری طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ سلام کیا، میں نے جواب دیا اور پوچھا مجھ سے واقف ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ علی گڑھ کے طالب علم ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے ملنے آ گئے تھے۔ میں نے کہا، میرے روپے چوری ہو گئے اگر آپ کے پاس کافی روپے ہوں تو کچھ مجھے قرض دے دیں۔ انھوں نے دے دیے، وہ شملہ جا رہے تھے، میں نے علی گڑھ خط لکھ دیا کہ اتنے روپے شملہ کے پتے پر بھیج دیے جائیں۔ چند منٹ کے اندر ساری تشویش ختم ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی کہ اگر کبھی کوئی جرم کر کے علی گڑھ سے مفرور ہونے کی صورت پیش آئی تو غالباً دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر پکڑ لیا جاؤں گا، اس لیے کہ دور افتادہ مقامات پر بھی میری ملاقات کسی نہ کسی علی گڑھ والے سے ضرور ہو گی۔ یہ کچھ مجھی پر منحصر نہیں ہے علی گڑھ کے ہر طالب علم کو اگر وہ کچھ دن رہ چکا ہے، یہ حادثہ پیش آئے گا!

مریضوں کی ہمہ وقت دیکھ بھال نرسوں، سسٹر اور میٹرن کے سپرد ہوتی ہے جو اپنے فرائض بڑی خوبی، مستعدی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔ مریض کی بہتری کے لیے ان کو سخت سے سخت اور ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی کبھی عار نہیں ہوتا۔ اس کی صحت اور عافیت کے مقابلے میں اپنی صحت و عافیت کا خیال نہیں کرتیں۔ ان میں یورپین، اینگلو انڈین، عیسائی، ہندستانی سبھی ہیں۔ اوّل الذکر دو اپنے فرائض نسبتاً زیادہ مستعدی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔ ان کی ڈیوٹی 8 ربجے دن سے 8 ربجے رات تک ہوتی اس دوران میں کھانے پینے کے سلسلے میں شاید تھوڑی دیر تک سا کن رہتی ہوں ورنہ مسلسل مصروف رہتی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اور کاموں کے علاوہ کچھ اور نہیں تو اس بارہ گھنٹے میں یہ پانچ چھ میل کی پیادہ پا مسافت طے کر لیتی ہوں گی۔

یہاں ایک خاص نرس کا تذکرہ کروں گا۔ اس کی ڈیوٹی بالعموم رات کی ہوا کرتی تھی۔ مجھے یقین ہے دوا دینے، ٹمپریچر لینے اور عام دیکھ بھال کا جو مقررہ پروگرام تھا اس کو پورا کرنے میں شاید ہی کبھی دو چار منٹ کی دیر یا سویر سے کام لیا ہو۔ ہر کام کو بڑی خوش دلی سے انجام دیتی تھی۔ اس کو کبھی تھکا ہارا بیزار یا سرکہ جبیں نہیں پایا۔ آپریشن کے بعد کی چند راتیں بڑی سخت گزریں۔ گھنٹی کی ہر آواز پر پہنچ جاتی اور تکلیف دور کرنے کی طرح طرح کی تدبیر اختیار کرتی، کچھ دن بعد جب تکالیف کی شدت ختم ہو چکی تھی، حسبِ معمول 2 ربجے رات کو ٹمپریچر لینے آئی۔ پوچھا کیسے ہو، میں نے جواب دیا یوں تو اچھا ہوں لیکن پڑے پڑے اپنے آپ کو بے وقوف سا محسوس کرنے لگا ہوں۔ کہا سو جاؤ یہ احساس بھی جاتا رہے گا۔ میں نے کہا پھر دوسرے احمق سمجھنے لگیں گے۔ بولی یہ صورت پہلے سے بہتر ہے!

ہسپتال میں مریضوں سے ملنے کے اوقات مقرر ہوتے ہیں، مثلاً دن میں پانچ بجے سے سات بجے تک۔ اس کے علاوہ اوقات میں ملنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، لیکن ہم ہندستانی اس طرح کی پابندی کا بہت کم لحاظ کرتے ہیں۔ اسکول کے ایک آشنا لکھنؤ میں مل گئے۔ شکل وصورت اچھی نہ تھی لیکن ہمیشہ اس ارمان میں رہے کہ کوئی دولت مند حسینہ ان پر عاشق ہو جائے۔ طرح طرح کے لباس پہنتے تھے اور عمر کبھی نہیں بتاتے تھے۔ ممنوعہ اوقات میں ملنے آتے اور ان کی

مڈ بھیڑ اس نرس سے ہو جاتی جو انھیں کی طرح بقول مولانا سہیل 'باصرہ خراش'' تھی جسے مزاج اور تیور کی درشتی نے اور زیادہ نا قابلِ تسخیر بنا دیا تھا، ان دوست کو نرسوں سے دلچسپی تھی۔ اکثر ان سے سلجھنے یا اُلجھنے کی کوشش فرماتے۔ اس وقت خاص لطف آتا جب یہ گھبرا کر یا غلط انگریزی بولنے کی رو میں، یس سر یا نو سر فرما جایا کرتے تھے۔ جس نرس کا اوپر ذکر آیا اس سے خائف رہتے تھے۔ آتے ہی پوچھتے کیوں جی اس کا تو کہیں آنے کا وقت نہیں ہے۔

ان کو میرے کمرے کا غسل خانہ پسند آ گیا تھا۔ سپید صاف کشادہ ٹب کو پانی سے لبریز دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ غسل کرنے کا ٹب ہے۔ ایک دن اس کا پرچۂ ترکیب استعمال دریافت فرمانے لگے۔ میں نے کہا اس میں نہانے کی مشق ہونی چاہیے۔ ورنہ داخل ہو کر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ناواقفی میں بعض جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ پوچھا اس کے ایک سرے پر پیتل کی لمبی لمبی سلاخیں کیسی ہیں۔ جواب دیا اس میں ایک لمبی رسی باندھ لیتے ہیں جس کو نہاتے وقت پکڑے رہتے ہیں پھر اطمینان سے ڈبکیاں لگاتے اور دھوم مچاتے رہتے ہیں۔ بولے آخر مریض کیسے نہاتے ہیں۔ میں نے کہا یہ ربر کا حلقہ رکھا ہوا ہے یہ لائف بلٹ (Life Belt) ہے۔ اس سے مدد لیتے ہیں۔

دراصل ربر کا یہ حلقہ جس کے اندر ہوا بھر دی جاتی ہے ان مریضوں کے بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے ہوتا ہے جو عرصہ سے صاحب فراش ہوں یا جن کے بارے میں ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کی پیٹھ یا کمر مجروح نہ ہونے پائے۔ فرمایا، ایک دن اس غسل خانہ میں نہانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ضرور اور ابھی کیوں نہیں۔ کہنے لگے برہنہ نہانا تو شرعاً منع ہے میں نے کہا قمیص سے تہبند کا کام لو۔ نہانے کے بعد دُھلی ہوئی قمیص میرے بکس سے نکال کر پہن لینا۔ چنانچہ قمیص اور ربر کا حلقہ لے کر غسل خانہ میں داخل ہو گئے۔

اندر پہنچ کر آواز دی وہ رسّی کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا، رسّی تو شاید نہ مل سکے۔ میں تو کمر بند سے کام لے لیا کرتا ہوں۔ ترکیب سن کر مطمئن ہو گئے۔ میں نے کہا غسل خانہ کا کواڑ اندر سے بند نہ کرنا شاید کوئی ضرورت پیش آ جائے۔ اب انھوں نے نہانا اور گنگنانا شروع کیا۔ یہ معلوم ہوا جیسے ٹب میں دو مگرمچھ ایک دوسرے سے اختلاف یا اختلاط کر رہے ہوں۔

تھوڑی دیر میں اسی نرس کے پاؤں کی چاپ سنی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ میں سوتا بن گیا، معزز خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور باہر سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ بند نہیں ہے۔ موصوفہ بے تکلف غسل خانہ میں داخل ہوگئیں۔ ساتھ ہی دو چیخیں سنائی دیں۔

اس دورِ ابتلا میں مجھ پر جو گزر گئی اور احباب، اعزا اور بزرگوں نے اضطراب اور دوا دوش کے جیسے دن رات گزارے اس کا حال کیا بتاؤں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ محبت کی یہ متاعِ گراں مایہ کبھی کبھی کسی بے بضاعت کو کتنی کم قیمت پر مل جاتی ہے۔

(نگار۔ جولائی1929)

●●●

ماتا بدل

بستی کی بوڑھیاں اس پر متفق ہیں کہ ماتا بدل کا صحیفۂ حیات بالکل کورا ہے۔ وکلا، مقدمہ بازحتیٰ کہ افیونیوں کا بھی جن کی عمر کا تعین مشکل ہے، ان کے بارے میں یہی خیال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ موجودہ نسل میں ایسا کوئی نہیں ملتا جو ماتا بدل کی زندگی کے ابتدائی 40-30 سال میں ان کا ساتھی رہا ہو۔ یہ مزدوری کرتے ہیں اور حقہ پیتے ہیں۔ حیات کا ثبوت ان کی محنت، مزدوری اور حسِ حیات کا حقہ نوشی ہے۔ یہ اکثر و بیشتر انھیں دو مشاغل میں مصروف پائے جاتے ہیں۔ جب یہ متحرک ہوتے ہیں، ان کے سر پر ٹوکری ہوتی ہے۔ حالتِ سکون میں حقہ سے ہم آویز ہوتے ہیں۔ مزدوری میں ان کا محبوب مشغلہ سفالہ پوش مکانوں کی مرمت ہے لیکن کام کی نوعیت کچھ ہی ہو، کوئی موقع ومحل ہو، ان کی یکسوئی میں فرق نہیں آتا۔ شکل وصورت دیکھ کر ذہن لارڈ ولزلی کی اس تصویر کی جانب منتقل ہوتا ہے جو ابتدائی درجوں کی بعض تاریخ ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ وہی آنکھیں، وہی پلکیں، وہی چہرے کی جھرّیاں، وہی تیور، وہی سب کچھ۔

قصبے میں کوئی مکان ایسا نہیں جس کے بنانے بگاڑنے یا مرمت کرنے میں ماتا بدل کی خدمات سے کسی نہ کسی وقت فائدہ نہ اُٹھایا گیا ہو اور شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہو جس کے زندہ یا مردہ افراد سے ماتا بدل واقف نہ ہوں۔ ہر مکان کے تفصیلی جغرافیہ سے یہ آشنا ہیں۔ ماتا بدل کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی خدمات کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوگی، مثلاً ٹوکری، بیلچہ، رسّی،

سیڑھی، گھڑا، پھاوڑا اور وہ مکان کے کس حصے میں رکھے ملیں گی یا موجود نہیں تو کہاں سے عاریتاً حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یوں تو ماتا بدل کی زندگی ایک کلاک سے بھی زیادہ یکساں اور یکسو ہے لیکن ان کے نزدیک زندگی کا ایک مقصد "احتیاط" بھی ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس کی طرف سے ان کو کبھی اطمینان نہیں حاصل ہوا۔ بولتے بہت کم ہیں الا ایسی حالت میں جب ان کے نزدیک خاموشی منافیِ احتیاط ہو۔ دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے تو ان کا فرض اکثر اپنے ساتھیوں کو حقہ یا پانی پلانا ہوتا ہے۔ ایسے اوقات میں کسی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وقتِ معینہ سے پہلے یہ کبھی ان چیزوں کی طرف مائل نہیں ہوتے اور نہ کسی کی فرمائش پر مخاطب ہوتے ہیں۔ مٹی کچلنے کے یہ ماہر خصوصی ہیں۔ جب تک اس مشغلہ سے فرصت نہیں پا لیتے کسی اور طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کے اصرار پر بھی اپنے مشغلے سے باز آ جائیں اور تعمیر کے لیے مٹی حوالہ کر دیں۔ بعض امراض کے مانند ان کے یہاں بھی ہر مشغلہ کا ایک کورس (دور) ہے جس کو پورا کیے بغیر چارہ نہیں! اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا تو اس کا جواب ماتا بدل کے یہاں صرف اپنی آنکھوں کو پوری طور پر کھول دینا اور مٹی کو اور زیادہ انہماک یا طیش کے ساتھ پامال کرنا ہوتا ہے۔ ماتا بدل کا بوجھ لے کر سیڑھی پر چڑھنا بھی خاص طور پر قابلِ لحاظ ہوتا ہے۔ ہر درجہ پر یہی معلوم ہوگا گویا ان کو کسی غنیم کے مقابلہ میں ایک نہایت مستحکم محاذ قائم کرنا منظور ہے اور کسی شاندار پیش قدمی یا اس سے زیادہ شاندار پسپائی کا ارادہ نہیں ہے۔ دوپہر میں جب کام روک دینے کا وقت آتا ہے، کسی ساتھی کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ خود کام بند کر دے۔ سب کی نظریں ماتا بدل کی سمت اُٹھتی ہیں جو کمر پر ہاتھ باندھے سر جھکائے مٹی کچلتے ہوتے ہیں اور مزدور سمجھ لیتے ہیں کہ ابھی ماتا بدل اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے کہ اگر سورج مہاراج کو خدانخواستہ گر پڑنا نصیب ہو تو یہ احتیاط کے ساتھ اپنی ایک پیچ والی پگڑی کے عین وسط پر روک لیں گے اور سورج ان کی مٹی کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا سکے گا۔ چوں کہ زمین گھومتی رہتی ہے اس لیے یہ اپنے محدود حلقہ میں اس کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طور پر ان کا سر آفتاب کے ساتھ خطِ عمودی قائم کر سکے۔ اس کوشش میں کامیاب ہو جانے کی یہ علامت ہے کہ ماتا بدل سر سے پگڑی کھول دیتے ہیں اور دیوار کے سائے میں جہاں اُپلے کا ایک ٹکڑا سلگتا ہوتا

ہے پگڑی کو بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ گویا کمر کھول دینے کا اذن عام ہوتا ہے۔ سارے مزدوران کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ سب سے کم عمر مزدور کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حقہ چڑھا کر پیش کرے۔ ماتا بدل دو ہی چار کش لے کر سکوت اور دل جمعی کا مجسمہ بن جاتے ہیں جس کا ایک ناکمل سا نمونہ اکثر اس اشتہار میں دیکھا گیا ہے جس میں ایک نہایت فربہ اندام بزرگ سگار کا ایک کونہ لبوں سے دبائے نیم باز آنکھوں اور کسی قدر تبسم زیر لب سے لوگوں کی توجہ اور سگار کے دھویں کو جذب کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اور نیچے لکھا ہوتا ہے "آسودگی کامل"۔

کام ختم کرنے کے بعد شام کو مزدور رخصت ہوتے ہیں۔ یہ ماتا بدل کی انتہائی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے۔ مزدوروں سے دن کے کام کا جائزہ لیتے ہیں جن چیزوں سے کام لیا گیا ہے مثلاً کدال، پھاوڑا، ٹوکری، گھڑا ان سب کو اس طور پر اس کی جگہ سے اُٹھاتے ہیں کہ کسی متلاشی آثار قدیمہ کو بھی ان کے احتیاط و اہتمام پر رشک آ سکتا ہے۔ مالک مکان نے ان کو مکان سے جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن ہر چیز کو اکٹھا کر لینے اور دروازے کو مقفل کر دینے کے بعد بھی یہ مطمئن نہیں ہوتے۔ جاتے وقت کوئی موجود نہ بھی ہو تو یہ خود بخود کہتے جائیں گے کہ تمام چیزیں ٹھکانے سے رکھ دی گئی ہیں۔ ٹوکری کونے میں ہے، کدال اس کے نیچے اور رسّی کھونٹی پر ہے، وغیرہ۔ ابھی چند قدم بھی آگے نہ بڑھے ہوں گے کہ لوٹ آئیں گے۔

"کیوں ماتا بدل کیسے پلٹ آئے۔"

ماتا بدل۔ "معلوم نا ہیں گھڑوا کہن اہے" (معلوم نہیں گھڑا کہاں ہے) اندر جا کر سب دیکھ بھال آئے اور خیریت بول کر آگے بڑھے تھوڑی دور جا کر دوبارہ پلٹے۔

"کیوں اب کیا رہا۔"

ماتا بدل۔ "سرکار دو پہر دا کے جون روپیواد ہے دہن اودمان کے پیسوا گنج لیہ رہن کہ نا ہین۔" (دوپہر کو جو روپیہ سرکار نے دیا تھا اس کے پیسوں کو سنبھال لیا تھا کہ نہیں)

"ہاں ہاں گن لیا تھا۔ اب تم بے فکر ہو کر مکان جاؤ۔"

ماتا بدل کچھ دور جا کر پھر پلٹے اور سیدھے مکان کی طرف بڑھے۔

"کیوں؟"

ماتابدل۔" کھوناہیں، تنی دیکھے کے رہا کہ تکوالاگل ہے کہ ناہیں" (کچھ نہیں ذرا دیکھنا تھا کہ تالالگا ہوا ہے کہ نہیں)

ایک بار ماتابدل کو ایک ایسے مکان میں کام کرنا پڑا جس کی ہمسایہ 'برق تھی، صرصر تھی یا زلزلہ' کا مصداق تھی جس گلی سے گزر ہوتا لوگ سہم جاتے۔ اس کی گالی گلوج اور بدمزاجی سے ساری بستی پناہ مانگتی تھی۔ جس دُکان پر سودا خریدنے پہنچ جاتی تمام بھیڑ چھنٹ جاتی اور دُکان دار سارا کام چھوڑ کر جھنیا کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ بستی کے شریر اور جھگڑالو لڑکے اور کتے اس کو دیکھ کر راستے سے کترا جاتے تھے۔ بارش، کیچڑ، سردی، کہر دھوپ، لو تک اس کے غیظ و غضب اور سب وشتم سے محفوظ نہ تھی۔ روایت تو یہاں تک ہے کہ جھنیا کی شادی ایک ایسے مردِ معقول سے ہوئی تھی جو آج کل ہوتے تو ان پر یورپ کے مکمل ہندستانی تعلیم یافتہ نوجوان کا دھوکہ ہوتا۔ بیوی اور شوہر کے روابط اور ازدواجی زندگی کے اظہار و اعلان کا وسیلہ اکثر و بیش تر جھنیا کی جوتی ہوئی جسے وہ وقت بے وقت بہ سلسلۂ تفریح یا ورزش بے تکلف بر سرِ کار لاتی اور شوہر نامدار مصلحتِ وقت یا مشیتِ الٰہی سمجھ کر انگیز کیا کرتے تھے۔ مکان کے اندر انار کا درخت تھا جسے کسی جن نے اپنا نشیمن بنالیا تھا۔ شوہر اس حقیقت سے باخبر تھے اور اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ کبھی وہ جن جھنیا کی خبر لے گا لیکن جن کتنا ہی جن کیوں نہ ہو، میاں بیوی کے جھگڑوں میں پڑنے سے گریز کرتا ہے بالخصوص جہاں بیوی جھنیا ہو۔

ایک دن بیوی سے سفر کی اجازت طلب کی اور کہا کہ پردیس جا کر کچھ کھانے کمانے کی فکر کرنا چاہیے۔ ممکن ہے فراغت کے جتنے دن اب تک بسر ہوئے وہ آئندہ میسّر نہ آئیں۔ جھنیا نے سوال کیا کہ پھر وہ جوتیاں کس پر آزمایا کرے گی۔ شوہر نے جواب دیا میں جلد ہی واپس آؤں گا۔ میری عدم موجودگی میں اس انار کے درخت پر اپنے شوق پورے کرنا۔ غرض تھوڑی ردّوقدح کے بعد جس میں کچھ الوداعی جوتی پیزار کو بھی دخل تھا، شوہر صاحب پردیس کو سدھارے۔

کچھ دنوں بعد کسی شہر میں ایک مہاجن کے یہاں نوکر ہو گئے اور اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ اتفاق سے مہاجن کی لڑکی پر آسیب کا دخل ہوا۔ ہر طرح کی دوا دارو، جھاڑ پھونک سے مایوس ہو کر مہاجن نے اعلان کیا کہ جو شخص لڑکی کو اس آفت سے نجات دلائے گا

صلے میں اسی سے لڑکی کی شادی کردی جائے گی۔ یہ بے چارے بھی حق نمک خواری ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوئے لیکن آدمی تھے تجربہ کار اور دوراندیش صلے کی شرط مسترد کرالی۔ لڑکی کے پاس پہنچے تو وطن کے دوست کو پہچان لیا۔

جنّات سے بہت کچھ منت سماجت کی کہ لڑکی کی جان چھوڑ دیں لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور جنّات کے شدید اصرار کے باوجود گریہ وزاری کا سبب نہ بتایا۔ بالآخر جنّات نے کہا:

''اگر تم کو رونا ہی ہے تو کہیں دوسری جگہ جا کر روؤ۔ یہاں آخر اس کا کیا موقع ہے؟''

شوہر۔'' کیا کروں مجھے تو آپ کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ جس مصیبت کے باعث آوارۂ وطن ہوا، ہر قسم کی صعوبتیں اُٹھائیں، وہ اب معلوم ہوا کہ میرے خمیر میں ہے۔

جنّات۔'' آخر کیا مصیبت پیش آئی کہ زندگی سے بیزار نظر آتے ہو۔''

شوہر۔'' آپ سے کیا پردہ مجھے بھی اپنا سا بنا لیجیے۔ دنیا میں جنّات بن کر رہنا بھی کیسی خوش بختی ہے۔''

جنّات۔''سنوں بھی تو معاملہ کیا ہے۔''

شوہر۔(ہکلاتے ہوئے)''.........وہی۔''

جنّات۔'' کون وہی؟''

شوہر۔''چہ.......چہ.........''

جنّات۔(چوکنا ہو کر).....کیا؟

شوہر۔''چہ.....چھت......چھتیا!''

جنّات۔''کون؟''

شوہر۔''ہاں وہی۔''

جنّات۔(بدحواس ہو کر)''پھر کیا ہوا؟''

شوہر۔''میری تمھاری خبر سن کر آنے والی ہے!''

جنّات غائب ہوگیا۔ لڑکی اچھی ہوگئی۔ شوہر صاحب انعام و اکرام لے کر مکان واپس آئے تو معلوم ہوا کہ چھتیا نے انار پر اپنی روزانہ مشق جاری رکھی تھی۔ چنانچہ جنّات کو چھتیا کے شوہر کے نقشِ قدم کو اپنا خضرِ راہ بنانا پڑا۔

ماتابدل کوٹھے کی کھپریل درست کر رہے تھے معلوم نہیں زمانہ یا زندگی کے کس نشیب و فراز پر غور کر رہے تھے اور حقہ نوشی کے کن مدارج سے گزر رہے ہوتا تھا کہ یکا یک چھت سے پھسلے اور کوٹھے کی دوسری سمت چھتیا کے صحن میں حقہ سمیت جا گرے۔ دھماکے کی آواز سن کر چھتیا للکارتی ہوئی نکلی۔ ادھر ماتابدل کا قریب قریب وصال ہی ہو چکا ہے۔ چھتیا اس پر جھگڑ رہی تھی کہ یہ اس کے صحن میں کیسے صادر ہوئے اور ماتابدل بے ہوش نہیں بلکہ دم سادھے ہوئے تھے۔ ماتابدل کو محلّے والوں نے پہچانا اور لاد پھاند کر ان کے گھر پہنچایا۔

مدتوں بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ نقل و حرکت میں اب اور زیادہ احتیاط برتنے لگے تھے۔ قدم پھونک پھونک کر دھرتے اور کھپریل وغیرہ کی مرمت اب بالکل بند کر دی تھی۔ صرف وہی کام کرتے جس سے پاؤں کا تعلق زمین سے منقطع نہ ہونے پائے۔ جس چیز کو اُٹھاتے اس کی پورے طور پر دیکھ بھال کر لیتے اور جہاں رکھتے اس مقام کی بھی جانچ پڑتال کر لیتے۔ حقہ نوشی بھی بڑھ گئی تھی۔

برساتی مرمت کے سلسلے میں جامع المتفرقین نے چھتیا اور ماتابدل کو پھر یکجا کر دیا۔ کچھ کھپروں کی ضرورت تھی جس کو لانے کے لیے یہ تعینات کیے گئے۔ کمہار کی دُکان سے کھپرے ٹوکری میں اور ٹوکری سر پر رکھ کر مکان واپس آئے۔ مسافت طویل تھی اس لیے صحن میں داخل ہوتے ہی ٹوکری زمین پر رکھ دی اور ایک طرف بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ ممکن ہے حقہ کی موسیقی اس کی ذمہ دار رہی ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک کالے سانپ نے جس کا تمام جسم کھپروں میں چھپا ہوا تھا ایک بالشت اوپر نکالا اور ماتابدل کی بین نوازی کی داد میں وجد کرنے لگا۔ ماتابدل کی نیم باز آنکھوں کے سامنے سارا مکان ٹوکری اور چھتیا خود پہلے سے رقص اور وجد میں تھیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ ٹوکری میں عورتوں یا ان کے بچّوں کے 'ماموں' ناچ رہے تھے یا خود ان کے ناریل کا دھواں پیچ کھا رہا تھا۔ چھتیا نے بے تکان چیخ مارنا شروع کیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔

محلّے والے دوڑ پڑے۔ لیکن ماتابدل کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ جھتیا نے لپک کر ان کے حقّے کو ایسا دوہتڑ رسید کیا کہ چلم اور ناریل دونوں ٹوکری کے پاس جا گرے۔ بھانجی کی یہ حرکت 'ماموں' کو پسند نہ آئی۔ انھوں نے اس کی طرف رُخ کیا تو مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ جھتیا نے چیخ مار کر جست کی تو ماتابدل کے اوپر گری۔ اب ان کو صورتِ حال کا احساس ہوا۔ سانپ اب بالکل ان کے پاؤں کے پاس آچکا تھا۔ کچھ خفت اور غصہ اور بہت کچھ جھتیا کا غیر متوقع بوجھ، ان سب سے متاثر یا بیزار ہو کر اپنی سخت، کھردری اور دندانے دار اینڈی کا ایک ایسا بھرپور دھچکا دیا کہ 'ماموں' کا سر پسندے کی بوٹی بن گیا اور جھٹکے میں 'بھانجی' مرحوم 'ماموں' کے اوپر آرہی۔ یہ مزید خلفشار کا باعث ہوا۔ کسی کو کیا معلوم کہ شیش ناگ کی گت ہو چکی تھی۔ لوگ یہی سمجھے کہ جھتیا کی جان خطرے میں ہے۔ کسی نے پاؤں پکڑا کسی نے ہاتھ بعضوں نے سر۔ ہر ایک نے بیک وقت اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جھتیا معلق ہو گئی جسے علاحدہ ڈال دیا گیا۔ کچھ دیر بعد سکون ہوا تو مجمع عام کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔

جھتیا۔ ''یہ حرام خور اس سے پہلے بھی ایک بار اس گھر میں کود چکا ہے۔ آج اپنے باپ کو اُٹھا لایا۔ ماموں نے اس کی بجو والی آنکھوں کو نہیں ڈس لیا۔''

ماتابدل۔ ارے او گھرماں کو دب رہا کہ دیو کا کوپ، ای سسر کا ناتی البتہ کھپروا میں کہاں گھسر ل رہا (ارے وہ گھر میں کودنا تھا کہ خدا کا قہر تھا۔ یہ سسر کا ناتی البتہ معلوم نہیں کہاں کھپروں میں گھسا ہوا تھا) مجمع میں ایک سال خوردہ کانسٹبل بھی تھے۔ ماتابدل سے کچھ ''دستِ غیب'' کے طالب ہوئے مایوسی ہوئی تو سب کو تھانے پکڑ لائے۔

ریاست کی فضا، وہیں کے قوانین، ویسے ہی حاکم اور اسی قسم کے ماتحت۔ داروغہ جی لالہ گنپت رائے، نائب صاحب لالہ جنگل کشور اور دیوانجی لالہ چھیل بہاری۔ غرض سارا تھانہ لالہ زار تھا۔ لالہ گنپت رائے بہرے تھے اور بات چیت کرتے وقت ہمیشہ آلۂ سماعت کانوں سے لگا لیتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا داروغہ جی میلی دھوتی کا نصف حصہ باندھے اور نصف اوڑھے نیب کے سایہ میں بانس کی ایک کھری چارپائی پر سو رہے تھے۔ چارپائی کے ایک پائے سے آلۂ سماعت اور دوسرے سے ناریل (حقہ) آویزاں تھا۔ لالہ جنگل کشور کنوئیں پر کھڑے اشنان کر رہے تھے،

ایک کہارن کنوئیں سے پانی نکال کر ان کے اوپر ڈالتی جاتی تھی۔ منشی چھیل بہاری دفتر میں روزنامچہ سر کے نیچے رکھے خراٹے لے رہے تھے۔ موٹے شیشے کی عینک ناک سے پھسل کر نیم کشادہ دہن میں آ گئی تھی اور ہر سانس کے ساتھ حلق تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شور وغل سن کر چونکے۔ تھانے کے احاطے میں مجمع دیکھ کر اُٹھ بیٹھے۔ عینک درست کی اور کاغذات اُلٹنے پلٹنے لگے۔ لالہ گنپت رائے بھی اُٹھائے گئے۔ تھوڑی دیر میں سب اکٹھا ہو گئے اور مدعیہ ملزم اور گواہوں کے بیانات شروع ہوئے۔ قصہ سننے کے بعد یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ملزم پر کون سی دفعہ لگائی جائے۔ ہر ایک نے شروع سے آخر تک تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوج داری کی ورق گردانی کی۔ بالآخر سب نے تنگ آ کر کتاب پٹک دی اور کہنے لگے کہ یہ معاملہ زبانی ہی طے ہو جائے تو اچھا ہے۔ کتاب کو چھیڑنا اچھا نہیں ہے۔ ورنہ وکیل مختاروں کی مین میخ سے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔

دیوانجی کی رائے تھی کہ دفعہ 323 (مار پیٹ) عائد ہوتی تھی۔ لالہ جگل کشور کو اصرار تھا کہ یہ نقضِ امن اور مجمع خلاف قانون کے تحت آتا تھا۔ بہر حال کچھ طے نہیں ہو پاتا تھا کہ لالہ گنپت رائے نے یک لخت آلۂ سماعت کو ایک بار پھر چار پائی کے پایہ سے آویزاں کیا اور فرمایا۔

''یہ سب کچھ نہیں کپتان صاحب کا کیمپ قریب ہے۔ تنگ بندی کا یہ موقع نہیں ہے۔ میں اس معاملہ کی تہ تک پہنچ چکا ہوں، ذرا سا شبہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی آپ کی دعا سے دور ہوا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ 302 (قتلِ عمد) کا ہے یا 304 (قتلِ انسان) کا۔ اگر کپتان صاحب نئے نئے نہ آئے ہوتے تو قتلِ انسان چل سکتا تھا لیکن بھائی زمانہ نازک ہے پنشن کے دن بھی قریب ہیں۔ ایک کمانے اور بیس کھانے والے ہیں۔ قتلِ عمد ہی چلانا مناسب ہے۔ ایشور نے ایسا صاف قتل کا مقدمہ بھیج دیا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہیں۔ قیصر ہند کو بھی مدعی بننے کی ضرورت نہیں رہی۔ چلتے چلاتے ایسی کارروائی ہو جاتی ہے کہ سارا علاقہ تھرا جائے گا۔ مقدمہ کی صورت یہ ہے کہ اس سے قبل ملزم، مدعیہ کے گھر میں قتل کی نیت سے کودا تھا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ دوسری بار کھپرے لانے کے بہانے عمداً (دیوانجی غور کیجیے گا عمداً) ایک سانپ پکڑ لایا اور مدعیہ کو کٹانا چاہتا تھا۔ ملزم صورت سے بھی اچھا خاصا سپیرا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں بھئی

منشی چھیل بہاری کیسی رہی۔ بھئی تم کو کتاب کی قسم اس واقعے کی بھنک کپتان صاحب کے کان میں بھی ڈال دینا چاہیے۔ افسر اعلیٰ ہے، پھر انگریز ہے۔ انگریز کیا معلوم خوش ہو کر ہم کو آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دے! انسپکٹر صاحب بھی رخصت پر جانے والے ہیں۔"

ڈورس صاحب کپتان تھے، اور کپتان ہی نہیں بلکہ اپنے وقت کے کلکٹر کمشنر اور لاٹ صاحب بھی۔ قانون اور قاعدے سے ان کو اتنا ہی مس تھا جتنا نئی روشنی کی بیویوں کو اپنے مہذب اور مصلحت اندیش شوہروں سے۔ اکثر تمام دن دھوپ میں روئی کی نیم آستین پہن کر خندق کھودا کرتے تھے اور شام کو کشتی لڑتے تھے۔ رات کو اجلاس شروع ہوتا تھا۔ اختلاف رائے کا اظہار اس لمبے کوڑے سے کیا کرتے تھے جو ہر وقت ان کے پاس رہتا۔ صاحب کی خوش نودی مزاج یا اپنی سلامتی ذات کی خاطر میں ان کے چھوٹے بڑے لواحقین بھی بلا قید موسم روئی دار کپڑے استعمال کرتے تھے۔ ایک بار محرر پیشی کو ملزم کی حیثیت سے کسی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ اتفاق سے اس دن ڈورس صاحب کا بھی اجلاس تھا۔ محرر کی طلبی ہوئی تو غیر حاضر پایا گیا۔ جھنجھلا کر کوڑے کی طرف متوجہ ہوئے تو بوڑھے اردلی نے کہا۔

اردلی۔ ہوا کیا، محرر کو فوج داری والے پکڑ لے گئے۔ کچھ کرتے دھرتے تو نہیں سب کو ناحق بے ناحق پیٹا کرتے ہو!

ڈورس صاحب۔ (غضب ناک ہو کر) کہاں گیا فوج داری والا؟

اردلی۔ وہ کیا سامنے اجلاس ہو رہا ہے۔

ڈورس صاحب نے کوڑا سنبھالا، سامنے عدالت میں جا گھسے، دیکھا کہ ان کا محرر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور بیان ہو رہا ہے۔ وکیل مختار تو دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئے، حاکم نے بھی فوراً آرام کمرے کا رُخ کیا۔ پیش کار صاحب کو کہیں جگہ نہ ملی تو میز کے نیچے دبک گئے۔ ڈورس صاحب نے اپنے محرر کی گردن دبوچی اور ایک کوڑا رسید کیا۔ بدمعاش یہاں کس کے حکم سے آیا، اور دھکا دیتے اور کوڑے سے ہنکاتے ہوئے اپنے اجلاس میں پکڑ لائے۔ حاکم اجلاس نے کلکٹر صاحب سے جا کر شکایت کی تو موصوف نے فرمایا۔ "جانے ہی دو، پاگل سے دور ہی رہنا اچھا ہے۔"

ڈورس صاحب کبھی سوال کرتے تھے تو فوراً ہی بعد پوچھتے تھے، ''سمجھا'' مخاطب کی خیریت اسی میں تھی کہ اگر نہ سمجھا ہو تو فوراً کہہ دے کہ نہیں سمجھا۔ اگر کسی نے شامتِ اعمال سے ذہن پر زور دے کر ادھر اُدھر کا جواب دے دیا اور ڈورس صاحب کی تشفی نہ ہوئی تو فوراً کوڑے سے خبر لیتے تھے۔ اتفاق سے جس روز چھتیا اور ماتابدل کا مقدمہ پیش ہونے والا تھا ڈورس صاحب نے پیش کار سے دریافت کیا۔

ڈورس صاحب۔ ''ول پیش کار ایک ہم ایک تم کیا ہوا سمجھا؟''

پیش کار۔ (فوراً) ''حضور نہیں سمجھا!''

ڈورس صاحب۔ ''دیکھو ایک ہم اور ایک تم کیا ہوا؟''

پیش کار۔ ''حضور بالکل نہیں سمجھا (دفعتاً کچھ سوچ کر) اگر حکم ہو تو داروغہ جی کو بلا لاؤں وہ خوب سمجھتے ہیں اور اس وقت اتفاق سے حضور کو سلام کرنے آئے ہوئے ہیں۔

ڈورس صاحب۔ بلاؤ!

پیش کار نے اردلی کی طرف اشارہ کیا، لالہ گنپت رائے ایک لمبا چغا پہنے پگڑی باندھے حاضر ہوئے۔

ڈورس صاحب۔ ''ول تھانے دار، ایک ہم ایک تم کیا ہوا؟''

تھانے دار صاحب نے حسبِ دستور آلۂ سماعت نکال کر کان کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ڈورس صاحب کا کوڑا ہوا میں بلند ہوا۔ تھانے دار صاحب نے فوراً راہ فرار اختیار کی۔ ڈورس صاحب نے تعاقب کیا۔ جھاڑی کا احاطہ تھا۔ لالہ گنپت رائے نے کوشش کی کہ کسی طرح جھاڑی سے نکل جائیں۔ کانٹوں نے دامن اور پگڑی دونوں کو گرفتار کرلیا۔ داروغہ جی کانٹوں میں گرے۔ ڈورس صاحب ادھر سے نازل ہوئے۔ دوسری طرف چھتیا، عمالِ تھانہ اور دوسرے تماشائیوں میں خلفشار مچ گیا۔ جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگ نکلا۔

شام تک ماتابدل بھی مکان پہنچ گئے۔

مطبوعہ: الناظر، لکھنؤ، اگست 1924

●●●

کارواں پیدا است

کہتے ہیں ایک بار تین بزرگ ہم سفر ہوئے۔ ایک نائی، ایک گنجا اور ایک فلسفی۔ رات آئی تو یہ طے پایا کہ ہر شخص باری باری سوئے جاگے۔ ترتیب یہ قرار پائی کہ سب سے پہلے نائی پہرا دے، اس کے بعد فلسفی، اس کے بعد گنجا۔ چنانچہ موخر الذکر دونوں سو رہے اور نائی پہرہ دینے لگا۔ کچھ دیر تک تو جاگتا رہا آخر طبیعت اُکتائی تو سوچا کہ کوئی مشغلہ ہونا چاہیے ورنہ وقت کٹنا دوبھر ہو جائے گا۔ چنانچہ استرہ نکالا اور بیٹھے بیٹھے فلاسفر کا سر مونڈ دیا۔ وقت معینہ ختم ہونے پر اس نے فلسفی کو جگا دیا اور خود سو رہا۔ فلسفی نے جمائی لے کر اتفاقاً سر پر ہاتھ پھیرا تو چونک پڑا اور متحیر ہو کر بولا۔ ''باری تو میری تھی کم بخت نائی نے گنجے کو کیوں جگا دیا۔''

مجید ملک صاحب[1] سے یہ طے ہوا تھا کہ ہو سکا تو کارواں کے لیے مضمون لکھ دوں گا، بات آئی گئی ہو گئی۔ مجید صاحب کو یقین کہ میں مضمون لکھ دوں گا اور مجھے اس پر بھروسہ کہ لکھنا تو اپنے اختیار کی بات ہے۔ چنانچہ مجید صاحب نے یاددہانی کے طرح طرح کے طریقے اختیار کیے۔ لیکن بات جہاں کی تہاں رہی۔

ایک روز دروازے پر ایک موٹر رُکی۔ میں نے ہر قسم کی موٹر دیکھی ہے لیکن یہ اپنی سج دھج اور شور و شغب میں نرالی تھی۔ رُکی رہتی تو معلوم ہوتا کوئی سنیاسی حبس دم کیے ہوئے ہے۔

---

1 مجید ملک مرحوم ایڈیٹر رسالہ 'کارواں'۔ لاہور

چلنے والی ہوتی تو معلوم ہوتا زلزلہ آ رہا ہے، چل نکلتی تو پھر:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!

ڈاکٹر عطاءاللہ بٹ صاحب [1] نمودار ہوئے۔ ایک نعرہ لگایا کہاں ہے رشید؟ نوکر، بچے، اعزا، سب بھاگ کر اندر آ گئے باوجود اس کے کہ میں اپنے مکان کے اس کمرے میں تھا جہاں اندر صحن کی آواز بھی بہ مشکل پہنچ سکتی تھی، اس خلفشار نے مجھے سراسیمہ کر دیا۔ باہر نکلا تو آواز آئی ارے مجید کا خط آیا ہے تم نے کارواں کے لیے مضمون لکھا یا نہیں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ گھر والوں میں سے کوئی بیمار تو نہیں ہے جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو کسی قدر دلیر ہو کر بولا کیسا مضمون، فرمایا اس کا خط آیا ہے کہ مضمون لے کر بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا جناب لکھنے یا نہ لکھنے کا وعدہ تو میں نے ان سے کیا تھا آپ مجھ پر کیسے مسلط ہو گئے۔ بولے سلام علیکم۔ گاڑی پر لرزہ طاری ہوا، محلہ والوں کے کان کھڑے ہوئے، انجن نے زقند بھری اور سوار و سواری دونوں غائب! یا مظہر العجائب!

ٹائیفائڈ نے ورود فرمایا۔ گھر میں بچی بیمار ہوئی ارادہ کیا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلوں، ساتھ ہی ساتھ مضمون کا خیال آیا جس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ جھوٹ بولنے کی تحریک ہوئی۔ ایک مصرعہ بھی ذہن میں آ گیا، ایسا رواں اور شگفتہ کہ دیکھتے دیکھتے پوری غزل مرتب ہو گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ یہ میرس روڈ پر حال ہی میں تیار ہوئی ہے۔ وسیع خوش قطع سامنے گھاس کا کشادہ میدان، آمد و رفت کا راستہ چوڑا صاف ستھرا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی، انفلوئنزا میں مبتلا تھے۔ دیکھتے ہی بولے خوب آئے کوٹھی کا نام تجویز کرو۔ میں نے کہا آپ نے رو کار پر یہ کیا لکھوا رکھا ہے۔ فرمایا حمید بٹ اور محمود بٹ۔ عرض کیا یہ کوٹھی کا نام ہے یا خاندان کا شجرۂ نسب۔ کہنے لگے ہرج کیا ہے؟ میں نے کہا ایسا نام بھی کیا جس کو نہ ثواب سے لگاؤ نہ آرٹ سے تعلق۔ ثواب کی خاطر رکھتے تو کراماً کاتبین میں کیا قباحت تھی۔ آرٹ مدنظر تھا تو یاجوج ماجوج رکھتے۔ اُکتا کر بولے ناک میں دم ہے، تم ہی بتاؤ، لیکن میں منزل و نزل کا قائل نہیں۔ میں نے کہا بٹ کدہ نام رکھیے رفتہ رفتہ بت کدہ بن جائے گا۔

---

1 ڈاکٹر عطاءاللہ بٹ یونیورسٹی کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھے۔

عرض کیا بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے، کہنے لگے حال سناؤ۔ میں نے کہنا شروع کیا اور ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا۔ میں نے ابھی بحر متعین نہیں کی تھی، ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کر دی۔ اتنے میں طائیہ بی دوڑی آئیں۔ فرمایا باجی نے پوچھا ہے آپ نے کارواں کے لیے مضمون لکھا۔ میں نے کہا کہ باجی سے کہہ دیجیے کہ اس چکر میں نہ پڑیں۔ ایڈیٹر اور مضمون نگار کے معاملات اور ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم دونوں کو للکارا کمرے سے باہر نکل جاؤ۔ طائیہ بی تو بے چاری گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ میں نے کہا، جناب والا آپ کا یہ حکم بحیثیت مالک مکان کے ہے یا بحیثیت ڈاکٹر کے۔ فرمایا تم کو معلوم ہے انفلوئنزا متعدی ہوتا ہے۔ میں نے کہا انفلوئنزا کا متعدی ہونا مسلّم لیکن آپ کا بداخلاق یا بدحواس ہونا کہاں تک روا ہے۔ ڈاکٹروں نے مرض کو اور مولویوں نے مذہب کو ہوا بنا رکھا ہے۔ مرض میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہونا اتنا بڑا سانحہ نہیں جتنا مریض سے بھاگنا بزدلی اور شقاوت۔ کہنے لگے لفاظی کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھو یہ تو بتاؤ مضمون بھی لکھا یا نہیں، اس کے لیے میں تیار ہو کر آیا تھا بولا، عنقریب ختم ہونے والا ہے لیکن بچی کی بیماری کو کیا کروں۔ فرمایا اچھی ہو جائے گی مضمون تیار کرلو۔ میں نے کہا، لیکن مشکل یہ ہے کہ مضمون لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ کا نسخہ لکھ ڈالنا۔ کہنے لگے تو پھر تم نے لکھنے کا وعدہ کیوں کیا ہوا تھا۔ میں نے عرض کیا، ڈاکٹر صاحب بعض وعدے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے آپ نے کہا سلام علیکم، میں نے کہا وعلیکم السلام۔ ایک اضطراری فعل کا جواب دوسرے اضطراری فعل سے دے دیا گیا ہے۔ اس کے ایفا پر آپ کا اصرار کرنا ''حق آسائش میں خلل اندازی'' ہے۔ فرمایا اچھا رخصت۔ سلام علیکم!

تعطیلوں میں بارش اور چوروں کی یورش ہوئی۔ اس پر لطف یہ کہ مکان ایک حصہ کی توسیع ہو رہی تھی، بارش اور سلسلۂ تعمیر نے ''کاشانہ کا کیا یہ رنگ۔''

کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا دن تو ڈاکٹروں کے ہاں حاضری دینے میں کٹتا رات بھر تیمارداری کا سلسلہ جاری رہتا۔ ایک بار تنگ آکر کہا تیمارداری سے تو بہتر ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو جانا ہے۔ بیوی نے کہا خاموش ہو جاؤ اللہ کی مصلحت میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ میں نے کہا چون و چرا

کون کرتا ہے۔ رات بھر بچی کو گود میں لے کر ٹہلانے میں ایسے فقرے نکل ہی جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہب کے معاملات میں بھی مجھ سے مشتبہ ہو جاؤ۔ مصلحت کی قائل تو مجھ سے زیادہ تم ہو نہیں سکتیں۔ دیکھتی نہیں آج کل چوروں کی وجہ سے تمام لوگ کتنے پریشان ہیں، لیکن ہم تم کس قدر بے فکر ہیں۔ بچی کی بیماری چوروں سے نجات کا باعث بن گئی۔ ورنہ مکان ٹوٹا ہوا ہے، چور گھس آتے تو ہماری تمہاری بے پردگی تو ہوتی ہی تمھاری کفایت شعاری اور میری زیرباری دونوں مال مسروقہ بن جاتیں۔ بیوی نے کہا، اچھا چپ رہو رات کے وقت چور ڈاکو کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن آخر برسات میں مکان چھیڑنے کو کس نے کہا تھا۔ عرض کیا کہا کس نے تھا مصیبت کہیں کہہ کر آتی ہے، ضرورت اور اتفاق کس کے بس کے ہیں۔ تم ہی بتاؤ ہماری تمھاری شادی کو کس نے کہا تھا کہ عین طوفان کی حالت میں ہو اور رخصتی طوفانِ نوح اور کشتی نوح میں ہو۔ جھلا کر کہا کہاں کی بات کہاں پہنچادی تم تو، مجھے ہمیشہ وبالِ جان سمجھتے رہے۔ میں نے کہا، بڑی مشکل ہے۔ میں نے چوروں کا تذکرہ کیا تو تم نے کہا رات کے وقت اس کا ذکر نہ کرو، میں نے سوچا نیت شب بخیر، شادی کا قصہ چھیڑوں اس پر تم چراغ پا ہو گئیں۔

تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے [1]

اتنے میں بچی روئی اور میں پھر ڈکی چلنے لگا، اور موسیقی کی وہ دھن شروع کردی جو موسیقی کی ایجاد سے بہت پہلے مدوّن ہو چکی تھی۔ اب بارش کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہوا چلنے لگی شب کی تاریکی و خاموشی میں ایک طرح کا نم آلود سکر پیدا ہوا، جس نے رفتہ رفتہ دماغ اعضا اور عضلات میں سرایت کرنا شروع کیا۔ اس وقت میں زندگی کا ماحصل یا زندگی کی زبونی وورماندگی کا معاوضہ اس آرام کی نیند سے تعبیر کر رہا تھا جو مجھے اپنے اس صاف ستھرے بستر پر میسّر آسکتی تھی جس پر میں نے کبھی اپنی طویل بیماری میں نہایت مایوسی اور بے قراری کی راتیں گزاری تھیں۔ زندگی کے بعض لمحات بھی کس درجہ عجیب ہوتے ہیں جب انسان بے اختیار یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ان لمحات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی قیمتی ترین متاع بھی قربان کی جا سکتی ہے۔

---

1 مکمل شعر:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے   تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے   غالب

بچّی کو میں نے چارپائی پر آہستہ سے سلا دیا۔ خیال آیا بیوی کو جگا کر خود سو رہوں۔ اتنے میں چوکیدار کی چیخ سنائی دی۔ اس محلہ کے چوکیدار کی آواز ایسی ہے گویا چور کو دیکھ کر خوف کے مارے اس کی چیخ نکل گئی ہو۔ بیوی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ بشرے سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا چیخ کا مصنف میں تھا۔ فرمایا دیکھتے نہیں بچّی بیمار ہے۔ میں نے کہا، دیکھنے کی کون سی بات ہے۔ میں تو اس کے علاوہ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ آرام فرما رہی ہیں۔ چوکیدار چیخ رہا ہے، بارش ہو رہی ہے اور میں اُلو کی طرح بیٹھا ہوں۔ فرمایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کس طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔ اچھا اب جا کر سو رہیں گے، تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ آپ کو ڈاکٹر بٹ صاحب کے پاس جانا ہوگا اور ہاں آمنہ بی کہتی تھیں کہ آپ نے کوئی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا جسے اب تک پورا نہیں کیا۔ میرے تحمّل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے کہا وعدہ تو میں نے کیا تھا آپ کیوں سر پر سوار ہو گئیں۔ جی میں آیا لکھوں گا جی میں نہ آیا نہ لکھوں گا۔ نیک بخت بولیں، اچھا شور نہ مچایئے۔ اتنا بھی تو لحاظ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب ہم لوگوں پر کتنا کرم کرتے ہیں۔ ان کی ایک ذرا سی فرمائش تو پوری نہیں ہوتی سارا گھر سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ آپ کا مضمون میری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں۔ میں نے کہا جس دن میرا مضمون آپ کی سمجھ میں آ گیا، اسی دن میں خودکشی بھی کر لوں گا۔ فرمایا خودکشی کے اس سے بہتر مواقع پیش آیا کیے ہیں، لیکن آپ نے اپنا ارادہ ملتوی رکھا۔

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لیے نہیں کہ اس سے رفع شر مقصود تھا بلکہ کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔ جا کر چارپائی پر لیٹ رہا۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر پر کارواں کا انبار ہے موٹر بے تحاشا چلی آ رہی ہے۔ کھڑ کھڑ، دھڑ دھڑ، تڑ تڑ تڑ تڑ، چڑ چڑ اور... ارارا رادھڑام میرے اوپر سے گزر گئی۔ آنکھ کھل گئی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بچّی کو دیکھنے آئے ہیں اور دروازے پر کھڑے نعرے لگا رہے ہیں!

ڈاکٹر عبادالرحمٰن خان[1] بیمار ہوئے۔ ایک آدھ دن ملاقات نہیں ہوئی۔ خیال کیا الموڑہ سے بیوی بچے واپس نہیں آئے، ممکن ہے ان کی فکر میں ہوں۔ بالآخر معلوم ہوا بیمار ہیں، کوئی کہتا ہے

1. ڈاکٹر عبادالرحمٰن شعبۂ جغرافیہ کے استاد اور رشید صاحب کے گہرے دوست۔

ملیریا ہے کوئی ٹائیفائڈ بتاتا ہے۔ پہنچا تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں اور ان کے طالب علم تیمارداری میں مصروف ہیں۔ پوچھا کیسا مزاج ہے تو اس قدر آہستہ جواب دیا، گویا الموڑہ سے آواز آرہی ہے۔ بخار ہے، میں نے کہا، اللہ رحم کرے لیکن یہ بتاشے کی طرح بیٹھے کیوں جارہے ہیں۔ بخار ہے تو ہوا کرے اور زیادہ نحیف آواز میں بولے، ٹائیفائڈ ہوا، تو میں نے کہا کہ میں اپنے سارے قرضے ابھی معاف کیے دیتا ہوں۔ اس پر ڈاکٹر خان چونکتے ہوئے، آواز میں کسی قدر توانائی آئی۔ بولے کیسا قرض، ارے تم میرے مقروض ہو یا میں تمھارا۔ میں نے کہا بھائی کسی کا قرض ہو یہ موقع تو صرف معاف کرنے کرانے کا ہے۔

خون کا معائنہ کیا گیا رپورٹ دیکھ کر ڈاکٹر اصغر نے کہا ٹائیفائڈ تو ہے نہیں ملیریا البتہ ہے۔ میں نے کہا آپ مریضوں کے نہیں بلکہ طالب علموں کے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کی رائے لینے یا دینے کے کوئی معنی نہیں۔ فرمایا، آپ احمق ہیں، ٹمپریچر چارٹ دیکھو تو معلوم ہو اگراف کا موجودہ نشیب و فراز ٹائیفائڈ کا نہیں ہے۔ عرض کیا ٹائیفائڈ اور ملیریا دونوں ہوتو کیا ہو۔ فرمایا ممکن ہے۔ میں نے کہا، آپ کے فیصلہ کا یہی حال ہے تو تھوڑی سی ہومیو پیتھک پڑھ ڈالیے۔ کہنے لگے خوب یاد دلایا۔ ٹائیفائڈ میں ہومیو پیتھک علاج بڑا کارگر ہوتا ہے۔ اگر یہ متیقن ہو جائے تو یقیناً ہومیو پیتھک علاج کرنا چاہیے۔ عرض کیا کہ جب تک مرض یا علاج متیقن نہ ہو اور آپ کی رائے ہو تو میں زعفران سے آیتہ شفا لکھ کر پلانے کا انتظام کروں۔ ڈاکٹر صاحب بولے، مذاق کی کون سی بات ہے۔ کیا معلوم زعفران کی مقدار بجائے خود ہومیو پیتھک خوراک ہوتی ہو۔ میں نے کہا، آپ تو بحیثیت ایک سائنس داں کے زعفران کے معتقد ہوں گے۔ خود ڈاکٹر خان آیتہ شفا کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر خان نے متغض ہو کر کہا تم دونوں یہاں سے دفع ہو تو میری جان بچ جائے اور مجھ پر بڑا احسان ہو اگر آپ لوگ میرے پاس باری باری آیا کریں۔

بخار قائم رہا۔ انار اور سنترے کا عرق، آش جو ہمبل سب کچھ دیا گیا۔ ایک پیش نہ گئی۔ ایک دن حسب معمول میں اور اصغر صاحب دیکھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے۔ حال دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوا اور غذا دونوں سے بیزار ہیں اور برابر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم دونوں دخل

درمعقولات دینے مریض کے پاس پہنچے۔ پوچھا آخر دوا کیوں نہیں پیتے؟ فرمایا کچھ استعمال نہ کروں گا۔ معدہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، بخار کا وہی عالم ہے۔ میں نے کہا، دوا تو ہر حال میں پینی پڑے گی۔ آپ کو جو تکلیف ہے اس کا دفعیہ صرف دوا سے ممکن ہے۔ اصغر صاحب اور مجھ کو دیکھیے تندرستی میں بھی دوا ترک نہیں کرتے۔ اصغر صاحب نے فرمایا جھوٹے ہو، تم ہی تندرستی میں دوا پیتے ہو گے۔ ڈاکٹر خاں نے کہا میں کچھ نہ کروں گا۔ میں نے کہا آپ تو بچوں اور جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے عزیز شاگرد آپ کی جتنی اور جیسی خدمت کرتے ہیں اس کو دیکھ کر اصغر صاحب کو رشک ہے۔ کہتے تھے اتنی اور ایسی خدمت میری ہو تو میں بیمار ہونے کو تیار ہوں۔ اصغر صاحب نے کہا جھوٹے ہو۔ میں نے کب کہا کہ میں بیمار ہونے کو تیار ہوں۔ ڈاکٹر خان مسکرائے تو میں نے کہا، دوا پی لیجیے۔ فرمایا بکومت۔ میں نے کہا، آپ کے اس جواب سے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کا مسکرانا محض منافقت تھی، دوا بہر حال پینی پڑے گی۔ بولے معاف کیجیے اور تشریف لے جایئے۔ عرض کیا، آپ کی تندرستی میں کبھی یہ خطرہ نہیں گزرا کہ آپ اس درجہ بے تکے اور ضدی ہیں۔ میں تو آپ کو ان لوگوں میں سمجھتا تھا جو دوستوں کی خاطر بڑی سے بڑی حماقت کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ فرمایا بھائی جان ہی لینے پر آمادہ ہے تو سب کچھ کروں گا۔ سوڈا اور دودھ دیا گیا اس کے بعد دوا پلائی گئی اور ہم سب مکان واپس آئے۔

المورٔہ سے بیوی بچے آئے، تیمار دار کم ہونے لگے۔ ایک دن شام کو پہنچے تو لوگوں نے اندر جانے سے منع کیا کہ آج اضمحلال زیادہ ہے۔ میں نے کہا، پھر تو ہماری موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ پردہ کرایا گیا اندر پہنچے تو موصوف واقعی نڈھال پائے گئے۔ نہایت نحیف آواز سے بولے طبیعت بہت درماندہ ہے حرکت کرنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے کہا، یہ علامت اچھی ہے بخار اور نشہ دونوں کی یکساں خاصیت ہے۔ اُترنے میں اضمحلال بڑھتا رہا اس لیے آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ اس سے بیوی تیمار دار سب خوش ہوں گے۔ مرشد کا قول آپ کو نہیں یاد رہا کہ خوش رہنا مفید غذا مقوی دوا ہے۔

میں نے کہا، کچھ اور بھی سنا! خان صاحب جرمنی جانے والے ہیں اور اصغر صاحب حج کرنے والے ہیں۔ اصغر صاحب بولے "خان صاحب حج کو جا رہے ہیں اور میرا ارادہ جرمنی

ملیریا ہے کوئی ٹائیفائڈ بتاتا ہے۔ پہنچا تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں اور ان کے طالب علم تیمارداری میں مصروف ہیں۔ پوچھا کیسا مزاج ہے تو اس قدر آہستہ جواب دیا، گویا الموزہ سے آواز آرہی ہے۔ بخار ہے، میں نے کہا، اللہ رحم کرے لیکن یہ بتاشے کی طرح بیٹھے کیوں جارہے ہیں۔ بخار ہے تو ہوا کرے اور زیادہ نحیف آواز میں بولے، ٹائیفائڈ ہوا، تو میں نے کہا کہ میں اپنے سارے قرضے ابھی معاف کیے دیتا ہوں۔ اس پر ڈاکٹر خان چونکتے ہوئے، آواز میں کسی قدر توانائی آئی۔ بولے کیسا قرض، ارے تم میرے مقروض ہو یا میں تمھارا۔ میں نے کہا بھائی کسی کا قرض ہو یہ موقع تو صرف معاف کرنے کرانے کا ہے۔

خون کا معائنہ کیا گیا رپورٹ دیکھ کر ڈاکٹر اصغر نے کہا ٹائیفائڈ تو ہے نہیں ملیریا البتہ ہے۔ میں نے کہا آپ مریضوں کے نہیں بلکہ طالب علموں کے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کی رائے لینے یا دینے کے کوئی معنی نہیں۔ فرمایا، آپ احمق ہیں، ٹمپریچر چارٹ دیکھو تو معلوم ہو اگراف کا موجودہ نشیب وفراز ٹائیفائڈ کا نہیں ہے۔ عرض کیا ٹائیفائڈ اور ملیریا دونوں ہو تو کیا ہو۔ فرمایا ممکن ہے۔ میں نے کہا، آپ کے فیصلہ کا یہی حال ہے تو تھوڑی سی ہومیو پیتھک پڑھ ڈالیے۔ کہنے لگے خوب یاد دلایا۔ ٹائیفائڈ میں ہومیو پیتھک علاج بڑا کارگر ہوتا ہے۔ اگر یہ متیقن ہوجائے تو یقیناً ہومیو پیتھک علاج کرنا چاہیے۔ عرض کیا کہ جب تک مرض یا علاج متیقن نہ ہو اور آپ کی رائے ہو تو میں زعفران سے آیۂ شفا لکھ کر پلانے کا انتظام کروں۔ ڈاکٹر صاحب بولے، مذاق کی کون سی بات ہے۔ کیا معلوم زعفران کی مقدار بجائے خود ہومیو پیتھک خوراک ہوتی ہو۔ میں نے کہا، آپ تو بحیثیت ایک سائنس داں کے زعفران کے معتقد ہوں گے۔ خود ڈاکٹر خان آیۂ شفا کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر خان نے متغض ہو کر کہا تم دونوں یہاں سے دفع ہو تو میری جان بچ جائے اور مجھ پر بڑا احسان ہو اگر آپ لوگ میرے پاس باری باری آیا کریں۔

بخار قائم رہا۔ انار اور سنترے کا عرق، آش جو مبہل سب کچھ دیا گیا۔ ایک پیش نہ گئی۔ ایک دن حسب معمول میں اور اصغر صاحب دیکھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے۔ حال دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوا اور غذا دونوں سے بیزار ہیں اور برابر پیچ وتاب کھاتے رہتے ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم دونوں دخل

درمعقولات دینے مریض کے پاس پہنچے۔ پوچھا آخر دوا کیوں نہیں پیتے؟ فرمایا کچھ استعمال نہ کروں گا۔ معدہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، بخار کا وہی عالم ہے۔ میں نے کہا، دوا تو ہر حال میں پینی پڑے گی۔ آپ کو جو تکلیف ہے اس کا دفعیہ صرف دوا سے ممکن ہے۔ اصغر صاحب اور مجھ کو دیکھیے تندرستی میں بھی دوا ترک نہیں کرتے۔ اصغر صاحب نے فرمایا جھوٹے ہو، تم ہی تندرستی میں دوا پیتے ہوگے۔ ڈاکٹر خاں نے کہا میں کچھ نہ کروں گا۔ میں نے کہا آپ تو بچوں اور جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے عزیز شاگرد آپ کی جتنی اور جیسی خدمت کرتے ہیں اس کو دیکھ کر اصغر صاحب کو رشک ہے۔ کہتے تھے اتنی اور ایسی خدمت میری ہو تو میں بیمار ہونے کو تیار ہوں۔ اصغر صاحب نے کہا جھوٹے ہو۔ میں نے کب کہا کہ میں بیمار ہونے کو تیار ہوں۔ ڈاکٹر خان مسکرائے تو میں نے کہا، دوا پی لیجیے۔ فرمایا بکومت۔ میں نے کہا، آپ کے اس جواب سے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کا مسکرانا محض منافقت تھی، دوا بہر حال پینی پڑے گی۔ بولے معاف کیجیے اور تشریف لے جایئے۔ عرض کیا، آپ کی تندرستی میں کبھی یہ خطرہ نہیں گزرا کہ آپ اس درجہ بے تکے اور ضدی ہیں۔ میں تو آپ کو ان لوگوں میں سمجھتا تھا جو دوستوں کی خاطر بڑی سے بڑی حماقت کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ فرمایا بھائی جان ہی لینے پر آمادہ ہے تو سب کچھ کروں گا۔ سوڈا اور دودھ دیا گیا اس کے بعد دوا پلائی گئی اور ہم سب مکان واپس آئے۔

الموڑہ سے بیوی بچے آئے، تیماردار کم ہونے لگے۔ ایک دن شام کو پہنچے تو لوگوں نے اندر جانے سے منع کیا کہ آج اضمحلال زیادہ ہے۔ میں نے کہا، پھر تو ہماری موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ پردہ کرایا گیا اندر پہنچے تو موصوف واقعی نڈھال پائے گئے۔ نہایت نحیف آواز سے بولے طبیعت بہت درماندہ ہے حرکت کرنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے کہا، یہ علامت اچھی ہے بخار اور نشہ دونوں کی یکساں خاصیت ہے۔ اُترنے میں اضمحلال بڑھتا رہا اس لیے آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ اس سے بیوی تیماردار سب خوش ہوں گے۔ مرشد کا قول آپ کو نہیں یاد رہا کہ خوش رہنا مفید غذا مقوی دوا ہے۔

میں نے کہا، کچھ اور بھی سنا! خان صاحب جرمنی جانے والے ہیں اور اصغر صاحب حج کرنے والے ہیں۔ اصغر صاحب بولے ''خان صاحب حج کو جا رہے ہیں اور میرا ارادہ جرمنی

کا ہے۔'' میں نے کہا'' یہ تو آپ لوگ ایک بار کر چکے ہیں لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، اب آپ حج کو جائیں اور خان صاحب جرمنی ہو آئیں۔ اس طور پر مذہب اور آرٹ یا مولوی اور عورت کی بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔'' ڈاکٹر خان بولے'' خود کیوں نہیں ہو آتے۔'' میں نے کہا'' میں اور آپ دونوں گئے گزرے لوگوں میں ہیں۔ میں شیروانی پاجامہ پر ہیٹ لگاتا ہوں۔ آپ کوٹ پتلون میں مزارات پر جاتے ہیں۔

باہر نکلے اور زینہ سے اُتر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب اپنی بھونچال پر سوار آدھمکے۔ دور ہی سے للکارا تم لوگ مریض کے پاس کیسے پہنچے؟ عرض کیا کیوں نہ پہنچتے۔ ڈاکٹر صاحب بگڑ کر بولے، میں نے ہدایت کردی تھی کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے۔ میں نے کہا ہم لوگ 'شخص' کب ہیں، ہم تو علاج ہیں۔ فرمایا، ناک میں دم ہے اور کیوں جی مضمون لکھا۔ میں نے بھی کہا ناک میں دم ہے۔ فرمایا، سلام علیکم۔ ہم لوگ تانگے پر بیٹھ کر واپس ہوئے۔

راستے میں اصغر صاحب نے فرمایا، کیوں جی آٹھ دس دن سے تانگے پر یہاں آتے جاتے ہیں کرایہ کون دیا کرتا ہے۔ میں نے کہا تانگے والے سے پوچھیے۔ بگڑ کر فرمایا، تانگے والے سے کیوں پوچھا جائے تم جو مفت خوری کرتے ہو۔ عرض کیا اور کبھی آپ کو یہ بھی خیال آیا میں تعظیماً برابر آگے بیٹھتا آیا ہوں اور ارباب باصفا پر مخفی نہیں کہ جو شخص تانگے پر آگے بیٹھتا ہے اس کا کرایہ معاف ہوتا ہے۔

فرمایا، یہ سب صحیح لیکن آپ خود کیوں نہیں تانگہ کرتے ہیں۔ عرض کیا، سوال سینئر اور جونیئر کا ہے۔ پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ سفر میں ایک شخص کو سردار بنا لیا جاتا ہے، بقیہ اس کی متابعت کرتے ہیں۔ سینئر اور جونیئر میں فرق یہ ہے کہ میں جونیئر، آپ سینئر کی معیت میں ہوں تو میرا خوش گوار فرض ہوگا کہ میں تانگہ پکڑ لاؤں، اسباب بار کراؤں، کرایہ چکاؤں۔ کسی دُکان پر جائیں تو آپ تانگے پر بیٹھے رہیں میں کپڑے، موزے، جوتے، پھل پھلہری لالا کر آپ کو دکھاؤں، کوئی فقیر آجائے تو مار بھگاؤں یا آپ کی نقدی میں سے خیرات دے دوں، مجھے کوئی چیز پسند آجائے تو آپ خرید دیں۔ کچھ بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو قبل اس کے کہ آپ غلط اردو

بولنے پر مجبور ہوں، میں غلط انگریزی بولنے لگوں۔ برج کی صحبت ہو اور ہم آپ ایک طرف ہوں تو اگر آپ ایک نو ٹرمپ کہیں تو میں دو نو ٹرمپ کہوں۔ دشمن آپ کو ڈبل کرے تو میں ''ری ڈبل'' کروں۔ آپ غلطی کریں تو مجھے برا بھلا کہہ لیں مجھے بحیثیت جونیئر کے کوئی حق نہ ہوگا کہ سینئر کے خلاف ایک لفظ منہ سے نکالوں!

فرمایا شکریہ! لیکن آپ خود کیوں نہ سینئر بنیں۔ میں نے کہا سینئر بننا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے صورت شکل، وضع قطع، رکھ رکھاؤ ضروری ہے۔ مجھے اکثر میٹنگ وغیرہ میں شریک ہونے کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات ایسی دشواریاں پیش آئیں اور رُسوائی ہوئی کہ اکثر جی میں آیا کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاؤں۔ اوّل تو قلی پوچھتا ہے، صاحب اسباب انٹر کلاس میں رکھوں۔ اس کے بعد ہر بڑے اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر آکر دیکھ جاتا ہے۔ خوانچہ والے دہی بڑے پیش کرتے ہیں، پانی والا تاملوٹ اور بالٹی دکھاتا ہے!

ان حالات کو دیکھتے ہوئے انصاف فرمایئے جو میں سینئر بننے کی کہاں تک صلاحیت ہے۔ دوسری طرف اپنے کو ملاحظہ فرمایئے۔ آپ سے زیادہ یونیورسٹی میں نہ کوئی خوش لباس نہ خوش اطوار، نہ خوش اوقات، آپ کا پاندان میری بیوی کے سنگاردان سے زیادہ خوب صورت ہے۔ اُبلا پانی پیتے ہیں، ٹیکے لگواتے ہیں، مکھی زندہ نہیں رہنے دیتے، قاعدے سے برج کھیلتے آئے ہیں، خواہ قاعدے کے سبب سے بنتے ہوئے گیم کے بجائے دو چار ہاتھ ڈاؤن ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ سالن میں مرچ نہیں کھاتے، چائے میں دودھ نہیں ڈالتے، بدتمیزی معاف نہیں کرتے، قرض کا تقاضا نہیں کرتے، ہر روز شیو کرتے ہیں اور دو بار غسل کرتے ہیں۔ نہ کبھی کلاس چھوڑتے ہیں نہ ٹرین۔ میں تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لوں تو کسی کو یقین نہ آئے آپ بے ٹکٹ بھی سفر کریں تو کوئی قریب آنے کی ہمت نہ کرے۔ آپ سے ہاتھ ملانے کے لوگ متمنی اور منتظر۔ میرا سلام لینے سے مستغنی اور بیزار انصاف کیجیے ایسی حالت میں کون سینئر بننے کا مستحق اور سزاوار ہے؟

فرمایا آپ ہیں احمق، مسخرہ بننے کی کوشش فرماتے ہیں۔ ذرا آئینہ میں شکل ملاحظہ فرمایئے۔ میں نے کہا آپ کے یہ خیالات غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں احمق نہیں اس لیے کہ چندہ دیتا

ہوں، خیرات نہیں کرتا۔ پردہ کا حامی ہوں لیکن علانیہ رقص کرتا ہوں۔ غریب پر آنچ آئے تو گورنمنٹ کا ساتھ دیتا ہوں۔ اپنے اوپر آفت آئے تو جہاد کی تلقین کرتا ہوں۔ رہی مسخرگی اس کا الزام یوں غلط ہے کہ یہ بجائے خود مرض نہیں ہے علامتِ مرض ہے۔ آپ در بارداری کا مطالبہ نہ کریں میں مسخرگی سے باز آ جاؤں۔ آئینے میں شکل دیکھنے کا کوئی سوال نہیں، جونیئر کی شکل ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ مقولہ نہیں سنا دنیا میں رہنے کے دو مقصد ہیں، نشاط یا نجات!

ایک صاحب نے مجید صاحب کا تار لا کر دیا کہ ابھی ابھی گھر پر آیا تھا۔

اب پانی سر سے گزر چکا تھا ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھوں گا۔ خیال آیا کہ کمرہ میلا ہے، چیزیں بے ترتیب ہیں، ان کو درست کرلوں تو اطمینان سے لکھوں۔ چنانچہ کمرہ صاف کیا گیا۔ چیزیں قرینے سے رکھی گئیں۔ قلم اُٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی نہیں۔ فوراً بک ڈپو پہنچا کہ سیاہی کی شیشی خریدوں۔ معلوم ہوا کہ بک ڈپو کی چھت ٹپک رہی ہے۔ فلاں کتاب نہیں آئی، پارسلوں کی بلٹیاں وی۔ پی سے آئی ہوئی ہیں۔ روپیہ کا انتظام کیجیے۔ ایک خریدار منیجر سے اُلجھے ہوئے ہیں۔ منشی اور دفتری کی جھک جھک ہو رہی ہے۔ کتابوں اور کاپیوں کا آرڈر بھیجنا ہے۔ اسٹیشنری کی قیمت نہیں لگائی گئی ہے۔ تین گھنٹے اس کی نذر ہوئے، شام ہوگئی۔ مکان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ داخلے کے سلسلے میں لڑکے 'معہ والدین' آئے ہوئے ہیں۔ تیسرے درجہ میں پاس ہوئے ہیں۔ گھر سے ایک پیسے کی امداد نہیں ہو سکتی۔ فیس معاف ہونی چاہیے۔ قرضِ حسنہ دلوایئے۔ آفتاب ہال میں جگہ مل جائے۔ سکنڈ ہینڈ کتابوں کا بندوبست کیجیے۔ فرنیچر گھر سے دیجیے۔ فلاں فلاں اصحاب سے ملایئے۔ وائس چانسلر صاحب کے یہاں لے چلیے۔ قوم کی غفلت اور مسلمان بچوں کی تباہی پر ان کے ساتھ ماتم کرتا ہوا اور ماحضر کھانا کھلاتا رہا۔

رات گئے زنان خانے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب بیمار ہیں۔ دوسرے کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں۔ تیسرے صاحب اس قدر کھائے جا رہے ہیں کہ ان کی صحت خطرہ میں ہے۔ یہ قضیے فیصل کر کے بیٹھا تھا کہ کل پڑھانے کے لیے کچھ پڑھ لوں۔ تھوڑی دیر تک مراقبہ میں بیٹھا رہا کہ ایک طرف سے سسکنے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی۔ پوچھا کیا ہے؟ معلوم ہوا پانی پئیں گے جب تک پانی مہیا کیا جائے دوسرے نے ایک نالہ سر کیا۔

ان کی خدمت میں حاضر ہوا فرمایا میں بھی پانی پیوں گا۔ ان کے حکم کی تعمیل کی۔ واپس آ کر کتابیں اُٹھائیں۔ کل کا سبق ہے ارتقا، نظم نکالی گئی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی! [1]

بات تو ٹھیک ہے لیکن آج کل کے نوجوان مسلمان اسے سمجھیں گے کس طور پر؟ چراغ مصطفوی پر ایمان نہیں، شرار بولہبی کے قائل نہیں۔ اچھا مسئلہ خیر وشر سے بحث کی جائے گی۔ لیکن خیر وشر کو سمجھتے تو چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کے سمجھنے میں کون چیز حائل تھی؟ اچھا یہ بھی نہ سہی، سرمایہ دار اور مزدور کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ آگے چلو!

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی [2]

اس شعر کو سمجھانا ذرا دشوار ہے۔ ایسی حیات جس نے مشکل کشی اور جفا طلبی سے ترکیب پائی ہو، ان نوجوانوں کی سمجھ میں کیسے آئے گی، جو حیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی کفالت کے ذمہ داران کے والدین یا مسلم یونیورسٹی ہو اور ہندوستان کی آزادی کے ذمہ دار ہندو۔ تکلیف ہو تو چیخنے لگیں، راحت ملے تو کسی اور کی چیخ سنائی نہ دے۔ اچھا ان کو مثال دے کر سمجھایا جائے گا۔ مسلمانوں کی تاریخ تو ان کے نزدیک افسانۂ کہن ہے۔ ممکن ہے موجودہ ترکوں کی مثال سمجھ میں آ جائے لیکن اگر کوئی یہ بول اُٹھا کہ موجودہ ترک مسلمان کب ہیں تو کیا جواب دوں گا؟ کچھ حرج نہیں، حکومتِ ترکیہ اسلامیہ کے مظاہر شخصی بھی دو ہیں: مصطفیٰ کمال اور رؤف بے۔ لیکن اسلامی حکومت ممکن ہے ہندی مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آئے کیوں کہ اس چیز کو مہا سبھا اور برطانوی کابینہ وزارت دونوں بُرا سمجھتے ہیں، اس لیے اخلاق اور عقل دونوں اعتبار سے یہ قابلِ احتراز ہے۔ بہر حال اس پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

لیکن اس بحث کو کیوں اُٹھایا جائے، مشکل کشی اور جفا طلبی کا مسئلہ نوجوانوں کی سمجھ میں اس وقت تک نہ آئے گا جب تک آپ اسلامی ادب یا تاریخ کی مثالیں پیش کرتے رہیں گے۔

1، 2 اقبال

کسی غیر اسلامی چیز کو پیش کریں، مان لیں گے۔ لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں کہ قوم کا ماتم کیا جائے کسی نہ کسی طرح سبق پر نظر ڈال لینی ہے۔

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی [1]

شاید اس شعر کے سمجھنے میں زیادہ وقت نہ ہو۔ یہ بحث مشکل کشی اور جفا طلبی کے سلسلے میں آ چکی ہوگی۔ کچھ کسر باقی رہ گئی تو پھر ان کو وہ زمانہ یاد دلایا جائے گا جب امتحان قریب ہوتا ہے اور کورس کورا! شام کو بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ نیند آتی ہے تو اُٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں۔ پھر پڑھتے ہیں۔ نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو چائے کی تیاری میں ہر قسم کی زحمت اُٹھاتے ہیں۔ پھر پڑھائی شروع ہوتی ہے۔ نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ کورس قبضے میں آ جاتا ہے۔ پاس کے درختوں پر پرندوں کا پہلا نغمہ شروع ہوتا ہے۔ افق مشرق سے آفتاب اُبھرتا ہے یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل!

کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و خراش
ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی!
مقامِ بست و شکست و فشار سوز کشید!
میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی! [2]

یہ اشعار ٹھیک ہیں۔ اس عہد کے نوجوان ساغر اور شراب کا مفہوم ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ دقت اس وقت پڑتی ہے جب ساغر اور شراب کو تصوف یا تصوف کو ان کے قالب میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سہولت یہ بھی ہے کہ آج کل فنِ معلّمی کا ایک گر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مفہوم کے سمجھنے یا سمجھانے میں دشواری پیش آئے تو موضوعِ بحث کو دلچسپ انداز میں خارج از بحث بنا دیا جائے۔ یوں بھی ساغر و شراب کی حکایت لذیذ ہوتی ہے!

---

1 اقبال

2

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند [1]

''اسی کشاکشِ پیہم'' پر بحث ہو چکی ہے۔ ملّتِ عربی کو پیش کرنے کا موقع دیکھا جائے گا۔ آخری شعر فارسی کا ہے۔ موجودہ دور میں اردو ہی کون سمجھتا ہے کہ یہ فارسی کا شعر بیچ میں آ گیا۔ ''ستارہ می شکنند آفتاب می سازند'' کی بلندی اور بلاغت سے ان لوگوں کو کیسے آشنا کیا جائے گا جن میں سے ایک صاحب مغاں کو فغاں پڑھتے تھے اور سر دُھنتے تھے! اللہ مالک ہے۔ سمجھا نہ سکا تو اردو کے ایک شعر میں پناہ لوں گا:

انگور میں تھی یہ ے پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے [2]

دوسری کلاس میں غالب سے سابقہ ہو گا۔ رات زیادہ ہو گئی ہے مگر کوئی مفر نہیں۔ خدا کرے سبق آسان ہو۔ دیوان کھولا یہ نکلا۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی! [3]

لیکن اب الفاظ اور سطروں کی بجائے نیند چلی آتی ہے۔ پہلا مصرعہ امرِ مسلّم لیکن دوسرا خلافِ واقعہ ہے۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی! [4]

---

1 وہ ساقی جو دانۂ انگور سے شراب کشید کرتے ہیں دراصل وہ ستاروں پر کمند ڈال کر آفتاب کو وجود میں لاتے ہیں۔

2

3 غالب

4 غالب

صبح مضمون لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا سیاہی کی شیشی خریدنا بھول گیا۔ پنسل ڈھونڈ کر نکالی۔ مضمون کا عنوان کیا ہو، کچھ دیر سوچتا رہا پھر طے کیا عنوان نہ سہی مضمون کی فکر کرو لیکن مضمون کا بھی پتہ نہیں۔ اچھا عنوان پر پھر زور لگاؤ مثلاً ہندو مسلم اتحاد۔ برطانیہ کا اخلاص اور ہندوستان کا افلاس، انجمن اقوامِ عالم اور ہم، اچھوت اور ہم، ہٹلر اور ہم، بم اور ہم، کارواں اور ہم، یعنی ہمی ہم!

ہندو مسلم اتحاد پر لکھنا آسان ہے مثلاً محرم، گاؤ کشی، تناسب آبادی اور بربادی، ریاست متحدہ اسلامیہ، پورن راج، مخلوط انتخاب از دواج، اردوئے معلّٰی، ناگری پرچارنی سبھا، لاٹھی چارج، شفیع داؤدی اور پنڈت مالوی۔ لیکن ان کی طرف متوجہ کون ہوگا؟ ''برطانوی اخلاص اور ہندستانی افلاس'' بھی اچھا مضمون ہے مگر اس قسم کی چیزوں سے میرٹھ کا مقدمہ، سازش بھی مرتب ہو جایا کرتا ہے اس لیے اس سے اجتناب لازم ہے۔ فائدہ کیا خود جیل خانہ گئے، گورنمنٹ کو زیر بار ہونا پڑا۔

انجمن اقوامِ عالم اور ہم، خاصا عنوان ہے لیکن اقبال نے ایک شعر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہم سے ایک جلد میں بھی نہ لکھا جائے گا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند [1]

'اچھوت اور ہم' البتہ کسی قدر حسبِ حال ہے۔ 'ہٹلر اور ہم' بھی خوب ہے لیکن ہٹلر کو ہم اپنی یونیورسٹی کے نقطۂ نظر سے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے اور بزرگوں نے کہا ہے کہ ایسوں کا نام نہ لینا چاہیے ورنہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادھر نام لیا اُدھر وہ آدھمکے، اس لیے بہتری ہے کہ اس کو نظر انداز کیا جائے۔

'بم اور ہم' قافیہ کے اعتبار سے مناسب لیکن عنقریب ہز ایکسلینسی گورنر کا ورود ہوگا۔ ایسی حالت میں اس کا ذکر مناسب نہیں۔ کیوں نہ اس عنوان کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے پاس بھیج دیا جائے۔ کسی ایسے ہی موقع پر موصوف نے 'پیاری ڈکار' تصنیف فرمائی تھی۔ ممکن ہے اس دفعہ بھی کچھ ہو جائے!

کارواں۔ لاہور، دسمبر 1933

---

1 میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ چند کفن چوروں نے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنائی ہے۔

●●●

گھاگ

گھاگ (یا گھاگھ) کی ہیئت صوتی وتحریری اس کو کسی تعریف کا محتاج نہیں رکھتیں۔ الفاظ کی شکل اور آواز سے کتنے اور کیسے کیسے معنی اخذ کیے گئے ہیں۔ لسانیات کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔ کبھی کبھی تلفظ سے بولنے والے کی نسل اور قبیلہ کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ گھاگ کی تعریف منطق یا فلسفہ سے نہیں تجربے سے کی جاتی ہے۔ ایسا تجربہ جسے عقل مند سمجھ لیتا ہے، بے وقوف برتنا چاہتا ہے۔

گھاگیات کا ایک اصول یہ ہے کہ قضیے میں فریق سے بہتر قاضی بننا ہے۔ جھگڑے میں فریق ہونا خامی کی دلیل ہے۔ حکم بننا عقل مندوں کا شعار ہے۔ اگر ہر ایجاد کے لیے ایک ماں کی ضرورت ہے تو ہر ضرورت کے لیے ایک گھاگ لازم آتا ہے۔ گھاگ موجود نہ ہوتا تو دنیا سے ضرورت کا عنصر مفقود ہو جاتا اور 'طلب محض ہے سارا عالم' کا فلسفہ انسداد توہین مذاہب کے قانون کی مانند ناقص ہو کر رہ جاتا ـــــ گھاگ کا کمال یہ ہے کہ وہ گھاگ نہ سمجھا جائے۔ اگر کوئی شخص گھاگ ہونے کا اظہار کرے یا بقول شخصے 'مار کھا جائے' تو وہ گھاگ نہیں گھاکس ہے اور یہ گھاگ کی ادنیٰ قسم ہے۔ ان میں امتیاز کرنا دشوار بھی ہے آسان بھی۔ جیسے کسی روشن خیال بیوی کے جذبۂ شوہر پرستی یا کسی مولوی کے جذبۂ خدا ترسی کا صحیح اندازہ لگانا۔

گھاگ ایک منفرد شخصیت ہوتی ہے، وہ نہ کوئی ذات ہے نہ قبیلہ۔ وہ صرف پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس کی نسل نہیں چلتی، روایت قائم رہتی ہے۔ ہر طبقہ اور جماعت میں کوئی نہ کوئی

گھاگ موجود ہوتا ہے۔ معاشرہ، مذہب، حکومت، غرض وہ تمام ادارے جن سے انسان اپنے آپ کو بناتا بگاڑتا یا ڈرتا ڈراتا رہتا ہے۔ کسی نہ کسی گھاگ کی دستبرد میں ہوتے ہیں۔ وہ جذبات سے خالی ہوتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول میں نہ جاہل کو جاہل سمجھتا ہے نہ عالم کو عالم۔ دانش مند کے سامنے وہ اپنے کو احمق اور احمق کے سامنے احمق تر ظاہر کرے گا۔ جب تک وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتا ہے، اس کو یہ پروانہیں ہوتی کہ دنیا اس کو کیا کہے گی۔ وہ کامیابی ہی کو مقصد جانتا ہے، وسیلے کو اہمیت نہیں دیتا۔

گھاگ کا سوسائٹی کے جس طبقے سے تعلق ہوتا ہے اسی اعتبار سے اس کی گھاگیت کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ نچلے طبقے کا متوسط طبقے اور متوسط طبقے کا اعلیٰ طبقے کے گھاگ پر فوقیت رکھتا ہے، اس لیے کہ موخرالذکر کو اوّل الذکر سے کہیں زیادہ سہولتیں میسّر ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گھاگ نہ بھی ہوں جب بھی اپنی دولت اور اثر سے کام نکال سکتے ہیں۔ ان سے کم درجہ والے کو اپنی گھاگیت کے سوا کچھ اور میسّر نہیں ہوتا۔ مثلاً گھاگ ہونے کے اعتبار سے ایک پٹواری کا درجہ کسی سفیر سے کم نہیں بشرطیکہ سفیر خود کبھی پٹواری نہ رہ چکا ہو۔

سیاسی گھاگ کو قوم اور حکومت کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو قمار خانے کے منیجر کو قمار بازوں میں ہوتی ہے۔ یعنی ہار جیت کسی کی نفع اس کا! وہ صدارت کی کرسی پر سب سے زیادہ ہار پہن کر تالیوں اور نعروں کی گونج میں بیٹھتا ہے اور تحریر و تقریر میں پریس اور حکومت کے نمائندوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ کہیں گولی چلنے والی ہو یا دار و رسن کا سامنا ہو تو وہ اپنے ڈرائنگ روم یا کوہستانی قیام گاہ کو بہتر و محفوظ تر جگہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک قوم کی حیثیت نعش کی ہے۔ اس پر مزار تعمیر کر کے نذرانے اور چڑھاوے وصول کیے جاسکتے ہیں، لیکن پیش قدمی کی ضرورت ہو تو ان سے گڑھے پاٹ کر راستے ہموار کیے جاسکتے ہیں۔ اپنے اغراض کے پیشِ نظر وہ نوحہ غم اور نغمہ شادی میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ حکومت سے خفیہ طور پر اور حکومت اس سے علانیہ ڈرتی ہے۔

گھاگ صرف اپنا دوست ہوتا ہے۔ کسی اور کی دوستی پر اعتبار نہیں رکھتا۔ موقع سے فائدہ اُٹھاتا ہے، موقع کو اپنے سے فائدہ نہیں اُٹھانے دیتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے کو خطرے میں بھی

ڈال دیتا ہے لیکن اسی وقت جب اسے یقین ہوتا ہے کہ خطرے سے اُس کو نہیں بلکہ اُس سے خطرے کو نقصان پہنچے گا۔ وہ انتہا پسند نہیں ہوتا صرف انتہا پسندوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسی عدالتی مسل سے دی جا سکتی ہے جس کی رو سے متضاد فیصلے آسانی سے دیے جا سکتے ہیں اور وہ فیصلے آسانی سے بحال بھی رکھے جا سکتے ہیں اور توڑے بھی جا سکتے ہیں۔

سیاسی گھاگ فیکٹری کے بڑے پہیے کی مانند ہوتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ صرف ایک بڑا پہیا گردش کر رہا ہے لیکن اس ایک پہیے کے دم سے معلوم نہیں کتنے اور کل پرزے گردش کرتے ہوتے ہیں۔ کہیں بھاری مشین تیار ہوتی ہے کہیں نازک ہلکے طرح طرح کے آلات۔ کہیں زہر، کہیں تریاق، کہیں برہنہ رکھنے کے لیے کپڑے تیار ہوتے ہوں گے کہیں بھوکا رکھنے کے لیے خرمن جمع کیا جا رہا ہوگا۔ کہیں حفاظت کا کام درپیش ہوگا، کہیں ہلاکت کے سامان کیے جا رہے ہوں۔ گھاگ بولنے کے موقع پر سوچتا ہے اور چھینکنے کو صرف ایک جمائی پر ختم کر دیتا ہے۔ وہ ضابطۂ فوج داری اور کتابِ الٰہی دونوں کی طاقت اور کمزوری سے واقف ہوتا ہے۔ آرام کمرے میں بیٹھ کر جیل خانہ پر عذاب جھیلنے والوں سے ہمدردی کرے گا کہ کہیں وہ ملک الموت کی زد میں نہ ہوں۔

وہ حکومت کے خطابات قبول نہیں کرتا لیکن خطاب یافتوں کو اپنے اثر میں رکھتا ہے۔ کونسل اور کمیٹی میں نہیں بولتا ہے لیکن کونسل اور کمیٹی میں بولنے والے اسی کی زبان بولتے ہیں۔ وہ کبھی بیمار نہیں پڑتا۔ لیکن بیماری اسی طرح مناتا ہے جس طرح دوسرے تعطیل مناتے ہیں۔ اس کا بیمار ہونا درحقیقت اپنی صحت منانا ہوتا ہے۔ وہ ہر طرح کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے لیکن ماخوذ کسی میں نہیں ہوتا۔ جرائم پیشہ ہوتا ہے سزا یافتہ نہیں ہوتا۔

مذہبی گھاگ کو مذہب سے وہی نسبت ہے جو بعض نوجوانوں کو اپنے والدین سے ہوتی ہے۔ وہ والدین کو اپنا کمزور اور مضبوط دونوں پہلو سمجھتا ہے۔ ایک طرف تو وہ ان کو حکام کے آستانوں پر حاضر ہو کر مرادیں مانگنے کا وسیلہ سمجھتا ہے دوسری طرف اگر وہ خود تعلیم یافتہ، روشن خیال اور اسی طرح کی بیوی کا شوہر ہے اور والدین ذی حیثیت نہیں ہیں تو ان کو حکامِ عالی مقام کے چپراسی سے بھی چھپانے کی کوشش کرے گا۔ ضرورت پڑ جائے گی تو

مذہب کا واسطہ دلا کر دوسروں کو ہندوستان سے ہجرت پر آمادہ کرے گا۔ کسی اور موقع پر مذہب ہی کی آڑ پکڑ کر دارالحرب میں سود لینے لگے گا۔ وہ تارکِ موالات رہے گا۔ تارکِ لذّت نہ ہوگا۔

ایک شخص کا کردار یوں بیان کیا گیا ہے۔ پیشِ ملا قاضی پیشِ قاضی ملا، پیشِ ہیچ ہردو، پیشِ ہردو ہیچ۔ یعنی وہ ملا کے سامنے قاضی بنا رہتا ہے اور قاضی کے سامنے ملا۔ دونوں میں سے کسی کا سامنا نہ ہو تو دونوں حیثیتیں اختیار کر لیتا ہے اور دونوں موجود ہوں تو کہیں کا نہیں رہتا۔ یہ مقولہ گھاگس پر صادق آتا ہے۔ گھاگ ایسا موقع نہیں آنے دیتا کہ ''وہ کہیں کا نہ رہے'' گھاگ کی یہ مستند پہچان ہے۔

دفعتاً حاجی بلغ العلیٰ وارد ہوئے اور آتے ہی بے ربط سوالات اور دوسرے اضطراری یا اختیاری اشغال سے ایک دھوم مچا دی۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دور ہی سے سلام علیکم۔ کمبل بردوش ریش بداماں، پوچھنے لگے، نظر کیوں نہیں آتے، سگریٹ لاؤ۔ پانی لاؤ۔ آخر دیر کیا ہے، کھانا کھا چکے ہو، کچھ معلوم ہوا؟ کمیشن والے آج ٹینس کھیلیں گے یا ڈاکٹر ضیاالدین صاحب کا بیان لیں گے؟ اچھا کوئی گانا سناؤ۔ ''آمد شہزادہ ہے گلشن ہے سارا لکھنؤ!'' ایک کرسی پر جا بیٹھے ٹھیک طور سے جگہ نہیں پکڑی تھی کہ کھڑے ہو کر دیوار پر آویزاں تصویر دیکھنے لگے لیکن جیسے تصویر دیکھنا نہیں وقت گزارنا مدنظر ہو۔ وہاں سے جست کی تو چارپائی پر دراز اور کمبل میں ملفوف چند لمحے بعد اُٹھ بیٹھے جیسے کوئی بھولی بات یاد آ گئی ہو، پھر یوں لیٹ گئے جیسے اس چیز کو اور اس کے ساتھ ساری کائنات کو صبر کر بیٹھے ہوں۔ پانی آیا، فرمایا نہیں دیا سلائی لاؤ، وہ آئی تو جلانے کے بجائے اس سے خلال کرنے لگے۔ کچھ کتابیں اُلٹیں۔ اخبار کے اوراق زیروزبر کر ڈالے۔ فرمایا یہ سب تو ہوا، بتاؤ فلاں صاحب مکان پر ملیں گے، اور ہاں تم کچھ لکھ رہے تھے۔ عرض کیا 'گھاگ' فرمایا شیطنت سے باز نہ آؤ گے۔ اب دیکھتا ہوں تو حاجی صاحب صحن کے دروازے سے غائب ہوتے نظر آئے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، ہر جماعت میں گھاگ ہوتے ہیں یہاں تک کہ فرشتوں میں جب 'مسلسل و مدام' عبادت ہونے لگی تو مصلحتِ الٰہی نے آدم کو پیدا کیا۔ فرشتوں کا یہ کہنا کہ

یہ صفحۂ ہستی پر فساد پھیلائیں گے۔ گھاگ کی آمد کا پیش خیمہ تھا۔ جس طور پر کٹر ملحد اور دہریے کبھی کبھی کٹر موحد اور متقی ہو جاتے ہیں اسی طور پر فرشتوں کے معصوم طبقے میں ابلیس (گھاگ) پیدا ہوا۔ گندم چشی پر آدم وحوا سے باز پرس کی گئی۔ گھاگھس تھے گھگھی بندھ گئی۔ اپنی خطا کا اس طرح اعتراف کیا جیسے اس پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ گھاگ سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے جواب دیا ''مجھے آخر کس نے گمراہ کیا؟'' یہ سوال ارتکاب جرم سے زیادہ سنگین تھا۔ گھاگ اور گھاگھس دونوں جلاوطن کیے گئے اور اس جہان میں پھینک دیے گئے جہاں نبرد آزمائی کے ہر ایک کو مساوی مواقع ملے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے:

مزی اندر جہانِ کور ذوقے

کہ یزدان دارد و شیطاں ندارد [1]

مطبوعہ: نیرنگ خیال۔ لاہور، اپریل دمئی 1928

●●●

1۔ صرف بدذوقوں کی دنیا میں مت زندگی بسر کر، اس لیے کہ ایسی دنیا بے سود ہے جس میں صرف خدا کا تصور ہو شیطان کا کوئی تصور ہی نہ ہو۔

آمد میں آورد!

ہر ہندوستانی کے دو پیدائشی حقوق ہیں، ایک بلوغ دوسرا سوراج۔ مس میو اور تلک آنجہانی اس پر گواہ ہیں۔ شرعاً ممکن ہے یہ گواہی ناقص ہو لیکن مس میو کی اصلاحی سرگرمیاں اس قسم کے اصلاحی اعتراضات سے بری ہیں۔ معلوم نہیں ہندستانیوں کو اس کی توفیق کبھی ہوگی یا نہیں کہ حقوق کو متوازن کر یا رکھ سکیں۔ ہندستانی کون ہے اور کون نہیں یہ بعد کو طے ہوگا، میرا خیال ہے غیر ہندستانی دو ہیں۔ ایک ہندو دوسرے مسلمان۔ ان کو مس میو کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے گی۔ اس آزادی کو سوراج کہہ لیجیے یا شب برات، نہ سائمن کی ضرورت باقی رہے گی نہ آتش گرہ گولیوں کی۔

لیکن آمد اور آورد کو سائمن کمیشن اور آتش گرہ گولیوں سے کیا نسبت اور یہ بھی کیا ضرور کہ ہر مضمون کو اس کے عنوان سے نسبت ہو۔ آخر تعلیم یافتہ بیوی کو ہندستانی شوہر سے بھی کچھ اسی طرح کی نسبت ہوتی ہے۔ ہر شخص اس کا طلب گار ہے کہ اسے کم سے کم اولاد اور زیادہ سے زیادہ روشن خیال بیویوں سے سابقہ ہو۔ ایسا نہ ہو تو آرٹ کا مقصد کیوں کر پورا ہوگا، جب یہ بھی معلوم ہو کہ آرٹ کے زوال سے بیسویں صدی میں کتنوں کو جوتیاں اور کتنوں کی روٹیاں ماری جائیں گی۔ قضاو قدر نے روزی کے مسئلہ میں ایک ستم ظریفی ملحوظ رکھی ہے، یعنی اکثر اولاد ایک گھر میں اور روزی دوسرے گھر میں بھیجی جاتی ہے۔ کبھی کبھی روٹیاں اور جوتیاں ایک ہی

خاندان میں بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی روٹی کے ساتھ دال بھی، اتنا کھانے کے لیے نہیں جتنا بٹنے کے لیے!

آمد اور آورد کے سلسلہ میں سب سے پہلے آدم کو لے لیجیے جو صرف آمد کا ایک پھیر ہے۔ بالغ اور لا یعقل مشرقیوں کا خیال ہے کہ آدم یا آدمی کی شانِ نزول 'آورد' کے تحت آتی ہے۔ مغرب کا دعویٰ ہے کہ حیوان نے ترقی کر کے انسان کا خلعت اختیار کیا اور دعویٰ کے بجائے ثبوت یہ ہے کہ انسان بالخصوص ہندوستان کا انسان ترقی کر کے حیوان بن جاتا ہے۔ اب یہ اس کی قسمت ہے، اگر حکومت کے ہاتھ لگ جائے تو بندر ہے، ہندستانیوں کے قبضے میں آجائے تو گائے ہے۔ وہ بھی اللہ میاں کی نہیں پنڈت مالوی کی۔

دیکھنا یہ ہے کہ حضرت انسان کی آمد کس طرح ہوتی ہے! اس کی ابتدا روزِ ازل سے بھی ہو سکتی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد![1]

لیکن یہاں اس سے بحث نہیں، بچّے کی آمد بھی دو طرح کی ہوتی ہے، آمد یا آورد۔ آمد تو کسی اندھیری بدبودار کوٹھری میں ہوتی ہے جس کو اور زیادہ ناقابلِ برداشت بنا دینے کے لیے گندی دائی رونے، شور مچانے والے بچّے بچّیاں، ان سے زیادہ چیخنے والی بی اماں اور نانی اماں ہوتی ہیں جو کبھی کبھی پاس کے بچّے بچّیوں پر رفع یدین بھی کرتی جاتی ہیں۔ میلے کٹورے، گلاس، لوٹے اور سلفچی کا باہم ٹکراتے رہنا۔ بچّوں کا رونا، عورتوں کا چیخنا کوسنا، بیوی کا کراہنا، شوہر کی بدحواسی، باہر کسی پڑوسی کا بندوق داغنا گویا کسی شکار کا جنگل میں ہنکوا ہو رہا ہے، اتنے میں مولود سعید برآمد ہوئے۔

دوسری طرف آورد ہے۔ مفلس شوہر اور روشن خیال بیوی کے بچّوں کی بالعموم کسی ہسپتال میں کھینچ تان یا قطع برید ہوتی ہے۔ مدتوں پہلے سے ہسپتال کی زیارت ہوتی رہی ہے۔ ولادت سے ہفتوں قبل بیگم صاحبہ ہسپتال پہنچ جاتی ہیں۔ ان بیویوں کی حالت بھی ایک گونہ قابلِ رحم ہوتی ہے۔ حمل، وضعِ حمل اور مکافاتِ حمل سب ہسپتال ہی میں پورے ہوتے ہیں۔

1۔ ترجمہ: اے پردہ دارو ہوشیار رہو کہ پردہ اُٹھانے والے بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ (مرتب)

وضع حمل کا وقت آتا ہے تو سارے چھوٹے بڑے خوش حال تنگ دست دور اور نزدیک کے رشتے دار کسی دوسرے کمرے یا برآمدہ میں اس طور پر بیٹھے ہوتے ہیں گویا عدالتِ فوج داری میں مجرم کی حیثیت سے لائے گئے ہیں۔ پہلو بدلنے پر بھی آمادہ ہوئے تو لیڈی ڈاکٹر سے لے کر بھنگن تک اس طور پر ڈانٹتے ہیں جس طور پر عدالت کا چپراسی اس فریق کو پھٹکارتا ہے جس سے اس کو کچھ دستِ غیب نہ وصول ہوسکا ہو۔ بچے نے برآمد ہونے میں ذرا پس وپیش کی اور لیڈی ڈاکٹر نے کلوروفارم نشتر، چاقو اور دوسرے اقسام کے آلات سنبھالے اور مولودِ سعید پا بہ دستِ دگرے دست بدست دگرے عالمِ ظہور میں لائے گئے۔ دوسری طرف تا برخاست کچہری قید رہ کر فریقین کو حکمِ رہائی ملا۔ ساتھ ہی ساتھ جرمانے کا بل بھی پیش کیا گیا جس کے مطالبات نے ننھے سے پہلے ننھے کے ابا کا عقیقہ کردیا۔ شوہر کو ہدایت کی گئی کہ آئندہ وہ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرے جس سے اس طرح کی نوبت آئے۔ نیک چلنی کی آزمائش کے لیے لیڈی صاحبہ متبسم ہوگئیں۔ ثبوت میں شوہر صاحب مفلس۔ نانی اماں کو ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ روئیں کم اور صفائی زیادہ رکھیں۔

فرض کیجیے کسی قومی لیڈر کی آمد ہے۔ حکومت نے پولیس کو حکم دیا کہ لیڈر کی ہسٹری شیٹ کا مطالعہ شروع کردیں۔ کچھ اہالیانِ شہر اور خفیہ پولیس نے استقبالیہ کمیٹی کی طرح ڈالی۔ بھوکے شریف اور شکم سیر انفارمر جن سے زیادہ خطرناک طبقہ کوئی اور نہیں ہوتا، رضا کار بنے۔ جن لوگوں کو حکومت سے یہ شکایت تھی کہ وہ ان کی پرسش نہیں کرتی تھی یا ضرورت سے زیادہ ان کا خیال رکھتی تھی، مقروض رؤسا، مایوس اطبا، مفلوک الحال وکیل، دیوالیے مہاجن، فیل شدہ طلبا اور ایسے لوگ جن کو عرش پر بھی بیگار نصیب ہوا استقبالیہ کمیٹی کے ممبر بنے۔ پھاٹک کھڑے کیے گئے، ہار تیار ہوئے، گولے بنائے گئے، ایڈریس لکھے جانے لگے، پولیس کو گالیاں دی جانے لگیں، کلکٹر صاحب نے با جلاسِ خطاب یافتگان دفعہ 144 پر غور کرنا شروع کیا۔ شرفا نے گھر کے کواڑ بند کیے۔ پنڈال میں مجمع ہوا۔ اللہ اکبر، مہاتما گاندھی کی جے اور بھارت ماتا کی جے وغیرہ کے نعرے بلند کیے گئے اور لیڈر صاحب ہار پھول میں لدے قربانی کا بکرا بنے صدارت کی کرسی پر براجمان یا جلوہ افروز ہوئے۔ جو مرے تھے ان پر تعزیت کے اور جو زندہ تھے ان پر لعنت کے

ووٹ پاس کیے گئے۔ خطبۂ صدارت میں اپنی اور اپنے منتخب کرنے والوں کی نالائقی پر اظہارِ تشکر کیا۔ اس کے بعد جو مسئلہ اُٹھایا گیا اس میں حضرتِ آدم سے لے کر پنڈال تک کی کارروائیوں کا جائزہ لیا گیا اور قوم، نصب العین، ماحول، حکومت، تعلیم، افلاس اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ جن کو مقرروں اور اخبار نویسوں نے آرائشِ سخن کے طور پر رواج دے رکھا ہے، دُہرائے جانے لگے۔

لیڈر نے حکومت، پولیس، قوم اور دوسرے لیڈروں کو صلواتیں سنائیں۔ مجمع نے تالیاں بجائیں، دعوتیں ہوئیں، سفرخرچ وصول کیا گیا۔ لیڈر صاحب رخصت ہوئے۔ شہر میں کچھ دنوں بعد بلوہ ہوا۔ وکیلوں کی عید آئی۔ جن کو چوٹ لگی یا جن سے پولیس کو چوٹ پہنچی تھی جیل خانہ بھیج دیے گئے!

مولوی یا پیر صاحبان بالعموم رمضان میں رخصتِ سفر درست کرتے ہیں۔ اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک طرف روزہ کو شہ مات ہوئی، دوسری طرف سحری و افطار خیر خیرات حصے میں آئے۔ مریدوں اور عقیدت مندوں کے گھر صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ بچّہ کا ختنہ، یا بسم اللہ، لڑکی کی شادی اور رخصتی، حمل و وضعِ حمل یا ان کا ردِّعمل، مریض کی حیات و ممات سب اسی دن کے لیے ملتوی رکھے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نازل ہوئے۔ کسی کو اولادِ نرینہ عطا ہوتی ہے، کسی کو بہشت نصیب ہوتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کو جہنم کے لیے نامزد کیا جاتا ہے۔ بعضوں کی جائداد کے متولی بنتے ہیں۔ تعویذ لکھیں گے تو صرف مرغِ سفید کے خون سے تاکہ دسترخوان پر مرغ مسلّم موجود ہو۔

گورنر یا وائسرائے کی آمد ہے، یہ آمد بھی آورد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ جہاں کہیں جاتے ہیں مدعو ہوتے ہیں لیکن یہ امر اَب تک تصفیہ طلب ہے کہ ان کا مدعو کیا جانا، ناگزیر ہے یا ان کا تشریف لانا لازمی ہے۔ کچھ ہی ہو ان کا ورود مسعود مفید ہے۔ ہندوستان کی میونسپلٹیاں صرف دو وقت اپنی زندگی یا اپنے کارآمد ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ یا تو میونسپلٹی کے کسی ممبر یا چیئرمین کے ہاں 'فوتی پیدائش' قسم کا کوئی واقعہ پیش آ گیا ہو یا 'حکامِ بالادست' کی آمد ہو۔ میونسپلٹی کی بیداری میونسپلٹی کی کوڑا گاڑی کا متحرک ہونا ہے۔ یہی دو مواقع ایسے ہیں جب یہ گاڑیاں حرکت میں آتی ہیں۔ اس کوڑا گاڑی کو صرف کوڑا کہنا زیادہ صحیح ہے۔ نیم جان بھینسے اور

تنومند بھنگی کو بھی اس میں شمار کرنا چاہیے۔ کوڑا اکثر متحرک بھی دیکھا گیا ہے لیکن کوڑا گاڑی قائم بالذات رہتی ہے۔ آج تک کوئی گاڑی درست حالت میں نہیں پائی گئی۔ پانی چھڑکنے والی گاڑیوں کو دیکھ کر یہ کوڑا چھڑکنے والی گاڑیاں خود بخود معرضِ وجود میں آ گئیں۔ جہاں تک کوڑے کا تعلق ہے ان گاڑیوں کو یہ گوارا نہیں کہ کوڑے کا سارا سرمایہ ایک ہی مرکز پر جائے اس لیے وہ ان کو ہر طرف تقسیم کرتی رہتی ہیں۔

اگر حکام کی آمد یا اربابِ بلدیہ (میونسپلٹی) کے ہاں تقریب نہ ہو تو یقیناً ساری بستی کسی وبا کی شکار ہو جائے۔ فرض کیجیے گورنر یا گورنر جنرل بہادر کہیں نزول اجلال فرمانے والے ہیں۔ غریب اور امیر دونوں متفکر ہوتے ہیں۔ غریب کو تو یہ فکر کہ کہیں صفائی کے سلسلے میں ان کے شکستہ مکانات یا ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں سطحِ زمین سے نہ ملا دی جائیں۔ امیر کو یہ فکر کہ کس قسم کا خطاب کس قسم کے اخراجات کا مطالبہ کرتا ہے؟ پھر یہ سوچا جاتا ہے کہ کہاں تک خود ان کا اندوختہ اور کہاں تک رعایا اور کسانوں کی پونجی اس سودے کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اگر دونوں راسیں بیٹھ گئیں تو فہو المراد، ورنہ قرض کی سبیل نکالی جاتی ہے۔ ان سب سے عہدہ برآ ہونے کے بعد مغرور اور مہنگے مہمان کو چائے، لنچ، ڈنر، رقص و سرود، افتتاحیات اور تاسیسیات کے سلسلے میں مدعو کیا جاتا ہے۔ جوں جوں مقررہ ساعت قریب آتی جاتی ہے، یا ہنگامے بڑھنے لگتے ہیں، پولیس چپے چپے پر پھیل جاتی ہے، جو شخص کسی جرم کے سلسلے میں ماخوذ یا مشتبہ ہے اس کو تا مراجعتِ حاکم زیرِ نگرانی رکھا جاتا ہے۔ دن رات ایک کر دیے جاتے ہیں، آرائش و زیبائش اور دھوم دھام پر روپیہ اس طرح صَرف کیا جاتا ہے جس طور پر جوان اپنی جوانی یا طالب علم والدین کے روپیہ اُڑاتا ہے۔ ان حکام کی آمد پر ہندستانی رؤسا یا انجمنیں اور تعلیم گاہیں ایک سال میں جتنے روپے صَرف کر دیتی ہیں ان کو پس انداز کر لیا جائے تو خیال ہے ایک سال میں کئی سوراج ہندوستان کے لیے حاصل کیے جا سکتے ہیں اور یہ رقم حکومت کے ہاتھ لگ جائے تو اس کو ہندستانی بجٹ کی اس رقم خطیر کی ضرورت باقی نہ رہے جو صوبہ سرحد کے نظم و نسق یا دوسرے سیاسی مصالح کے سلسلے میں صَرف کرنے پڑتے ہیں، اور جس کا حساب دینے سے وہ اتنا ہی گھبراتی ہے جتنا گھریلو شوہر اور بیویاں ایک دوسرے کا نام بتانے میں۔

ان حکام کا ہندستانی ریاستوں میں ورود بظاہر ایک شاندار جلوسِ تقریب نشاط و کامرانی معلوم ہوتا ہے، لیکن میزبان رؤسا پر جو کچھ گزر جاتی ہے، اس کا اندازہ بہ مشکل کیا جاسکتا ہے۔ وقت، عافیت اور روپیہ کا خسارہ تو درکنار لطف اس وقت آتا ہے جب ملک معظم کے جامِ صحت کے بعد معزز مہمان گل افشانی گفتار کرتا ہے۔ ریاستیں اس پر تلی ہیں کہ ان کے اپنے اندرونی معاملات میں حکومتِ ہند کو دخل دینے کا حق نہ حاصل ہو۔ اس کو وہ مساوات یا خودمختاری کے منافی سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف معزز نمائندگانِ حکومت کا اصولِ مہمانی یا حکمرانی یہ ہے کہ نہ ان کو عیش اُڑانے دو نہ چین سے رہنے دو۔ لیکن دوسری ریاستوں میں یہ اصول نافذ کرتے ہیں کہ کار ہوتا ہے یعنی عیش کیوں نہیں اُڑاتے؟ فی الحال ان ریاستوں اور برطانوی حکومت کے درمیان وہی تعلقات ہیں جو ہندستانی شوہر اور بیوی کے ہوتے ہیں۔ حکومت ریاستوں کو وہی حیثیت دینی چاہتی ہے جو ہندستانی شوہر اور ہندستانی بیوی کی ہے۔ یعنی بیوی کا کام یہ ہے کہ وہ کھلائے پلائے اور خوش رکھے۔ شوہر کا فریضہ یہ ہے کہ وہ بیوی کے مطالبات یا میلانات کو اپنے مقاصد سے بلند یا ان کا منافی نہ ہونے دے۔ لیکن اب ریاستیں روشن خیال بیویوں کی حیثیت حاصل کرنا چاہتی ہیں یعنی کھلاؤ پلاؤ اور آزاد رکھو اور ایک دوسرے کے مقاصد ایک دوسرے کی ذمہ داری پر چھوڑ دو، اور ذمہ داری کسے کہتے ہیں اس میں تجسس نہ کرو۔

معزز مہمان آئے اور معزز مہمان چلے گئے۔ میزبان نے دن گننے شروع کیے۔ نوروز یا ملک معظم کی سال گرہ کا موقع آیا دونوں پر یاس واُمید کی دھوپ چھاؤں پڑنی شروع ہوئی۔ دنیا کی بے ثباتی اور سب سے پہلے اپنی حماقت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ خیال آتا ہے تارک موالات کیوں نہ ہوئے جو کچھ ضیافت میں صرف کیا تھا اس کو کسی بہتر کام میں کیوں نہ لگا یا دیا۔ لڑکی کی شادی ہوسکتی تھی۔ مہاجن کا قرض بھی ہلکا کیا جاسکتا تھا۔ پچھلے سال وبا میں کیوں نہ چل بسے۔ غرض وہ تمام باتیں ایک ایک کر کے تازہ ہو جاتی ہیں جو شاید عالمِ نزع میں بھی ان کو یاد نہ آتیں۔ ایک اور قسم کی آمد ہے۔ ایک بزرگ شکستہ حال، شکستہ تر جھونپڑے میں اسی طرح کے بستر پر 'ایک شہر آرزو' کے ساتھ 'ایک زانوئے تامل' بنے بیٹھے ہیں۔ مضامین کی آمد ہے بیوی سردی کے مارے باورچی خانہ میں بیٹھی کانپ رہی ہے۔ ایک بچہ سینے سے لگا ہوا دودھ کھینچتے کھینچتے اور چیختے

چیختے گود ہی میں سو گیا ہے۔ دوسرا بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ سب سے بڑی لڑکی دم بہ دم سرد ہونے والے چولھے کے منہ سے جاگی ہے اور تیسرے بچّے کو گلے سے لٹکائے ہوئے ہے اور آس پاس کا کام بچّہ کو لیے ہوئے کھسک کھسک کر کرتی جاتی ہے۔ کبھی کبھی خود اونگھ جاتی ہے کبھی ماں سے کہتی ہے اگر کہیے تو ایک لکڑی اور لگا دوں۔ سالن ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔ ماں سمجھ جاتی ہے کہ یہ معصومانہ حسنِ طلب صرف بھوک اور سردی کی بنا پر ہے۔ کچھ جواب نہیں دیتی لیکن لڑکی کو اس باورانہ یاس انگیز شفقت سے دیکھنے لگتی ہے کہ لڑکی اپنے اندر استقلال اور شکر کی توانائی محسوس کرنے لگتی ہے۔ پھر کہتی ہے، سنیے وہ ابا میاں کھانسے، ارے ننھے ابا میاں آئے ہیں تو ان کی گود میں بیٹھ کر کھانا کھائے گا۔ اماں دیگچی اُتاریے میں برتن لاتی ہوں۔ اماں ان باتوں کو خوب سمجھتی ہے لیکن اس دفعہ زیادہ واضح طور پر لڑکی کی تالیفِ قلب کرتی ہے۔ اچھا بی بی تم بچّوں کو سلا لو۔ میں ذرا پہلو بدل لوں اور وضو بھی کر لوں۔ لڑکی ہر کام کے لیے مستعدی سے آمادہ ہو جاتی ہے اور باوجود اس کے کہ ماں عمداً ہر کام میں سستی کرتی ہے۔ لڑکی تمام فرائض سے سبک دوش ہو جاتی ہے۔ ماں کو تقریباً خاموش اور مایوس دیکھ کر کہتی ہے ابا کو بلا لاؤں۔ ماں کہتی ہے بیٹی ان کے کام میں مخل نہ ہو ان کی طبیعت اچھی نہیں۔ بلاؤ گی تو ان کو تکلیف ہوگی اور ہاں بیٹی تم کچھ کھا لو۔ میں نماز پڑھ کر تم کو کھانے میں شریک کر لوں گی۔ لڑکی کہتی ہے نہیں بھوک نہیں ہے۔ میں ابا میاں کا انتظار کروں گی، اور ہاں اماں ابا جان کیسی شکر قند لائے تھے، آپ نے اس دن کیسی نفیس کڑھی تیار کی تھی، اس دن ہم سب.....کی شادی میں کیسے اچھے اچھے کپڑے پہن کر گئے تھے۔ احمد کا کوٹ صابرہ کو کیسا ٹھیک آیا تھا۔ ماں ہوں ہاں کرتی جاتی ہے۔ چراغ کی روشنی مدّھم ہونے لگتی ہے۔ اکا دُکا سلگے ہوئے کوئلے بھی راکھ میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ جلتے ہوئے انگارے سے راکھ جھڑ جاتی ہے تو ایک لمحے کے لیے چولھے کی خاکستری فضا بیدار سی ہو جاتی ہے۔ ماں سوچتی ہے آج تمام دن آفتاب نہیں نکلا۔ بچّوں کا بستر بالکل نہیں سوکھ سکا ہے۔ ان کو شب میں کیسی سردی لگے گی۔ صبح بچّوں کا ناشتہ کیا ہوگا! دھوبی کپڑے نہیں لایا۔ کل جمعہ کو کپڑے کیوں کر بدلے جائیں گے!

دوسری طرف اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔ اس گھر کے مالک (شاعر) مراقبے میں ہیں۔ فضائے تخیل میں معلوم نہیں کہاں کہاں پرواز کر رہے ہیں۔ کبھی صحرائے نجد میں 'عرضِ مجنوں'

منار ہے ہیں، کبھی نپولین اور صلاح الدین کے ہمدوش سرگرم کارزار ہیں۔ کہیں کارنیگی اور فورڈ کی دولت کو ٹھکرا رہے ہیں، کبھی آستانۂ محبوب پر 'دعائیں صرفِ درباں' کر رہے ہیں۔ ایک طرف 'پریوں کی محفل' ہے ان سب سے دل کو بچائے ہوئے معلوم نہیں دیوؤں کے دنگل میں لیے جا رہے ہیں یا کسی خیراتی ہسپتال میں! کبھی رازی ہیگل برگساں اور رومی سب کو پھلانگتے ہوئے 'عدم سے بھی پرے' پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی 'آہِ آتشیں سے بالِ عنقا' خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ کبھی پٹ گلیڈسٹون میٹرنخ کے مقبرہ کو ٹھکراتے ہوئے لائڈ جارج و برکن ہڈ کو کہنی مارتے ہوئے مس میو سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان سے گزرتے ہیں تو شدھی، سنگٹھن سب پر لات مارتے ہوئے، لکشمی کاٹن مل کی دھجیاں بکھیرتے چھوٹانی سالٹز پر جا کر دم لیتے ہیں۔ خالی دماغ اور خالی شکم میں خیالات کا وہ ہجوم ہو رہا ہے جیسے کسی تھرڈ کلاس میں یاتری بھر دیے گئے ہیں۔ کبھی لیلیٰ، عذرا، کلوپیٹرا، دمینتی، ان کی نگاہِ کرم کی متمنی کھڑی ہیں، اور یہ آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یعنی جب تک کہ ان کا 'لپٹا ہوا بستر کھلا' دیکھیے تو سرِ زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے پڑے ہیں۔ ''مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب'' ملک الموت سے آنکھ مچولی کر رہے ہیں۔ کبھی غالب کے اس شعر۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں!

کو پڑھتے ہیں اور غالب کے قوی شاعر ہونے پر وجد کرتے ہیں اور بالآخر:

کر دیا ضعف نے عاجز غالب!
ننگِ پیری ہے جوانی میری!!

کا مصداق بن جاتے ہیں۔

●●●

مغالطہ

نان کوآپریشن کے مانند مغالطہ بھی ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ نان کوآپریشن اور مغالطہ دونوں اب تک کسی منطقی تعریف کے نہ متحمل ہوئے نہ محتاج! جس طور پر نان کوآپریشن کے مختلف خفی اور جلی پہلو ہوتے ہیں، مغالطہ بھی مختلف النوع اور مختلف الجہات ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خالی دماغ شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ جسے مرورِایام نے دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ جب دماغ خالی ہوتا ہے تو اس میں شیطانی وسوسے سما جاتے ہیں۔ وسوسوں کا تعلق تو شکم سے ہے۔ معدہ خالی ہو یا بھرا، وسوسے دماغ کی طرف صعود کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہر بھلے مانس کو شکم سیر انفار اور بھو کے اشراف سے بچتے رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ یہی وسوسے کبھی انجرہ، کبھی ریاح، کبھی مزدور اور کبھی سرمایہ دار کی صورت میں ایسی حکومتوں کو بالخصوص جن کا قیام قانون اور امن کے تحت عمل میں آیا ہو، ستاتے رہتے ہیں۔ حکومت کا سر ریاح اور روشن دماغ ادویات سے ان کا مداوا کرتی رہتی ہے، مگر ایک پیش نہیں جاتی۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ قدیم الایام سے اب تک جو ضرب المثل صحیح چلی آتی تھی وہ مجروح ہوگئی ہے۔ یعنی رعایا کو اسی قسم کی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ اب ہونے یہ لگا ہے کہ حکومت کو اسی قسم کی رعایا ملتی ہے جس کی وہ سزاوار ہوتی ہے۔

مغالطہ کی تحقیق میں میرے پاس وہی مواد موجود ہے جو سودا کو اپنے گھوڑے کے سلسلے میں دستیاب ہوا تھا۔ فرق یہ ہے کہ ان کے گھوڑے پر شیطان سوار ہو کر جنت سے نکلا تھا اور میری تحقیقات یہ ہے کہ مغالطہ خود شیطان پر سوار ہو کر دنیا میں آیا۔ یہ وہی موقع تھا جب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ ابلیس کو خاکی اور آتشی کا مغالطہ لگا اور فرشتوں کی جماعت سے نکل کر خدا جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ بالآخر ہندوستان آ گیا۔ ناخواندہ مہمان کی آمد پر سخت احتجاج کیا گیا یعنی ''شیطان چلے جاؤ، شیطان چلے جاؤ'' لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا اور از آدم تا ایندم موجود ہیں اور اب وہ خود طرح طرح کے عناصر کو چلے آنے یا چلے جانے کی دعوت دیا کرتے ہیں!

یہ تو شیطان کا تاریخی پہلو تھا لیکن اس کا نفسیاتی پہلو بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مشیت الٰہی نے عالم کو پیدا کیا تو یہ ضروری ہوا کہ اس نیرنگ خانہ کو ایسی حیثیت دی جائے جس میں ایک طرف مبدا اعلیٰ کا عظیم و عسیر الفہم لاہوتی تصور قائم رہے دوسری طرف ناسوت کی گریز پا اور رنگین آویزشیں اور لغزشیں بھی کارفرما ہیں۔ انسان کو اگر صرف انسان ہی بنانا یا رکھنا مقصود ہوتا تو ملائک غیر ضروری ہو جاتے اس لیے انسانوں کی جماعت میں غیر سرکاری، عنصر (اہرمن) کا اضافہ کیا گیا۔ ابلیس وہاں کے نکالے ہوؤں میں تھا اس کو بڑی دور کی نسبت تھی۔ وہ لاہوتی حقیقتوں کو ناسوتی کرشموں میں بے نقاب کرنے لگا۔ وہ انسان کے کمزور پہلو کو اپنے کمزور بچے کی مانند زیادہ عزیز رکھتا ہے لیکن اس کا قائل نہیں ہے، محض اس لیے کہ وہ قائل ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ زنجیر کی استواری کا مدار زنجیر کے سب سے کمزور حلقے پر ہوتا ہے اس لیے ذہن و دماغ سے بہتر میدان اس کی جولان گاہ کے لیے نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں تک مغالطہ یا شیطنت کا ایک طائرانہ یا اشترانہ جائزہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیائے عمل میں اس نے کیسے گل کھلائے ہیں۔ مغالطہ ایک طرح کی گمراہی ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے یا محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس صفت میں ساری دنیا فرط رشک و رقابت سے جل کر تباہ ہو جائے گی یا اسے تباہ ہو جانا چاہیے۔ اگر اس کے پاس دولت ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس لعنت سے بہرہ مند دنیا میں اب تک وہی رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ

جو لوگ اس سے محروم ہیں وہ اس کے قدموں پر گریں گے یا وہ خود کلکٹر کے قدموں پر گر کر ان کو جیل خانے بھجوا دے گا۔ لطف یہ ہے کہ دونوں قدموں پر گرتے ہیں اور دونوں کامیابی سے دور رہتے ہیں۔ ایک اس فعل کو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہوتی دوسرا اس لیے کرتا ہے کہ اس کے بازوؤں میں سکت نہیں ہوتی۔

دولت کا مغالطہ عجیب و غریب ہے۔ دولت مند اپنے آپ کو سب سے زیادہ طاقت ور، عقل مند، قوم پرست، طرفہ یہ کہ سب سے زیادہ معقول بھی سمجھتا ہے۔ کبھی بحیثیت مجموعی کبھی علاحدہ علاحدہ۔

اس کے نزدیک یہ تمام سعادتیں بینک سسٹم پر قائم ہیں۔ ہر مد میں کچھ رقم جمع کر دی جس کی آمدنی سے ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی عظیم ہستیاں نیز اراکینِ مسلم یونیورسٹی کمیشن کے مورثِ اعلیٰ بینک میں اتنی دولت جمع کر گئے تھے کہ ساری سعادت اور شہرت ان کو بطور سود ملتی رہتی ہے۔ حالاں کہ خود اسے جو نام نہاد اہمیت حاصل ہے، اس کی تحقیق اپنے نظریہ کے مطابق کرنے سے گریز کرتا ہے اور کوئی دوسرا اس نیک کام کے لیے اپنی خدمات پیش کرے تو بگڑتا ہے اور عدالتی چارہ جوئی کی دھمکی دیتا ہے۔ لیکن کوئی دوسرا عدالتی چارہ جوئی پر آمادہ ہو جائے تو اس سے ہر قیمت پر صلح کر لیتا ہے۔

وہ دولت کا غلام بن کر غیر دولت مندوں پر حکومت کرنا چاہتا ہے، اور ہندستانیوں کے مانند اس کا قائل ہونا پسند نہیں کرتا کہ غلامی اور برتری دو متضاد باتیں ہیں۔ وہ ڈومینین اسٹیٹس یا سوراج ملک معظم کی سال گرہ کے موقع پر حاصل کرنا چاہتا ہے، اور یہی اس کے مغالطے کا مضحک پہلو ہے۔ وہ جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی عالموں سے علم و فضل کی باتیں کرے گا، اور وہ بھی اس طور پر گویا اس کے مخاطب ان جواہر پاروں سے اتنا ہی ناآشنا تھے جتنا مس میو ہندوستان سے۔ جیسے وہ خود ان فنون کا امام رہ چکا ہے لیکن بر بنائے ایثار دوسروں کے لیے ترک کر چکا ہے۔ اس فرقہ میں ایسے بھی ملیں گے جو علم و ادب کے اکابر سے اس فروتنی اور افتادگی سے پیش آئیں گے گویا مخاطب کو نعوذ باللہ 'کلکٹر صاحب' سمجھتے ہیں۔ مثلاً میں تو آپ کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں۔ آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر۔ بے شک لاریب آپ ملک و قوم کے لیے باعثِ فخر

ہیں۔ آپ کے طفیل خدا قوم پر رحم کرے، ''مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور'' وغیرہ اور یہ سب اس لیے کہ وہ آپ کو احمق سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی اس لیے بھی کہ دنیا یہ سمجھ لے کہ وہ علم وفن کا مربی اور سرپرست ہے اور اکبر و بکر ماجیت کے عہد کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے اتنا ہی مضطرب ہے جتنا مہا سبھا اور جمعیۃ العلما ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دلانے کے لیے دست بدعا یا دست وگریباں ہیں۔ آپ سے اس کا کام نکلتا ہوگا تو وہ آپ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ آپ بیک وقت اس کے بھائی، باپ یا لڑکے اور کلکٹر صاحب تو نہیں کلکٹر صاحب کے چپراسی یا پیشکار ہیں اور آپ بھی باوجود اس کے کہ صرف ایک کثیر الاولاد، بے روزگار، مقروض ہندستانی شوہر ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس مغالطہ میں پڑ جائیں گے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے ممکن ہے وہ صحیح ہو!

جس طور پر حکومت ہند کو آئی سی ایس نے مغالطہ میں مبتلا کر رکھا ہے اسی طور پر طبقۂ رؤسا کو مصاحبین اور متوسلین نے گمراہ کر رکھا ہے۔ حکومت ہند نے آئی سی ایس کو اپنا ہاتھ پاؤں نہیں بلکہ عقل و دماغ قرار دے دیا ہے۔ دوسری طرف رؤسا کے مصاحبین ہیں جو ان کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ یہ عام طور پر جاہل لیکن خصوصیت کے ساتھ عقل مند ہوتے ہیں اور چوں کہ اپنی بعض نہایت قیمتی متاع رؤسا کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کا معاوضہ بھی اس دلیری اور سفا کی سے لیتے ہیں۔ ان مصاحبوں کی وفاداری اور ذہانت کا ان کی سرکار پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ سوچ نہیں سکتا کہ اس دنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اس کے اور اس کے لواحقین سے زیادہ قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ مشیر و مصاحب اکثر تیسرے درجہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن مصاحبوں کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ واجد علی شاہ اور اکبر دونوں مصاحبوں کے گمراہ کیے ہوئے تھے لیکن ایک 'رنگیلے' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، دوسرے 'اللہ اکبر'!

بعض کو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا وجود دنیا کے لیے ناگزیر ہے۔ کوئی پوچھے کہ اس بیسویں صدی میں کتنے ہیں جو خود خدا کے ناگزیر ہونے کے قائل ہیں۔ خدا کو جانے دیجیے کتنے ہیں جو ہندوستان کے امن و ترقی کے لیے حکومتِ برطانیہ کو ناگزیر سمجھتے ہیں! حالاں کہ حکومتِ برطانیہ کے پاس دفعہ 144 سے لے کر سر مائیکل اوڈائر تک موجود ہیں۔

میرے دو ایسے کرم فرما ہیں جو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹایا دنیا سے اُٹھا لیے گئے تو نظامِ شمسی درہم برہم ہو جائے گا۔ ایک تو 'مخدومہ' ہیں جو میرے یہاں کھانا پکاتی ہیں اور ہر اُس چیز کو میرے گھر کے لیے غیر ضروری سمجھتی ہیں جو گھر والوں کی نظر سے اوجھل اور نقل وحمل کی متحمل ہو۔ ان کو کسی نے یقین دلا دیا ہے کہ ہر دانے پر ہر شخص کا نام لکھا ہوتا ہے اور وہ اس کے حصہ میں آ کر رہتا ہے۔ اس بنا پر ان کا مسلک ایک طور پر وہی ہے جو بعض صوفیا کا ہے۔ یہ 'ہمہ از اوست' کے بجائے 'ہمہ برائے ماست' کی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس روز انھوں نے ہم کو اپنی خدمات سے سبک دوش کر دیا اسی دن ہم پر کمیشن بیٹھ جائے گا یا ہم دنیا سے اُٹھا لیے جائیں گے۔ ہر شخص کے بارے میں ایک رائے رکھتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی زبونی کا سبب یہ ہے کہ لوگ بیویاں رکھنے کے عادی ہیں بلکہ جس قدر بیوی پر اعتماد کرتے ہیں اتنا ان پر نہیں کرتے۔ چنانچہ بڑی بیزاری و برہمی کے ساتھ لکڑی پھونکتی ہیں اور میں کسی محفوظ مقام پر بیٹھا ڈرتا رہتا ہوں کہ لکڑی کے ساتھ یہ کہیں بیوی بچے کو چولھے میں نہ جھونک دیں۔ کبھی کبھی یہ قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ اس وقت ہم کو اپنی حالت پر ترس آ جاتا ہے اور اس اندیشے سے کہ کہیں دوسرا ان سے بھی زیادہ 'مہربان' نہ ملے، فوراً ایک جلسۂ خاص منعقد کیا جاتا ہے جس میں ان کی خدمات واحسانات کا اعتراف کرتا ہوں۔ بیوی 'شیم شیم' اور بچے 'ہیر ہیر' (جن کا اخباری ترجمہ 'شرم شرم' اور 'سنو سنو' ہے) کرتے ہیں اور ایک بار پھر ہم ان کو اپنے آپ پر مسلّط کر لیتے ہیں۔

سرسید کی بدنصیبی تھی اور ہماری اب بھی ہے کہ یہ سرسید کے عہد میں تھیں۔ ان کو سرسید کا اتنا شدید مغالطہ ہے کہ ہر بات پر سید یا ان کے عہد کا حوالہ دیتی ہیں اور چوں کہ ہم پیدائش کے اعتبار سے مسلمان اور پیشہ کی حیثیت سے قبر پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے سرسید کا نام مخدومہ کی زبان سے سن کر خائف وخفیف ہوتے رہتے ہیں۔ چیزیں چرانے اور لکڑی پھونکنے کے علاوہ ان کا فرصت کا ہر لمحہ سرسید کی خطبہ خوانی میں صَرف ہوتا ہے۔ ایک دن عرض کیا بڑی بی ان دنوں کمیشن آیا ہوا ہے ہم لوگ فوج داری میں پڑے ہیں، کچھ دعا کرو۔ کہنے لگیں میاں سرسید کے مزار پر چراغ جلاؤ اور پھول چڑھاؤ۔ بیویوں سے کہو غریب محتاجوں کو ستائیں نہیں۔ ان کے

کاموں میں عیب نہ نکالیں۔ سرسید کی برسی پر میں ایک سال چراغ چڑھانے اور طاق بھرنے نہیں گئی تھی، میری بچی کے چیچک نکل آئی۔ میاں جب سے کان پکڑا، ہر سال برسی پر مزار جاتی ہوں اور ایک پاؤں پر کھڑی ہو کر دعا مانگتی ہوں کہ کالج کے لڑکے بڑے اچھے ہیں، بیویاں البتہ بہت ستاتی ہیں، ان کو کوئی خواب دکھاؤ۔ میں تو اس ان کو ایک دن میں ٹھیک کرلوں لیکن یہ تمھارا ڈائننگ ہال ٹھیک نہیں ہونے دیتا۔ کھانا پکانا بند کردوں تو سب ڈائننگ ہال سے بریانی کھانے لگتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یہ تو سب رہا، لکڑی چولھے سے کھینچ لو بیکار جل رہی ہے۔ کہنے لگیں میاں سرسید کے زمانے میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ بیوی نے کہا آج کھانا پکنے میں دیر ہوئی، ذرا جلدی کرو۔ فرمایا کہہ لو، بیوی کہہ لو۔ سرسید کا زمانہ ہوتا تو بتاتی۔ غرض سرسید، ان کا عہد اور ان کے کارنامے اس درجہ ان پر مسلط ہیں اور بات بات پر مرحوم کو اس کثرت سے یاد کرتی ہیں اور یاد دلاتی رہتی ہیں کہ کبھی کبھی یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ موقع ملے۔ سرسید اجازت دیں اور بیوی مانع نہ ہوں تو بڑی بی کے ساتھ سرسید ہی کے مزار میں سما جاؤں۔

میرے دوست ابھی جیل خانہ سے واپس آئے ہیں۔ نان کوآپریشن کی تعبیر میں ان سے اور ضلع کے کلکٹر سے اختلاف آ رہا ہوا۔ اس نے ایسا طول پکڑا کہ جیل خانہ جانا پڑا۔ فی الحال ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان سے اور ان کے خاندان سے زیادہ دنیا میں نام و نمود پیدا کرنے کا کوئی اور اہل نہیں ہے۔ جب کبھی اس قسم کا تذکرہ آئے گا کہ فلاں شخص نہایت قابلِ منتظم، خوبرو یا پرہیزگار ہے، تو وہ یہ فرمائیں گے کہ ان کو یا ان کے کسی عزیز یا رشتہ دار کو اس قسم کے ناروا ذرائع اور وسائل حاصل نہیں ہوئے ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ یا ان کے عزیز اس پایہ کے نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ کارنیگی راک فیلر کا تذکرہ آیا۔ فرمانے لگے، میرے پاس اتنا روپیہ ہوا تنی سہولتیں نصیب ہوں تو کیا میں کارنیگی اور راک فیلر نہیں بن سکتا، مصطفیٰ کمال کو دیکھو اسلام سے برگشتہ اور بیزار ہو کر اتنی شہرت حاصل کرلی تو کیا ہوا مجھے دیکھو۔

منکرے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن!

ایک مرتبہ ذکر چھڑا کہ یورپین عورتیں بڑی محنتی اور منتظم ہوتی ہیں۔ فرمانے لگے یوں نہ کہیے گا پروپیگنڈا کرتا ہوں لیکن یقین مانیے جفاکشی کے ان امور میں میری بیوی کو کمال حاصل

ہے۔ یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ میرے حصے میں آئی ورنہ اگر کہیں یورپ میں پیدا ہوئی ہوتی اور کم بخت پردہ وغیرہ کی پابند نہ ہوتی تو لطیفہ خانم اور ملکہ ثریا کا کوئی نام نہ لیتا۔ میری خود یہ حالت ہے کہ ان کے سامنے بالکل سہا ہوا رہتا ہوں۔ یہ انھیں کی تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ میرے بچے صحت اور ذہانت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ چھوٹے کو آپ نے دیکھا ہوگا اس کی ذہانت کا خیال کرتا ہوں تو دنگ رہ جاتا ہوں۔ ایک دن تو اس نے مجھ کو بالکل متحیر کر دیا۔ میں اندر سبھا پڑھ رہا تھا راجہ اندر کی تصویر دیکھ کر کہنے لگا، کیوں ابا یہ آپ کی تصویر ہے نا! اتفاق سے وہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں، بول اُٹھیں کیوں بے۔ یہ تیرے ابا ہیں تو کیا یہ ساری قطامہ جو ارد گرد کھڑی ہیں وہ تیری نانی ہیں!

قابلیت کا ذکر آیا تو فرمانے لگے میرا بھتیجا آئیڈیل طالب علم ہے۔ کل کلب میں میری زبان سے اس کا نام نکل گیا سب لوگ تعجب اور فخر سے دریافت کرنے لگے، کیوں صاحب وہ آپ کا بھتیجا ہے؟ ایک صاحب نے فرمایا آپ اس کو ولایت کیوں نہیں بھیج دیتے؟ دوسرا بولا اس کو کیوں نہیں بتاتے۔ تیسرے بزرگ دریافت فرمانے لگے کیوں صاحب ان کی شادی ہوئی ہے یا نہیں؟

میرے دوست کوئی ایسی چیز پسند نہیں کرتے جو ان کے پاس نہ ہو، بلکہ دوسروں کی مِلک ہو۔ آپ نہایت اچھا کپڑا پہن کر جائیں، وہ کہیں گے سلا اچھا نہیں، رنگ بھی یوں ہی سا ہے، میری شیروانی تو دیکھی ہوگی۔ ایک دن پہن کر نکلا تو خلقت عش عش کرنے لگی۔ آپ کا مکان اچھا ہے لیکن کچھ تاریک سا ہے، میرے مکان کو دیکھیے اکثر رات کو صحن میں نکل نکل کر دیکھا ہے تمام در و دیوار روشن اور شگفتہ نظر آئے۔ آپ کے گھر پر تو بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

غرض آپ کوئی تذکرہ کریں یہ اپنا اپنے بیوی بچوں یا عزیزوں کا پروپیگنڈا کیے بغیر نہ رہیں گے۔ جیل خانہ میں اس عادت کو انھوں نے بالکل ترک کر دیا تھا کیوں کہ قیدیوں کے جرائم سن کر اکثر اپنے قبیلے کے کارناموں کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پولیس نے تحقیقات شروع کر دی۔ بالآخر ایک دن اعزا ملنے آئے اور تاکید کر دی کہ وہ اس طرح ساتھیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ فرمایا کریں ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ سارے رشتے دار جیل خانہ پہنچ جائیں گے۔

ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہے جو کنگارو کو اپنے بچہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طور پر کنگارو کا بچہ خطرے کی آہٹ پاکر ماں کی جھونج میں جا بیٹھتا ہے۔ ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی جھونج میں پناہ لیتا ہے لیکن خطرے کا سامنا نہ ہو تو ڈپٹی کلکٹر نہ کسی کی نیازمندی کو خطرہ میں لائے گا نہ کسی کی ناموس کو۔ صرف اپنا نفع دیکھے گا! ڈپٹی کلکٹر مغالطے کے اعتبار سے کئی قسم کا ہوتا ہے مثلاً مادرزاد ڈپٹی کلکٹر چوبیس گھنٹہ ڈپٹی کلکٹر، پیشہ ور ڈپٹی کلکٹر وغیرہ۔ ڈپٹی کلکٹر تنہا نہیں ہوتا بلکہ ایک ڈپٹی کلکٹر کے معنی بے شمار ڈپٹی کلکٹروں کے ہیں۔ اس کے دوست، رشتے دار، چپراسی، خانساماں، بھنگی، بہشتی سب کے سب ڈپٹی ہوتے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹری کی تاریخ میں بعض ابتدائی قسمیں ایسی ملتی ہیں جو اَب بعض جانوروں کی مانند یا تو ناپید ہوگئی ہیں یا خال خال کہیں نظر آ جاتی ہیں۔

کسی زمانے میں ایک ڈپٹی فتح علی خاں تھے۔ شکل صورت ڈیل ڈول، رعب داب میں لندھور بن سعدان، یا رحمت اللہ رعد کی بڑی جنتری اور اس کی بعض تصاویر یاد ہوں تو ان کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ صرف سزا دیتے تھے اور "شبہ کا فائدہ" اگر کبھی کسی نے اُٹھایا تو وہ ملزم نہیں بلکہ اس کے وکیل مختار ہوتے تھے اور یہی سبب تھا کہ وکیل مختار موکل سے زیادہ اپنی خیر مناتے رہتے۔ ڈپٹی صاحب کا تعزیراتِ ہند کا یہ تصور تھا کہ اس کا مقصد صرف لوگوں کو سزا دینا تھا۔ رہا شبہ یا عدم ثبوت اسے وہ وکیلوں کا فریب یا حاکم عدالت کی کمزوری یا عدم قابلیت پر محمول فرماتے تھے۔ ان کی عدالت میں مقدمے کا سزایاب ہونا یقینی ہوتا۔ ان کا کام ہی سزا دینا یا فرصت کے لمحات میں یادِ الٰہی میں مصروف رہنا تھا۔ لیکن عدالت میں خدا کا اور عبادت میں عباد کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ڈپٹی صاحب سے ہر شخص ڈرتا تھا۔ بیوی اور بیوی کے گھر والے بھی! خدا جانے کب سے زندہ تھے اور خدا ہی جانے کب تک زندہ رہنے کا قصد رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر شخص جھوٹا تھا اور زدوکوب اور سب وشتم کا سزاوار۔ اس میں بیوی بچے پیشکار، وکیل، مختار، مدعی، ملزم کسی کی تخصیص نہ تھی۔

ڈپٹی صاحب دورے پر تھے، بابو گنیشی لال پرانے زمانے کے مختار وکیل، ایڈوکیٹ، بیرسٹر سب ہی کچھ تھے۔ نہایت طرار، حکام رس، حاضر جواب، وقت پڑے شاعری بھی کر لیتے

تھے۔ کسی مقدمے کی پیروی میں کیمپ کے ساتھ تھے اور خانساماں وغیرہ کے ساتھ بیٹھے حقہ کے دو چار کش لے رہے تھے۔ قضارا رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک طرف بیت الخلا تھا لوٹا لیے بدحواسی کے ساتھ داخل ہوئے، وہاں جو دیکھتے ہیں ڈپٹی فتح علی خاں جلوہ افروز ہیں

تو گوئی ہمہ تخت سہراب بود!

لوٹا فوراً زمین پر رکھ دیا، جھک کر سلام کیا۔ پھر جو فرار ہوئے تو کہا جاتا ہے جب تک ڈپٹی فتح علی صاحب اس ضلع میں رہے۔ بابو گنیشی لال کو کسی نے عدالت میں نہیں دیکھا۔

چوبیس گھنٹہ ڈپٹی کلکٹر کی علامت یہ ہے کہ وہ تنگ سوٹ میں ملبوس ہوگا اور سستے قسم کا سگریٹ کثرت سے پیے گا اور ٹھیک اس وقت جب انگریزی بولنا ضروری ہو وہ غلط اردو بولے گا اور جہاں اردو بولنا مناسب ہو وہ غلط انگریزی شروع کردے گا۔ زین کے کوٹ پتلون سے اسے خاص اُلفت ہوتی ہے۔ بالعموم شرعی پتلون پہنے گا یعنی ٹخنوں سے کافی اونچا۔ چھوٹا، جوتا، گھٹیا، کوٹ ہمیشہ تنگ ہوگا۔ گو دیدہ و دانستہ کبھی ایسا کوٹ تیار نہیں کراتا لیکن تن و توش کے بڑھانے میں اس کا ڈپٹی ہونا نادانستہ اور نامعلوم طور پر ہمیشہ معین ہوتا رہتا ہے۔ ڈپٹی کو میل ملاقات کے لیے ڈپٹی ہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ دوسروں کی محبت میں یا تو وہ اپنے آپ کو بے وقوف ورنہ برتر سمجھتا ہے، لیکن نتیجہ یکساں ہوتا ہے یعنی وہ رہتا بالکل ڈپٹی ہی ہے۔ آپ اس سے ملیں آپ کے سلام پیام، مزاج پرسی اور اس قسم کے دوسرے تکلفات کو سن کر کچھ اس طرح کا رنگ اختیار کرے گا جیسے یہ سب کچھ غیر متعلق باتیں تھیں۔ پھر وہ ایسا کھویا کھویا نظر آنے لگے گا جیسے جلد سے جلد آپ سے نجات پانے اور کسی دوسرے ڈپٹی کا منتظر ہو!

سواری میں عام طور سے بائیسکل استعمال کرتا ہے لیکن گھنٹی نہیں بجاتا خاص طور پر احاطہ، عدالت میں پہنچ کر، تاکہ کوئی گنوار ٹکراتے ٹکراتے بچے اور اس کو اپنا سفید دانت نکال کر اینگلو انڈین زبان میں اس طرح گالی دینے لگے کہ ایک طرف بے چارہ گنوار سہم جائے، دوسری طرف ڈپٹی صاحب کی آمد کی اطلاع ساری کچہری میں ہو جائے۔ وہ ہمیشہ اس کی کوشش کرے گا کہ اس کی وضع قطع اور طور طریقے کو دیکھ کر لوگ یہ یقین کرلیں کہ یہ سلسلۂ 'فاتحانِ ہند' کی کوئی کڑی ہے گم شدہ نہیں تو گری پڑی سہی!

24 گھنٹے ڈپٹی کلکٹر کی زندگی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوا۔ اس سے قبل کے زندگی اور خاندان کے سارے حالات وحوادث اس طور پر بھلادے گا گویا وہ کبھی پیش ہی نہیں آئے تھے۔ اب نہ وہ عزیزوں کو پہچانے گا نہ دوستوں کو خاطر میں لائے گا، بشرطیکہ وہ کلکٹر صاحب نہ ہوں۔ ڈپٹی کسی وقت کو خاطر میں نہیں لاتا سوا اس کے کہ جب اسے اپنے سے کم درجے کے عزیزوں اور رشتے داروں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو یا کلکٹر صاحب خفا ہوں۔ وہ کبھی کھل کر ہنستا ہوا نہیں پایا جائے گا تاوقتیکہ وہ ڈپٹی برادری میں نہ ہو۔ کبھی ایسا ہوا بھی تو محض یہ محسوس کرانے کے لیے بادلِ نخواستہ ہنسے گا کہ آپ پر احسان کر رہا ہے! وہ ہر واقعہ یا مسئلے کو خواہ اس کے عقل وفہم سے باہر ہی کیوں نہ ہو، اس طور پر سنے گا گویا اس کی تہ تک پہنچ چکا ہے اور آپ جس سنجیدگی یا تشویش کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں وہ آپ کی حماقت کی دلیل ہے۔ ڈپٹی کلکٹر کبھی بے تکلف نہیں ہوتا کیوں کہ اس کو یقین ہے کہ اس کے بے تکلف ہونے سے ہندوستان سے انگریزی اقتدار اُٹھ جائے گا، اور ظاہر ہے اس کے ساتھ اس کی ڈپٹیت بھی!

بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیئت اور حلیے کے اعتبار سے ان کا عجیب وغریب نظر آنا، اسی کے مطابق لباس تیار کرنا، سر کے بالوں کو بڑھا کر ان کی حالت پر چھوڑ دینا یا انوکھے انداز سے چلنا یا گفتگو کرنا ان کی شہرت یا قابلیت کے لیے اتنا ہی ضروری یا مفید ہے جتنا امرت دھارا یا حکیم صاحب کی گولیاں امراض معدہ میں۔ مثلاً ایک صاحب موسیقی کے فن کے ماہر تھے۔ ان کی عادت برہنہ سر رہنے کی تھی، دوسرے نے اس خیال سے کہ لوگ ان کو بھی ویسا ہی باکمال سمجھنے لگیں، یا ان کو دیکھ کر اوّل الذکر کا دھوکا ہو، ٹوپی ترک فرمادی۔ حالاں کہ ان کا کمال اگر ظاہر ہوسکتا تھا تو اس طور پر کہ ٹوپی کے سوا یہ سارے کپڑے ترک فرمادیتے!

بعض لوگ جو ہمیشہ انگریزی طرز کے لباس پہنتے ہیں جب کوئی غیر معمولی تقریب ہوگی تو وہ قدیم اور متروک ہندستانی لباس میں نظر آئیں گے تاکہ لوگ حیرت میں آکر یہ سوچنے لگیں کہ ایسا قابل اور ایسا مشہور آدمی جس لباس میں نظر آرہا ہے، اس سے اپنے شاندار ماضی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

ایک دوست اس تیور اور کچھ تعجب نہیں اس مقصد سے نماز پڑھتے ہیں کہ جو لوگ ان کے ساتھ یا ان کے پیچھے نہیں پڑھتے وہ دوزخی ہیں۔ دوسرے ہیں جن کی زندگی کا وطیرہ یہ ہے کہ

وہ مشہور لوگوں کے ساتھ رہیں اور ان کے ساتھ دیکھے یا پائے جائیں۔ وہ کھیلنے سے قطعاً نا آشنا ہوں گے لیکن کیپٹن کے اردلی بنے رہیں گے، کہیں کھیل ہو رہا ہو تو گھوم پھر کے وہیں رہیں گے جہاں کھلاڑی جمع ہوں۔ اپنے سوا کسی دوسرے کو وہاں آنے نہ دیں گے۔ اس سلسلے میں ان کو دو چار پست قسم کے کام کرنے پڑیں یا کیپٹن یا ٹیم والے ان کو تفریحاً گالی دے دیں یا ایک آدھ ہاتھ تفریحاً رسید بھی کر دیں تو وہ غالب سے نابلد ہونے کے باوجود غالب کے مسلک

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے!

کی پیروی کرتے نظر آئیں گے۔ ان کو اس کا معاوضہ کیا ملتا ہے؟ صرف اتنا کہ وہ کیپٹن یا کھلاڑی یا دوسرے ممتاز افراد سے بے تکلف ہیں۔ ان کی گفتگو میں شریک ہوں گے کبھی کبھی اپنا کھانا منگوا کر ان کے دستر خوان پر بیٹھ جائیں گے۔ ان کی عدم موجودگی میں دوسروں سے کھیل کا حال کھیل کا طریقہ یا کھیل کا فلسفہ اس طور پر بیان کریں گے گویا یہ خود اس میں شریک تھے اور انھیں کے نام پر ٹرافی حوالہ کی گئی ہے۔ پہلی بار تو مجبوری ہے ٹرافی کیپٹن ہی کے ہاتھ میں دی جائے گی لیکن اس کے بعد غریب ٹرافی ہے اور یہ ہیں۔ تانگے میں، ریل میں، پلیٹ فارم پر، چوراہے پر ہر جگہ ٹرافی انھیں کے آغوش میں ہوگی۔ اس قسم کے لوگ یا اس قسم کی حرکتیں صرف کھیل کود تک محدود نہیں ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً لکھنا پڑھنا، تقریر کرنا، فیل ہونا، کھیلنا، مانیٹری کرنا، اسٹرائک کرنا، مارنا، مار کھانا، شادی کرنا، والدین بننا یا نان کو آپریشن کرنا وغیرہ۔

ایک صاحب اور ہیں جن کا خیال ہے کہ ان کے علاوہ تمام دوسرے لوگ مغالطے میں مبتلا ہیں۔ اگر ناظرین ان کا ٹھیک پتہ بتا سکیں تو اس صلے میں یہ مضمون دریافت کرنے والے کے نام معنون کر دیا جائے گا۔

مطبوعہ:

1۔ انٹر کالج میگزین۔ علی گڑھ، مئی 1929

2۔ نیرنگ خیال۔ لاہور، جون 1929

3۔ نگار۔ لکھنؤ، جون 1929 ''مغالطہ ذرا ہٹ کر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

●●●

مثلث

مرشد[1] کا مقولہ ہے اور میرا تجربہ کہ اگر انسان کو بدترین دشمن کی تلاش ہو تو اس کو اپنے عزیزوں میں مل جائیں گے اور بہترین دوست کی ضرورت ہو تو غیروں کا جائزہ لینا چاہیے۔ یعنی عزیزوں سے زیادہ دشمن اور غیروں سے زیادہ دوست نہیں ہوتے۔ اس پر ایک دوست نے فرمایا، دوست اور دشمن دونوں کی بدترین مثال یونیورسٹی میں مل جائے گی۔

اس سال یونیورسٹی میں غیر معمولی تعطیل ہوئی۔ یعنی غیر معمولی طور پر طویل، اور اس میں حصہ لینے کے لیے ہم آزاد ہی نہیں مجبور بھی ہیں تو سوچنا پڑا کہ آخر کیا کیا جائے، چنانچہ مرشد سے رجوع کیا گیا۔ فرمایا، تعطیل گزارنے کی دو صورتیں ہیں یا تو،

سیر کر دنیا کی غافل 'نوجوانی' پھر کہاں

اور یہ صورت اس حال میں روا ہے جب صحت اچھی ہو اور روپے پاس نہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیے، عزیزوں کی مدد کیجیے، کسی کی روپے سے کسی کی کپڑے لتے سے، ایک کی تیمارداری کیجیے، دو چار کی تجہیز و تکفین اور پھر بیمار، مفلوک الحال، مقروض اور مطعون ہو کر واپس آجائیے۔ مشورے میں ایسے لوگ شامل تھے جو مرشد کے ماننے

---

1. رشید صاحب اپنے نام کی مناسبت سے ذاکر صاحب (1969-1897) کو مرشد کہتے تھے۔ مرشد کے عنوان سے ذاکر صاحب پر ایک سوانحی مضمون بھی تحریر کیا ہے۔

اور ان کی بشارتوں کے ہمیشہ سے قائل تھے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اس بارے میں مرشد کی ہدایت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کہاں اور کب چلا جائے۔

مرشد نے فرمایا، یورپ چلا جائے۔ راؤنڈ ٹیبل میں شرکت بھی ہو جائے گی اور میموں سے بھی جھجک نکل جائے گی۔ عرض کیا مرشد میموں سے جھجک کے کیا معنی۔ فرمایا یہی تھوڑی بہت یا واللہ۔ مثلاً یہ کہ جب دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا ساتھ ہوگا تو پھر وہ باتیں جو ہمارے بزرگوں کو ان کی بری معلوم ہوتی ہیں ہم کو بھلی معلوم ہونے لگیں گی۔ اپنے یہاں کی عورتوں کے علاوہ سارے جہاں کی عورتوں کی توقیر ہماری نظروں میں بڑھ جائے گی اور ہم صحیح معنوں میں عورت اور آزادی کا اندازہ کر سکیں گے۔ آپ جانتے ہیں ہمارے آپ کے بزرگوں کے ذہن میں کبھی یہ معمولی سی بات بھی نہیں آئی کہ ہندوستان کی آزادی درحقیقت عورتوں کی آزادی سے وابستہ ہے۔ جس دن عورت آزاد ہوئی ہم آپ بھی آزاد ہو جائیں گے اور بفرضِ محال ہم آزاد نہ بھی ہوئے تو مجلس بین الاقوام تو ہم کو آزاد ماننے پر مجبور ہی ہوگی، اور جس دن مجلس بین الاقوام نے ہم کو آزاد قرار دے دیا نہ نگار فتح پوری کی ضرورت ہوگی نہ سچ دریابادی کی، نہ طلاق ہے نہ تعدد ازدواج نہ سعدی نہ شفیع داؤدی۔

نہ ہر زن، زن است و نہ ہر مرد مرد!

ایک طرف سے آواز آئی۔

گئے تھے ہر بھجن بنیں گلے کپاس!

میرے ایک دوست میر مجھو ہیں۔ جن کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ دولت میں راک فلر کے ہمسر اور شہرت میں مہاتما گاندھی کے لگ بھگ ہو جائیں۔ دریافت کیا کہ آخر آپ کو اس کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ پہلے تو بہت جز بز ہوئے لیکن جب میں معافی مانگنے پر آمادہ ہوا اور ان کو اندیشہ ہوا کہ میں اپنے سوال کو جہاں کا تہاں رہنے دوں گا تو فرمانے لگے، تم سے کیا تکلف میں چاہتا ہوں کہ کوئی نہایت حسین، نوجوان، تندرست، دولت مند اور نیک عورت مجھ سے عشق کرنے لگے۔ میں نے کہا جو صفات آپ عورت میں چاہتے ہیں وہ خدانخواستہ مل گئیں تو اندیشہ ہے وہ سب سے پہلے تو خدا سے عشق کرے گی یا پھر مجھ سے۔ آپ کا تو کوسوں پتہ نہ ہوگا۔

میر صاحب چراغ پا ہوگئے۔فرمایا،تم کافر بھی ہو اور جھوٹے بھی۔آخر تم پر وہ کیوں اور کیسے مائل ہوگی۔میں نے کہا،صاحب سنو۔مجھ پر تو وہ یوں مائل ہوگی کہ اس میں جتنے صفات ہوں گے اس کے برعکس مجھ میں عیوب ہیں اور آپ جانتے ہیں عورت مرد کے محاسن سے زیادہ اس کے معاصی کی پرستار ہوتی ہے۔آپ خود ان لوگوں میں ہیں جن کو نہ اپنے محاسن کا احساس، نہ معاصی کا علم۔ آپ کا دشمن ہوتا آپ کے بارہ میں حکم لگاتا۔نہ رزق نہ موت!

میر منجھو ان لوگوں میں تھے جن کی شادی والدین کرتے ہیں، اور عقدِ ثانی دوست احباب۔کسی زمانے میں ان کی شادی ضرور ہوئی تھی، کیوں کہ ان کا مخصوص برزخ اس پر گواہ تھا۔ لیکن والدین کے ساتھ ساتھ بیوی نے بھی مفارقت کی۔میر منجھو نے ہوش سنبھالا تو جوانی اور دولت دونوں ختم ہو چکی تھیں۔لوگوں کا خیال ہے کہ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ جب انسان میں کار نیگی اور انٹولی بننے کی استعداد نہیں صرف آرزو رہ جاتی ہے اور ظاہر ہے اس حالت پر پہنچ کر انسان کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔جیل خانہ جانے سے زیادہ نائٹ بننا پسند کرتا ہے۔

میر صاحب بوڑھے ہو گئے تھے لیکن بڑھاپا ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔داڑھی مونچھ دونوں صاف۔نماز روزے سے مستثنیٰ۔عورتوں سے مایوس، شادی سے گریز، تہجد کے وقت تک جاگتے اور چاشت تک سوتے۔ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے اور بڑی سے بڑی مسرّت پر متبسّم نہ ہوتے۔تندرست تھے لیکن شکل سے بالکل ہندستانی دواخانہ۔ایک سبب یہ بھی تھا جس سے عورتیں اور لڑکے ان سے بھاگتے اور دوست احباب ان کے گرد رہتے تھے۔آج تک کسی کو نہ معلوم ہوگا کہ میر منجھو کا مبلغ علم کیسا ہے، نہ کوئی شخص یہ پتہ لگا سکا کہ ان کو کیا نہیں آتا کہ ایک دن ایک مریض کے زخم کی پٹی دیکھ کر غش کھا گئے لیکن میں اس دن بھی موجود، جب میر صاحب کی داہنی بغل کی چار گلٹیاں نشتر سے نکالی گئیں اور میر صاحب اس دوران میں بائیں ہاتھ سے چار سگریٹ پی گئے۔

میر صاحب ہٹی اور سنکی دونوں ہیں اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ کس موقع پر کیا کر بیٹھیں گے۔میر صاحب کو اس کا کبھی یقین نہیں آئے گا کہ کل پورب سے سورج نکلے گا یا نہیں۔ لیکن اگر آپ یہ کہنے لگیں کہ شاید سورج نہ نکلے تو پھر کہیں گے کہ سورج ضرور نکلے گا۔آپ کیسی ہی

معقول اور مدلل بات کیوں نہ کہیں وہ اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے آپ نامعقول یا پھُس پھسی بات پیش کریں اور میر صاحب اس کے معقول ہونے کی قسم کھالیں۔

یورپ جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں نے کہا مرشد دو چیزوں کی ہمیشہ تمنا رہی۔ ایک داڑھی رکھنے کی، دوسرے یورپ جانے کی۔ داڑھی کی تو اب تک توفیق نہیں ہوئی۔ آپ کے ہوتے اگر یورپ جانا بھی نصیب نہ ہوا تو میری بیوی بچے آپ کو کیا کہیں گے۔ میر منجھو بولے یورپ جانے والوں کا یہ منہ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا مرشد نے سالہا سال کس منہ سے یورپ میں بسر کی ہے۔ مرشد نے فرمایا بھئی یورپ میں ہر قسم کا منہ چالو ہے بشرطیکہ منہ میں زبان کے بجائے پیسے ہوں۔ میں نے کہا مرشد پیسے ہوتے تو آم کیوں نہ کھاتے۔ آم کا سننا تھا کہ مرشد یک لخت کھڑے ہوئے۔ فرمایا چلو..... چلیں۔ سبحان اللہ آم تو علاج الغربا کا بہترین نسخہ ہے۔ مقوی، مشتہی، مسکن، محرک اور بہت سے دوسرے خواص زرینہ، جن سے ہندستانی دواخانہ کی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ عرض کیا مرشد یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک ہی چیز مسکن بھی ہو اور محرک بھی۔ فرمایا جب تم نفسیاتِ طب سے واقف نہیں ہو تو پھر ہر بات میں قابلیت کیوں جتاتے ہو۔ اتنا تو جانتے ہو کہ جرم کا مدار نیت پر ہے، اس لیے تسکین اور تحریک کا مدار محض نیت پر ہے جو آم کے استعمال کی محرک ہوئی۔ میں نے کہا بعض جرائم ایسے بھی تو ہیں جن میں نیت کا مدار جرم پر ہوتا ہے یا جہاں جرم موجود ہوتا ہے اور نیت کا پتہ نہیں ہوتا۔ فرمایا وہ کیا! کہا مثلاً نان کوآپریشن۔ کہنے لگے دیکھو ذاتیات کو معرضِ بحث میں لاتے ہو اور یہ علی گڑھ والوں کا عام شیوہ ہے۔ میں نے کہا علی گڑھ کا ہونے کی کمزوری تو مجھ میں آپ میں برابر ہے کہ میر منجھو نے سرکہ جبیں ہو کر فرمایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ نے علی گڑھ کو چار چاند لگائے ہیں اور ذاکر صاحب سے علی گڑھ کو کلنک کا ٹیکہ لگا ہے۔ میں نے کہا میر صاحب آپ کے خوشامدی ہونے کا ثبوت مل گیا لیکن مرشد کو ذاکر صاحب کہنے سے کیا مطلب ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں آپ کا عقیدہ بھی وہی ہو جس کی بنا پر محمد علی جناح، مہاتما گاندھی کو مسٹر گاندھی کہتے ہیں۔

مرشد نے فرمایا، نان کوآپریشن نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے کہا مرشد نان کوآپریشن جب مولانا شوکت علی کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے! میر منجھو نے کہا تم

دونوں میں بننے کی کب صلاحیت تھی کہ کچھ بگڑتا۔ میں نے کہا جناب میں، مرشد، جملہ اراکین اسمبلی، امیر فیصل اور میر منجھو مسلمان ہیں، جن کی نجاتِ اخروی کا ذمہ دار خدا اور نجاتِ دنیوی کی حکومتِ برطانیہ ہے۔ اس کے بعد رہ کیا جاتا ہے۔ نان کو آپریشن کا درد سر وہ خریدے جس پر اُن کا ایمان نہ ہو۔ مرشد اس پر کچھ ایسے نعل در آتش ہوئے کہ قریب تھا کہ کوئی نہایت غیر ذمہ دار فقرہ زبان پر لاتے، اتنے میں آم والے نے صدا دی۔ مرشد کا چہرہ اصغر صاحب کا مصرعہ بن گیا۔

شعاعیں (صدائیں!) کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

آم والے کو آواز دی۔ اس نے خوانچہ سامنے رکھ دیا۔ مرشد نے آموں کی اقسام اور ان کی تعریف شروع کر دی۔ ٹوکرے میں اتنے آم یا اس کے اقسام نہ تھے، جتنے مرشد کی زبان پر توصیفی الفاظ عرض کیا۔ مرشد مسئلہ آم اور اقسام کا نہیں ہے بلکہ آم و دام کا ہے۔ فرمایا انسانیت سے کیوں گزرے جاتے ہیں۔ میں نے کہا آخر یہ کس صحیفۂ اخلاق کی تعلیم ہے کہ آم کے سلسلے میں آپ کسی کی انسانیت کو معرضِ بحث میں لائیں۔ فرمایا آم اور انسانیت کا جب کبھی مقابلہ کریں گے اوّل الذکر کو بہتر و برتر پائیں گے۔ مثلاً آم سے کمزوریوں میں اور انسانیت سے حریفوں میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ آم سے آپ سرخ وسفید ہوں گے۔ انسانیت سے آپ کے دشمن آم کھاتے رہیے اولاد پیدا کرتے رہیے۔ انسانیت دکھایئے تو بیوی اور برطانیہ دونوں شیر۔ اتنے میں ایک دوست بول اُٹھے، آم کھانے سے گرمی دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ میر منجھو نے بھی سر ہلاتے ہوئے اس کی مبہم سی تصدیق کی۔ مرشد نے بشارتاً فرمایا اس پر دودھ استعمال کیجیے تو گرمی قائم رہے گی اور دانے پیدا نہ ہوں گے۔ یہ بشارت کچھ ایسی تھی کہ آم والا دام لیے بغیر چل دیا۔ مجھ پر وجد کا عالم طاری ہوا۔ مرشد اسی وقت کے منتظر اور آم خائف تھے۔ چنانچہ کھانا آتے آتے تمام آم ناگفتہ بہ ہو گئے۔

کئی دن تک مرشد دعوتیں اور میر منجھو غم کھاتے رہے، ایک دن پھر جلسۂ مشاورت ہوا۔ طے پایا کہ میر منجھو کوئی پروگرام پیش کریں۔ میر صاحب کبھی فیصلہ کن بات پیش نہیں کریں گے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے۔ لیکن کوئی دوسرا پیش کرے تو اس کی مخالفت شروع کر دیں گے۔ میر صاحب صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا کرتے ہیں اور وہ بھی اس طور پر گویا ان کو اس کا یقین نہیں ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ میر صاحب مسئلہ کی اتنی مخالفت نہیں

کرتے جتنی مسئلہ پیش کرنے والے کی۔ مثلاً کوئی شخص کہے، موسم نہایت عمدہ ہے۔ میر صاحب بول اُٹھیں گے آپ احمق ہیں۔ کوئی ڈرتے ڈرتے یہ دریافت کرے کہ میر صاحب آپ عقدِ ثانی پر مجبور کیے جائیں تو کس قسم کی بیوی پسند فرمائیں گے۔ چھوٹتے ہی فرمائیں گے اُلو۔ لیکن میر صاحب کوئی قطعی بات پیش بھی کردیں گے تو جلد ہی اس کے نقائص یا خطرات بھی بیان کرنے لگیں گے۔ مثلاً ارشاد ہوگا کہ یہ وقت شکار کے لیے موزوں ہے اور لوگوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔ معاً دوسری آواز آئے گی لیکن دیکھو ممکن ہے دھوپ تیز ہو جائے موٹر میں آگ لگ جائے، چلتے چلتے وصال ہو جائے، بندوق موجود نہ ہو، ناشتہ تیار نہ ہو سکے، شکار نہ ملے، ورنہ پھر کہو گے میں نے تجویز پیش کی تھی۔ اس پر بھی لوگ تیغ و کفن باندھ کر تیار ہو گئے، تو فرمائیں گے۔ سورج نکلنے پر روانگی ہوگی اور سورج غروب ہونے سے پہلے واپسی۔ شکار کس قسم کا ہوگا، چرند، پرند درند یا کیا؟ جائے ورود سے شکار کتنے فاصلہ پر ہوگا، کن کن لوگوں کی بیویاں چلیں گی اور کن کن کے بچے اور کون لوگ گھر رہ جائیں گے۔ اگر ان تمام امور کا جواب خاطر خواہ ہوا تو پھر میر صاحب آمادہ ہوئے، لیکن روانہ ہوتے ہوتے سفر کے دوران، سفر کے اختتام پر کہتے یہی رہیں گے کہ شکار نہ ملے گا اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ نہیں ملتا اور آخر ملے بھی کیوں؟ میر صاحب چاہتے ہیں کہ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے نہ شکار کو اپنے پاؤں سے چلنے کی توفیق ہو۔ آرزو یہ ہوتی ہے کہ شکار کے دولت خانے پر چلے جائیں مل جائے تو فبہا ورنہ کارڈ چھوڑ آئیں۔ شکار کی اخلاقی پابندی ہے کہ وہ بازدید کے لیے میر صاحب کے آستانہ پر حاضر ہو۔

ایک دن سب نے

نکل گھر سے بس راہ شملہ کی لی

راستے میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مرشد دہلی اُتر پڑے۔ میر منجھو اسٹیشن پر ٹھہر گئے اور میں مکان واپس آ گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ سب کے روپے میر صاحب کے پاس تھے جسے وہ گھر بھول آئے تھے۔ لیکن تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ روپے صرف ان کے تھے اور بقیوں کے وعدے۔ غلطی سے وعدے ساتھ چلے آئے اور روپے گھر رہ گئے۔ یہ مسئلہ پھر مرشد کے سامنے آیا۔ موصوف نے فرمایا کہ روپے کا انتظام شملہ پہنچ کر کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اصغر صاحب

نے دریافت فرمایا وہاں پہنچ کر آخر کیا سبیل ہوگی۔ مرشد نے فرمایا کہ اس وقت شملہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ راؤنڈ ٹیبل میں کس قسم کے ممبران بھیجے جائیں۔ دقت یہ تھی کہ امیدواروں کے زمرے میں ایک جماعت کے پاس روپے کی افراط تھی اور اراکین کی کمی۔ دوسری اگر ایسی حالت میں ہم شملہ پہنچ جائیں تو حکومت کا نام اور ہمارا کام ہو جائے گا۔

میں نے دریافت کیا یہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن شملہ پہنچیں گے کیوں کر؛ طے پایا کہ مرشد ایک دفعہ ہندستانی دواخانہ ہو آئیں۔ اصغر صاحب ریفرشمنٹ روم، میر منجھو جگادھری انبالہ، میں مکان۔ ہم لوگ اپنے اپنے مشن پر روانہ ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میر منجھو نے ہمارا خون ہدیہ کر دیا ہے!

میر منجھو اور مرشد سے نجات پا کر علی گڑھ واپس آیا۔ معلوم ہوا کہ عزیزوں میں ایک صاحب کی شادی ہونے والی ہے۔ دوسرے صاحب سفرِ آخرت کر گئے۔ تیسرے ایسا کرنے والے ہیں۔ چوتھے خود ہمارے یہاں تشریف لانے والے ہیں۔ یہ خبر ایسی فیصلہ کن تھی کہ فی الفور بیوی بچّوں کو محفوظ مقام پر بھیج دیا گیا اور میں نینی تال کے لیے روانہ ہو گیا۔

ایک دفعہ ایک کتے سے کچھ اختلاف آرا ہوا تھا۔ اس لیے کسولی جانا پڑا تھا۔ ورنہ اب تک کسی پہاڑ کو مجھ سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ایک عرصہ سے ڈاکٹر اصغر صاحب سے ناخوش تھا۔ سبب یہ تھا کہ انھوں نے میرے ساتھ کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن آخر وقت میں جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اس سلسلہ میں بہت کچھ زیر بار ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک میرے سفر کا تعلق ہے ان سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ انھوں نے بہت کچھ عذر و معذرت بھی کی، لیکن میں قطعاً بیزار رہا۔ لیکن بعض مستند راویوں کا خیال ہے کہ جو قصور میں اصغر صاحب کے سر تھوپ رہا ہوں۔ وہ ان کا نہیں میرا تھا در اصل میں نے کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا اور آخر وقت میں، میں نے سفر سے انکار کر دیا، اور وہ مجھ سے بیزار تھے اور عزم کر چکے تھے کہ اب سے میرے قول و فعل کا کبھی اعتبار نہ کریں گے۔ بہت کچھ معافی مانگی لیکن انھوں نے اعتنا نہیں کی۔ بہرحال اوّل تو میری عادت ردّ و قدح کرنے کی نہیں ہے، دوسرے میرے اور ان کے تعلقات نئے سرے سے شگفتہ ہوئے ہیں۔ اس لیے اس مسئلہ کو معرضِ بحث میں نہیں لانا چاہتا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب میں اور وہ نینی تال کو اپنا ممنونِ کرم بنانے کے لیے روانہ ہوئے تو تعلقات کچھ یوں ہی سے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میرا اصولِ سفر یہ ہے کہ میں اور میرا ہمسفر پہلے یہ طے کر لے گا کہ کون سینئر ہوگا اور کون جونیئر۔ سینئر اور جونیئر کے فرائض یہ ہیں کہ صرف ریل کا کرایہ اپنے اپنے پاس سے ادا کریں۔ اس کے بعد موٹر تانگے کا کرایہ۔ قلی کی مزدوری، کھانے کی قیمت، قیام، طعام اور راستے کے تمام اخراجات سینئر کے ذمہ، ناشتہ لے چلنے کا ذمہ دار بھی سینئر ہے۔ جہاں جا رہے ہو وہاں جونیئر کو روپیوں کی ضرورت ہو تو سینئر کا فرض ہے کہ وہ بطور قرض ادا کرے، جہاں تک اس قسم کے قرض کا تعلق ہے جونیئر کا فرض ہے کہ وہ اپنی سہولت کو مدِّنظر رکھ کر بالاقساط ادا کرے۔ لیکن ہمیشہ ہر مجمع میں اس کا اقرار کرے کہ اس نے قرض لیا ہے۔ اس کے علاوہ جونیئر کا فرض یہ ہے کہ وہ اسباب وغیرہ کا نگراں رہے۔ سینئر کے لیے ریل پر ہر قسم کی سہولت فراہم کرے۔ مثلاً پانی یا ضرورت کی چیزیں اسٹیشن پر سے لایا کرے۔ قلی اور تانگے والے سے لڑائی مول لے، ٹکٹ کلکٹر سے انگریزی بولے، نئے مسافروں کو اندر نہ آنے دے اور سینئر کو باہر نہ جانے دے۔ ناشتہ دسترخوان پر چن دے پھر ساری چیزوں اور برتن کو سمیٹ لے۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کے متوقع اخراجات کا سینئر اور جونیئر بننے یا بنائے جانے کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ اصغر صاحب نے سرے سے انکار کر دیا کہ نہ کوئی جونیئر ہے اور نہ سینئر۔ ہر شخص ہمسر اور سب نے بہت کچھ سمجھایا کہ بغیر اس کے کام نہ چلے گا لیکن کسی کی ایک پیش نہ گئی۔ شام کے پانچ بجے روانگی کا وقت تھا لیکن سامان وغیرہ درست نہ ہو سکا۔ رات کے دس بجے تک یہی عالم رہا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ علی گڑھ سے کاٹھ گودام تک میں جونیئر اور اصغر صاحب سینئر اور کاٹھ گودام سے نینی تال تک میں سینئر اور اصغر صاحب جونیئر۔ بارہ بجے رات کو روانہ ہوئے صبح بریلی پہنچے اور 10-9 بجے تک کاٹھ گودام۔ تمام راستے کے اخراجات کے اصغر صاحب کفیل اور خدمات کا میں متحمل رہا۔ کاٹھ گودام پہنچے تو ترشح ہو رہا تھا۔ میں نے کہا چھتری نکال کر مجھے لگائیے۔ فرمایا یہ تم کو خود کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا آخر کیوں؟ کہنے لگے یوں ہی۔ میں نے کہا اچھا کھانا اُتار کر چلیے، میں کھانا شروع کروں اور آپ لپک کر کوئی موٹر ٹھہرائیے اور اسباب بار کرائیے۔ کہنے لگے موٹر میں ٹھہرالوں گا لیکن کھانا نینی تال پہنچ کر کھایا جائے گا۔ ویٹنگ روم میں

بیٹھ گیا وہیں سے دیکھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ سارے موٹر والے، قلی، مسافر اور تماشائی اصغر صاحب کے گرد جمع ہیں۔ تھوڑی دیر تک اور یہی حالت رہتی تو پولیس کے چند سپاہیوں کا اور اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ مجھ کو بھی جانا پڑا۔ میں نے اصغر صاحب کو الگ لے جا کر دریافت کیا کہ اب آپ جونیئری سے فوراً مستعفی ہو جایئے، ورنہ نینی تال اور علی گڑھ دونوں ہاتھ سے جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک ردّ و قدح ہوتی رہی، لیکن بعد میں معاملات طے ہو گئے اور میں جونیئر کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔

کاٹھ گودام سے نینی تال تک کا سفر بھی کس درجہ روح پرور تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیاز فتح پوری کی جنت سے مولانا ماجد کی جنت کو منتقل ہو رہا ہوں، تو اس جنت کے اس تصوّر کو اس وقت دھچکا لگتا۔ جب ہوا زیادہ سرد ہونے لگتی، یا سامنے سے یک لخت کوئی موٹر آ جاتی۔ جنت اور دوزخ کے معاملہ میں ان دونوں بزرگوں میں جو 'مزاح المومنین' ہوا ہے اس پر ایک دفعہ مرشد سے بھی درخواست کی تھی۔ اس معاملہ میں رہبری فرمائیں۔ ارشاد ہوا تھا، یاوہ گوئی پر یاوہ گو کی زبان کھینچ لینی چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص یاوہ گوئی کا حق چھیننا چاہے تو اس کا سر قلم کر دینا لازم ہے۔ میں نے کہا مرشد معاف فرمایئے۔ یہ آپ کیا جرثقیل پیش کر رہے ہیں۔ میں اس طرح کی باتوں کو نہ سوچ سکتا ہوں نہ کہہ سکتا ہوں۔ فرمایا جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن اس وقت بھوک لگ رہی ہے۔ چنانچہ مداراتِ معدہ کے بعد مرشد چارپائی پر اس طور سے لیٹ گئے کہ ہاتھ اور پاؤں کے انگوٹھے سے اس کے چارپایوں کو چھونے لگے۔ عرض کیا مرشد یہ کس قسم کا لیٹنا ہے۔ فرمایا کھانے کے بعد یہ ایک طرح کا قیلولہ ہے جس سے غذا کے مقاصد جلد سے جلد پورے ہو جاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہندو مسلم نفرت و نفاق کا ذکر چلا، پوچھا مرشد اس بارے میں کیا حکم ہے۔ فرمایا رسہ کشی ہو رہی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دور رہو۔ لیکن دل نہ مانے تو ایک تیز چھُرا کہیں سے لاؤ۔ میں نے کہا مرشد اتنی ہمت نہیں ہے کہ چھُرے کا نام سن کر اس سے کام لے سکوں۔ فرمایا ایک حالت تو یہ ہوتی ہے کہ لاٹھی نہ ٹوٹے اور سانپ مر جائے۔ دوسری یہ کہ لاٹھی ٹوٹ جائے اور سانپ نہ مرے۔ تیسری یہ کہ دونوں پر آفت آئے، اور چوتھی یہ کہ کسی پر نہ آفت

آ ئے۔ میں اُچھل پڑا۔ مرشد مرحبا، بس آخری ترکیب ٹھیک ہے۔ فرمایا اچھا اس وقت دونوں انتہائی جوش اور شدت کے ساتھ رستا کھینچ رہے ہیں۔ تم بیچ میں کھڑے ہو جاؤ، جب دونوں پورے طور پر آنکھیں کھولے اور دانت نکالے ہوئے ہوں، رسّے پر بھر پور ایک ہاتھ چھرے کا مار دینا!

لاحول ولاقوۃ کہاں سے کہاں جا پڑا۔ ہم موٹر پر اس تیزی کے ساتھ بلندی کی طرف بڑھ رہے، جیسے کسی مہاجن کا سودی قرض۔ سیاہ چکنی چمکتی پر پیچ و پرخم سڑک جیسے پیکرِ کوہ کی طرف بڑھ کے فشارِ آغوش میں ہو۔ راستہ خشک اور خنک، منظر حسن و شباب کا تصوّر اور تصویر، سردی بڑھتی جاتی تھی۔ نشیب سے کہر اور ابر کی فضائیں بلند ہونی شروع ہوئیں، دیکھتے دیکھتے سارا ماحول ایک نم ناک دھند لکے میں تبدیل ہو گیا۔ کبھی خیال آتا کہ شاید زندگی کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ زندگی کی انتہا ایسی ہی ہوگی۔ بایں ہمہ یہ خیال بھی نہ گیا کہ یہ سب صحیح ہو یا نہ ہو، گرم کپڑوں کی ضرورت مسلّم ہے۔

ہم دونوں نینی تال پہنچے۔ ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب موٹر اسٹینڈ پر پہلے سے موجود تھے۔ ان کی آنکھیں بھی اچھی ہیں اور قسمت بھی۔ وہ یونیورسٹی میں بھی ہیں اور ہم کو قرض بھی دے دیتے ہیں۔ ابھی جھیل کے کنارے نہیں پہنچے تھے کہ ایک سمت ایک نئی عمارت نامکمل حالت میں نظر آئی۔ اصغر صاحب کو بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر خان نے کہا یہ عمارت فروخت ہونے والی ہے۔ اصغر صاحب نے بے اختیار ہو کر قیمت دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ کم وبیش ایک لاکھ پر معاملہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کو کچھ کام تھا اس لیے وہ راستے ہی سے ہم لوگوں سے معافی مانگ کر رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر اصغر صاحب کو یہ بات آدابِ میزبانی کی منافی نظر آئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ گھر پر پہلے سے پہنچ کر مہمانوں کی تعداد یا کھانوں کی اقسام پر بعض ایسے لوگوں سے عرض معروض کرنے چلے گئے تھے جن کے مزاج وطبیعت سے وہ ہم لوگوں سے یقیناً زیادہ واقف تھے، لیکن تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ وہ راستے بھر ہمارے ساتھ رہے اور ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض لطفِ داستاں کے لیے تھا۔

ہم ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ یہ ایک عام دستور چلا آتا ہے کہ جب کسی کے ہاں مہمان کی حیثیت سے جایا جائے اور یہ یقین ہو کہ ہم کو نہیں صرف میزبان کو ہر قسم کے اخراجات کی زیر باری نصیب ہوگی تو اپنے آپ کو مطبوع و مقبول بنانے کے لیے ہر قسم کی کوشش کرنا لازم ہے۔ ہم دونوں کو اس کا علم تھا، لیکن ایک دوسرے سے چھپانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں تو اسباب وغیرہ سے اُلجھا ہوا تھا۔ اصغر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بچہ کو اس طور پر چمکارنا اور کھلانا شروع کیا کہ میں باوجود ایک پیشہ ور والدین ہونے کے تھوڑی دیر کے لیے حیران رہ گیا اور معاً خیال آیا کہ جھیل میں کود پڑوں۔ لیکن جھیل دور تھی اور بچے کے نانا قریب۔ چنانچہ زقند بھر کر ان کے پاس پہنچا اور ایک ایسا تعظیمی آداب بجالا کر دست بستہ کھڑا ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لیے دونوں ڈاکٹر مبہوت ہو گئے۔ نانا سے بغل گیر ہو کر نواسے سے بآواز بلند یوں مخاطب ہوا۔ ''بیٹے اپنی والدہ سے میرا اور میری بیوی کا اور میرے بچوں کا سلام کہنا اور یہ بھی کہہ دینا کہ آپ کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی ہے۔'' ہم لوگوں کی اس مقاومت و مسابقت کا کیا انجام ہوا، اس کا اندازہ ہم کو سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو سکا ہے کہ اصغر صاحب مجھ سے کچھ زیادہ اُلجھنے لگے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کا خاندان میرا مداح ہے۔

ڈاکٹر اصغر، ڈاکٹر خان اور میں ایک ہی کمرے میں مقیم ہوئے۔ شیر و شکر چائے کی مانند۔ مجھ سے ڈاکٹر اصغر سے صلح ہو گئی تھی۔ کچھ اس قسم کی صلح جو تیاری جنگ کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں اور ڈاکٹر اصغر اپنی اپنی چارپائیوں پر دراز ہو گئے، اور جب ڈاکٹر خان کو اطمینان ہو گیا کہ ہم دونوں کچھ عافیت سے رہیں گے یا انھیں رہنے دیں گے تو چپکے سے اُٹھ کر کہیں اور مخلِ عافیت ہونے کے لیے چل دیے۔ شام کے وقت اُٹھے تو معلوم ہوا کہ بارش اور چائے دونوں موجود ہیں۔ چائے سے فراغت ہوئی تو سردی، تاش اور گل غپ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ بازی کیا ہوگی؟ میں اصولاً بازی لگانے کے موافق ہوں اور عملاً مخالف۔ ڈاکٹر اصغر اصولاً اور عملاً دونوں طرح اس کے موید تھے۔ ڈاکٹر خان دونوں کے مخالف۔ چوتھے صاحب بازی لگانے کے موافق اور روپے لگانے کے مخالف۔ کھیل ہوتا رہا، بحث جاری رہی نتیجہ یہ ہوا کہ بحث پر سردی، سردی پر بھوک اور بھوک پر نیند غالب آئی۔ آج کا پورا دن اسی طور پر گزرا۔

شب میں بارش تیز ہوئی، صبح اصغر صاحب کا زکام اور ڈاکٹر خان کو حرارت اور مجھ کو فرحت معلوم ہونے لگی۔

اصغر صاحب صبح کو غسل کرنے کے عادی ہیں اور میں سردیوں میں اس چیز کو غیر ضروری ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی سمجھتا ہوں۔ اصغر صاحب ہر صبح کو نہانے کے دلدادہ ہیں۔ میں کم سے کم تیسرے دن اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں۔ پہلی ہی صبح کو اصغر صاحب نے مجھ سے بڑے فیصلہ کن لہجے میں فرمایا کہ تم کو نہانا بھی ہوگا اور خط بنانا بھی، ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ علی گڑھ نباشد، نینی تال ہے۔ میں نے کہا دیکھیے اصول کے ماتحت بحث ہونی چاہیے۔ میں بغیر ضرورت کسی کام کا کرنا حماقت سمجھتا ہوں۔ غسل کیوں کروں اور آپ کو کیوں کرنے دوں۔ غسل صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ جسم کی کثافت دور ہو یا تندرستی میں ترقی ہو۔ یعنی ضرورتاً یا تفریحاً۔ ماشاءاللہ مجھے اپنی طہارت اور پاکیزگی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا، اور نہ محسوس ہوتا ہے۔ رہا تندرستی کا سوال، وہ بھی اس درجہ ہے کہ اس سے ترقی کرنا ممکن ہے نینی تال یا علی گڑھ کی رُسوائی کا باعث ہو۔ خط بنانے کا اصول البتہ کچھ سمجھ میں آتا ہے یعنی خط بڑھا ہو یا نمایاں ہو تو عورتیں عاشق ہو نا یا ان کے اعزا و احباب چائے پلانا بند کر دیں گے۔ عورتوں کی طرف سے مجھے اطمینان ہے جہاں تک میرا سوال ہے ان کو کبھی مجھ سے عشق کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ داڑھی جز و مناکحت قرار دی گئی ہے نہ وجہ طلاق۔ میں نے تو مرشد سے یہاں تک سنا ہے کہ داڑھی عورتوں کو پسند ہے!

یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خط بنوانا ایک معاشرتی فعل ہے۔ اس پر عمل کرنا ضروری ہے، لیکن غسل کرنا تو قطعاً ذاتی فعل ہے۔ اس معاملہ میں، میں مولویوں کا اصول زیادہ بہتر سمجھتا ہوں یعنی صرف شرعاً طاہر ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں اس کا حتی الوسع لحاظ رکھتا ہوں۔ آپ حفظانِ صحت کے اصول کے پرستار ہیں اور میں شریعت کا پابند، مولوی کی تہبند اور مسٹر کی پتلون کا نظری جائزہ لیا جائے تو یقیناً تہبند کو نیچا دیکھنا پڑے گا لیکن خوردبین سے معائنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دیوبند اور نینی تال میں کیا فرق ہے۔ اگر آپ کو اس سے اختلاف ہے تو ڈاکٹر خان سے رجوع کیجیے۔ وہ قسمت میں مجھ سے بہتر ہیں، عقل میں آپ سے اور شکل و صورت میں مجھ سے آپ سے

دونوں سے۔ پھر یہ کہ گورنمنٹی آدمی ہیں جب تک خود ان کا معاملہ درمیان نہ ہو، ہمیشہ انصاف سے کام لیں گے۔

چنانچہ مسئلہ پیش ہوا اور جیسا کہ ایسے معاملات میں گورنمنٹ کا رویہ رہتا ہے یعنی فریقین موجود ہوں تو کمزور کو گھڑکی اور قوی کو تھپکی اور ان میں سے ایک موجود ہو تو حاضر کو تھپکی اور غائب کو صلواتیں اور دونوں غائب ہوں تو دونوں کو احمق سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر خان نے بھی اسی طریقۂ کار کو اختیار کیا اس ترمیم کے ساتھ، یعنی دونوں موجود تھے اور دونوں احمق قرار دیے گئے۔

جب سے نینی تال پہنچے تھے، بارش کا سلسلہ قائم تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ کئی کئی دن مکان سے باہر نہ نکل سکے۔ اس لیے برآمدہ یا کمرہ ہی میں بیٹھے ڈاکٹر خان کے ماحضر پر اکتفا کرتے رہے۔ اچھا مکان، اچھا کھانا، اچھا میزبان، اچھا موسم، کوئی کام نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اور اصغر صاحب کے درمیان کشاکش شروع ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ ایک دن موسم کسی قدر اعتدال پر نظر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کو نباتات کے بعض نوادر جمع کرنے تھے اور ڈاکٹر خان کو حجری نمونے۔ مجھ سے فرمایا تم بھی چلو۔ عرض کیا کہ مجھ کو جہاں کا تہاں چھوڑ دیجیے جس نمونے کی مجھے تلاش ہے، وہ جھیل کے کنارے ہی مل جاتا ہے۔ دونوں نے کہا کہ ساتھ چلے چلو۔ تم بھی اپنی تلاش میں کامیاب ہو جاؤ گے اور یقیناً نہایت سستے داموں، غرض سب لوگ چلنے پر آمادہ ہوئے۔ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ موسم کا تیور بدلا۔ اصغر صاحب کو یہ شکایت کہ میں نے چلنے میں دیر کی، مجھ کو اس پر کوفت کہ اصغر صاحب نے ہمت چھوڑ دی۔ بہرحال ہم سب مکان کی سمت روانہ ہوئے اور راستے بھر ایک دوسرے کو اس قدر نیک و بد سمجھاتے رہے کہ کوئی دور سے دیکھتا تو خیال کرتا کہ بعض بدمذاق برج کھیل کر واپس آ رہے ہیں، اور اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ کھیل ہی رہے ہیں۔

مکان واپس آئے تو دیکھا میر مجھو جلوہ افروز ہیں۔ ڈھلے مجھے بالکل فرنچ کٹ۔ کرسی پر بیٹھے سگار اس طور پر پی رہے تھے، گویا ساری دنیا سے بیزار ہیں۔ میں نے کہا آداب بجالاتا ہوں، میر صاحب تھے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لیے ہوئے۔

فرمایا کہاں ہیں ڈاکٹر عبادالرحمٰن۔ میں ہرگز یہاں نہیں رہوں گا۔ انھوں نے مجھ کو دھوکا دیا۔ یہ ان کی بددیانتی ہے کہ تمھاری موجودگی میں مجھ کو بلایا۔ میں تمھارا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے کہا میر صاحب مجھ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ عبادالرحمٰن خاں صاحب نے ہمارے آپ کے خلاف سازش کر رکھی ہے اور ہاں بالکل بھول گیا۔ یہ ڈاکٹر اصغر صاحب ہیں میرے بڑے کرم فرما اور آپ سے ملنے کے بے حد مشتاق۔

دونوں نے ایک دوسرے کو اس تیور سے دیکھا کہ مجھ پر ہنسی اور غشی دونوں کا عالم طاری ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اتنے میں ڈاکٹر خان بھی آ گئے اور ہم تینوں میں اس طور بیچ بچاؤ کر دیا کہ ہم سب نے ڈاکٹر خان کے خلاف صف آرا ہونے کی ٹھان لی۔ میر مجھو نے چائے پینے اور ہنسنے دونوں سے انکار کر دیا۔ معاملات نازک ہو رہے تھے کہ میں نے دست بستہ میر صاحب سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ اگر کبھی میں ان سے مخاطب ہو کر ہنسوں، ہنساؤں یا ہنسنے والوں کا منہ بناؤں، تو ان کو اختیار ہوگا چاہے وہ مجھے جھیل میں ڈھکیل دیں یا خود اس میں نزول اجلال فرمائیں۔ یا ہم دونوں اس قسم کی حرکت پر آمادہ ہوں۔ لیکن غصہ کا پارہ جس بلندی پر پہنچ چکا تھا وہاں سے اُترنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر خان دونوں اپنی اپنی چار پائیوں پر دراز ہو گئے۔ میں نے میر صاحب کو برآمدہ میں ایک کرسی پر بٹھایا۔ ایک انگریز لڑکی بے تحاشا گھوڑا دوڑائے چلی جا رہی تھی، شکل سے دس سال کی عمر ہوگی۔ اس کے پیچھے دو تین سیاہ کتے بھی بھاگے جا رہے تھے۔ میر صاحب پر کچھ کیفیت طاری ہوئی کہ میں نے للکارا۔

میر صاحب آپ ہیں کس مغالطہ میں، بھلے مانسوں کے سامنے خواہ مخواہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے ہیں۔ جتنی خوشامد کی جاتی ہے اتنا ہی آپ کا دماغ خراب ہوتا ہے کسی کو مہمان رکھنے کی توفیق تو آپ کو ہوئی نہیں اور مہمان بننے کی تمیز نہیں۔ نینی تال میں آ کر فوج داری کرنے کا ارادہ ہو تو بتا دیجیے۔ دیکھتے نہیں ایک شریف شخص کے آپ مہمان ہوئے ہیں۔ گھر میں بزرگ بیوی، بچے بھی موجود ہیں۔ فرض کر لیجیے ڈاکٹر خان کی بیوی نے آپ کو بدتمیز اور بداخلاق سمجھ لیا اور انھوں نے تمام نینی تال کی عورتوں میں مشہور کر دیا کہ آپ کبھی بھلے مانسوں میں

نہیں بند ہے تو پھر کیا بات رہ جائے گی؟ اور تو جانے دیجیے یہ جس لڑکی کو دیکھ کر آپ پر ذرا دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی، آپ کا حال سن کر آپ کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔

میر صاحب سب کچھ سنتے رہے اور پھر مسکرا اُٹھے۔ کہنے لگے خیر میں تو جیسا کچھ ہوں ظاہر ہے، لیکن ذرا اپنے نامۂ اعمال کے مسودے پر بھی غور کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم ڈاکٹر اصغر سے ٹھیک رہتے ہو اور چوں کہ وہ بھی موجود ہیں اس لیے مجھ کو اطمینان ہے کہ تم شریفانہ حدود سے متجاوز نہ ہوسکو گے۔ میر صاحب یہیں تک پہنچے تھے کہ اصغر صاحب کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پیچھے دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں اور چہرے پر آثارِ عتاب ہیں۔ دریافت کیا کیوں صاحب یہ میرے بارے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ میں نے کہا دیکھیے میر صاحب کیا فرما رہے ہیں۔ آپ نے اپنا نام تو سن ہی لیا ہوگا۔ کہنے لگے ہاں سنا ہے۔ میں نے کہا میر صاحب فرماتے تھے کہ اب ڈاکٹر اصغر شریفانہ حدود خطرے میں آجائیں کہ عباد الرحمٰن خاں صاحب نے نعرہ لگایا، خبردار قصور اسی شخص کا ہے جو غلط واقعات کا غلط راوی ہے۔ تم سب فوراً منتشر ہو جاؤ۔ ورنہ اس وقت کا کھانا اور دوسرے وقت کا سونا ضبط!

ایک دن میر مُنجھو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے۔ تجویز یہ ہوئی کہ آج کہیں نہ کہیں ضرور چلا جائے۔ عجیب بات یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر خان کے ایما سے میں نے میر صاحب کو خائف یا ناراض کرنے کی کوشش کی، لیکن ان پر کچھ ایسی 'کروشن فیلنگ' طاری تھی کہ ایک پیش نہ گئی۔ میر مُنجھو کی آمادگی نے ڈاکٹر اصغر صاحب کو بھی چلنے پر اُکسایا حالاں کہ یہ دونوں پیدل چلنے اور بلندی پر چڑھنے سے اتنا ہی بیزار تھے، جتنا مجھے کسی 'بور'[1] سے ملنے کے لیے اُٹھنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ غرض ایک طرف چل نکلے۔ ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر خان تو اپنے اپنے فن کی چیزوں کی تلاش اور تعریف میں انسانیت سے گزرنے لگے۔ جہاں سبزہ ہوتا تھا ڈاکٹر اصغر ایک ایک پتے اور اس کے رگ و ریشہ پر راگ اور رقص کو دخل دیتے تھے۔ دوسری طرف عریاں چٹانوں کو پاکر ڈاکٹر خان اس کی ہیئت اور ماہیت پر سر دُھنتے!

---

1. ایک صاحب نے 'بور' کی کتنی اچھی اور جامع تعریف کی ہے۔ ''شخصے کہ بے ارادہ مکلف باشد!''

میں نے کہا میر صاحب یہ دونوں تو ہاتھ سے گئے۔ آیئے ہم دونوں بھی اپنی اپنی فکر کریں۔ ایک پان کھلایئے اور اس پل پر بیٹھ جایئے۔ دیکھیے نیچے کتنا تاریک اور گہرا غار ہے اور غار کی تہ میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اگر ہم دونوں اس میں کود پڑیں تو پہلے کون شخص زمین پر پہنچے گا۔ میر صاحب نے فرمایا اور کون مسخرا اس میں کودے گا۔ میں نے کہا کودنے میں کیا لگتا ہے۔ فرض کیجیے آپ ہی کو کودنا پڑے۔ میر صاحب نے کچھ غصہ اور کچھ تحیر میں آکر جواب دیا کودنا پڑے! فرمایا میں کب آمادہ ہوں، میں نے کہا آمادہ تو میں بھی نہیں ہوں لیکن یہ میرا ذمہ ہے کہ میں آپ کو کودنے پر مجبور کردوں گا۔ میر صاحب پل سے نیچے اُتر آئے اور فرمایا، اب کہو۔ میں نے کہا جب میں ایک کہوں تو آپ توبہ استغفار کرلیجیے گا۔ دو کہوں تو آنکھیں بند کرلیجیے گا اور تین کہوں تو کود پڑیے گا پھر جی چاہے تو آنکھیں بھی کھول لیجیے گا۔ فرمایا یہ سب کیوں اور میں کیوں ماننے لگا۔ میں نے کہا اور جو میں پیناٹزم جانتا ہوں، یہ میرا ہی تصرف تھا کہ آپ پل سے نیچے اُتر آئے۔ یہ تو میرا ادنیٰ تصرف تھا۔ اگر پوری توجہ کرتا تو آپ پل کی دوسری طرف اُترتے اور یہ تو معلوم ہورہا ہے کہ آپ توبہ استغفار کی نیت کررہے ہیں۔ 'اچھا ایک' میر صاحب چونک پڑے کیوں کہ پیچھے سے ڈاکٹر خان نے آکر ان کی آنکھوں پر اپنی اُنگلیاں جمادی تھیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اب کوئی شخص ایسی حرکت نہ کرے گا، جس سے فن کی مہارت اور علم کا ذوق ظاہر ہوتا ہو۔

ہم سب ایک طرف چل نکلے۔ راستہ تقریباً مسطح، خوش گوار، اونچی اونچی سرسبز چوٹیاں، اُچھلتے بل کھاتے شفاف چشمے یا فرہاد کا خواب شیر و شیریں، راستے میں بہائم سے بدتر قلی نظر آئے۔ کئی میل تک باتیں کرتے چلے گئے جن کی شادی ہوگئی تھی وہ بیویوں سے دور رہنے پر مطمئن، جن کی نہیں ہوئی تھی وہ نہ کرنے پر پشیمان۔ کہیں بھٹکے کہیں ٹھٹکے، ایک طرف سے ابر اُٹھنا شروع ہوا، دیکھتے دیکھتے ساری وادی دھندلی اور نم ہوگئی۔ طے یہ ہوا کہ اب جلد واپس ہونا چاہیے۔ اصغر صاحب کو ایک گھوڑا مل گیا اور ہم لوگوں کو ایک چڑھائی کا راستہ جو مختصر تھا۔ اس لیے یہ طے پایا کہ زیادہ محنت اور مختصر راستہ قابلِ ترجیح ہے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ بارش شروع ہوئی۔ اصغر صاحب جاچکے تھے، میں میر مجھو اور ڈاکٹر خان رہ گئے تھے۔ کسی کے پاس نہ چھتری تھی نہ

برساتی، سب نے بھیگنا اور میر منجھو نے ہانپنا کوسنا شروع کیا۔ طے یہ پایا کہ اگر میر منجھو کے ہم دوش وہم عنان رہے تو دو قدم بھی چلنا دشوار ہوگا۔ اس لیے میر منجھو چھوڑ دیے گئے۔ ڈاکٹر خان بڑھتے چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ اگر میر منجھو چھوڑ دیے گئے تو ممکن ہے کہیں کسی ایسی حرکت پر نہ آمادہ ہو جائیں جو 'نقصانِ ہمسایہ وشماتت ماہٰ' کا موجب ہو۔ اس لیے میں کچھ آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر میں میر منجھو بھی آکر مل گئے۔ کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ جب تک میر منجھو خود سلسلۂ گفتگو کا آغاز نہ کریں گے میں بھی خاموش رہوں گا۔ بالآخر ایک طویل سانس لے کر میر منجھو نے فرمایا۔ بھئی برے پھنسے، اب کیا کیا جائے۔ تم سے کہہ رہا تھا کہ چھتری لے لو۔ تمھارے ہی کہنے سے برساتی نہیں خریدی، اب بتاؤ کیا کیا جائے اور دیکھو ڈاکٹر خان نے کیسا چرکہ دیا ہے، چڑھائی تو دیکھو 'اللہ کی پناہ' لیکن ایک بات البتہ میں نے دریافت کی ہے اور وہ یہ ہے کہ چڑھائی میں سانس ناک سے لینا چاہیے۔ منہ سے لینے سے تو بڑی تکلیف اور تکان ہوتی ہے۔

عرض کیا میر صاحب غلطی تو ہوئی۔ اسی طور پر قیامت کے دن لوگ کہیں گے کہ فلاں کام کیوں نہیں کیا اور فلاں کے کہنے میں کیوں آگئے اور دیکھیے تو قیامت اور آج کے دن میں فرق ہی کیا ہے۔ سورج سوا نیزے پر نہیں تو معلوم نہیں کتنے ہزار نیزے اس کے قریب آہی گئے ہیں۔ فرق گرمی اور سردی کا ہے، لیکن آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ سردی جب بڑھ جاتی ہے تو گرمی کا کام کرنے لگتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ قیامت کے دن ماں، باپ، بیوی، بچے، دوست، اعزا کام نہ آئیں گے صرف اعمالِ صالح کام آئیں گے۔ سو یہ چیزیں لکھنؤ ہی میں آپ کے پاس کب تھیں کہ آج ان کی سرد مہری یا بے وفائی کا شکوہ کیا جائے۔ ڈاکٹر خان اور اصغر صاحب پر آپ کو بڑا اعتماد تھا۔ انھوں نے رفاقت چھوڑ دی۔ آپ نہ اعمالِ صالح کے قائل تھے اور نہ میرے بایں ہمہ اعمالِ صالح کے بجائے میں ظاہر ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے تکلف فرمایئے۔ پھر قیامت میں کیا تکلف، جل کر فرمایا اور تم کسی آشوبِ قیامت سے کم ہو۔

عرض کیا میر صاحب اگر آپ کے جذبات اب تک وہی ہیں جو لکھنؤ میں تھے تو مبارک ہو کہ ابھی قیامت نہیں آئی ہے اور ہم ایک دوسرے کے بیوی بچوں سے مل سکیں گے۔

ہنس پڑے، فرمایا بھئی کہیں ٹھہر جاؤ۔ میں نے کہا میر صاحب اس میں خطرہ ہے۔ بھیگ تو آپ کافی گئے ہیں، چلنے سے حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے جس سے سردی کا سد باب ہوتا رہتا ہے۔ ٹھہرے تو صرف نمونیا کا اندیشہ ہے۔ نینی تال کا پہاڑ کچا پہاڑ بتایا جاتا ہے۔ اگر کوئی حصہ تفریحاً آ رہا تو کیسی رہے گی۔ فرمایا سچ کہتے ہو، لیکن چلا بھی تو نہیں جاتا۔ میں نے کہا چلنے کا ارادہ نہ کیجیے ارادہ کمزوری پیدا کرتا ہے۔ بس مجھ سے باتیں کرتے رہیے اور سمجھیے کہ چلنا بھی باتوں کا ایک جزو ہے۔ کہنے لگے یہ بھی تو ممکن ہے کہ ڈاکٹر خان کسی دوسرے راستے سے نکل گئے ہوں اور ہم تم دونوں راستہ بھول گئے ہوں۔ میں نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ نہایت کشادہ اور ہموار ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی معقول آبادی اور مکانات ضرور ملیں گے۔ فرمایا اچھا یہ بتاؤ کس سمت چل رہے ہیں۔ میں نے کہا سمت کا سوال ہی بیکار ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم سب بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ کہنے لگے آخر بلندی کی بھی کوئی حد ہے، کب تک بلندی کی طرف چلو گے۔ میں نے کہا جب تک اللہ میاں یا ڈاکٹر خان نہ ملیں۔ میر صاحب اس پر کچھ آمادۂ نقضِ امن ہونے والے تھے کہ سامنے ایک طرف ڈاکٹر خان سگریٹ پیتے نظر آئے۔

فلیٹ پر آئے تو میر صاحب کو خیال ہوا کہ لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے۔ میں نے کہا میر صاحب یہ نینی تال ہے اس قسم کے حادثات آئے دن یہاں لوگوں کو پیش آتے ہوں گے۔ مردوں سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آخر ہم آپ یہاں کے کس مرد سے کم خوب صورت، توانا یا آبرو باختہ ہیں۔ رہیں لیڈیاں تو وہ ایک دفعہ آپ کو دیکھ کر ہنس تو ضرور پڑیں گی، لیکن بعد میں ضرور خیال کریں گی کہ ہم کتنے جری اور جفاکش ہیں کہ اس ابتلا مصیبت میں بھی بشاش چلے جا رہے ہیں اور ہاں وہ قصہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ شیریں فرہاد.......

گھر پہنچے تو بچّوں نے تالیاں بجائیں، نوکروں نے انگیٹھیاں سلگائیں۔ کپڑے تبدیل کیے گئے، کھانا کھایا گیا۔ اپنی اپنی چارپائی پر دراز ہوئے۔ میر مجھو کو نیند نے جھیل میں اور اصغر صاحب کو برلن پہنچا دیا۔ بیداری میں ڈاکٹر خان 'اندرونِ خانہ' پہنچے۔ میں نے خطوط کی طرف رُخ کیا۔ معلوم ہوا کہ بیوی ہسپتال میں، بچّے مکان پر ہیں اور بچّوں کے نانا کو آپریشن، سب کو جواب لکھے۔ بیوی کو لکھا میں دوسری شادی ہرگز نہ کروں گا اور نہ یہاں اس نیت سے آیا

ہوں۔ بچوں کو لکھا تم لوگ اماں بی کو پریشان نہ کروگے تو پڑھنے لکھنے سے ہمیشہ کے لیے آزاد کردیے جاؤگے۔ ان کے نانا میاں کو لکھا، مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ۔ یہاں تبدیلِ آب وہوا کی غرض سے آیا تھا لیکن آب وہوا کی کچھ ایسی کثرت ہوگئی ہے کہ بیوی بچوں تک پہنچنا دشوار ہورہا ہے۔

کچھ دیر کے بعد کمرے سے نکل کر برآمدہ میں بیٹھ گیا۔ جھیل میں بادبانی کشتیاں آبی تتلیوں کی مانند رقص کررہی تھیں۔ دور سے آبشاروں کی اور نزدیک سے ان خوب صورت چڑیوں کی آوازیں آرہی تھیں جو ایک طرف لٹکتے ہوئے پنجرے میں پُھدک رہی تھیں۔ کبھی خیال آتا کہ ان کو آزاد کردیا جائے تو کیسی مسرور ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ یہاں بہت آرام سے ہیں۔ موسم اور فضا کی بے اعتدالیوں سے بھی محفوظ ہیں۔ لیکن آزادی بھی کیا چیز ہے کہ ہر راحت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ سامنے سڑک پر سے قلی گزر رہے تھے، ایک تندرست آدمی کو چار کمزور آدمی ڈانڈی میں لیے جارہے تھے۔ ڈانڈی کا منظر بھی کس درجہ عافیت سوز ہوتا ہے۔ اس میں تو صرف عورتوں کو بیٹھنا چاہیے وہ بھی تفریحاً نہیں انتقاماً۔ مردوں کو اس سواری میں دیکھ کر اکثر جی میں آیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے درمیان سے ایک ڈنڈا نکال دیا جائے جس کے دونوں سروں کو قلی اُٹھالیں اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس زندہ لاش کو نینی تال کی سب سے بلند چوٹی پر لے جاکر اس طور پر پھینکیں کہ یہ جھیل کے عمیق ترین حصہ میں جاکر گرے۔

معاشرت اور معیشت کے بھی کیا کرشمے ہیں جن کے سامنے آج یورپ کی بازی گری بھی مات ہے۔ سرمایہ اور مزدور کی کشاکش، حسن وعشق کی کشاکش سے کچھ زیادہ پرآشوب نظر آرہی ہے، لیکن یہ وہ مسائل ہیں جن کو مجنوں اور مسولینی بھی حل نہیں کرسکے ہیں۔ شاید یہ حل ہونے کے لیے بنائے بھی نہیں گئے ہیں۔ ان کے حل ہونے پر ممکن ہے، بہت سے حل شدہ مسائل لاینحل ہوجائیں۔ سردی اور بڑھی، اندر سے ایک کمبل لایا۔ اوڑھ کر اس طور پر بیٹھا کہ دوسرے کو صرف کمبل اور عینک نظر آئے اور مجھ کو سارا نینی.....تا.....(کچھ نہیں!)

●●●

کچھ کا کچھ!

عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیراتِ ہند سے ڈرتی ہیں نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے اس لیے نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیراتِ ہند اور میونسپلٹی دونوں کی آوردہ ہیں، عشاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے بے نیاز ہیں۔ انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا عشاق کو شعرا نے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعرا اور آئی سی ایس کے اثر سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے سوراج مل جائے یعنی انگریزوں میں عشاق اور عشاق میں انگریز بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

عشاق کی تاریخ کا پتہ لگانا دشوار ہے۔ ان کی تفتیش یا ان کا تدارک نہ سائنس سے ممکن ہے نہ میونسپلٹی سے۔ کسی چیز کا پتہ تین ہستیاں لگا سکتی ہیں۔ پولیس، پروفیسر، مولوی، لیکن دقت یہ آن پڑی کہ پولیس نے تفتیش کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ عشاق کا مسئلہ پولیس سے نہیں بلکہ محکمۂ حفظانِ صحت سے تعلق رکھتا ہے۔ پروفیسر ہر بات کی ابتدا آکسفورڈ اور کیمبرج سے کرتا ہے۔ مولوی آدم اور جنت سے۔ رفع شر کی خاطر چاہا تھا کہ مولوی اور پروفیسر دونوں کے بابا آدم کو مشترک قرار دے دوں، لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ آکسفورڈ اور کیمبرج میں بابا آدم اور جنت نہیں ملتے۔ دوسری طرف بابا آدم اور ان کی جنت میں آکسفورڈ اور کیمبرج کا پتہ نہیں۔

اس تحقیق و تفتیش کے دوران میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے میں آپ کے بابا آدم سے واقف ہوں۔ ہم دونوں ہم وطن اور ہم مکتب تھے اور آپس میں نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ بعض جی حضوروں نے ہم میں اختلاف پیدا کرادیا اور اب اس اختلاف نے یہاں تک طوالت کھینچی ہے کہ ایک طرف یونیورسٹیاں قائم کی جانے لگی ہیں، دوسری طرف ہم کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ مولوی اور پروفیسر دونوں کے باوا آدم کا ایک ثابت کرنا اتنا مفید یا دلچسپ نہیں ہے جتنا مجھے ان دونوں کا چچا قرار دینا۔ اخی آدم میرے بڑے بھائی تھے، لیکن نہایت سادہ لوح، ضدی اور جاہل، ذرا یہ کرشمہ ملاحظہ فرمایئے گا۔ نہ بندوق اپنی نہ نشانہ اپنا نہ ارادہ اپنا نہ مقصد اپنا صرف اپنے کندھے پر رکھ کر چھڑوالی۔ ان کی اس حرکت سے کتنا بڑا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ اب جو کہتا ہوں کہ میاں یہ کیا کیا، تو کہتے ہیں کہ ہم خلاصۂ کائنات ہیں۔ میں نے کہا اور یہ خاکسار! لال پیلے ہو کر فرمایا، شیطان۔ میں نے کہا، خوب جنت نباشد، یہ دنیا ہے جہاں مولوی، اور پروفیسر اور تعزیرات ہند اور ملیریا اور بیوی بچوں سے پالا پڑے گا۔ یونیورسٹی میں تعلیم دی جائے گی، اسپتال میں ولادت ہوگی، اپالو اور چوپائی پر بیویاں ملیں گی۔ دفعہ 34 میں چالان ہوگا۔ سری گنیش آیمہ! جھلا کر بولے تو کافر ہے، جہنم کا ایندھن بنے، جہنم کے ایندھن کا مضحکہ اُڑائیں۔ میں تو خیر جہنم بردوش ہوں آپ بھی تو آکسفورڈ بداماں ہیں۔ میں جہنم میں چلا جاؤں گا، آپ بھی کیمبرج سے کبھی نکل سکیں گے یا نہیں؟ فرمایا استغفر اللہ۔ میں نے کڑک کر کہا بس بس یہی منہ سے نہ نکالنا نرے مولوی ہی معلوم ہوتے ہو نہ سمجھتے ہو نہ سمجھنے دیتے ہو، اور کوئی سمجھاتا ہے تو الف ہوتے ہو۔ میاں استغفر اللہ کہنے کا تو وقت تھا جب اپنوں سے سجدہ کرانے کی فرمائش کی گئی تھی، ایک اپنی خاطر ساری جماعت کی جگ ہنسائی کرائی۔ خلاصہ کائنات؟ کیا یہ بھی کوئی تعلیمی ڈگری تھی کہ جب تک کوئی دے یا نہ دے قابلیت کا معیار ہی نہ متعین ہو سکے۔ کیا خلاصۂ کائنات ہونے سے پہلے کچھ اور تھے، تمہارے اس بے اختیارانہ اور بے کسانہ استغفر اللہ پر ان کو بھی ندامت ہوتی ہے، جن کی پناہ پکڑنے پر اتنے دلیر ہو!

اپنے کو جو جی چاہے کہتے رہیے لیکن مسئلہ کی نوعیت، کھیل کھلاڑی کا پیسہ مداری کا، سے آگے نہیں بڑھتی۔ کھیل کھیلنے پر آپ مجبور ہیں۔ کمال فن پر داد ملتی ہے، خوش ہیں کہ کمال

آپ کا ہے۔ لیکن یہ آپ کی صریح لیکن مقتدر گمراہی ہے۔ کمال آپ کا ہوتا تو اپنے کمال کے اظہار پر اتنے مستعد نہ ہوتے، جتنا دوسروں کے کمال کا اعتراف کرنے پر آمادہ۔ کچھ ترش رو ہو کے فرمایا تو پھر گویا تمھارے کمال کی داد دوں۔ میں نے کہا تمھارے داد نہ دینے سے میری اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا، تمھارا خلاصۂ کائنات ہونا دوزخ کے اندیشے اور جنت کی ہوس پر منحصر ہے۔ دوزخ اور جنت نہ رہے تو تمھارا اشرف المخلوقات ہونا مہمل تر ہو جائے، یہ تو بالکل ایسا ہے جیسا ہندوستان کا امن برطانوی اقتدار پر ہے۔ انسان ایک مقدس گمراہی میں مبتلا ہے جس کو وہ مذہب قرار دیتا ہے اور جس چیز کو وہ نہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے اس کو مذہب کے حوالہ کر دیتا ہے۔ مذہب کو تم اپنے اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ قرار دیتے ہو، حالاں کہ وہ تمھارے اور خدا کے درمیان زیادہ سے زیادہ صرف ایک مفاہمہ ہے اور مفاہمہ کے لیے فریقین کا ہم سطح ہونا ضروری نہیں ہے۔ تم نے خدا کی جو حیثیتیں تسلیم کر لی ہیں اس کے اعتبار سے تم کو فریق بننے کا اختیار بھی حاصل ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے معاہدہ اور مفاہمہ دونوں بے معنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ مذہب کی ابتدا انسان کے اوّلین اعتراف شکست سے ہوئی تھی اور یہ گندم چشی اس کا اظہار معذرت تھا۔

تھوڑی دیر تک تو ہمارے سادہ لوح برادر مکرم پیچ و تاب کھاتے رہے لیکن چوں کہ ان کو اس کا یقین تھا کہ میرے لیے ان کی خوشی اور ناخوشی دونوں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ کچھ سنجیدہ بنے اور اس متفکرانہ لیکن برخود غلط طریقہ سے آمادۂ گفتگو ہوئے گویا کہ جو کچھ کہہ رہے تھے اس سے کہیں زیادہ علم کا ذخیرہ ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ تھا۔ فرمایا انسان کا کسی چیز کا نہ سمجھنا اس کی کمزوری کیوں ہو۔ کسی واقعہ کا سمجھنا یا نہ سمجھنا یہ سب اپنی اپنی جگہ پر ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان کسی چیز کو نہ بھی سمجھے پھر بھی وہ انسان ہے اس کا پیغمبر، جنرل، مصنف، یا اس قبیل کی کوئی اور چیز ہونا اس کے انسان بننے کے لیے ضروری نہیں ہے۔ انسان بجائے خود محض انسان ہونے کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ استغنا کے ساتھ جواب دیا اور اس طور پر گویا وہ میری بات کو مہمل سمجھ کر بھی اس کو مہمل ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے کہا آپ کی دلیل تو ایسی ہی ہے جیسے سی آئی ڈی ہر حال میں سی آئی ڈی ہے خواہ وہ جرم یا مجرم کا پتہ لگا سکے یا

نہیں ۔فرمایااور نہیں تو کیا، میں نے عرض کیا گویاانسان ہونا آپ کا پیشہ ہے کارنامہ نہیں! یہ جملہ یا جرعہ ان کے ظرف کی ساری وسعت پر محیط ہوکر چھلک گیا۔ سنتے ہی اصلیت پر اُتر آئے۔ کہنے لگے بدمعاش اب ذاتیات پر اُتر آیا۔ ابھی تو سی آئی ڈی پر دانت لگائے ہوئے تھا۔ اب شاید تیرا دوسرا وار آئی سی ایس پر ہوگا، غدار کہیں کا۔ میں نے کہا سی آئی ڈی کے جواز میں کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے تو آئی سی ایس کی کب تک خیر منا سکو گے۔ جس سے معاشرت کا بار نہ اُٹھایا جا سکے، مذہب کا جوا کیوں گلے میں ڈالے۔ غدار اُسے کہتے ہیں جس نے غدار ہونے یا نہ ہونے کی ذمہ داری لی ہو۔ میں غدار نہ ہوتا تو تم خلاصۂ کائنات کیسے ہوتے، لیکن انصاف شرط ہے۔ اس کائنات کا جس کے تم خلاصہ قرار دیے گئے ہو، اوّلین غدار کون ہے تم یا میں؟ تم مجود بنائے گئے اور یہی نہیں بلکہ تم میں اس کے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں تھی اس لیے کہ خودغرض بھی تھے اور احمق بھی۔ خودغرض یوں کہ تم نے غور تو کیا ہوتا تم میں مجود ہونے کی کون سی بات تھی۔ کسی کے کہہ دینے سے تم اس منصب کے اہل کب ہو گئے اور احمق یوں کہ سمجھتے تھے کہ دوسرے بھی احمق ہیں۔ بہرحال تم نے خودغرضی اور حماقت سے خان بہادری حاصل کر لی۔ میں نے تم کو سجدہ کرنا تمھارے پیدا کرنے والے کی توہین سمجھی لیکن تم اس کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔ تمھاری تخلیق کا بنیادی اصول ہی کمزور تھا۔ آستانہ پہلے سے موجود تھا پھر آخر جبیں کہاں سے لائی جاتی، وہ تم نے پیش کر دی۔ کرنے کو تو فرشتوں نے بھی سجدہ کیا اور تم کو کیا، لیکن ایسے آستانہ کی محرومی بھی قابلِ رحم ہے جو جبینوں کا محتاج ہو۔ میں نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ تم اس حقیقت کو کبھی نہ سمجھ سکو گے کہ میرے انکار نے تمھارے خدا کی بہترین صفت اور پوشیدہ ترین راز کو برافگندہ نقاب کر دیا۔ میلادِ آدم نے قوائے الٰہیہ کو مضمحل کر دیا تھا۔ انکارِ ابلیس نے ان کو شگفتہ بنا دیا۔ انکارِ ابلیس ایک آئینہ تھا جس میں حقیقت نے پہلی بار حقیقت کو پہچانا۔ لیکن آپ تو ظالم اور جاہل قرار دیے گئے ہیں۔ یہ باتیں کب ذہن میں آئیں گی۔ اچھا یہ سب جانے دیجیے آخر یہ کیوں لازم آتا ہے کہ جب تک کوئی سجدہ نہ کرے اس وقت تک کوئی معقول نہ ہو اور جب تک کوئی مسجود نہ ہولے اس وقت تک وہ مقتدر نہ ہو سکے۔ میرے سجدہ نہ کرنے سے آپ اشرف المخلوقات کیوں کر ہو گئے؟ اگر آپ کا اشرف المخلوقات ہونا محض اس بنا پر ہے کہ میں مردود ہوں تو آپ کی حالت یقینی قابلِ رحم ہے اور

میرا سجدہ نہ کرنا میرے لیے انتہائی فخر۔ آپ کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ آپ نے اپنا برا یا بھلا ہونا دوسروں کے برے یا بھلے ہونے پر منحصر رکھا ہے۔

اخی آدم اب گھبرائے، کہنے لگے۔ بھائی ان کو نہیں پکڑتا جن کا یہ سب کھیل ہے۔ آخر اتنی دیر سے مجھی سے کیوں اُلجھا ہوا ہے۔ اخی آدم کی معقول اور ناگزیر پسپائی مجھے پسند آئی۔ میں نے کہا ذرا قریب آؤ کان میں کہنے کی بات ہے۔ کوئی مولوی نہ سن لے، ورنہ میری اور تمھاری دونوں کی خیر نہیں۔ مجھے تعلیم یافتہ اور تمھیں شیطان قرار دے گا۔ اخی آدم کے کچھ تیور بدلنے لگے تھے کہ میں نے فوراً کہا، بھائی جان اچھی بات ہے میں نہیں آپ ہی تعلیم یافتہ سہی، اتنا سن کر اس طور پر مسکرائے اور ساتھ ہی ساتھ اظہارِ انکسار فرمایا جیسے کوئی پیشہ ور شاعر اپنے کلام کی داد پر اظہارِ فروتنی کرتا ہو اور داد دینے والے کو اس حرکت پر خجالت بھی آئے اور غصہ بھی۔ بہر حال اب آدم انتہائی خلوص اور اعتقاد کے ساتھ میری بات سننے کے لیے آمادہ ہوئے۔ مجھے خیال آیا کہ ہندوستان میں سوراج اور تعلیم یافتہ بیویوں کے ہنگامہ سے کسے کب فرصت ہو، آؤ جو کچھ کہنا ہے ان سے کہہ دو۔ مردِ معقول معلوم ہوتے ہیں۔ مریض و مفلس ہیں، متعدد بچے اور ایک ہی بیوی ہے۔ ممکن ہے راہِ راست پر آجائیں، ورنہ بقولِ شخصے ممکن ہے کسی ایسے سے سابقہ پڑتا جو خود جاہل ہوتا۔ بیوی پردہ نہ کرتی ہوتی۔ میں نے کہنا شروع کیا۔

''سنو حقیقت یہ ہے، انسانیت مکمل نہیں ہے اور نہ مکمل ہو سکتی ہے۔ یہ تمام کائناتِ عالم منشائے الٰہی اور قدرتِ الٰہی کی باہمی اور مسلسل کش مکش تفوق کا نتیجہ ہے۔ خدا سب سے بڑا 'آئیڈیلسٹ' ہے اور تم جانتے ہو آئیڈیلسٹ کی سب سے بڑی محرک.....''

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، پاس کی ایک شکستہ مسجد سے تکبیرِ اذاں بلند ہوئی، اور پھر کچھ نہ سنائی دیا کہ اخی آدم اور ابلیس کے مکالمہ یا مجادلہ کا کیا انجام ہوا۔

(مطبوعہ: نیرنگ خیال۔ لاہور، عید نمبر، فروری/ مارچ 1930)

●●●

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد اول)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 236

قیمت: -/174 روپے

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد دوم)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 544

قیمت: -/331 روپے

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد سوم)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 386

قیمت: -/252 روپے

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد چہارم)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 324

قیمت: -/219 روپے

انشا کاٹر کی روزنامچہ

مترجم: سید نعیم الدین

صفحات: 66

قیمت: -/15 روپے

بیسویں صدی (نصف اول) کے اردو مصنفین

مصنفہ: سنجیدہ خاتون

صفحات: 570

قیمت: -/137 روپے

₹ 140/-

ISBN : 978-81-7587-776-4

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110025